

دل کے انداز تحریر، زندگی کی تصویریں

کراچی

پچی کہانیاں

November

2013

پچی کہانیاں

ڈاٹ کام

اس شمارے میں

☆ ”آتش جنوں“ سلیم فاروقی کے قلم کا شاہکار

☆ ایک ناقابل فراموش سلسلہ ”مکھنی“ ارشد علی ارشد کے قلم سے

☆ ”مسئلہ یہ ہے“ آئی آئی کے ورثے آپ کے سگڑاں

www.paksociety.com

سچی کہانیاں

عیدِ قربان

7 سلیم فاروقی

احوال

9 نگران مدیر

ایک منٹ میں حالات کا تجزیہ
ملک کی موجودہ صورتحال پر
ایک نظر، مختصر مگر جامع ادارہ
تجزیے اور نوک جھونک

خیام کی رباعی

25 نسیم منیر علوی

آتش جنوں

36 سلیم فاروقی

آوارہ حسینہ

63 عظیم الدین انصاری

جسے چاہا تھا

71 مجید احمد جانی

عید کا جوڑا

انور فرید

موت کا عمل

159 بشری سعید

اک لمحے کی بھول

172 رضوان قیوم

تقدیر کے کھیل نیارے

181 عمر اسماعیل بروی

عادت بد

88 روبینہ شاہین

شمع جلتی رہے گی

92 محمد سلیم اختر

بہت بڑا ہول میں

103 محمد آصف طاہر

ہوس نے دن چوڑھائے

115 فرزات نگہت

اک سر بستہ راز

1 کاشی چوہان

مکھنی

197 ارشد علی ارشد

دُعا بد دُعا

220 آسم عادل

مسئلہ یہ ہے

224 قارئین / ادارہ

ہر شخص میں کوئی نہ کوئی کمزوری ہوتی ہے۔ دیے سے پیار روشن ہوتا ہے۔ صرف اُس میں تمام تر برائیاں تھیں لیکن وہ بہ ظاہر بہت شفیق، مہربان اور نرم دل تھی لیکن اُس میں ایک لالچی

ایک دیے کی حفاظت ہی اصل مسئلہ ہے۔ راوی پنڈی سے تحفہ خاص برائیاں اچھائیاں پر حاوی آگئی تھیں

اُس میں بھی ایک ایسی ہی خالی تھی

اُس میں تمام تر برائیاں تھیں لیکن وہ بہ ظاہر بہت شفیق، مہربان اور نرم دل تھی لیکن اُس میں ایک لالچی

ایک عجوبہ لڑکی کی عجیب داستان وہ ماورائی قوتوں کی مالک تھی اب تو یہی سے ایک عجب کہانی

ایک عجوبہ لڑکی کی عجیب داستان وہ ماورائی قوتوں کی مالک تھی اب تو یہی سے ایک عجب کہانی

زبان سے نکلنے والے الفاظ بعض اوقات حقیقت بن جاتے ہیں کبھی دُعا کبھی بد دُعا

دنیا میں کوئی الجھن ایسی نہیں جس کا حل موجود نہ ہو آیات قرآنی کی روشنی میں آپ کے مسائل کا حل

مجرم کون؟

119 مریم شاہ بخاری

جرم کی کوکھ

123 شاہ کنول اللہ دتہ

جرم کی بھی کئی قسمیں ہوتی ہیں بہت اُس نے اپنی عزت بچانے کے لیے جرم ایسے ہوتے ہیں کہ مجرم ایک خون کر دیتا تھا اُس کے باوجود وہ معصوم بن جاتا ہے دوسری مختصر کہانی عزت نہ بچا سکی تیسری مختصر کہانی

جرم کی بھی کئی قسمیں ہوتی ہیں بہت اُس نے اپنی عزت بچانے کے لیے جرم ایسے ہوتے ہیں کہ مجرم ایک خون کر دیتا تھا اُس کے باوجود وہ معصوم بن جاتا ہے دوسری مختصر کہانی عزت نہ بچا سکی تیسری مختصر کہانی

جرم کی بھی کئی قسمیں ہوتی ہیں بہت اُس نے اپنی عزت بچانے کے لیے جرم ایسے ہوتے ہیں کہ مجرم ایک خون کر دیتا تھا اُس کے باوجود وہ معصوم بن جاتا ہے دوسری مختصر کہانی عزت نہ بچا سکی تیسری مختصر کہانی

جرم کی بھی کئی قسمیں ہوتی ہیں بہت اُس نے اپنی عزت بچانے کے لیے جرم ایسے ہوتے ہیں کہ مجرم ایک خون کر دیتا تھا اُس کے باوجود وہ معصوم بن جاتا ہے دوسری مختصر کہانی عزت نہ بچا سکی تیسری مختصر کہانی

جرم کی بھی کئی قسمیں ہوتی ہیں بہت اُس نے اپنی عزت بچانے کے لیے جرم ایسے ہوتے ہیں کہ مجرم ایک خون کر دیتا تھا اُس کے باوجود وہ معصوم بن جاتا ہے دوسری مختصر کہانی عزت نہ بچا سکی تیسری مختصر کہانی

جرم کی بھی کئی قسمیں ہوتی ہیں بہت اُس نے اپنی عزت بچانے کے لیے جرم ایسے ہوتے ہیں کہ مجرم ایک خون کر دیتا تھا اُس کے باوجود وہ معصوم بن جاتا ہے دوسری مختصر کہانی عزت نہ بچا سکی تیسری مختصر کہانی

جرم کی بھی کئی قسمیں ہوتی ہیں بہت اُس نے اپنی عزت بچانے کے لیے جرم ایسے ہوتے ہیں کہ مجرم ایک خون کر دیتا تھا اُس کے باوجود وہ معصوم بن جاتا ہے دوسری مختصر کہانی عزت نہ بچا سکی تیسری مختصر کہانی

جرم کی بھی کئی قسمیں ہوتی ہیں بہت اُس نے اپنی عزت بچانے کے لیے جرم ایسے ہوتے ہیں کہ مجرم ایک خون کر دیتا تھا اُس کے باوجود وہ معصوم بن جاتا ہے دوسری مختصر کہانی عزت نہ بچا سکی تیسری مختصر کہانی

جرم کی بھی کئی قسمیں ہوتی ہیں بہت اُس نے اپنی عزت بچانے کے لیے جرم ایسے ہوتے ہیں کہ مجرم ایک خون کر دیتا تھا اُس کے باوجود وہ معصوم بن جاتا ہے دوسری مختصر کہانی عزت نہ بچا سکی تیسری مختصر کہانی

سچی کہانیاں

عیدِ قربان

7 سلیم فاروقی

احوال

9 نگران مدیر

ایک منٹ میں حالات کا تجزیہ
ملک کی موجودہ صورتحال پر
ایک نظر، مختصر مگر جامع ادارہ
تجزیے اور نوک جھونک

خیام کی رباعی

25 نسیم منیر علوی

آتش جنوں

36 سلیم فاروقی

آوارہ حسینہ

63 عظیم الدین انصاری

جسے چاہا تھا

71 مجید احمد جانی

عید کا جوڑا

انور فرید

موت کا عمل

159 بشری سعید

اک لمحے کی بھول

172 رضوان قیوم

تقدیر کے کھیل نیارے

181 عمر اسماعیل بروی

عادت بد

88 روبینہ شاہین

شمع جلتی رہے گی

92 محمد سلیم اختر

بہت بڑا ہول میں

103 محمد آصف طاہر

ہوس نے دن چوڑھائے

115 فرزات نگہت

اک سر بستہ راز

1 کاشی چوہان

مکھنی

197 ارشد علی ارشد

دُعا بد دُعا

220 آسم عادل

مسئلہ یہ ہے

224 قارئین / ادارہ

ہر شخص میں کوئی نہ کوئی کمزوری ہوتی ہے۔ دیے سے پیار روشن ہوتا ہے۔ صرف اُس میں تمام تر برائیاں تھیں لیکن وہ بہ ظاہر بہت شفیق، مہربان اور نرم دل تھی لیکن اُس میں ایک لالچی

ایک دیے کی حفاظت ہی اصل مسئلہ ہے۔ راوی پنڈی سے تحفہ خاص برائیاں اچھائیاں پر حاوی آگئی تھیں

اُس میں بھی ایک ایسی ہی خالی تھی

اُس میں تمام تر برائیاں تھیں لیکن وہ بہ ظاہر بہت شفیق، مہربان اور نرم دل تھی لیکن اُس میں ایک لالچی

ایک عجوبہ لڑکی کی عجیب داستان وہ ماورائی قوتوں کی مالک تھی اب تو یہی سے ایک عجب کہانی

ایک عجوبہ لڑکی کی عجیب داستان وہ ماورائی قوتوں کی مالک تھی اب تو یہی سے ایک عجب کہانی

زبان سے نکلنے والے الفاظ بعض اوقات حقیقت بن جاتے ہیں کبھی دُعا کبھی بد دُعا

دنیا میں کوئی الجھن ایسی نہیں جس کا حل موجود نہ ہو آیات قرآنی کی روشنی میں آپ کے مسائل کا حل

مجرم کون؟

119 مریم شاہ بخاری

جرم کی کوکھ

123 شاہ کنول اللہ دتہ

جرم کی بھی کئی قسمیں ہوتی ہیں بہت اُس نے اپنی عزت بچانے کے لیے جرم ایسے ہوتے ہیں کہ مجرم ایک خون کر دیتا تھا اُس کے باوجود وہ معصوم بن جاتا ہے دوسری مختصر کہانی عزت نہ بچا سکی تیسری مختصر کہانی

جرم کی بھی کئی قسمیں ہوتی ہیں بہت اُس نے اپنی عزت بچانے کے لیے جرم ایسے ہوتے ہیں کہ مجرم ایک خون کر دیتا تھا اُس کے باوجود وہ معصوم بن جاتا ہے دوسری مختصر کہانی عزت نہ بچا سکی تیسری مختصر کہانی

جرم کی بھی کئی قسمیں ہوتی ہیں بہت اُس نے اپنی عزت بچانے کے لیے جرم ایسے ہوتے ہیں کہ مجرم ایک خون کر دیتا تھا اُس کے باوجود وہ معصوم بن جاتا ہے دوسری مختصر کہانی عزت نہ بچا سکی تیسری مختصر کہانی

جرم کی بھی کئی قسمیں ہوتی ہیں بہت اُس نے اپنی عزت بچانے کے لیے جرم ایسے ہوتے ہیں کہ مجرم ایک خون کر دیتا تھا اُس کے باوجود وہ معصوم بن جاتا ہے دوسری مختصر کہانی عزت نہ بچا سکی تیسری مختصر کہانی

جرم کی بھی کئی قسمیں ہوتی ہیں بہت اُس نے اپنی عزت بچانے کے لیے جرم ایسے ہوتے ہیں کہ مجرم ایک خون کر دیتا تھا اُس کے باوجود وہ معصوم بن جاتا ہے دوسری مختصر کہانی عزت نہ بچا سکی تیسری مختصر کہانی

جرم کی بھی کئی قسمیں ہوتی ہیں بہت اُس نے اپنی عزت بچانے کے لیے جرم ایسے ہوتے ہیں کہ مجرم ایک خون کر دیتا تھا اُس کے باوجود وہ معصوم بن جاتا ہے دوسری مختصر کہانی عزت نہ بچا سکی تیسری مختصر کہانی

جرم کی بھی کئی قسمیں ہوتی ہیں بہت اُس نے اپنی عزت بچانے کے لیے جرم ایسے ہوتے ہیں کہ مجرم ایک خون کر دیتا تھا اُس کے باوجود وہ معصوم بن جاتا ہے دوسری مختصر کہانی عزت نہ بچا سکی تیسری مختصر کہانی

جرم کی بھی کئی قسمیں ہوتی ہیں بہت اُس نے اپنی عزت بچانے کے لیے جرم ایسے ہوتے ہیں کہ مجرم ایک خون کر دیتا تھا اُس کے باوجود وہ معصوم بن جاتا ہے دوسری مختصر کہانی عزت نہ بچا سکی تیسری مختصر کہانی



عید قرباں

ہم لوگ خوشیاں منا رہے ہیں کہ عید کی آمد آ رہی ہے جگہ جگہ جانوروں کی منڈیاں لگی ہوئی ہیں۔ گزشتہ کئی برس سے قربانی ”سنت ابراہیمی“ کم اور دکھاوا زیادہ ہو گئی ہے۔ لوگ لاکھوں میں قربانی کا جانور خرید کر اپنے پڑوسیوں اور ہمسایوں کو مرعوب کرتے ہیں۔ اس زعم میں بہت سے لوگوں کو یہ علم بھی نہیں ہے کہ حکومت نے عید قرباں سے پہلے خود عوام کو قربان کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے۔ عید سے پہلے ہی حکومت کی طرف سے بجلی کی ہوشربا قیمتوں میں مزید اضافے کا مژدہ سنا دیا گیا ہے۔ یہ گویا عوام کے لیے حکومت کی طرف سے قربانی کا تحفہ ہے۔ امن و امان کی صورت حال وہی ہے بلکہ مزید ابتر ہے۔ شہر کے مصروف چوراہوں اور شاہراہوں پر مویشی منڈیاں لگی ہوئی ہیں اور کوئی ان سے پوچھنے والا نہیں ہے کہ جب شہر سے باہر ایک منڈی موجود ہے تو شہر میں غلاظت پھیلانے کی کیا ضرورت ہے؟ عوام نے گلیاں بند کر کے اور خواص نے اچھی بھلی سڑکیں بند کر کے وہاں اپنے جانور رکھنے کا انتظام کر لیا ہے۔ ملک میں توانائی اور بجلی کا بحران تو پہلے ہی ہے اس پر مستزاد مزید مہنگائی نہ جانے عوام اس ”عوام کش دھماکے“ کو برداشت بھی کر پائیں گے یا حکومت کے خلاف پھٹ پڑیں گے؟ اللہ ہمارے حال پر رحم فرمائے۔ ہم جیسے چند جنونی اور خبطی یہ کہتے نظر آتے ہیں کہ

غیم وقت کے حملے کا مجھ کو خوف رہتا ہے
میں کاغذ کے سپاہی کاٹ کر لشکر بناتا ہوں

لیکن کاغذ کے یہ سپاہی مہنگائی کے جن کو کب روک سکیں گے؟ عوام قربانی کریں یا نہ کریں (قربانی کرنے کی سکت تو ان میں یوں بھی نہیں ہے) لیکن عید سے پہلے پہلے حکومت بجلی کی قیمتیں بڑھا کر ان کی قربانی کا فیصلہ کر چکی ہے۔ کیا خوب عید قرباں ہے؟

سلیم فاروقی

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیش کش

(WWW.PAKSOCIETY.COM)

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے آپ کیلئے پیش کیا۔

ہم خاص کیوں ہیں؟؟؟؟

یہ واحد ویب سائٹ ہے جہاں سے تمام ماہنامہ ڈائجسٹ، ناول، عمران سیریز، شاعری کی کتابیں، بچوں کی کہانیاں، اور اسلامی کتابیں ڈائریکٹ ڈاؤن لوڈ کرنے کے ساتھ ساتھ آن لائن پڑھ بھی سکتے ہیں۔



fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف

اگر آپ کو ویب سائٹ پسند آئی ہے تو پوسٹ کے آخر میں اپنا تبصرہ ضرور دیں۔

اپنا تبصرہ صرف پوسٹ تک محدود رکھیں۔ درخواست کے لئے رابطہ کا صفحہ استعمال کریں۔

اپنے دوست احباب کو بھی پاک سوسائٹی کے بارے میں بتائیں۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی انتظامیہ سے مالی تعاون کیجئے۔ تاکہ یہ منفرد ویب

سائٹ آپ کیلئے جاری رکھی جاسکے۔

پاکستانیوں کے ویب سائٹ

WWW.Paksociety.Com



Library For Pakistan

WWW.PAKSOCIETY.COM

احوال

نگراں مدیر اور قارئین کے درمیان مکالمہ

دوستو.....! السلام علیکم! جب تک یہ شمارہ آپ کے ہاتھ میں پہنچے گا عید قرباں گزر چکی ہوگی اور ہمارے دوستوں میں سے اکثر اب تک مکے، کباب، روست اور ہنتر بیف کھانے میں مصروف ہوں گے۔ بارہا کیوں کے پروگرام بن رہے ہوں گے۔ گرمی جاتے جاتے بھی اپنی بہار دکھا رہی ہے۔ ایسی گرمی تو جون اور جولائی ہی میں پڑتی ہے پھر کراچی کا موسم بھی بہت ناقابل اعتبار بلکہ ناقابل یقین ہے۔ اچانک بارش شروع ہو جاتی ہے بادل گر جتے ہیں اور ایسا لگتا ہے کہ گھٹا ٹوٹ کر برسے گی لیکن چند منٹ بعد ہی سب کچھ بدل جاتا ہے اور پھر وہی گرمی اور لو کے تھیرے۔ کراچی کے کچھ خوش نصیب علاقے ایسے بھی ہیں جہاں ڈھائی گھنٹے تک مسلسل بارش ہوئی ہے۔ دروغ برگردن راوی اور یہ راوی ہیں ہمارے سرکولیشن ڈپارٹمنٹ کے ساجد صاحب! وہ جب بھی باہر سے آتے ہیں ایک نئی اطلاع دیتے ہیں۔ باہر دھرنے کی وجہ سے ٹریفک جام ہے، فائرنگ ہو رہی ہے، فلاں علاقے میں پانچ افراد قتل ہو گئے، بوری میں بند لاشیں ملی ہیں لیکن پھر خود ہی فیس کر کہتے ہیں کہ میں نے یہ صرف سنا ہے، ہو سکتا ہے سب جھوٹ ہو۔ ان کی اطلاع پر سرکولیشن منیجر اقبال صاحب بیٹھے ہوں تو گھبرا کر کھڑے ہو جاتے ہیں، کھڑے ہوں تو گاڑی کی چابیاں اٹھا کر باہر کی طرف لپکتے ہیں لیکن ساجد کے آخری جملے پر چونک کر پھر کرسی پر بیٹھ جاتے ہیں۔ آفس سے باہر نکلتے ہی قربانی کے بھانت بھانت کے جانور نظر آتے ہیں۔ لوگوں نے ٹینٹ لگا کر ان کی عارضی قیام گاہیں بنادی ہیں جہاں دن بھر علاقے کے بچے جانوروں کو اور نوجوان وہاں سے گزرنے والی لڑکیوں کو دیکھتے ہیں۔ ہم لڑکیوں کو اس لیے نہیں دیکھتے کہ ان کی قربانی جائز نہیں ہے اور جانور یوں نہیں دیکھتے کہ انہیں خریدنا تو دور کی بات ہے، انہیں دیکھنے کی بھی سکت نہیں ہے۔ نوٹ فرمائیں کہ ہر سال دسمبر کا شمارہ ”روحانی نمبر“ کی بجائے ”خاص نمبر“ ہوگا۔ گزشتہ شمارے میں ”سہوا“ ”روحانی نمبر“ شائع ہو گیا ہے۔

یہ تو تھا ہمارا احوال اب ذرا ہم اپنے اصل تے وڈے ”احوال“ کی طرف چلتے ہیں۔

☒ یہ پہلا خط ہی بہت رنگین اور شگین ہے۔ لاہور سے افشاں رقم طراز ہیں۔ (ان کا دعویٰ ہے کہ یہ اس سے قبل بھی ”احوال“ میں خط لکھ چکی ہیں) ”سلیم انکل! آپ کو یاد ہوگا کہ آپ نے احوال میں جلوہ افروز ہوتے ہی کچھ وعدے کیے تھے؟ (ہمیں بالکل یاد ہے) آپ نے کہا تھا کہ انعامی رقم میں اضافہ کیا جا رہا ہے۔ (ہم نے ضرور ایسا کہا تھا اور ایسا ہوگا بھی اس میں پریشانی کی کیا بات ہے افشاں؟) آپ نے وعدہ کیا تھا کہ ”بچی کہانیاں راسٹرز ایوارڈز“ کی تقریب کا انعقاد کریں گے؟ (انشاء اللہ ضرور کریں گے۔ ذرا موسم اور امن وامان کے تیور کچھ سنبھل جائیں تو یہ تقریب اسی دھجج کے ساتھ ہوگی جیسی ”دوشیزہ“ کی ہوتی ہے بلکہ اس سے بھی اچھی انشاء اللہ!) آپ میں اور ہمارے وزیراعظم نواز شریف میں کوئی فرق نہیں ہے۔ (ارے ارے کیا کہہ رہی ہو افشاں؟ ہمارے سر پہ گھنے بال ہیں ہم کچیس لاکھ ڈالر کی گھڑی نہیں پہنتے، کسی غیر ملکی بینک میں ہمارے اثاثے نہیں ہیں۔ غیر ملکی تو کیا، ملکی بینک میں بھی اتنی رقم نہیں ہے کہ ہم قربانی کا کوئی جانور ہی خرید سکیں۔ مزید کوئی سوال کرنا ہو جی صاحب! تو ہم اب بھی ملزم کی طرح حاضر ہیں۔) اب آتے ہیں پرچے کی طرف! (شکر ہے تم نے موضوع تو بدلا) اس مرتبہ ادارے میں جو ”تماشا“ آپ نے دکھایا ہے وہ کوئی نئی اور انوکھی بات نہیں ہے۔ ہم تو گزشتہ 65 برس سے یہ تماشے دیکھ رہے ہیں۔ (اور اس کے باوجود ہمیں انکل کہہ رہی ہو؟) ”احوال“ میں اس مرتبہ آپ نے انکل عبدالعزیز جی آ کی دیرینہ خواہش پوری کر دی ان کے خط کا غالباً ایک لفظ بھی نہیں کاٹا۔ دیکھتی ہوں میرے خط کا کیا حشر ہوتا ہے؟ انکل جی آ! آپ ہی نے سب سے

پہلے ایوارڈ کی تقریب کے لیے آواز اٹھائی تھی۔ اس لحاظ سے تو آپ بارش کا پہلا قطرہ ہیں۔ اس کے بعد بہت سے خطوط پڑھے۔ کوئی بہ زعم خود شہزادی احوال ہے۔ کوئی شہزادہ احوال خیر ہمیں کیا ہم تو یوں بھی ملکہ اول ہیں احوال کی اور نہیں ہیں تو اب ہو جائیں گے۔ (افشاں! کبھی کبھی انسان خوش فہمی میں بھی خسارے میں رہتا ہے) خاص کہانی ”وہ سراب منظر“ کوئی ایسی خاص نہیں تھی۔ اس سے کہیں بہتر بلکہ بہترین کہانی تو ایمان مجسم (فرزادہ آغا) کی تھی۔ سفید پھول عذاب مال اور اجل گرفتہ بھی اچھی کہانیاں تھیں یعنی اس معاشرے کی صحیح عکاسی کرنے والی تحریریں تھیں۔ آتش جنوں میں اس دفعہ وہ تحمل نہیں تھا کہ پڑھ کر قاری کا سانس اکٹرنے لگے۔ (ڈرتے ہیں افشاں کہ کہیں ہم پر قانون کی کوئی دفعہ نہ لگ جائے) ”مکھنی“ کہانی تو اچھی ہے لیکن ایسی عجوبہ لڑکیاں کیا واقعی ہوتی ہیں؟ اگر آپ کسی ایسی لڑکی کو جانتے ہیں تو ہمیں بھی بتائیے گا۔ (ضرور بتائیں گے) ”بارشوں کے شہر میں“ اختر شہاب نے انڈونیشیا کی خوب سیر کرائی۔ بس ابھی اتنا ہی پڑھ پائی ہوں ورنہ خط آپ کو وقت پر نہیں ملے گا اور میری ساری محنت اکارت ہو جائے گی۔ زندگی رہی تو آئندہ بھی آتی رہوں گی اور اس دفعہ کہانی کے ساتھ آؤں گی۔ (کہانی کے ساتھ تو تم نے یوں کہا ہے افشاں جیسے ”سرخ کارڈز“ کے ساتھ آؤ گی؟)

✍ ناصر سلیم خانوال سے لکھتے ہیں۔ ”امید واثق ہے کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ زندگی کا پہلا عشق جو 11 سال کی عمر میں ہوا۔ (اوہو گویا پیدائشی عاشق ہیں جناب!) اس کی راتوں کے رت جگے چاند کے تخیل میں محبوب کی پوجا وہ راتیں اور کچھ دن پہلے ہونے والے پشاور بم دھماکے کے بعد دیگرے تین دھماکے پہلے دھماکے کے وقت ہم اسی بازار کی عقبی طرف تھے۔ میز پر رکھا ہوا چائے کا گلدیوار گیر کلاک ہوٹل لڑ گیا۔ آنکھوں کے آگے گھور اندھیرا! باہر نکلے تو الامان الحفیظ الاشوں کے چھتھرے..... فاروقی صاحب! اب تو زندگی بھی تماشا بن گئی ہے ہر روز ایک نئی عبرت! ایک نیا تماشا! اس کا جواب ہر انسان اپنے اندر ہی ڈھونڈ سکتا ہے۔ کچھ پرانے ساتھیوں کے نام آئے! اچھا لگا۔ سسر رائیل محفوظ عطاری صاحب! ملتان کی عروج خان پنڈی کی راحیلہ ڈاکر کراچی کے بھائی فیضان عثمانی! شعر جواد ایک حیرت انگیز تھے نوشاہی نام ذہن کے درپچوں سے کہیں پیچھے ہٹ گیا اور بہت سے بھولے ہوئے ساتھی پلیز لوٹ آئیں وہی محفلیں وہی بہاریں آپ کے سنگ سنگ گچی کہانیاں پھر چاہتا ہے۔ (بھائی ناصر! ہم بھی ملکی چاہتے ہیں اور آپ کے توسط سے ہم بھی انہیں آواز دے رہے ہیں کہ لوٹ آؤ میرے پردہ کی.....) مجموعی طور پر رسالہ بہترین تھا۔ دوبار تبصرہ لکھا زندگی کے جھکولوں میں کہیں آگے پیچھے ہو گیا۔ آج آپ کے شہر سے نکل رہا تھا تو سوچا کہ حاضری لگوائی جائے کسی دوسرے مقام تک پہنچتے پہنچتے لیٹ ہی نہ ہو جائیں۔ (بھائی ناصر سلیم! پشاور بم دھماکوں کا ہمیں بھی اتنا ہی افسوس ہے لیکن آپ تو ان کے بھتی شاہد ہیں آپ کو یقیناً اور زیادہ ہوگا۔ ہاں وہ آپ کے پیدائشی عشق کا تذکرہ تو رہی ہی گیا؟)

✍ ملتان سے قرۃ العین زنب لکھتی ہیں۔ ”اچھے سلیم بھائی! السلام علیکم! (یعنی! اب تو ہم اٹکل ہو گئے ہیں) پوری امید ہے کہ آپ بالکل خیریت سے ہوں گے۔ احوال کی ابتدا میں آپ کی بریکٹ والی خیریت اچھی لگی جیسے وہ کسی شاعر نے کہا ہے کہ ایک نکتے نے ہمیں محرم سے مجرم کروا دیا..... پاکستانی عوام کی خیریت پوچھنے کی بجائے پوچھنا چاہیے آپ ابھی تک خیریت سے ہیں؟ (اور اگر ہیں تو کیوں ہیں؟) عید ملن پارٹی کی تصاویر دیکھ کر بہت خوشی ہوئی اور حسرت بھی ہوئی کہ کاش ہم بھی شامل ہو سکتے۔ اس طرح اکٹھے بیٹھنا اور ملنا اچھا لگتا ہے۔ ٹائٹل کے بارے میں تو کہنا ہی بھول گئی بہت خوبصورت ٹائٹل تھا مگر اب جو یہ front page آپ نے فلیپ والا کر دیا ہے یہ کچھ میں نہیں آیا۔ یہ بے شک انوکھا لگتا ہے مگر ٹائٹل کا صفحہ اکثر رسالہ پڑھنے کے دوران مڑ جاتا ہے جس سے طبیعت میں بہت کوفت پیدا ہوتی ہے۔ مجھے شروع سے ہی کتابوں کو بہت سینٹ سینٹ کر رکھنے کی عادت ہے۔ اب ترے مڑے صفحے بہت پریشان کر رہے ہیں۔ آپ اس کا کوئی حل نکالیں۔ (اس کا بھی کوئی نہ کوئی حل نکال ہی لیں گے) کوئی مسئلہ ایسا نہیں جس کا حل موجود نہ ہو! اب آتی ہوں کہانیوں کی طرف پہلی کہانی ”وہ سراب منظر“ پڑھی سادہ سی کہانی کو بہت خوبصورتی سے لفظوں میں بنا گیا۔ ”سفید پھول“ واقعی انوکھی کہانی تھی۔ اس کہانی میں جو پہلو مجھے سب سے اچھا لگا وہ یہ تھا کہ نفرت جرم سے تھی مجرم سے نہیں۔ فرحان نے اپنے باپ سے نفرت نہیں کی بلکہ مسئلے کا حل نکالا۔ ”فن کار محبت“ میں دل لگی دل کی لگی بن گئی۔ لوگ دل توڑنا سب سے معمولی گناہ سمجھتے ہیں بلکہ بعض کے نزدیک تو یہ گناہ ہی نہیں بلکہ اگلے کی بے وقوفی ہے جبکہ بددعا میں اور آنسو کینسری طرح خاموشی سے ٹھنچے میں لیتے ہیں اور پھر فرار کی کوئی صورت نہیں رہتی۔ ”خونی رشتے“ کا لے جادو سے متعلق کہانی تھی محبت کے لیے جادو کروانے کی۔ خیر وہ عورت اپنے انجام کو پہنچ گئی اور جن کے لیے اس نے اللہ کو ناراض کیا تھا وہی شوہر اور بیٹا اسے پھینک گئے۔ اے عشق جنوں ناولت نما کہانی لگی۔ یہ عشق ایسا جذبہ ہے کہ اسے حاصل کرنے کے لیے جاؤ تو آگے بھاگتا ہے اور اس سے بھاگو تو پیچھے بھاگتا ہے۔ خدا محفوظ رکھے۔ اس آگ میں عقل کے

ماؤف ہو جانے کے بعد دنیا اور آخرت دونوں خطرے میں آ جاتے ہیں۔ ”انتہا پسند“ مجھے بہت اچھی لگی۔ یہ مذہب سے پیار بلکہ دشمنی ہے کہ ہم اللہ کے نام لوگوں کے دلوں میں اسلام کے لیے غلط تصورات ثبت کر دیں۔ مولانا کا انجام بھی بہت اچھا لگا۔ یہ ان مولانا حضرات میں سے تھے جن کو اپنے سوا ہر ایک میں عیب نظر آتا ہے تو اللہ نے ان کو دنیا میں ذلیل کر دیا وہ بھی ان کی اپنی اولاد کے ذریعے۔ بہت اچھی کاوش تھی۔ میرا مقدر پچھتاوا میں جس قسم کی ماں وہ عورت تھی بہت حیرت ہوئی کیوں کہ ماں کا تصور تو سمندر جیسی وسیع محبت کرنے والی ہستی کا ہے۔ پھر یہ کیسی ماں تھی؟ ”عذاب مال“ میں بعض جگہ بہت خوفناک منظر کشی کی گئی تھی۔ براہ مہربانی اتنے زیادہ تشدد یا خوفناک ظلم والے الفاظ شائع مت کیا کریں یا پھر کہانی کے اوپر خوفناک ہی لکھ دیں تاکہ بندہ ذرا سنبھل کر پڑھے۔ (سنبھل کر بیٹھنے سے تمہاری کیا مراد ہے یعنی؟ کیا سیٹ بیٹ بلکہ بیڈ بیٹ باندھ کر بیٹھو گی؟) ”لہو پکارے گا“ پڑھ کر آزاد کشمیر میں آنے والے زلزلے اور غیر انسانی رویے یاد آ گئے۔ موبائل کہانی بھی اچھی تھی۔ میں نے کسی جگہ پڑھا تھا کہ ہم اپنی آدمی زندگی میں ان چیزوں کے لیے سوچ سوچ کر پریشان ہوتے رہتے ہیں جو ہوتی ہی نہیں۔ (اور بقیہ آدمی زندگی ان کی حفاظت میں گزار دیتے ہیں) باقی سب سلسلے بھی اچھے لگے۔ عبدالعزیز جی آ بھائی! آپ کی ساری باتیں سمجھ میں آتی ہیں مگر اس بار جو آپ نے کہا کہ کہانیوں میں صنف نازک کی زیادہ کہانیاں تھیں تو یہ جائز نہیں لگا۔ پلیز یہ فرق اور تفریق مت ڈالیں۔ اچھی کہانی چاہے کسی کی بھی ہو شائع ہونی چاہیے۔ (جی ہاں بالکل! جی آ بھائی نوٹ کر لیں ورنہ یعنی ایڈووکیٹ ہائی کورٹ ہیں.....) عمران مظہر! آپ نے یاد کیا تو دیکھیں ہم حاضر ہیں۔ دعا کے لیے التماس ہے۔ سلیم بھائی! منورہ لوری خلیق کی تاریخی کہانیوں والا سلسلہ ایک بار پھر سے شروع کریں اور مجھے امید ہے کہ باقی احوال بھی اس سلسلے کی حمایت کریں گے۔ (ادارے کا خیال ہے کہ منورہ لوری خلیق پر ایک نمبر نکالا جائے) مریم شاہ بخاری! آپ کی بات سو فیصد صحیح کہ کچھ ہلکا ہلکا مذاق احوال میں ہونا چاہیے بہت اچھا لگتا ہے مگر یاد رہے کہ عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول ہے کہ ”انسان زبان کے پردے میں چھپا ہے۔“ جب ہم مذاق کرتے ہیں تو پھر سننے کی بھی ہمت رکھیں اور اگر کوئی کر نہیں رہا تو اس کے ساتھ کیا بھی نہ جائے۔ ایک بہت خوبصورت بات کے ساتھ خط کا اختتام کروں گی کہ انسان کو بولنا سیکھنے میں دو تین سال لگتے ہیں مگر کون سا لفظ کہاں بولنا ہے یہ سیکھنے میں پوری عمر لگ جاتی ہے۔ ہمارے مذاق سے کسی کی دل آزاری نہ ہوتی بہت خوبصورت عمل ہے جس سے دماغ ہلکا ہلکا ہوتا ہے۔ اب اجازت چاہوں گی کوئی بات بری لگی ہو تو معذرت خواہ ہوں۔ (سب کچھ کہنے کے بعد معذرت کا فائدہ گویا..... کچھ بھی نہ کہا اور کہہ بھی گئے) سب ”جی کہانیاں“ کے اسٹاف اور احوال کے لکھنے والوں کو حج اور عید الاضحیٰ کی مبارک باد!

✍ ایم سعید انور! لاہور سے لکھتے ہیں۔ ”بھائی سلیم فاروقی صاحب! السلام علیکم! امید ہے کہ آپ اور تمام اسٹاف بہ خیر و عافیت ہوگا۔ اس ماہ کے شمارے میں کالم ”پسند اپنی اپنی“ میں ہمارے اشعار بھی شامل اشاعت نہ ہو پائے۔ نہ جانے کیا وجہ ہے یا شاید آپ کو ہمارے اشعار پسند نہیں آئے؟ (بات پسند کی نہیں نمبر آنے کی ہے۔ ”پسند اپنی اپنی“ کے بے شمار اشعار چھپنے کے انتظار میں ہیں) اس ماہ تو ہمارے گھر کی تعمیر کا سلسلہ شروع ہوا اور ایسا سلسلہ شروع ہوا ہے کہ چھوڑنے کا نام ہی نہیں لیتا لہذا شمارہ کچھ زیادہ نہیں پڑھ پایا مگر بمشکل جو پڑھا ”ان“ میں ”آتش جنوں“ سلیم فاروقی ”ایک محبت ایک مذاق“ عمران خان کی اور آخر میں ”بارشوں کے شہر میں“ اختر شہاب کی تحریر پڑھیں اور بہت اچھی لگیں۔ بھائی ذیشان ریاض کو ایک دفعہ پھر جی کہانیاں میں رونق بخانے اور یاد کرنے کا شکریہ۔ آخر میں سب کو سلام اور ڈھیروں دعا میں اور اللہ تعالیٰ ہمارے اس ملک کو دشمنوں کے شر سے بچائے۔ (آمین!)“

✍ لاہور ہی سے کوثر سعید کا خلوص نامہ۔ ”محترم سلیم فاروقی بھائی! السلام علیکم! امید ہے کہ آپ اور تمام اسٹاف مع قارئین خیریت سے ہوگا۔ اس ماہ اکتوبر کے شمارے کا ٹائٹل بہت اچھا لگا اور باقی ٹائٹل سے بہت مختلف اور منفرد لگا۔ اس ماہ مصروفیت کی وجہ سے شمارے پر زیادہ توجہ نہ دے پائی مگر پھر بھی تھوڑا بہت ٹکال کر جو کہانیاں پڑھ سکی ”ان“ میں سرفہرست کہانی میں سیمیں غزالہ انہاں کی تحریر ”انتہا پسند“ صدف آصف کی تحریر ”اے عشق جنوں“ حنا بشری کی تحریر ”لہو پکارے گا“ بہترین تھیں۔ تحسین جو نیو باجی رضوان کوثر شاکستہ جیوں اور زریہ باجی کو سلام و دعا۔ آخر میں تمام قارئین کو سلام! زندگی رہی تو پھر حاضر ہوں گی۔ اللہ تمکبان!“

✍ رانا محمد شاہد پورے والا سے لکھتے ہیں۔ ”اکتوبر کا سرورق دیکھ کر بہت خوشی ہوئی خوبصورت ماڈل ہے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ جی کہانیاں میں پھر سے نئی تبدیلیاں آ رہی ہیں اور احوال میں بھی وہی رونق دیکھنے کو مل رہی ہے جو محترم سہام مرزا صاحب کے دور میں تھی۔ سلیم فاروقی صاحب کا ادارہ پڑھا۔ جب اس تماشے کا جواب اس ملک کے بانی کے پاس نہ ہوتا تو ہمارے اور آپ کے پاس جواب کہاں سے آتا۔ پیروں اور بجلی کی قیمتوں میں جس تیزی سے اضافہ ہو رہا ہے لگتا ہے کہ ”غریب مکاؤ“ پروگرام کا آغاز کر دیا گیا ہے۔ ٹی وی ٹاک شوز میں جو کچھ ہوتا ہے وہ کسی سے ڈھکا چھپا نہیں۔ آپ کو ایک پروگرام میں ڈاکٹر فردوس عاشق احوال اور کشمال طارق کی گفتگو یاد ہوگی۔ ایک دوسرے کی

کردار کشی میں کیا کسر چھوڑی تھی۔ ان دونوں پارلیمنٹیرینز نے بس اب تو دعائی کی جاسکتی ہے کہ اللہ ہمیں مزید تماشے کرنے سے بچائے حقیقت کو سمجھنے کی توفیق دے تاکہ دھند چھٹ جائے اور ہمیں راستہ دکھائی دینے لگے۔ بشیر احمد بھٹی! آپ کو 30 تاریخ کو سچی کہانیاں ملا تو چسکار ہو گیا، ہمیں 28 کول گیا تھا، ہم کیا لکھیں؟ (ویسے یہ چسکار ہوتا کیا ہے اور کیسے ہوتا ہے؟) فرید گیت تو دیکھا ہے شکار پوری گیت نہیں دیکھا اب کی بار ضرور دیکھیں گے۔ فرخندہ لودھی! اردو ہماری قومی زبان ہے۔ نہ جانے ہم اس کے ساتھ سوتیلوں کا سا سلوک کیوں کرتے ہیں اور اس کی بجائے انگریزی پر فخر کیوں کرتے ہیں؟ اتنی اچھی اردو پر مبارک باد! ثمنینہ ناز! دراصل حسد کینہ بددیانتی ایسی بیماریاں ہیں جو آج کے انسان کی بے سکونی کی سب سے بڑی وجہ ہیں۔ ان بیماریوں کا شکار انسان ہمیشہ اپنی خواہشات کو پھیلا دیتا ہے۔ اگر وہ کبھی اپنی خواہشوں کو حدوں سے آگے نہ نکلتے دے جو مل جائے اس پر شکر کرے جو چھین جائے اس پر افسوس نہ کرے جو مانگ لے اسے دے دے اور اگر یہ سوچ لے کہ وہ دنیا میں بے سامان آیا تھا اور بے سامان ہی واپس جائے گا تو یقیناً حسد کینہ اور بددیانتی جیسی بیماریوں سے بچا رہے گا۔ محمد سلیم اختر! اگر ڈکشنریوں سے لفظ نکالنے سے بات بنتی تو کب کے نکال چکے ہوتے۔ اگر انصاف کا لفظ ڈکشنری سے نکالنا چاہیے تو پھر اس کا بھی نکالنا ہوگا۔ کون سا معنی ہفتہ بلکہ دن گزرتا ہے جب ملک کے کسی نہ کسی حصے میں فائرنگ اور تشدد کے بعد قتل کے واقعات سامنے نہیں آتے۔ مریم شاہ بخاری! آپ کی بات سے میں اتفاق کرتا ہوں کہ اصل اہمیت کردار ہی کی ہوتی ہے مگر آپ نے غور سے پڑھا نہیں میں نے لکھا تھا کہ اس کا ایک دوسرا پہلو ہے وہ دوسرا پہلو میں نے آپ کو نہیں بلکہ ایک سوچ کو کہا تھا۔ جہاں تک فنکار اور کردار کی بات ہے تو ہمارے ہاں کتنے لوگ ہوں گے جو فنکار کے فن کے ساتھ اس کے کردار کو بھی اچھا سمجھتے ہوں گے؟ ہمارے ہاں تو خالدہ ریاست اور عظمیٰ گیلانی جیسی اداکارائیں بھی گزری ہیں جن کے کردار پر کسی کو بھی انگلی اٹھانے کی جرأت نہ ہوئی۔ نصرت سرفراز جس شمارے میں کہانی ہو وہی اعزازی ملتا ہے۔ آپ اس حوالے سے خوش قسمت ہیں۔ قرۃ العین زہب! کتاب کی اشاعت پر مبارک باد! اس موضوع پر آپ کے مضامین مڈویک میگزینز میں بھی آتے رہتے تھے۔ رائٹرز و ایڈیٹرز کی تصویریں دیکھ کر اچھا لگا۔ سرین بکھت سبزواری کا شمار اچھی رائٹرز میں ہوتا ہے۔ ”وہ سراب منظر“ انفرادیت کی حامل ایک بہترین کہانی تھی۔ ”آتش جنوں“ سلیم فاروقی صاحب کے قلم کا شاہکار ہے۔ ”سفید پھول“ انسانی نفسیات کی ایک عجیب مگر بھیاں صورت حال کا احاطہ کر رہی تھی۔ غلط فہمی انسان کو زندہ درگور کر دیتی ہے۔ فرحان غلط فہمی کا شکار ہو کر اپنی محبت کرنے والی بیوی کو ہمیشہ کے لیے کھو بیٹھا۔ باقی کہانیوں میں بدر سعید کی فن کار محبت، عظمیٰ رؤف کی خونی رشتے، صدف آصف کی اے عشق جنوں، سیمین خزانہ کی انتہا پسند سیمانا صرکی، اجل گرفتہ اور فرزانہ آغا کی ”ایمان مجسم“ زبردست کہانیاں تھیں۔ ”میری کہانی“ میری زبانی“ میں رائٹرز کی کہانیوں کا سلسلہ پھر سے شروع کریں۔ مزید ایک اپنی کہانی ”قرض“ پیش خدمت ہے۔ گزشتہ تحریروں کے بارے میں آپ نے نہیں بتایا کہ کب تک شائع ہوں گی؟ (آپ کی جو بھی کہانیاں موجود ہیں وہ قابل اشاعت ہونے کی صورت میں نمبر آنے پر ضرور شائع ہوں گی۔ انشاء اللہ!)

✉ سدرہ انور علی جھنگ سے لکھتی ہیں۔ ”سلیم انکل! السلام علیکم! اسی امید کے ساتھ محفل میں آئی ہوں کہ رب کریم کی ذات عالی وجود باری کی رحمت سے تمام اسٹاف اور سچی کہانیاں پڑھنے والے تمام لوگ بالکل خیریت سے ہوں گے۔ میری طرف سے آپ کو اور تمام پڑھنے والوں کو عید الاضحیٰ کی خوشیاں مبارک ہوں۔ ایک طرف ہمارے ملک خاص طور پر کراچی اور پشاور کے جو حالات ہو گئے ہیں تو پھر کیسی عید اور کیسی خوشیاں! اس دفعہ پرچہ شکر ہے جلد مل گیا اور انتظار کی کوفت سے بچا گیا۔ ماڈل تو بہ ظاہر اتنی خوب صورت نہیں لیکن اس کی ڈریننگ نے اس کی لاج رکھ لی۔ احوال میں بھی خطوط ٹھیک تھے لیکن عزیز انکل، ممتاز بسیا، سلیم اختر انکل اور تحسین جونجو کے خطوط بہت پسند آئے۔ آپ کا ادارہ ”عجب تماشا ہے“ واقعی دعاؤں سے بھی جو کتنا نظر نہیں آتا۔ ہمارے ملک پر ایسا وبال آیا ہے۔ خاص کہانی ”وہ سراب منظر“ سرین سبزواری کی تحریر بہت پسند آئی۔ ضروری نہیں کہ آنکھوں دیکھا سچ ہو۔ جو ظاہر ہے وہ باطن نہیں ہوتا۔ سلسلہ خاص ”آتش جنوں“ بہت اچھی جا رہی ہے۔ انکل! آپ کو یاد ہوگا 2005ء میں ایک بڑے ڈائجسٹ میں آپ کی کہانی ”لہو کا رشتہ“ شائع ہوئی تھی۔ میری اتج اب 19 سال ہے۔ آپ کی یہ دونوں کہانیاں مجھے کبھی نہیں بھولیں گی۔ وہ کہانی مجھے آج تک یاد ہے۔ سوچا بھی نہیں تھا کہ میں اس کے مصنف سے ایک دن مخاطب ہوں گی۔ ”سفید پھول“ زندگی اس جزیرے کے مانند ہے جس پر خوابوں اور عذابوں کے بہت سے درخت ہوتے ہیں۔ عظمیٰ عارف کی ”خونی رشتے“ محبت حاصل کرنے کے لیے بہت غلط طریقہ اپنایا گیا لیکن انجام بھی غلط رہا۔ صدف آصف کی ”اے عشق جنوں“ سچی کہانیاں کم اور شعاع کا افسانہ زیادہ لگی۔ (کبھی کبھی افسانہ بھی پڑھنا چاہیے) صدف مجھ سے سینئر ہیں۔ (اب ایسی سینئر بھی نہیں ہیں) میری جرأت نہیں کہ ایسے کمٹس دوں لیکن جو سچ ہو وہ میں کہہ دیتی ہوں۔ ”میرا مقدر بچھتاوا“ شاہ جہاں ملک کی تحریر سبق آموز ہے۔ جو مانیں اپنی بیٹیوں کو غلط راہ کا مسافر بنادیں وہ ایسے ہی انجام سے دوچار ہوتی ہیں۔ سیمانا صرکی ”اجل گرفتہ“ تحریر بہت پسند آئی۔ ویل ڈن سیمائی ویل ڈن! اللہ کرے زور قلم اور زیادہ۔ لہو رنگ

کہانیاں ایم ندیم احمد کی "عذاب مال" اف روٹکنے کھڑے ہو گئے۔ دولت کے لالچ میں ایسے عذاب نازل ہوتے ہیں سوچ کر جگر جھری آگئی۔ حنا بشری کی "لو پکارے گا" پڑھ کر دل خون کے آنسو رو دیا۔ ناقابل یقین کہانیاں پسند آئیں۔ موبائل کہانی "ایک محبت ایک مذاق" سچے اور پیار بھرے رشتوں کی قدر کرنی چاہیے کیوں کہ یہ زندگی میں بار بار نہیں ملے۔ اعترافات میں تینوں تحریریں پسند آئیں۔ دولت ہے سکون نہیں بے شک دولت آتی ہے تو سکون رخصت ہو جاتا ہے۔ "میں گناہ گار" بی بی اپنی ہو یا پرانی اسے غصہ آ جائے تو بچے ضرور مارتی ہے۔ آپ کی ڈائری میں تمام لوگوں کے انتحابات پسند آئے۔ خیال آرائی میں غلام حیدر کی دعا پسند آئی۔ شازی سعید مغل! ابھی ہم "سٹیشن" کے سحر سے نہیں نکل پارہے لیکن آپ کہاں غائب ہیں؟ پلیز انٹری دیکھیے نا کسی اچھی سی کہانی کے ساتھ۔ ملکہ احوال حسین جو نیچو! (کیا تم نے انہیں اپنے طور پر ملکہ بنادیا؟) آپ کیسی ہیں اور آپ کی وہ سسٹر زرینہ جو پچھلے ماہ ہمیں بلا کر خود غائب؟ ویل ڈن جو نیچو جی ویل ڈن۔ یہ تو خوب رہی۔ ممتاز اور شاہد بھیا! سلام! آپ کیسے ہیں؟ ممتاز بھیا! خط کے اینڈ میں آپ جو پھولوں کا گلہ سترہ دیتے ہیں وہ مجھے پسند ہے۔ زندگی رہی اور سانسون نے وفا کی تو اگلے ماہ ملاقات ہوگی آمد سدرہ تب تک کے لیے اللہ بھیاں!

✉ کراچی سے ام عادل کا خلوص نامہ۔ "محترم سلیم فاروقی! السلام علیکم! امید ہے آپ اور آپ کی ٹیم بہ خیر وعافیت ہوگی۔ محترم بھیا! آخر مسئلہ کیا ہے؟ میرا شمار ہر ماہ باقاعدگی سے احوال کی محفل میں شرکت کرنے والوں میں ہوتا تھا مگر اب گزشتہ کئی ماہ سے مجھے مسلسل محفل سے بے دخل کیا جا رہا ہے۔ ایک تو آپ کا رسالہ دیر سے ملتا ہے پھر بھی میں کوشش کر کے جس دن رسالہ ملے اسی دن خط پوسٹ کر دیتی ہوں۔ (بی بی! مسئلہ کچھ بھی نہیں ہے یہ ہماری ذاک کی کوئی ننگ سرور ہے) آج بھی 5 اکتوبر کو رسالہ ملا ہے اور آج ہی خط حوالہ ڈاک کر رہی ہوں۔ اس مرتبہ بھی اپنا خط شامل احوال نہ دیکھ کر پھر محنت کر کے اپنے پیسے ضائع کرنے کا بالکل ارادہ نہ تھا مگر جب تمام احوالیوں کے خطوط پڑھے تو سرگودھا کے محترم ممتاز احمد بھیا کے خلوص نامے کو پڑھ کر بہت بہت خوشی ہوئی کہ ساری محفل میں کوئی تو ہے جس نے میری غیر حاضری کو نہ صرف محسوس کیا بلکہ لوٹ آنے کی صدا کے ساتھ خوبصورت الفاظ میں کہا کہ آپ کے بغیر محفل پھینکی ہے۔ (یہ تو ہم بھی کہیں کے لیکن کیا کریں کہ ڈاک یا یہ نہیں کہتا۔ لگتا ہے اسے بھی سچی کہانیاں دینا ہی پڑے گا) اب تمہو! ابھی ممتاز سے مخاطب ہونے کی اجازت دیجیے۔ السلام علیکم! ممتاز بھیا! کیسے ہیں آپ؟ آپ کی بہن کی دلی دعا ہے کہ آپ صحت و تندرستی کے ساتھ طویل عمر جنیں اور زندگی کے ہر لمحے سے کامیابیاں و کامراناں کشید کریں۔ (آمین!) بھیا! میں نے یہ خط صرف آپ کی پر خلوص محبت بھری پکار پر لکھا ہے خط تو میں ہر ماہ باقاعدگی سے لکھتی ہوں مگر خدا ہی بہتر جانتے یہ غائب کہاں ہو جاتا ہے؟ (اب تو نہ جاؤ گرجیں نہ جاؤ گی چھڑی ہے۔ ہم خود بھی حیران ہیں کہ آپ کے خطوط کہاں غائب ہوتے ہیں؟) آپ کے خلوص کا بہت شکریہ مجھے آپ کی کہانیاں اور طرز تحریر بہت پسند ہے۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں سچی کہانیاں کے آفس سے آپ کا رابطہ نمبر لے سکتی ہوں؟ (ہم چٹکی معذرت خواہ ہیں بی بی کہ ہم کسی بھی قاری یا رائٹر کا رابطہ نمبر نہیں دیتے۔ یہ ابتدا ہی سے ہمارے پرچے کی پالیسی ہے) بھیا عبدالعزیز جی آ کا خط اور تبصرہ بھی ایک پوری کہانی ہوتا ہے۔ بھیا عزیز! ہم آپ کی تجاویز سے متفق ہیں۔ سچی کہانیاں کی ایوارڈ تقریب بھی ضرور ہونا چاہیے۔ جلد خط پوسٹ کرنے کی وجہ سے نہ رسالہ پڑھا جا سکے اور نہ تبصرہ ہو سکے۔ (چلیے آپ کے کم لکھے ہی کو زیادہ جانتے ہیں)۔"

✉ کنول عمران! کراچی سے لکھتی ہیں۔ "السلام علیکم! فاروقی انکل! کیسے ہیں آپ؟ میں کافی عرصے کے بعد احوال میں شرکت کر رہی ہوں۔ دراصل کچھ طبیعت کی ناسازی تھی اور ہے۔ مطلب یہ کہ میرا آپریشن ہونے والا ہے رُسوئی ہو گئی ہے۔ (ہماری دلی دعا ہے کہ اللہ تمہیں شفا عطا فرمائے کنول!) تو بس ذرا آج کل طبیعت ایسی ہی ہے۔ آج اکتوبر کا شمارہ دیکھا تو دل چاہا کہ احوال میں سب کا احوال لے لوں پھر آپریشن کے بعد تو کافی دن تک یہ موقع نہیں ملے گا۔ آپ سے گزارش ہے کہ دعا کریں خیریت سے میرا آپریشن ہو۔ (ہم سیت تمام قارئین کی دعائیں بھی تمہارے ساتھ ہیں کنول!) بیماری کی وجہ سے عید ملن پارٹی میں بھی نہ آ سکی۔ دل تو بہت چاہ رہا تھا کہ سب سے ملوں مگر طبیعت کی خرابی آڑے آگئی۔ سلیم انکل! میں نے ایک کہانی بھیجی تھی آپ کو "میری چاہت" کے نام سے وہ کب تک شائع ہوگی؟ پلیز بتادیں۔ (تمہاری کہانی موجود ہے کنول! بس ذرا انتظار کرو) اس ماہ کا شمارہ تو جتنا پڑھا ہے اس میں مجھے سب سے زیادہ "سفید پھول" پسند آئی باقی کہانیاں ابھی تک نہیں پڑھیں مگر امید ہے وہ بھی اچھی ہوں گی۔ میرا یہ خط ضرور شائع کیجیے گا۔ میں کافی عرصے بعد حاضری دے رہی ہوں اور انکل! ایک غزل ارسال کر رہی ہوں۔ اگر پسند آئے تو اسے بھی شائع کروا دیجیے گا۔ اوکے انکل! اب اجازت دیں طبیعت ٹھیک نہیں تو زیادہ لکھ نہیں سکتی۔ سب اشاف کو پیار بھرا سلام۔ (Get well soon) کنول! ہمیں یقین ہے کہ تم انشاء اللہ اگلے ماہ کے احوال میں بھی شرکت کرو گی۔"

✉ کراچی سے بھائی محمد نعیم کا نامہ خلوص۔ لکھتے ہیں۔ "محترم سلیم فاروقی! السلام علیکم! آپ کو اور آپ کے توسط سے ادارے کے تمام افراد لکھنے والوں اور قارئین کو عید الاضحیٰ کی دلی مبارکباد! (ادارے کی جانب سے بھی دلی مبارکباد قبول فرمائیں تو اس وقت تک عید الاضحیٰ گزر چکی

نومبر 2013

احوال

میں سچی کہانیاں کی کہانیوں پر سیر حاصل تبصرہ اپنی تصویر کے ساتھ ارسال کر رہا کر رہی ہوں۔ اس خط کو احوال میں شامل کر لیں۔

نام اور مکمل پتا:

سچی کہانیاں

MINI MAG

نومبر 2013

میں اپنی پسند کا تراشہ بھیج رہا/رہی ہوں جسے میں نے نامی کتاب کے صفحہ نمبر..... سے اتارا ہے۔ میرا نام و پتا:

پسند اپنی اپنی

نومبر 2013

میرا پسندیدہ شعر الگ کاغذ پر ہے اسے شائع کر دیں

شاعر:

شعر بھیجنے والے کا نام:

پتا:

ہوگی اور آپ کا گوشت سے بھرا ہوا ڈیپ فریزر آدھا ہو چکا ہوگا) اس کے بعد ٹائٹل کی بات۔ سرورق پر مشرقی انداز کی ماڈل دیکھ کر خوشی ہوئی۔ باقی تعریف و توصیف حضرت جی جی آ کے لیے چھوڑتے ہیں۔ (کیا ماڈل کو دیکھ کر آپ کو بھی ”کچھ کچھ“ ہوا تھا؟) سلیم بھائی! آپ نے ”عجب تماشا“ دکھاتے ہوئے وطن عزیز کے حالات کی صحیح عکاسی کی ہے۔ آپ نے جو سوال کیا ہے واقعی اس کا جواب تو کسی کے پاس بھی نہیں۔ اب آتے ہیں احوال کی جانب! رحیم یار خان کی فرخندہ بٹول! سچی کہانیاں کی فیمیلی میں خوش آمدید! آپ کی فصیح و بلیغ اردو نے دل خوش کر دیا۔ ملک سے دور رہ کر بھی اپنی زبان سے یہ محبت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ داد دیتے ہیں آپ کے والدین کو کہ انگریزوں میں رہتے ہوئے بھی آپ کو اتنی اچھی اردو سکھائی۔ جی جی! پہلے تو آپ کی صاحبزادی کی صحت یابی پر مبارک باد اور اس کے خوش گوار مستقبل کے لیے بہت سی دعائیں پھر آپ کے عزم و حوصلے کی داد کہ متواتر ناکامیوں کے بعد بھی آپ سچی کہانیاں کی تقریب ایوارڈ کے لیے ڈٹے ہوئے ہیں۔ (یہ تو جی آ صاحب کا حق ہے اور ہمارا فرض کہ ہم یہ تقریب ایوارڈ انشاء اللہ ضرور منعقد کریں گے) اس مطالبے میں ہماری آواز بھی شامل ہے۔ صغیہ سلطانہ! آپ کی صحت یابی کے لیے ڈھیروں دعائیں۔ ہاں یہ آپ اکیڈمی کی ڈائریکٹر شپ کتنے افراد میں مفت تقسیم کریں گی؟ (نہیم بھائی! اکیڈمی کی ڈائریکٹر شپ کوئی بازار میں بکنے والی چیز نہیں ہے جسے مفت میں تقسیم کیا جاسکے۔ یہ شاید آپ اس بات پر کہہ رہے ہیں کہ صغیہ نے ہمیں ڈائریکٹر شپ کی آفر کی ہے۔ یہ مفت نہیں ہے اس کی قیمت گزشتہ پچیس برسوں کا تجربہ ہے۔ صغیہ سلطانہ کو رائٹ بنانے میں کس کا ہاتھ ہے؟) سدرہ! آپ نے اتنے لوگوں سے سلام دعا کی ہے۔ آپ کو ان ناچیز فیملی انکھ کی یاد نہیں آئی؟ ہم ام منال اور رانا شاہد کی تجویز کی حمایت کرتے ہیں کہ ”منورہ ٹوری خلیق نمبر“ ضرور شائع کیا جائے۔ (ان کا نمبر انشاء اللہ ضرور شائع ہوگا) ان کی خدمات قابل قدر ہیں۔ ہم ایک مرتبہ پھر تمام پڑھنے والوں سے پرزور درخواست کرتے ہیں کہ وہ پرچے کی شان بڑھانے کو لوٹ آئیں اور فاروقی صاحب کے ساتھ تعاون کرتے ہوئے اپنا کردار ضرور ادا کریں۔ بھتیجی اول قرۃ العین نے صائب صاحبہ کی کتاب پر مبارک باد! آپ سچی کہانیاں کی معرفت اپنی کتاب دی پی کر دیں، ہم قیمت ادا کر کے چھڑالیں گے۔ (ان کی کتاب عالمی قوانین کے بارے میں ہے اور اب ان قوانین کی آپ کو کیا ضرورت ہے؟) ”وہ سراب منظر“ واقعی اس ماہ کی خاص کہانی تھی۔ بہت زیادہ پسند آئی۔ ”آتش جنوں“ حسب سابق سنسنی خیز اور تجسس سے بھرپور۔ ”سفید پھول“ بھی زبردست کہانی تھی۔ فنکار محبت کی ابتدا اچھی تھی لیکن اختتام غلج میں کیا گیا۔ نامعلوم مصنف کیا کہنا چاہتا تھا؟ ”خونی رشہ“ سبق آموز تحریر تھی۔ ”میرا مقدر پچھتاوا“ بے جالا ڈیپار کی عکاس تحریر تھی لیکن سبق آموز بھی تھی۔ (نہیم صاحب! سابق ایڈیٹر کی طرف سے نادانستگی میں آپ کے ساتھ جو زیادتی ہوئی ہے میں اس کے لیے معذرت خواہ ہوں۔ بڑے انسانوں کا ظرف بھی بڑا ہوتا ہے۔ ہاں آپ سے ایک درخواست یہ ہے کہ آئندہ رومن میں خط نہ بھیجے گا۔ یا تو ان چیج (اردو) میں بھیجیں یا پھر ڈاک کے ذریعے بہت شکریہ!)“

✉ ڈاکٹر صغیر احمد ناصر کا مختصر نامہ! لکھتے ہیں۔ ”مدیر صاحب السلام علیکم! ایک کہانی آپ کے معتبر جریدے کے نام کر رہا ہوں۔ اگر معیار پر پوری اترے تو کسی قریبی اشاعت میں جگہ دے دیجیے گا۔ بہت شکریہ! کہانی کا عنوان ہے ”عذاب یاد رفتگان“ (ڈاکٹر صاحب! آپ کی کہانی مل گئی ہے پڑھنے کے بعد ہی اشاعت کا فیصلہ کریں گے)“

✉ کراچی سے عائشہ خورشید انور رقم طراز ہیں۔ ”پیارے بھائی سلیم فاروقی! آداب! احوالیوں میں شامل ہونے کے لیے ایک بار پھر آپ کے در پر حاضر خدمت ہوں۔ سب کو میرا سلام۔ (سب کی طرف سے وعلیکم السلام!) آپ سب کی اکتوبر کے شمارے میں تصویر دیکھی! اچھا لگا۔ (جن لوگوں کا تذکرہ آپ نے کیا ہے وہ ادارے سے جا چکے ہیں) تبصرہ کیسے کروں کہ رسالہ ابھی ہاتھ لگا ہے اور میں اسے ایک سانس میں نہیں پڑھ سکتی۔ ایک نظر میں اسے چاٹ ضرور گئی لیکن تبصرہ کرنے سے قاصر ہوں۔ بہر حال تبصرہ اس پر کیا جاتا ہے جس پر تنقید ہو۔ یہ رسالہ تو میرا بہت پرانا ساتھی ہے۔ منزہ آپی کیسی ہیں؟ ان کو میرا بہت بہت سلام! (ان کی طرف سے وعلیکم السلام! وہ بہ فضل تعالیٰ خیریت سے ہیں) باقی تمام لکھنے والوں کو بھی میرا سلام پہنچادیں۔ (ان سطور کے ذریعے پہنچ گیا) مجھے اپنی بزم میں شامل احوال کرنے کا بہت بہت شکریہ۔ ایک خیال اور بھیج رہی ہوں برائے مہربانی اسے ضرور خیال آرائی میں شامل کر کے شکرے کا موقع دیں۔ (خیال آرائی معیاری ہوگی تو ضرور شائع ہوگی عائشہ!)“

✉ مجید احمد جانی ملتان سے لکھتے ہیں۔ ”سلیم فاروقی صاحب! مزاج گرامی! (یہ پوچھیں کہ ”مزاج گرامی“ تو ہم کچھ جواب بھی دیں) امید واثق ہے پھولوں کی طرح مہکتے چاند کی طرح چمکتے کوئل کی طرح سریلے لبوں سے سریلی شیریں گفتگو کرتے ہوں گے۔ (بھئی! ہم انسان ہیں! انسانوں کی طرح بولتے اور چلتے پھرتے ہیں) ہمیشہ کی طرح ہاتھ اٹھائے سر جھکائے رب کائنات کے حضور دست دعا کرتا ہوں کہ آپ کو آپ کی فیملی کو اور سچی کہانیاں کی فیملی اینڈ قارئین کو ہمیشہ ہنستا مسکراتا رکھے۔ ایمان کی سلامتی، صحت و تندرستی اور درازی عمر عطا فرمائے غموں سے دور خوشیوں کے آنگن میں رکھے انہوں کے پاس دشمنوں کے شر سے محفوظ رکھے۔ (آمین! آمین! کروڑ آمین!) (آپ کی دعا بھی خاصی فصیح و بلیغ

قسم کی ہے۔ بہر حال بہت شکریہ!) دیگر احوال یوں کہ اچانک یکم ستمبر ممتاز آباد مارکیٹ جانا ہوا۔ عجیب سی کشش تھی دل بے چین کو قرار نہیں آ رہا تھا۔ بے اختیار میرے قدم بک اسٹال کی طرف اٹھ گئے۔ کتابیں پڑھنے کا جنون ہے۔ یہی سوچ کر وہاں گیا کہ کوئی بک خرید لیتا ہوں۔ اسٹال پر پہنچا تو اکتوبر 2013ء کا کچی کہانیاں جلوہ گر تھا۔ میں سب بھول گیا۔ کچی کہانیاں خرید لیا۔ نقلی زیورات سے کچی ایک حینہ دلہن کے روپ میں سفید موتیوں جیسے دانٹوں کی نمائش کر رہی تھی۔ خوشی کے آثار نمایاں تھے شاید اپنے دو لہے کی منتظر تھی۔ (یہ آپ کیسے کہہ سکتے ہیں کہ وہ کسی کی منتظر تھی؟) دلہن کے روپ میں کچی حینہ کو دیکھ کر میری آنکھیں بھیگ گئیں۔ پوچھ رہے ہیں کیوں؟ ہاں جی میرے ابو جان میرے لیے دلہن گھرانے والے تھے مگر..... مگر کس کو علم تھا کہ خود وہ لہا کے روپ میں سچ دھج کر حقیقی رب کے پاس چلے جائیں گے۔ 24 اگست ہفتے کا دن میں کیسے بھول سکتا ہوں۔ رات بھر ڈیوٹی کرنے کے بعد صبح سویرے ابو جان کو ہسپتال لے جانا، دھکی جاتی سرخ آنکھیں اسٹریچر پر پڑے ابو جان کو دیکھ رہی تھیں۔ چند لمحوں میں کیا سے کیا ہو گیا۔ دن تین بجے آنکھوں میں آنکھیں ڈالے میرے پاپا مجھے دنیا میں تنہا چھوڑ گئے۔ کیا منظر تھا! اسٹریچر خود سنبھالے ہوا تھا۔ دوسرے ہاتھ میں آنکھیں کا سلنڈر اٹھائے ابو کی بگڑتی صحت دیکھ رہا تھا۔ میرے ہاتھوں میں میرا باپ دم توڑ گیا اور میں سب کچھ کرنے کے بعد بھی کچھ نہ کر پایا۔ (جائی صاحب! ہم آپ کے غم میں برابر کے شریک ہیں۔ اللہ ان کے درجات بلند فرمائے۔ اللہ کی امانت تھی اس نے واپس لے لی۔ ازل سے یہ ہی ہوتا آیا ہے اور یہی ہوتا رہے گا) احوال لکھتے ہوئے بھی آنکھیں نم دیدہ ہیں۔ کمزور کندھوں پر بھاری بوجھ آن پڑا ہے۔ رب کی رضا ماننا پڑتی ہے۔ نہ چاہتے ہوئے بھی میں نے اپنے پیارے باپ کو خود منوں مٹی تلے دفن کر دیا اور نہ میرے وطن کے جو حالات ہیں مرنے والے کو کفن تک نصیب نہیں ہوتا۔ لاشیں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بکھرتی ہیں۔ درختوں پر لٹکے لاشے سڑک پر پڑی ٹکڑے ٹکڑے لاشیں! میرے وطن کی سرحدیں مضبوط ہیں چپے چپے پر میرے وطن کے محافظ ہیں پھر نہ جانے یہ دشمن دہشت گرد کہاں سے آ جاتے ہیں؟ یہ اپنوں کے روپ میں چپے میر صادق میر جعفر ہیں جو بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں نیست و نابود کریں۔ (آمین! آمین!) تبصرے کی طرف آتے ہیں۔ سرور قی پر بیٹھی حینہ سے ہیلو ہائے کرتے من پسند میں کچے کھانوں سے لطف اندوز ہوتے جام شیریں سے من کو ٹھنڈا کرتے 'Head & Shoulders' سے نہاتے عرق گلاب سے چہرہ سجاتے ہوئے کچی کہانیاں کی جھلیاں میں جا پہنچے۔ دوشیزہ میں اشتہار دیتے سلیم فاروقی صاحب سے جا ملے۔ عید کو یاد کر رہے تھے۔ ارے بھائی عید آئی کہاں تھی۔ مجھے نہیں یاد کہ عید آئی ہو۔ اکتوبر 2008ء کے بعد میں نے عید نہیں دیکھی۔ میرے سامنے روتی مائیں اجڑتی گودیں ہیں بھائیوں سے پچھرتی بہنیں اجڑتی سہاگن ہیں۔ سب رب سے التجا ہے کہ عیدیں پلٹ آئیں۔ خوشیاں امن میرے وطن میں لوٹ آئیں اور بس! (بچی تو ہم بھی کہہ رہے ہیں کہ ہماری تو عید سے ملاقات نہیں ہوئی۔ کسی قاری کی ہوئی ہو تو ہمیں ضرور بتائے) لو جی! احوال میں پھر سلیم فاروقی صاحب سے بغل گیر ہو گئے ہیں۔ سلیم بھائی آپ نے صرف ایک کچی کو تھپڑ کھاتے دیکھا ہے اس گناہ گار نے غربت سے تنگ باپ کو خود کشی کرتے دیکھا ہے۔ ماؤں بہنوں کو در بدر ہوتے دیکھا ہے۔ آنکھیں ہیں نم دیدہ دل رنجیدہ ہے۔ ابتدائی تین احوال پڑھتے محمد اسلم آزاد کے پاس پہنچے۔ جناب ہم آپ سے اتفاق نہیں کرتے کیوں کہ ڈائجسٹ جیسا بھی ہو حفاظت کرنا آپ کا کام ہے۔ میرے پاس دس سال پرانے ڈائجسٹ نوجوانوں میں موجود ہیں۔ شاید آپ کو حفاظت کرنی نہیں آتی ورنہ یہ گلہ نہ کرتے۔ عبدالعزیز جی آ کے احوال میں پہنچے تو وہ دن یاد آ گیا جب جناب نے مجھے کال کی تھی۔ پیارے انداز میں پیاری گفتار کے ساتھ میری حوصلہ افزائی کی تھی۔ کچی مگر کڑوی باتیں احوال میں کر رہے تھے۔ چھوڑیں جی محبتیں عام کریں نفرتیں کرنے والے بہت ہیں۔ محمد سہیل خان، سلمیٰ غزل، فرزانہ بگت، بشیر احمد، جعفر خان جمالی، ملک مندر عباس کے احوال میں پہنچے موصوف میرے ہی ہمسائے ہیں اور ہم سے دور بیٹھے ہیں۔ آؤ جی گلے لگ جاؤ۔ آہا! ٹھنڈ پے گئی کلیجے وچ! ناتھن شاہ، عجیب نام پڑھا۔ ام مثال کا خط متاثر کن تھا۔ (سندھ میں ناتھن شاہ ایک علاقہ بھی ہے) ادو ہو مجید احمد جائی کا احوال بھی شامل ہے۔ مجید احمد کے ساتھ "جائی" غائب تھا۔ میرا نام مکمل دیا کریں کیوں کہ نام سے پہچان ہے۔ بہت شکریہ بہت مہربانی کہ آپ نے ہمیں شامل حال کیا! میرے سوالوں کا جواب دیا۔ رانا محمد شاہد پورے والے سے تشریف آور تھے۔ افشاں علی کا اظہار یہ پڑھتے ہوئے احوال اختتام پذیر ہوئے۔ برائے لگے تو ایک بات کہتا ہوں بہت سے دوستوں کے احوال پڑھے مجھے ان میں جھوٹ کی بو محسوس ہوئی۔ مطلب نام شائع کروانے کی خاطر چند لائنیں بنا رسالہ پڑھے تحریر کر دیتے ہیں۔ شاید لغافہ دیکھ کر خط کا مضمون بھانپ لیتے ہیں والی بات ہے کیوں؟ سچ کہاناں میں نے؟ کہانیوں کے مگر میں غوطہ زن ہوا تو سب سے پہلے "وہ سراب منظر" پڑھی پھر "آتش جنوں" اور "مکھنی" کی باری آئی۔ سب تحریریں بہترین تھیں۔ باقی کہانیاں زیر مطالعہ ہیں سو تبصرے کے لیے معذرت۔ چھوٹے کالم آپ کی ڈائری پسند اپنی اپنی دلچسپ تھے۔ ایک نشان دہی کرتا چلوں جناب سلیم فاروقی صاحب! اتنا معیاری رسالہ ہے مگر کہیں کہیں کپورنگ کی غلطیاں ہیں۔ (آپ کی نشان دہی کا بہت شکریہ آئندہ خیال رکھا جائے گا) ایک اور بات یہ کہ رسالے میں جہاں اتنا مواد شامل ہو سکتا ہے وہاں شروع میں اسلامی صفحہ یا احمد نعت کیوں نہیں؟ امید ہے توجہ فرمائیں

گے۔ (آپ کی تجویز پر غور کریں گے قابل عمل ہے) آخری بات کرتے ہوئے احوال سے رخصت ہوتے ہیں۔ جناب میں تین اسٹوریاں بہ نام ”خواہشوں کی منزل“ ”تیرے انتظار میں“ ”جسے چاہا تھا“ ای میل کر چکا ہوں۔ آپ صرف اتنا بتا دیجیے کہ کیا اشاعت کے قابل ہیں کہ نہیں تاکہ بندہ انتظار کی سولی پر نہ لٹکا رہے۔ (خوش ہو جائیے کہ آپ کی ایک کہانی اسی شمارے میں شامل ہے) دُعائیہ کلمات کے ساتھ اگلے ماہ کے احوال تک رخصت کا طالب ہوں۔ زندگی رہی تو ملاقات ہوگی۔ اللہ تعالیٰ آپ کو تمام اسٹاف اینڈ قارئین کو اپنی حفظ و امان میں رکھے اور سچی کہانیاں کو ترقی کی تمام منزلیں طے کروائے۔ (آمین اثم آمین!)“

✉ کراچی سے سنبل کا اظہار یہ! محترم سلیم بھائی! السلام علیکم! اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے ہماری طرف سب خیریت ہے اور آپ کی خیریت خداوند کریم سے نیک مطلوب ہے۔ دیگر احوال یہ ہے کہ ”سچی کہانیاں“ آپ لوگ بھیجتے ہی نہیں تو اس پر رائے کیا دوں؟ (سنبل بی بی! جن رائز کی کہانیاں شائع ہوتی ہیں انہیں پرچہ ارسال کر دیا جاتا ہے۔ ویسے مارکیٹ میں تو عام دستیاب ہے) تبصر کا شمار ابھی زیر مطالعہ ہے۔ صرف احوال ہی پڑھا ہے وہ حسب معمول اچھا ہے۔ آتھس جنوں کا خلاصہ پڑھا، یقیناً اچھی چل رہی ہے۔ مکھنی کا خلاصہ ابھی پڑھوں گی۔ بھائی! الحمد للہ! میرا ریکارڈ اس سلسلے میں ہمیشہ صاف رہا ہے کہ میں نے ڈائجسٹ کبھی خرید کر نہیں پڑھے سوا کہ ممکن ہوا کہ تبصر کا شمار جس میں ظہرانے کا احوال ہوگا مجھے بھجوا دیجیے گا مہربانی ہوگی۔ (کوئی بھی کام کبھی نہ کبھی پہلی دفعہ شروع ہوتا ہے سنبل! ارسال خرید کر پڑھنے کا مزہ ہی اور ہے) بھائی! میری ایک پراسرار کہانی اور تقریباً تین اور کہانیاں آپ کے پاس ہیں۔ اگر ممکن ہو تو ان کی اشاعت کر کے شکرے کا موقع دیں۔ (تمہاری کہانیاں ابھی زیر غور ہیں) ظہرانے والے دن آپ سب سے مل کر اچھا لگا۔ اگر بلا واسطہ سے نہ ہوتا اور خصوصاً ساسو ماں کا نہ ہوتا تو میں مزید رکتی کہ صاحب علم لوگوں کی محبت ہمیشہ فائدہ دیتی ہے مگر..... خیر خدا کے بلاوے کے بعد یہ دوسرا بلاوا ہے جس پر میں ہر کام چھوڑ کر لبیک کہتی ہوں اور مزید کیا لکھوں! اب اجازت دیں۔ اپنا خیال رکھیے گا اور دعاؤں میں یاد رکھیے گا۔“

✉ جہانیاں سے ملک صفدر عباس اعوان لکھتے ہیں۔ ”پیارے چچا جان! سلیم فاروقی صاحب! السلام علیکم! امید کرتا ہوں کہ آپ خیر خیریت اور صحت کی دولت سے مالا مال ہوں گے۔ اپنے بارے میں کیا لکھوں آپ کو پتا بھی ہے کہ آپ کے معصوم بچے پر پچھلے دنوں کیا ہوتی ہے۔ وہ کتنی بے چینی میں مبتلا رہا ہے۔ چچا جان! آپ کو کچھ خبر بھی ہے؟ بھتیجا بننا اگر مشکل ہے تو چچا بھی کہلوانا بہت مشکل ہوتا ہے۔ ایک چچا کو اپنے معصوم بچے کے بارے میں ساری رپورٹ ہونی چاہیے۔ اچھا تو پھر میں بات کر رہا تھا کہ جب میری طبیعت بڑی بے زار ہوئی تو راتوں کی نیند زیادہ بڑھ گئی اور بھوک کا تو پھر پوچھیں مت۔ جتنا کھاؤ اتنا کم! پھر تو یہ فکر ہی لاحق ہو گئی کہ کہیں کھا کھا کر گول کیا ہی نہ ہو جاؤں۔ نگاہیں اور قدم تو ہر وقت گلی کی طرف ہی رہتے کہ کاش اس کی ایک بار جھلک تو نظر آ جائے۔ آگے پھر میرا کام ہے لو پھر دعا منظور ہوئی۔ میں جو گلی میں ڈیرہ لگانے کا سوچ رہا تھا کہ وہ لہرائی بل کھاتی دور سے گلی میں آتی ہوئی دکھائی دی تو مت پوچھیں کہ دل کی کیا حالت ہو رہی تھی۔ وہ ایک مخصوص آواز سے اپنے آنے کا پتا بتا رہی تھی۔ اس کے ساتھ ”وہ“ بھی تھا، بس اسی کا تو انتظار تھا۔ آپ کیا سمجھتے؟ ارے بابا! میں ڈاکیا اور اس کی سائیکل کے بارے میں بات کر رہا ہوں۔ آپ بھی نا قسم سے..... ڈاکیا آیا تو اپنا محبوب رسالہ ملا۔ نہیں تو میں انتظار کی سولی پر سوار تھا۔ اس بار ٹائٹل انڈیا کی خوب روادا کارہ فرح کی یاد دلا گیا۔ ٹائٹل گرل ہو بہو اس کی شکل کی تھی۔ عروسی لباس اور خوب صورت زیورات میں وہ واقعی حقیقی دلہن لگ رہی تھی۔ ادارہ ”عجب تماشا ہے“ کے عنوان سے خوب لکھا۔ آخر میں آپ نے لکھا کہ قائد اعظم زندہ ہوتے تو شاید وہ اس کا جواب نہ دے پاتے۔ سوال یہ ہے کہ اگر وہ ہوتے تو یہ سب ہوتا ہی کیوں؟ ذرا سوچیے۔ عید ملن پارٹی کا سنا کاش کہ ہم بھی بہ قلم خود تشریف لاتے۔ آپ سے ملنے کچھ باتیں کرتے خود خاموش رہتے مگر صرف آپ کی سنتے مگر ہم کہاں اور پھر کراچی کہاں۔ ہزار میل کا فاصلہ اور اوپر سے کراچی کے حالات۔ شہر احوال میں پہنچے تو اس کو خوب سجا ہوا پایا، خوب رونق میلہ لگا ہوا تھا۔ اس میلے میں تو عمر رسیدہ احوالی بھی بچے بنے ہوئے تھے پھر ایک کے بارے میں تو بہت مشہور ہے کہ وہ بچے بنتے نہیں بلکہ بچے جیسی حرکتیں کر کے خود کو بچہ ظاہر کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ جن جن احوالیوں نے مجھے یاد رکھا میں ان کا بہت مشکور ہوں۔ ان میں رانا محمد شاہد کی بات پر صرف اتنا کہوں گا کہ جس کا جتنا ظرف ہوتا ہے وہ اتنی ہی بات کرتا اور سوچتا ہے۔ کم عقلی خود میں ایک بڑی بیماری ہے۔ رسالہ دیر سے موصول ہوا اس لیے کہانیاں نہیں پڑھ پایا تبصرے سے قاصر ہوں۔ اپنی کسی بھی تحریر کو رسالہ میں نہ پا کر مایوسی ہوئی۔ ”یہ ہے میری زندگی“ میں میری ذاتی تحریر شائع کرنے کا غالباً آپ نے ٹیلی فون پر کہا بھی تھا پھر وہی بات کہ میری باقی کہانیوں کا کیا بنے گا؟ (حوصلہ رکھو کچھ نہ کچھ بن جائے گا) ایک اور کہانی حاضر خدمت ہے۔ اشاعت کا جلد خواہش مند ہوں۔ چچا جان! جب سے آپ نے مجھے بھتیجا بنانے میں ہچکچاہٹ کا اظہار کیا ہے میرے سارے حلقہ احباب میرا مذاق اڑاتے ہیں۔ وہ سب کہتے ہیں کہ سلیم فاروقی صاحب بہت سخت طبیعت

اطلاع عام

ماہنامہ ”سچی کہانیاں“ اور ماہنامہ ”دوشیزہ“ کے قارئین، مصنفین اور تمام ایجنٹس کو مطلع کیا جاتا ہے کہ ناصر رضا (سابق مدیر خصوصی ”سچی کہانیاں“) اور راجا محمود (سابق مدیر ”سچی کہانیاں“) کو کام سے کوتاہی اور مجرمانہ غفلت کے باعث ادارے نے ملازمت سے برخاست کر دیا ہے۔

اب ان دونوں حضرات کا ادارے سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان دونوں حضرات سے کسی بھی قسم کے لین دین یا کسی بھی معاملے کا ذمہ دار ادارہ نہ ہوگا۔

(ادارہ)

تاحیات قائم رہے گا۔ عید الاضحیٰ کے موقع پر میں تو سندھی بریانی کی دیک کی تیاری میں لگی ہوئی ہوں۔ آخر کون سا سارے احوالی جولائن میں لگ گئے ہیں۔ ہاں تو کس کی شامت آتی ہے جلدی مطلع کریں کہ یہاں ہماری بھینس تو ابھی سے اپنے سینک چکا رہی ہے۔ (بھینس کی بریانی؟ آئیڈیا اچھا ہے۔ ویسے اس بھینس کے سینک زخ ہونے کے بعد تم کھالینا) بچ پارٹی کا انعقاد ایک بہترین آغاز ہے۔ رائٹر ز گپ شپ کے ساتھ باہم مشورے بھی دے پائیں گے۔ ایک فون اس بچی کو بھی کر دیتے، شرکت یقینی بناتے۔ خیر یہ سلسلہ جاری رکھیے گا۔ کہا گیا ہے تو اپن کا چانس بھی بن ہی جائے گا کبھی۔ (کال میں نہیں کرنا تھی بلکہ اس بچی کو کرنا تھی شرکت یقینی بنانے کے لیے۔) ہم نے تو ملائے عام دی تھی کہ جو چاہے آجائے) سلیم اختر انکل روشن الفاظ میں آپ کا یاد رکھنا مجھے بھی بھلا گا۔ یہ قرض کس طرح اتاریں گے چلیں، کوئی مسئلہ ہی نہیں اتاریں دیتے ہیں۔ چار چاند کیا آٹھ چاند بھی لگا سکتے ہیں کراتی چمک دیکھ کر کہیں جلنے کی بو آگئی تو اپنے فاروقی انکل قصور وار ہمیں ہی ٹھہرائیں گے تاکہ پتہ کی جھوٹ بھی اتی آتش بازی کی؟ ”آتش جنوں“ کیا کم تھی۔ (اچھا تو اب کھلا کر تم آتش بازی بھی ہو لیکن خاموش ہی رہنا ورنہ کہیں ہم دھماکے میں تمہارا نام بھی آسکتا ہے) انکل اس بار میرا خط طویل ہے اس یقین کے ساتھ کہ باقی ساتھیوں کی طرح مجھے بھی مایوس نہیں کریں گے کہ جب کوئی تحریر ابھر کے سامنے آجائے اور اجاگر ہونے سے پہلے ہی اسے دفن کر دیا جائے تو یہ قربانی سے پہلے قربانی کا جرمانہ کیسے ادا ہوگا؟ پلیز! (جرمانہ تو قربانی سے پہلے ہی ادا کرنا پڑتا ہے ورنہ گائے والا گائے کے صرف دانت دکھاتا ہے یوں ہی پوری گائے حوالے نہیں کر دیتا) عمران مظہر صاحب چلیں یہ فیصلہ قارئین اور فاروقی انکل کے سپرد کر دیتے ہیں کہ ملکہ یا شہزادی جو بھی حکم ہوا ہم تسلیم کریں گے ویسے خیال رہے میرا ریکارڈ بھی تاریخ میں موجود ہے۔ (ہمیں تو لگ رہا ہے کہ تم دونوں کے ریکارڈ افشاں توڑ دے گی۔ اس کی تحریر میں غلطی کے ساتھ ساتھ جتنی بھی ہے اور برجستہ جملے لکھتی ہے۔ اس کا خط تو ہم نے بہت کاٹ دیا ورنہ احوال کے دو صفحے تو اسی کے ہوتے) سدرہ انور اہلیکم السلام! جی بجا فرمایا اتنی تکلیف تو ہانڈی کے جلنے کی نہیں ہوتی جتنی محنت و محبت سے لکھے خط کے غائب ہونے کی ہوتی ہے۔ ایک ہم ہیں جو خط کے چکر میں کھانا تک نہیں کھاتے جب تک ”کھاتے“ میں

خط نہ ڈال دیں۔ (تم کھانے میں خط کھاتی ہو؟ ہمارے پاس بے شمار خطوط ہیں جن کے جواب دینے کے بعد ہم تلف کرنے والے تھے۔ اب تم پارٹی میں آؤ گی تو تمہیں ”خط ڈش“ کھلائیں گے) کوثر سعید آپی جانی، اہلیکم السلام! ویسے سلام سے آگے بھی کچھ پوچھ لیا

کے مالک معلوم ہوتے ہیں۔ وہ تو تمہاری بات بڑی مشکل سے مانیں گے پھر پتا ہے چچا جان میں نے ان کو کیا جواب دیا کہ چلو تم لوگ بھاگو یہاں سے۔ میرے چچا ایسے نہیں ہیں۔ اتنے پیارے نرم مزاج، بہت ہی نفیس طبیعت کے مالک ہیں اور سوہنترے بھی بہت ہیں۔ یہ تو آپ کو رسالہ میں تصویر دیکھ کر اندازہ ہوا کیوں ٹھیک جواب دیا تاں ان کو میں نے؟ بابا بابا اور چچا جان کدی ہنس دی لیا کر۔ (چلو ہنس دیے۔ بابا بابا!) بقر عید کی ایڈوانس مبارک باد اور ہاں میری 3 نومبر کو ساگرہ بھی آرہی ہے۔ چچا جان میری ساگرہ پر آپ مجھے کیا تحفہ دیں گے اور بڑی عید پر آپ سے عید کی بھی مزید لٹنی ہے۔ چچا جان بچوں کا کچھ تو حق ہوتا ہے ناں اب اجازت دیں۔ شہر احوال سے بہت دور جانا پڑ رہا ہے۔ واپس آنے میں بہت وقت لگ جائے گا۔ دعاؤں میں ضرور یاد رکھیے گا۔ (3 نومبر تک تو تمہیں رسالہ بھی مل جائے گا اور تحفے میں ہماری دعائیں بھی اور کیا چاہیے؟)

✉ محمد اسماعیل بروہی، شہر دوڑ نواب شاہ سے لکھتے ہیں۔ ”السلام علیکم! سلیم فاروقی صاحب! خدا کرے آپ ہمیشہ ہنستے مسکراتے رہیں۔ (کیا تو تھ پیٹ کے اشتہار میں ماڈلنگ کرانا ہے؟) سلیم صاحب! کہانی چھپنے کے انتظار میں ہماری آنکھیں پتھر انگلیں مگر کہانی شامل نہیں ہوئی۔ پلیز! پلیز! پلیز! اور انتظار مت کرو ایسے۔ ہماری کہانی بعنوان ”میرے اپنے“ شامل کیجیے۔ (اپنی آنکھوں کو درست کر لو اب تمہیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ انتظار کی گھڑیاں بلکہ تمام گھڑیاں ختم ہو گئی ہیں) سلیم صاحب! میرا خواب ہے کہ بڑا رائٹر بنوں گا۔ کہانیوں کا مجموعہ لاؤں گا۔ آپ اور سچی کہانیاں میری مدد اور حوصلہ افزائی کریں گے۔ میری کہانیاں جتنی رہیں گی اور میں بڑا کہانی کار بن جاؤں گا مگر یہ حسرت قبر تک بھی پوری نہیں ہوگی۔ (ارے ارے اتنی مایوسی کیوں اسماعیل؟ مایوسی تو یوں بھی کفر ہے۔ اب تو تمہاری کہانی پہلی فرصت میں لگائیں گے اب خوش ہو جاؤ) دوسرے رائٹر کی کہانیاں بار بار یاہر مینے شامل ہوتی ہیں مگر ہمارے ساتھ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ ہر ماہ میں انتظار کرتا ہوں کہ کہانی شامل ہوگی مگر کہانیوں کی فہرست دیکھتا ہوں تو دل ٹوٹ کر رہ جاتا ہے۔ (دل کو ذرا مضبوط رکھیں بلکہ بطنی سے جوڑ لیں۔ شروع شروع میں ہمیں بھی اتنے ہی پاؤں بیلنا پڑے تھے اور دوسرے ہمارے چڑانے کو پاؤں والا کہتے تھے) اب پرچے کی طرف۔ ماڈل بہت خوب صورت اور دلکش ہے۔ ادارہ ”عجب تماشا ہے“ میں آپ نے سچ لکھا۔ ایک بات کہوں کہ کوئی مخلص نہیں پاکستان کے ساتھ نہ پولیس نہ سیاست دان نہ ٹی وی میٹرو والے۔ وہ سراب منظر نسرن نگہت نے ایک بہترین کہانی لکھی۔ آتش جنوں بھی پسند آئی۔ سفید پھول لا جواب کہانی ہے۔ خونی رشتے، عظمیٰ عارف نے بھی اپنے قلم سے انصاف کیا۔ کہانیاں بس اتنی ہی پڑھ سکا ہوں۔ آپ کی ڈائری میں نگہت عاتش کا انتخاب پسند آیا۔ خیال آرائی میں راحیلہ ڈاکر اور عکاشہ سحر ایمان کی خیال آرائیاں پسند آئیں۔ ”پسند اپنی اپنی“ میں مہنا ز خان کی بھی ہوئی شاعری پسند آئی۔ ماہ ستمبر میں مور شاہد حسین نے اپنے خط میں ہمارا نام لکھ کر گویا ہمیں پھر سے زندہ کیا۔ مور شاہد بھائی یہ بھی دوستی تا قیامت رہے۔ انکل عزیز جی آپ بھی ہماری طرف نہیں دیکھتے۔ حنا بھن کی صحت کے لیے دعائیں کرتا ہوں۔ میرا سلام کہیے گا حنا کو۔ تحسین جو نیچو بھی بھائی کو بھول گئیں اور اب آخر میں انکل محمد نعیم صدف اسحاق تئیں علی محمد وقار بروہی اور محمد اسلم آزاد کو سلام۔“

✉ بورڈی سے زریہ جو نیچو کا اظہار یہ..... ”محترم سلیم فاروقی صاحب! پیار بھر اسلام قبول کیجیے۔ رب العزت سے دعا ہے کہ آپ کو لمبی عمر و صحت کا ملکہ عطا فرمائے۔ (آمین!) عزیز جی آپ کا طویل خط شائع ہوا ان کی برسوں پرانی خواہش پوری ہوگئی۔ جھیل میٹلو! آپ کو جھیل کیوں کہتے ہیں وجہ؟ (بک نیم ہے۔ ویسے جھیل نام بھی ہوتا ہے۔ تم سے اگر سوال کیا جائے کہ تمہیں زریہ کیوں کہتے ہیں تو تم کیا جواب دو گی؟) سلسلہ اعترافات میں ”دولت ہے سکون نہیں“ اسے کہتے ہیں اللہ کی لائٹی بے آواز ہے۔ دوسرا اعتراف ”میں قاتل ہوں“ خلیلہ بڑی عالم اور سفاک عورت تھی۔ قدرت نے انتقام اس سے بیٹا چھین لیا۔ اللہ معاف کرے! ”لہو پکارے گا“ حنا بشری کی تحریر خوب رہی۔ بچی نے مکار پنہانی کے کردار کو پہچان لیا تھا مگر معصوم زریہ کتنی بھولی تھی۔ ”ایمان مجسم“ فرزانہ آغا کی تحریر بیٹ رہی۔ فرزانہ آغا ہمیشہ سے اچھا لکھتی آئی ہیں۔ ”سفید پھول“ پسند آئی۔ ”بارشوں کے شہر میں“ اختر شہاب صاحب کا سفر نامہ پڑھ کر خوب مزہ آیا۔ ارشد علی ارشد کی قسط وار ”مکھنی“ آتش جنوں سلیم فاروقی دونوں تاول اپنے اپنے حساب سے بہتر جا رہے ہیں۔ شمارے کوئی اوقات اتنا ہی پڑھ سکی ہوں جتنا تبصرہ کیا ہے۔ نیا سلسلہ ”روحانی نمبر“ کا مجھے بھی انتظار رہے گا۔ انتخاب میں رفیق انکل مرحوم عارفہ مسعود شعیب محی الدین پارس جو نیچو کا انتخاب پسند آیا۔ (اب ”روحانی نمبر“ کی بجائے دبیر میں خاص نمبر شائع ہوگا) عمران مظہر بشری سعید علی رضا عمرانی اختر شہاب سدرہ انور اور پرانے ساتھیوں کو سلام۔“

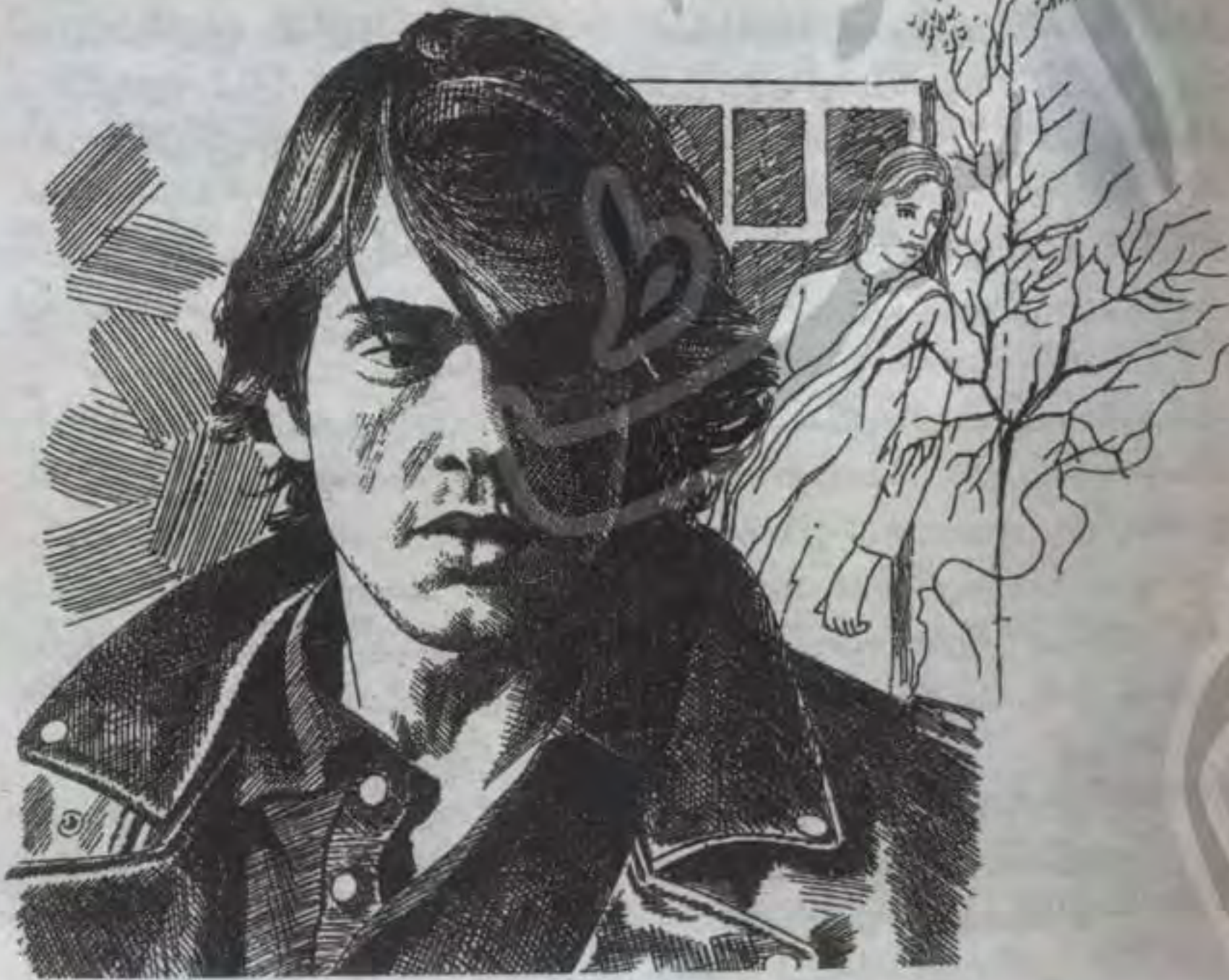
✉ تحسین جو نیچو بورڈی سے رقم طراز ہیں۔ ”محترم سلیم فاروقی انکل! السلام علیکم! خوش رہیں خوشیاں بانٹتے رہیں۔ (آمین!) ٹائٹل بہت خوبصورت مگر لباس زیادہ خوب صورت تھا کہ چہرے کی خوب صورتی تو محض میک اپ کا کمال ہی رہا۔ ادارہ ”عجب تماشا ہے“ یہ تماشا تو شاید

خیام کی رباعی

تسلیم منیر علوی

وہ اپنے جیون ساتھی کو جنون کی حد تک چاہتی تھی اور اس کی ہر بات پر آنکھیں بند کر کے یقین بھی کر لیتی تھی لیکن جب اس کی آنکھیں کھلیں تو اسی لمحہ یقین کا شیشہ پھو پھو ہو گیا

ایک سنگتی مسکتی بہارِ تحریر



کریں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ (کہنے والے تو بے شمار ہیں تحسین!) نامرسلیم صاحب! اے کی لکھ دتا اے؟ رسالہ کبھی ہمیں تو اپنے شہر سے ملا نہیں آپ نے کیسے خرید لیا؟ ویسے کس شہر کو میرا سمجھ لیا ہے؟ (جس شہر میں تم رہتی ہو اسی شہر کی بات کی ہے) عبدالرؤف عدم! اچھے بھیا! اب آپ بھی آئی جائیں تو آٹھ کے بجائے سولہ چاند لگائیں گے۔ قرۃ العین آپ بھی آگئی ہیں ویلکم بیک۔ نسیم انکل کی آمد سے بھی بہت خوشی ہوئی۔ اب آتے رہے گا۔ طویل خطوط کی لسٹ میں عزیز جی آپ انکل ٹاپ پر رہے۔ انکل اب خصوصی خط کا آغاز بھی کر دیں۔ مقابلہ سخت ہوتا جا رہا ہے۔ امید کہ لاج رکھی جائے گی۔ ارے یہ کیا! بے خبری میں آپ کی خبر غائب؟ اب کیسے خبر پڑے گی کہ ”خبر“ میں کیا کیا خبریں ہیں؟ آپ کی ڈائری کے شہ پاروں میں اپنے پرانے ساتھیوں کے نام دیکھ کر خوشی ہوئی کہ اس کوشش سے شاید وہ اپنی آمد یقینی بنائیں۔ اوہو! کافی مغز ماری ہوگئی۔ اب کہانیوں پر بھی تبصرہ کر دوں۔ کہیں انکل غصہ نہ ہو جائیں۔ خصوصی کہانی ”وہ سراب منظر“ سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ آنکھیں بھی دھوکا کھا جاتی ہیں۔ حالات نے رخ موڑا تو زندگی سرائٹھانے لگی۔ بہت اچلی۔ ”اے عشق جنوں“ کہانی ہے یا کوئی مکمل ناول؟ کیا اندازِ تحریر ہے؟ مزہ آگیا ورنہ تو رونے دھونے والی تحریریں پڑھ پڑھ کر اپنی شکل ہی بگڑ جاتی ہے۔ ایسے میں آکسیجن پہنچانے والا کام کر گئی۔ (بگڑی ہوئی شکل یا کہانی؟) جیسے ڈرامائی تشکیل کے تناظر میں پنہاں زندگی کے رنگ اجاگر کرتی نظر آئی کہ بار بار پڑھنے کو دل دے ویل ڈن۔ خصوصی تحریر میری نظر میں اسے ہونا چاہیے تھا۔ ”سفید پھول“ میں بھی نفسیات پر روشنی ڈالی گئی کہ ایک نئی کہانی ابھر کے آئی۔ حقیقی معنوں میں یہ کڑوی سچائی سچ میں ڈھل رہی ہے۔ وقت بدلا، حالات بدلے تو انسان کیا چیز ہے۔ ”ایمان مجسم“ شاہکار تخلیق موتیوں میں پروئی ہوئی۔ ”انہا پسند“ حد سے زیادہ بے جا پابندیاں بھی حالات بگاڑ کے رکھ دیتی ہیں۔ پردہ لازم ہونا چاہیے مگر ایک پیچھی بھی منجھڑے میں قید ہو کر دم توڑ دیتا ہے تو پھر عورت اتنی مظلوم کیوں؟ ”فن کا رعبت“ نے سوچنے پر مجبور کر دیا۔ ”میرا مقدر کچھتاوا“ کسی کو اتنا سرچڑھا دیا جائے کہ سر ہی اڑا دے۔ سبق آموز تحریر! ”ایک محبت“ ایک مذاق“ موبائل اور نیٹ نے تو کسی کی محبت مذاق بنا دی اور کسی کا مذاق محبت عجیب داستان یہ بھی کہ ہر بار ایک انوکھی کہانی جنم لیتی ہے۔ اعتراضات میں تینوں اعتراف غم زدہ رہے۔ اپنی ذات کے متعلق اعتراف بیان کرنا ایک الگ ہی سکون بخشتا ہے۔ ارشد علی ارشد بھائی کی ”مکھنی“ اور اختر شہاب انکل کا سفر نامہ مکمل ہونے پر تبصرہ پیش کریں گے۔ 14 نومبر کو میرے بچے آریان کی سالگرہ ہے۔ (بہت بہت مبارک ہو۔ ویسے یہ ”آریان“ کس زبان کا لفظ ہے اور اس کا مطلب کیا ہے تحسین؟)

✉ کراچی سے امین مراد انصاری کی آمد! ”محترم سلیم فاروقی! السلام علیکم! سچی کہانیاں اکتوبر کا شمار تین اکتوبر کو ملا۔ اس شمارے میں آپ نے میرے خط کو کاٹ پیٹ کر شائع کیا جس کی بنا پر تبصرے کا مقصد ہی فوت ہو گیا۔ کیا سچی کہانیاں میں سچ لکھنا منع ہے؟“ (سچی کہانیاں) ہی میں تو سچ لکھا جاتا ہے ورنہ تو ہر طرف جھوٹ کی بھرمار ہے بھائی میرے! چلیے اس خط میں آپ کی تعریف کیے دیتے ہیں۔ (ایسا کیا تو خط میں مزید کاٹ چھانٹ ہوگی) آپ کا ادارہ ”عجب تماشا“ بے حد اچھا لگا۔ آپ نے سچ کہا ہے کہ ٹیلی وژن کے ٹاک شو میں سیاست دانوں کی گفتگو میں اخلاق نہیں ہوتا، خصوصاً خواتین سیاست دانوں کی لڑائی کسی تماشے سے کم نہیں ہے۔ انٹکوز کے سوالات اور سیاست دانوں کے جوابات سے اس قوم کو نہ تو کوئی فائدہ ہے اور نہ ہی کوئی رہنمائی ملتی ہے۔ اس قسم کے پروگرام ذاتی پبلسٹی کے لیے پیش کیے جاتے ہیں۔ پرائیویٹ ٹیلی وژن کے مالکان حکومت اور اپوزیشن دونوں سے مال بنور نے میں معروف دکھائی دیتے ہیں۔ اس شمارے میں خطوط کے اس کالم میں عائشہ خورشید انور کراچی کا خط بہت دلچسپ تھا بار بار پڑھتا رہا۔ ہاں عائشہ بہن! آپ نے سچ کہا ہے کہ شوق کا کیزر الکھاری کو تنگ کرتا ہے یہ کیزر امیرے اندر بھی ہے جب تک کچھ نہ کچھ نہ لکھوں! کلیلا تا ہی رہتا ہے۔ (افسوس کی بات ہے) آپ لکھنے کے Talent کو کیزر اکبر رہے ہیں؟ کیزر اتوان لوگوں میں ہوتا ہے جو کچھ نہیں لکھتے) میری طرف سے تمام دوستوں کو سلام اور عید مبارک!

✉ لہڑی سے نور محمد نور بھٹو کی پہلی بار احوال میں دستک! سلیم فاروقی صاحب! سدا خوش رہو! آمین! السلام علیکم! خیرم و خیر خواہم! بعد از خیریت احوال یہ ہے کہ میں سچی کہانیاں کافی عرصے سے پڑھ رہا ہوں مگر اس میں پہلی مرتبہ اپنی ایک تحریر ”آخری خواہش“ کے ساتھ آپ کی خدمت میں پیش ہو رہا ہوں۔ امید ہے کہ آپ خوش آمدید کہہ کر تحریر شائع کر کے شکریہ کا موقع دیں گے۔ (خوش آمدید! اور بولے)

اب تک جو خطوط ہمیں موصول ہوئے ہیں وہ سب ”احوال“ میں شامل کر دیے گئے ہیں۔ اگلے ماہ بہ شرطِ زندگی انشاء اللہ پھر ملاقات ہوگی! تب تک کے لیے اجازت۔

آپ کی دعاؤں کا طالب
سلیم فاروقی

میں صرف نام کی تابندہ ہوں۔ جانے کیا سوچ کر اماں باوا نے یہ نام رکھا؟ تابندگی تو کیا خاک ہوتی البتہ ”بندگی“ کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ والدین کو بیٹا نہ ہونے کے غم نے نڈھال کر دیا تھا اور جب توری کی تیل کی طرح آس پاس کی دیواریں پھلاکتی ہم تین بہنیں چھتوں پر جا لگیں تو دونوں کی سرگوشیوں میں اضافہ ہو گیا۔ ویسے خدا لگتی بات ہے کہ غریبوں کے یہاں تین بیٹیوں کا ہونا واقعی پریشان کن تھا پھر آمدنی محدود اماں ایک گھریلو خاتون اور ابا چائے کی ایک پکٹی میں سپروائزر جنہیں ایمانداری اور محنت پر بڑا گھمنڈ..... بس یہ ضرور تھا کہ ہم تینوں بڑھ رہی تھیں۔

چھوٹی بہنیں انٹر میں تھیں اور میں نے اُن دونوں بی اے کیا تھا۔ اماں باوا دونوں شاید جاگتی آنکھوں خواب دیکھتے رہے کہ سلونی سلونی، لمبی گھٹاؤں، حسیں زلفوں والی تابندہ کو کوئی پرستان کا شہزادہ آکر لے جائے گا مگر جب صرف محلے ہی سے لٹو بٹو جیسے لفٹوں کے پیغام آنا شروع ہوئے تو ان کی سوئی حس جاگ اٹھی۔

”نہ بھیا“ ہم نے جو تکلفیں اٹھائیں۔ اللہ نہ کرے ہماری پھول جیسی بچیاں اٹھائیں۔“

میں اسی چکر میں یونیورسٹی جا پہنچی اور جب یکے بعد دیگرے دونوں بہنیں بی اے کر کے نکلیں تو ابا کی جیسے سوچیں ہی سلب ہو گئیں۔ اماں سے اصرار کرنے لگے کہ گولڈن فیک ہینڈلے کر کسی بہتر جگہ گھر لے لیتے ہیں۔ یہ گھر کرائے پر اٹھا دیتے ہیں۔“

اماں تو اپنا بسا بسایا گھر ہرگز چھوڑنے پر تیار نہ تھیں مگر ساری عورتوں کی طرح اماں کی کیا چلتی۔ اپنے مجازی خدا کے پیچھے چل پڑیں اور ہمارے بہتر رشتوں کی خاطر یہ کڑوا گھونٹ پینے پر تیار ہو گئیں۔

یوں ہم تنگ و تنار یک گلیوں سے نکل کر قدرے روشن اور شفاف علاقے میں آ گئے۔ میں نے جاب کی تلاش میں اخبارات کھنگال ڈالے۔ بہنوں نے بھی اصرار کیا کہ بجائی طرح ہم بھی یونیورسٹی جائیں گے مگر ابا نے ان کی ذرا نہ چلنے دی یوں وہ گھر بیٹھ کر ٹیوشن کرتیں اور میگزین سے دیکھ کر نئی نئی تراش خراش کے کپڑے سلواتیں اور میں روز ایک خواب جگائے دوسرے دن کا انتظار کرتی کیونکہ میری زندگی میں چراغ امید اور خواب

ہی رہ گئے تھے۔ جب ایک کمپنی میں ملازمت کی آفر آئی تو مانو ایک تازہ ہوا کا جھونکا میری خاردار زندگی میں بہار بن کر داخل ہوا۔ اب زندگی قدرے سہل ہو گئی اور اماں کے چہرے پر بھی سکون در آیا۔

سب کچھ عین میرے پلان کے مطابق چل رہا تھا کہ اچانک میری زندگی میں مشاہر کی انٹری ہوئی۔ یہ شخص میرا باس تھا جو غالب کے مصرعے کی طرح سبک اور آتش کے شعر کی طرح بے باک ہر بات کو کسی نہ کسی ادا سے شعر و مصرعوں میں ادا کرتا تو میرے بھی شعری ذوق کی تسکین ہوتی۔

پھر جب ایک ہی جگہ کام کرتے ہوئے بے تکلفی بڑھی تو مشاہر نے اپنا پروپوزل بھیجنے پر اصرار کیا۔ بات کچھ نہ تھی مگر رنگ فسانہ اختیار کر گئی بقول جون ایلیا، ایک گلی کی بات تھی اور گلی گلی گئی

اماں کہتیں تم نے اُن مہینوں کے مختصر سے وقت میں کتنا اُسے جان لیا؟ پہلے ہم معلومات کریں گے یعنی میری ذہنی عمر کے بعد بھی انتخاب خاص کا اہتمام جاری تھا بلکہ اماں تو اُس وقت مجھے یوں لگا بالکل سیلکش ہو گئی ہوں کہ یوں اتنی جلدی موٹی اسامی ہاتھ سے نکل جائے بلکہ وہ تو اصرار کر رہی تھیں کہ فرخندہ کی بات چلائی جائے۔ میرے دل میں جانے کیوں چنگاریاں سی بھر گئیں۔ وہ تو بھلا ہوا بابا کا جنہوں نے بات سنبھال لی اور یوں میں جلد مشاہر کی زندگی میں داخل ہو گئی۔

..... مشاہر کے متعلق تو میں نے آپ کو کچھ بتایا ہی نہیں۔ وہ ہم سے بہتر حالات میں سانس لے رہا تھا۔ ایک ذاتی مکان تھا۔ بڑی بہن ملک سے باہر بیابانی تھی۔ والدین کے ساتھ صرف مشاہر تھا جس کو ملازمت کے زیادہ عرصہ نہ ہوا تھا۔ بقول مشاہر کی اماں ”بیا“ تم نے مشاہر کا ساتھ دے کر مکان کو گھر کر دیا ہے ورنہ تو یہ شادی کے لیے تیار ہی نہ ہوتا تھا۔“

میں جاب کر رہی تھی کہ پہلا پتھر یوں آیا کہ مشاہر کو ایک ہی کمپنی میں جاب پر اعتراض شروع ہوا۔ ”مجھے اچھا نہیں لگتا میاں بیوی باس و ملازم ہوں۔ فی الحال تم جاب چھوڑ دو۔“

مجھے کیا معلوم تھا کہ اب جو موج آئے گی وہ پلٹے گی کنارہ لے کر میں روز قلم زد کرنے اور اخبارات میں ”ضرورت ہے“ کے گرد دائرے بنانے میں مصروف ہو گئی مگر میں نام کی تابندہ ایک ناکام بندہ بن کر رہ گئی۔

جب کسی صورت بھی جاب نہ ملی تو گریسٹی میں سر کھانا چاہا۔ چولہا ہانڈی میرا بھی من پسند مشغلہ نہ رہا تھا سو مارے باندھے یہ بھی کرنا پڑا۔ دوسری طرف اماں بیمار رہنے لگیں۔ دو بہنوں کی عمریں بڑھ رہی تھیں اور میری بے قراریاں۔

مشاہر بظاہر ایک سلجھے اور رکھ رکھاؤ والے شخص تھے۔ اُن میں آج کل کے مردوں جیسی اسپرٹ بالکل نہ تھی۔ حضرت داغ بیٹھ گئے بیٹھ گئے۔

جب ہی تو کسی قسم کی تنگ و دو اور جدوجہد یا آگے بڑھنے کی ہلکی آنچ تک نہ تھی۔ چار سال سے ایک ڈیک اور لیپ ٹاپ پر اکتفا کر کے شکر کرتے۔

”آج کل جاب کہاں ملتی ہے شکر کرو کسی کام سے لگا ہوا ہوں ورنہ بڑے بڑے M.B.A. اور M.S. جوتیاں پچھتاتے پھر رہے ہیں۔“ لہجے میں قدرے نخوت جھلک آتی اور میں حیرت سے پلٹیں جھپکائے بغیر انہیں نکال کر دیتی۔

”ایسے کیا دیکھ رہی ہوتی“ تم تو قریہ جاں میں پھول کھلانے آتی ہو۔ جلدی سے ایک گرم کائی ہو جائے۔“

اور میں بے بسی سے اٹھ کر پچن کی طرف چل دی۔ کتنا بے حس ہے یہ شخص! صاحب دل ہو کر میری جال کا دشمن بنا ہوا ہے۔ میں تو اُس کی حاضر جوابی شاعرانہ وارفتگی پر مر رہی۔

..... سہ پہر ڈھل رہی تھی۔ مشاہر کے لوٹ آنے کا وقت ہو چلا تھا۔ میں بیڈروم میں فریش ہو رہی تھی۔ آخر آج بارہ دسمبر تھی ہماری شادی کی سالگرہ..... میں نے بھی خوب اہتمام کیا مگر میں نے گھریا سجا یا تو برامان گئے۔

”ادہ تابی آج کوئی آ رہا ہے۔ خوشبو بتا رہی ہے کہ کوئی آنے والا ہے۔ سوری جانو آج میں کسی کو ٹائم نہ دے پاؤں گا۔ آج رات ڈائریکٹر نے ڈنر پر انوائسٹ کیا

ہے۔ میرا تو ذرہ برابر بھی موڈ نہ تھا مگر تمہاری بات یاد آ گئی۔ صرف ایک ڈیک پر بیٹھنے سے ترقی نہیں ہوتی، حرکت میں برکت ہے اور حمید اختر نے بھی اصرار کیا ہے۔ ایسی پارٹی نہیں چھوڑنا چاہیے۔“ اس نے نظر اٹھا کر دیکھا بھی نہیں۔

”سوٹ پر لیں کر دو۔“ اور میں مبہوت سی روباوٹ کے مانند پلٹ آئی۔

اور جب پر لیں شدہ سوٹ لے کر پلٹی تو وہ ہاتھ روم سے نکل رہا تھا۔ تازہ غسل کے چھینٹوں سے اس کے بازو تر تھے۔ وہ ایک وجیہہ اور دلکش شخص تھا۔ میں نے نگاہیں اٹھائیں۔

”لایے پارمن! کیا نظر لگانے کا ارادہ ہے؟“ میں شپٹا گئی۔ انداز بڑا مہذب تھا۔ مجھے بھی مذاق سوچھا۔

”اوں میں تو یہ کہتی ہوں کہ شکر ہے شوہر والوں کی آپ پر نظر عنایت نہیں ہوئی ورنہ فیصل فریشی کو اب کسی رول میں نسوانی کردار نہ دیتے۔“

انہوں نے ایک ادائے تاز سے مجھے پرے دھکیلا۔ ”اب اتنا تو کانٹوں میں نہ گھسیٹو۔ ایسے تو میں بھی کہہ سکتا ہوں شکر ہے تم پر کسی کی نظر نہیں پڑی ورنہ ہم تو بے موت ہی مارے جاتے۔ آج تو یہ شوخ شیفون کا کلر تمہارے دلکش سراپا کو مزید دلکش بنا رہا ہے۔ کیا کروں یار روزی رزق کا معاملہ ہے۔ جانا تو ہوگا۔ کون ظالم ایسی بیوی کو چھوڑ کر باس کی خوشنودی کو جائے گا مگر وہ شاید مائنڈ کر جائے۔“

”کیا اُس کا مائنڈ ہے جو وہ بارہ دسمبر سردیوں کی اس رات ڈنر پر جا رہا ہے؟“ میں نے بڑا تاملنا سوال اس کی طرف پھینکا۔

”اوہ..... یار..... اُف“ سوری! یہ ہوتی ہے غیر دماغی۔“

وہ میرے بالکل قریب آ گیا۔ کلون کی دھیمی دھیمی خوشبو اس کے وجود سے پھوٹ رہی تھی۔

”جان مشاہر! آج معافی مانگتا ہے یہ غلام! آئندہ یہ گستاخی نہ ہوگی۔“ وہ واقعی شرمندہ تھا۔ اس نے ادائے دلبرائی سے میرے بکھرے بالوں کو سمیٹا۔

میں کسماسی گئی۔ ”آپ جائیں میں بالکل ٹھیک

ہوں۔“

وہ گنگنا رہے تھے۔ ”کپڑے بدل کر بال بنا کر۔“
میں نے شعر کی تصحیح کرنا چاہی تو آگے بڑھ کر لبوں پر انگلی
رکھ دی۔

جیسی باہر ہارن بچنا شروع ہو گیا۔

”حمید اختر آ گیا۔ اسی کم بخت نے مجھے پھنسا یا
ہے۔“ وہ بڑبڑاتا ہوا باہر کو لپکا۔

میں جانے کیوں اس بے نام عشق میں کود گئی۔ یہ تو
نازمین دلربا، انجم تاباں، ماہ درخشاں جیسے شاعرانہ خطاب
کے بعد سمجھتا ہے۔ میں اس کی چال میں پھنس کر بے دام
غلام بن جاؤں گی۔ وہ تو میرے گرد گھیرا تنگ کرتا جا رہا
ہے اور میں اس گھیرے میں گھر کر چلتی جا رہی ہوں اور
آپ بڑی ادا سے آتش کا کوئی شعر پڑھ رہے ہیں۔ میرا
تو خیال ہے کہ روٹھ جاتے ہو تو کچھ اور حسین لگتے ہو۔۔۔۔۔
ہم نے یہ سوچ کے ہی تم کو خفا رکھا ہے کے فارمولے پر
عمل پیرا ہے۔

جب میں یونیورسٹی میں پڑھ رہی تھی تو اماں مجھے ملز
اینڈ بون کی ناویں پڑھتا دیکھ کر کہتیں کہ تم ہر وقت
رومانس کی دنیا بسا کر مشکل میں پڑ جاؤ گی۔ حقیقت کی دنیا
سے دور یہاں کوئی شہزادہ نہیں آئے گا۔

اور میں کھلکھلا کر ان سے کہتی۔ ”تو اماں! آدم
یو آدم یو کہتا کوئی دیو آدھمکے گا۔“ اماں میری بات پر
جلال میں آ جاتیں۔

”یہ ٹھیک ہے کہ اب ہر وقت رومانی باتیں شعر و سخن
گل و بلبل لب و رخسار سے مجھے چڑی ہوئی ہے۔ واقعی
یہ صرف وقتی دلا سے ہیں۔ ان کا ہماری عملی زندگی میں کوئی
عمل دخل نہیں۔ میں تو اب ”بیک پائپر“ کی طرح اس
کے پیچھے چل پڑی ہوں۔ میں پڑھی لکھی ہوں اور مانتی
ہوں کسی حد تک خود پسندی لڑکی ہوں مگر اب ان پانچ
سالوں میں یہ اندازہ ہوا یہ تو کسی اور ہی سیارے کا بندہ
ہے۔ ایک لگے بندھے نظام میں گردش کر رہا ہے۔ ناشتا
ہاف فرائی انڈے سلاکس ایک کپ دودھ۔

میں کہتی۔ ”مشاہر آج چھٹی ہے۔ بریک فاسٹ
میں کچھ اور لے لیں۔ پراٹھا بنا دیتی ہوں۔“

”نو بھئی“ تو بہت طبیعت بوجھل ہو جاتی ہے۔“
”مشاہر دیکھیں آج نئی ڈش ٹرائی کی ہے۔ آپ کو

پسند آئے گی۔“ میں بڑے لجاجت سے کہتی۔

”ارے تابی بیگم! یہ کھانے پکانے کے چھٹلو نے ہم
جیسے سادہ کھانے کھانے والوں کو مشکل میں ڈال دیا
ہے۔ آپ کھائیں! اماں کو ٹیسٹ کرائیں۔ مجھے تو شور بہ
چپانی ہی سوٹ کرتی ہے۔ رات کو ڈنریوں بھی ہلکا ہی ہونا
چاہیے۔“

لیجے جناب پانچ سال سے وہی روٹیں! مجھے تو
حیرت ہوئی۔

”مشاہر آج اس سوٹ کے ساتھ ٹائی یہ لگالیں۔
پچھلی برتھ ڈے پر آپ کو گفٹ کی تھی جب سے پڑی
ہے۔“ میں بڑے ارمان سے کہتی۔

”یہ شوخ کلر میں کہاں لگاؤں گا؟“ میں دل سوس
کر رہ جاتی۔

گھر کی اس یکسانیت نے مجھے روبرو بنا دیا ہے۔
خاموشی میں اکثر گھڑی کا پنڈولم ہی غیبت لگتا۔ ساس
سرسبھی کم گو۔ دونوں کتابیں پڑھتے ہی دی ٹاک شوز
دیکھتے وقت پر کھانا پھر اپنے بیڈروم میں چلے جاتے۔
دس بجے دودھ کے کپ کے ساتھ میڈلین دے کر میں
ریسٹ لے کر بیٹھ جاتی۔ وہ لوگ فوجیوں کی طرح تھے
اور میں ایک بیٹ مین!

سردیوں کی ایک شام بارش ابھی رکی تھی۔ جسم میں
آرے کی طرح سرکتی ٹھنڈ سارے گھر کو منجمد کر رہی تھی۔
اماں اب اس شام گرم ادنی کپڑوں میں لپٹے کمرے میں
آتش دان روشن کیے مسدس حالی پڑھنے میں مصروف
تھے۔ ابا کوئی شعر سناتے تو اماں اپنی چندی چندی آنکھوں
سے ابا کو نکھین اور اپنے جھریوں زدہ ہاتھ کبل سے نکال کر
داد دیتیں۔

ہم سے اچھے تو یہ دونوں بوڑھے تھے۔ ہمیں تو اپنا
بڑھاپا بھی ایسا نظر نہیں آتا۔ یہ دونوں آپس میں مکالمہ تو
کر لیتے ہیں۔

اس پے ستم یہ کہ اتنے برس بیتے گھر میں کسی نئے فرد
کی آمد نہیں ہوئی۔ مشاہر کو اس کی بھی کوئی پریشانی نہیں۔
امریکا میں جا بسنے والی بیٹی ہر مہینے فون پر رابطہ کرتی
ہیں۔ اماں بادا کی خیریت پوچھتی، ہیلو ہائے بھائی بھوج
سے بھی بات کر لیتیں مگر کبھی مذاق میں بھی بھیا بھائی کو نہ

یادوں کے چراغ

ماضی کے حیدر آباد (دکن) کے شب و روز کا احوال ایک تہذیب کا عروج و زوال
اُردو ادب کی معروف مصنفہ ٹیلی وژن کی بے مثل ڈراما نگار اور مقبول سماجی شخصیت

فاطمہ ثریا بجیا

کی رُودادِ حیات.....

کچھ کہی، کچھ اُن کہی باتیں اور یادیں.....

ایک عہد، ایک دور کی کہانی، فاطمہ ثریا بجیا کی زبانی

ماہنامہ ”پچی کہانیاں“ کے صفحات پر بہت جلد پیش کی جائے گی۔

چھیڑا کہ تمہارے باغ میں کب نیا پھول اپنی بہار دکھائے
گا؟ اور بھیا صاحب مٹی کے مادھو! انہیں تو جیسے بچوں
سے خدا واسطے کا پیر.....

ابھی کل ہی کی تو بات ہے میں یوریت میں گرفتار
گیٹ تک چلی گئی۔ باہر بچے کرکٹ کھیل رہے تھے۔ اُن
کی گیند اکثر ہمارے گھر آ جاتی۔ میں اسے واپس کرتی تو
اکثر اُن ننھے ننھے بچوں سے تھوڑی دیر باتیں کر لیتی۔ مایا
بھولی سی بچی پھولے پھولے گالوں والی سرخ گھیردار
فراک پہنے بہت پیاری لگتی تھی۔

کھیلنے میں ایک دفعہ بیلنس برقرار نہ رکھ سکی اور
اونڈے منہ جا گری۔ میں دوڑ کر گئی گھر لا کر اس کا منہ
ہاتھ دھلایا، کھٹے چھل گئے تھے ڈینول سے صاف کئے۔
نئی پلاسٹ لگایا اور اپنے پاس بٹھا کر اس سے باتیں
کرنے لگی۔

اُس نے بتایا ایک گڈا سا منا بھیا امی کے پاس
آسمان سے آ کر اُن کی بھولی میں آن گرا ہے۔ ماما بابا
اس سے بہت پیار کرتے ہیں۔ وہ اپنی تو تلی زبان میں
جانے کتنی باتیں کر رہی تھی کہ مجھے اپنے پیچھے آہٹ محسوس

”آپ؟“ میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا۔ وہ مشاہر
تھے۔ ”مشاہر مجھے تو پتا ہی نہیں چلا۔“

”اوہ ہو تو بلیکس ایڈھی صاحبہ آپ نے یہ دلچسپی
ڈھونڈ نکالی ہے۔ باہر گیٹ کھلا پڑا ہے اور آپ یہاں
سبق پڑھ امانت کا صداقت کا لے کر بیٹھی ہیں۔ بھئی
مجھے آفس سے آ کر سکون چاہیے ہوتا ہے۔ یہ بچوں کا شور
اور دھماچو کڑی مجھے ڈسٹرب کرتی ہے۔ ابھی باہر بھی
ڈانٹ کر آیا ہوں۔“ جتانے والے انداز میں کہا گیا تھا۔

میرے جسم میں دیکھ کا شعلہ سالکا۔

”اب تو آپ اقبال کی دعا کی تفسیر نظر آرہی ہیں۔
جائیے اس ”مشغلے“ کو باہر رخصت کر کے آئیے۔“

مجھے تو تھر تھری سی آگئی۔ دل کی رفتار اچانک تیز
ہو گئی۔ ”اف خدا! ہم نے تو دل جلا کے سر عام رکھ دیا!“

مشاہر کو یوں گفتگو کرتے دیکھ کر وہ بچی تو وہاں سے
چلی گئی مگر اپنے پیچھے بہت سے سوال چھوڑ گئی۔

میں نے سوچا یہ شخص تو مجھے ذہنی مریض بنا دے گا۔
کیسے آداب سے خیر میرے آگے رکھ دیتا ہے۔ یہ لومیری

گریس فل بیوٹی کون ڈریم لیڈی، لوپلیز، یہ آرام سے اپنی رگ گلو پر رکھ لو۔ زیادہ کچھ بھی نہیں ہوگا جانم! تمہیں سرخ گلاب بہت پسند ہیں، بس سرخ گلابوں سے لہجہ جاؤ گی اور میں بروٹس یوٹو؟ سیزر کی طرح بے بسی سے دیکھتی رہ جاؤں گی۔ جانے مجھے اُس وقت کیا ہو گیا تھا۔ صبر کا پیمانہ شاید چھلکنے کو بے قرار تھا۔

مشاہر شام ڈھلے گھر لوٹے تو کافی بجھے دل سے ٹائی کی ناٹ کو ڈھیل کر تے ہوئے بستر پہ جا گرے۔
”یا اللہ! خیر!“ میں ان کی ہاؤس میڈ فور امد کو لپی۔
”کیا ہو گیا! طبیعت تو ٹھیک ہے؟“ میں نے فکر مندی سے کندھا ہلایا۔ ”ہاں، سر درد سے پھنسا جا رہا ہے۔“ ابھی میں لپک جھپک کر سائیڈ ٹیبل سے دوا تلاش ہی کر رہی تھی کہ موصوف گویا ہوئے۔ ”اب تم کیا کرنے لگیں؟ ہم تو تمہاری گہری آنکھوں پر بھی خم دار چکوں کی جھال پر اپنا آپ گم کر دینے کے لیے بے قرار ہیں۔ ادھر آئیے جان مشاہر!“ انہوں نے ہاتھ بڑھا کر مجھے قریب کرنا چاہا۔
”آپ تو شاعر کا خواب خیام کی رباعی ہیں۔“ میں نے بھی ایک ادائے ناز سے اُن کو پرے دھکیلا۔

”یار بن دروسر ہنوز برقرار است۔“ وہ اس جملے پر پھڑک اٹھے۔
”یار! آپ تو ہمارے ساتھ رہ کر بالکل ہماری کاپی بن گئی ہیں۔ زبردست! خوب گزرے گی جول بیٹھیں گے دیوانے دو“

میں نے دل میں سوچا۔ ”جی! جناب نے دیوانہ ہی بنا رکھا ہے، بس اب سنگ اٹھانے کی دیر ہے۔“
میں پانی کے لیے باہر جانے کو لپی تو آنچل تھام لیا۔
”تائی! میرے درد کا مداویہ کوئی نہیں۔ دراصل مجھ سے میری ڈیک اور جگہ تبدیل کرنے کو کہا گیا ہے اور مجھے.....“

”ہاں! ہاں کہیے! آپ کی ترقی ہوئی، کہیں اور پوسٹنگ ہو رہی ہے؟“ میں نے مسکرا کر شکفتہ انداز میں سوال کیا۔ ”تو اس میں پریشانی کی کیا بات ہے؟ کچھ ٹائم لگے گا، نئی جگہ پر سیٹ ہو جائیں گے۔ تبدیلی اچھی چیز ہے۔“ میں نے اپنے نزدیک بڑی سمجھداری کا مظاہرہ کیا۔ اُن کو تو جیسے کرنٹ لگ گیا۔ ”یہ ہی..... یہ ہی تمہاری

کمزوری ہے۔ ہر وقت تبدیلی، حرکت، ہلچل، شور و غوغا، نہیں چاہیے مجھے چھینچ۔ مجھے تبدیلی پسند نہیں۔ ایک اچھے بھلے روٹین سے کسی ملازم کو ہٹا کر جگہ سے بے جگہ کرنا۔ یہ سیٹھ لوگوں کا وتیرہ ہے اور وہ حمید کم بخت، میری بے بسی پر اتراتا ہے۔“ وہ نم اور بے بس لہجے میں بول رہے تھے۔
”اب حمید نے کیا کر دیا؟ وہ تو آپ کا بڑا جگری دوست ہے۔“ میں نے بھی تنک کر سنگ باری کی تھی۔

وہ پھڑک اٹھے۔ ”وہی تو ہے اس سارے معاملے کا ذمہ دار۔“ خیام صاحب کے کمرے میں مجھے منتقل کیا جا رہا ہے۔ وہ مجھے اپنے کمرے میں اپنے قریب رکھنا چاہتے ہیں۔ مجھے بڑا لائق فائق سمجھتے ہیں۔ ”اب تو سانس بھی لے آہستہ کہ نازک ہے بہت کام“ بھلا بتاؤ! میری تائی! باس کے ساتھ میں کیسے آزادانہ کام کر پاؤں گا۔ ہر بات ہر حرکت پر نظر ہوگی۔ آف خدایا!!“ وہ غصے سے اٹھ کر ہاتھ روم شاور لینے بھاگے۔
میں نے کچھ سمجھتے، نہ سمجھتے ہوئے چائے کا پانی چڑھایا تاکہ پارہ ذرا نیچے آئے۔

مشاہر کو ایک روم سے شفٹ ہونے میں اتنی وقت اتنی برہمی میری سمجھ سے باہر تھی۔ دو تین دن ان کا موڈ خراب رہا، اکھڑے اکھڑے میرے سرکار نظر آتے ہیں۔ میں نے تو یہ ہی تاثر قائم کیا کہ جس بندے کو ایک لگی بندھی روٹین اور نپے تلے ماحول میں وقت گزارنے کی عادت ہو تو وہ ایسا ہی ڈسٹرب ہو جاتا ہوگا۔ مشاہر کا تو یہ انداز پانچ سال سے دیکھ رہی ہوں۔ بیڈ روم میں اگر سینک تبدیل کر دوں، فوراً اعتراض کی بوچھاڑ شروع۔

”تمہیں تو مجھے ستانے میں لطف آتا ہے۔ جب میں اپنے پیپر والٹ، گھڑی اتار کر ادھر ٹیبل پر گزشتہ کئی برس سے رکھ رہا ہوں تو تمہیں ہٹانے کی کیا ضرورت تھی؟ مجھے لگتا ہے تم مجھے میرے مدار سے نکل جانے پر مجبور کر رہی ہو۔“ اس دن انہوں نے مجھے کندھے سے پکڑ کر تقریباً جھنجھوڑ ڈالا۔ ”یاد رکھو مدار سے باہر ہونے کی صورت میں قیامت آ جاتی ہے قیامت۔“ لہجہ کھولتا ہوا تھا۔

اس لیے اپنی صفائی میں کیا کہتی کہ میز کا ایک پایہ ہل رہا تھا۔ شاید کسی وقت واش روم سے پانی آ گیا تھا وہ گل

کر کمزور ہو گیا اور کسی وقت اپنے بوجھ سے آزاد ہو کر زمیں بوس ہو جاتی۔
بس اتنی سی بات تھی مگر اب خود ہی آ کر سائیڈ ٹیبل کی دراز کھول کر اپنا موبائل اور دیگر سامان وہاں رکھ دیا۔ میرے خیال میں باہر اسٹور کے سامنے میز کی زبوں حالی دیکھ کر اب غصہ ٹھنڈا ہو گیا تھا۔

یہ بوجھل ماحول ہمارے گھر کا حصہ تھا۔ بات اتنی معمولی ہوتی کہ یقین نہیں آتا کہ یہ احمقانہ حرکت میرا مجازی خد کر رہا ہے جو پڑھا لکھا اور سمجھدار شخص ہے۔ کبھی بھی تو جانے کیوں میرا دل چاہتا کہ خوب قہقہے لگاؤں یا ان کی کم عقلی پر ماتم کروں یا اُن کے پرزے اڑا دوں لیکن میں ہنسی میں چھپا کر منہ بنا کر اداکاری کرتی۔
”جی حضور! سوری! اب ایسا نہیں ہوگا۔“

اور جب اس جی حضوری کے بعد جناب کی انا کے غبارے میں خوب ہوا بھر جاتی تو فتح مندی کے آثار نمایاں ہو جاتے۔

”اوہ گڈ گرل! پہلے خیال کر لیا کرو ان چھوٹی چھوٹی باتوں کا۔“ اور بڑی ادا سے میری پٹھری ہوئی ایک لٹ کو چھو کر فیض کا شعر پڑھنے لگتے۔ ”کھل رہے ہیں تیرے پہلو کے سمن اور گلاب! اب بھی دلکش ہے تیرا حسن مگر کیا کیجیے، وہ مجھے بانہوں میں سمیٹ کر باہر لان میں پھیلی چاندنی میں لے آتے۔

مجھے خاموشی اداس دیکھ کر اس سے پہلے کہ وہ پھر غالب، فیض یا فراز کو زحمت دیں۔ میں کہہ اٹھتی۔ ”اس وقت آپ نے جو جفا کی وہ بڑے قاعدے قانون سے کی۔ اس طرح خوش رہا کریں۔ زچ نہ ہو جایا کریں۔“
”بس اب نیچر نہ بنو۔“ اور میں سہم کر پیچھے ہٹ گئی۔

آج چھٹی تھی کہ اتوار تھا۔ مشاہر خلاف توقع بہت جلد اٹھ گئے۔

میں نے بڑی امید سے کہا۔ ”آج چھٹی ہے کوئی پروگرام ہے؟“
”وہ..... حمید اختر.....!“

”آف! پھر حمید! میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ حمید کے کسی پروگرام کا حصہ نہیں بننا، نہ فارم ہاؤس نہ پچھر ہاؤس مگر ہاں! صرف ہاؤس! ہاؤس اور ہاؤس۔“ اس پر

انہوں نے ایک بھر پور قہقہہ اچھالا۔
”ہمارے ساتھ رہو گی تو یوں ہی فقرہ بازی میں ماہر ہو جاؤ گی۔“

دل میں آیا، اس وقت لوہا گرم ہے بات کا رخ موڑ دوں۔ میں نے جی کڑا کر کے سامنے بیٹھے مشاہر کا ہاتھ تھام لیا اور کسی سوچ میں غرق بیٹھے مشاہر کو مخاطب کیا۔
”مشاہر! ایک بات سنیں۔ جب آپ نہیں ہوتے ہیں تا میں بور ہو جاتی ہوں۔ میرا مطلب ہے ہمیں اب اپنی فیملی کے متعلق سوچنا چاہیے۔ ان پانچ برسوں میں آپ کے دل میں کسی ننھے فرشتے کے لمس کا احساس نہیں جاگا؟“ میں نے ڈرتے ڈرتے اظہارِ مدعا کر دیا اور کن آنکھوں سے کھڑکی سے ہلکی ہلکی چھن کر آنے والی روشنی میں ان کا بے انت چہرہ دیکھنے کی کوشش کی۔

پہلے ایک تناؤ آ کر دوبارہ اپنی اصلی حالت میں آ گیا۔

”اچھا تو تم فیملی میں اضافہ چاہتی ہو؟ ایسا کرؤ کوئی ملازمہ رکھ لو کوئی جانور پال لو۔“ آواز میں بناوٹی شوخی کھل گئی۔

میں نے نہایت بے مروتی سے کہا۔ ”مشاہر! یہ کون سا مذاق کا وقت ہے؟ میں ایک سیریس میٹرڈ سکس کر رہی ہوں۔ یہ ہماری زندگی میں آنے والی بہاروں سے متعلق ہے۔“

انہوں نے بات کا رخ موڑنا چاہا۔ ”وہ..... حمید.....“

”سنیں!“ میں نے ان کی بات کاٹ دی۔ ”حمید! حمید کی گردان میرے سامنے تو آپ رہنے ہی دیں! آفس آفس نہ کھیلیں۔“ میں نے بھی آج آخر کار ہمت کر ہی لی تھی مگر ہائے اس ستم ظریف کا انداز ستم۔

”اے میری عمر خیام کی رباعی تم چاہتی ہو، ہماری محبت کے درمیان کوئی تیسرا آ جائے؟ پھر تم تو ہماری طرف دیکھو گی بھی نہیں۔ نا بابا! میں اپنی محبت کو یوں تقسیم ہوتے نہیں دیکھ سکتا۔ سوری جانم، سوری۔“ وہ اپنے مخصوص انداز سے دونوں ہاتھ اٹھا کر کمرے سے نکل گیا۔ میری ہر اک مسافت رائیگاں تھی، مجھے تسلیم کرنا پڑ رہا ہے سنا ہے ایک جادو ہے محبت، یہ جادو بھی تو الٹا پڑ رہا ہے!

اب صرف گھر میں مشاہر کی بے تکی اور بے وقت کی شاعرانہ گفتگو تھی اور ساس سسر کی خدمت! ٹائم پر کھانا، میڈیسن، کمرہ سنوارنا اور لمبی لمبی دوپہروں کو ادھر سے ادھر چکر کاٹنا، بس یہ کام رہ گیا تھا۔

شام کا سرمئی اندھیرا تاریکی میں تبدیل ہو چکا تھا۔ مشاہر کا ابھی تک پتا نہ تھا۔ موبائل پر نیل جا رہی تھی۔ آفس کے نمبر پر کوئی اٹھا نہیں رہا تھا۔ شاید حمید..... مگر کیوں؟؟؟ حمید کے ساتھ کہاں ہوں گے اب تو سب کے گھر لوٹنے کا وقت ہے۔ میں بے دلی سے اٹھ کر کچن میں چلی گئی۔ کھانا گرم کر کے پانی کی بوتل میں گرم پانی بھرا۔ کھانے کے لیے پوچھنے اماں! ابا کے کمرے میں گئی تو اماں غنودگی میں تھیں۔ ابائی وی پر ٹاک شو دیکھ رہے تھے۔ کوئی معلوماتی پروگرام آرہا تھا۔ دلچسپ ہونے کی وجہ سے میں بھی بیٹھ گئی۔

عمر خیام پر پروگرام تھا۔ یہ سال عمر خیام کے نام۔ ان کی پیدائش پر جشن اور پروگراموں پر بات ہو رہی تھی۔ مشاعرہ بھی فہرست میں شامل تھا۔ میزبان بڑی اچھی اور نئی تلی گفتگو کر رہا تھا۔ خیام کی رباعی پر ان صاحب نے بڑی مدلل و پر مغز باتیں کیں۔ اس کی کچھ ایجادات پر بھی بات ہوئی۔ خیام کے لفظی معنی ”خیمہ“ کے ہیں۔

میرے انتہاک کو کچن سے آتی خوشبو نے منتشر کر دیا اور میں نے کچن کی طرف دوڑ لگائی۔ شکر ہے وقت پر پہنچ گئی تھی ورنہ ہانڈی جل کر خاک ہو جاتی۔

ایسے میں گیٹ پر پہنچنے والی گھنٹی نے مشاہر کے آنے کا اشارہ دیا اور آپ جانیں ہم تو ایک اشارے پر عمل پیرا۔

”اوہ مشاہر! آپ ٹھیک تو ہیں؟ بہت دیر ہو گئی۔ سب خیریت تو ہے نا؟“

چہرہ سٹا ہوا، فکر مندی کے آثار نمایاں..... یا الہی! خیر!! میں نے کئی سوال ساتھ کر دیے۔

”آپ چیچ کر میں کھانا لاتی ہوں۔“

”نہیں، رکھو کھانا تو آج خیام صاحب کے ساتھ کھا لیا۔“

”کیا مطلب!! اچھا تو پھر ہم بھی کھانا نہیں کھاتے۔“ میں نے مصنوعی خفگی کا اظہار کیا۔

”تم سے کتنی بار کہا ہے کھانا کھالیا کرو۔“ ان کے لہجے میں کئی ناقابل بیان کیفیتیں چھپی ہوئی تھیں پھر جیسے میرے بھوکا رہنے پر احتجاج کیا۔ ”چلو تم اپنا کھانا یہاں ہی لے آؤ اور میرے لیے ایک کپ دودھ۔ ہم دونوں یہاں بیٹھ کر ہی کچھ دیر باتیں کر لیں گے۔“

میں نے آج کی مفاہمتی کوشش کو سراہا اور کچن کی طرف دوڑ لگائی۔

نومبر کی ایک دوپہر تھی۔ سورج کی تپش روشنی کو نگل رہی تھی یعنی سہ پہر اپنے جوہن پر تھی۔ آتی سردیوں میں گویا رقص بہاراں کا احساس تھا۔ میں نے گھڑی دیکھی چار بجے تھے۔ شام کا ملگجاندھیرا چھا رہا تھا۔ کھڑکی کا پردہ کھسکا کر باہر کا نظارہ کرنا چاہا تو پام کے اونچے درخت کے پرے سامنے سیاہیل کھائی سڑک پر اکا دکا ٹریفک نظر آئی۔ اندر باہر ہر شے سناٹا، باہر نکل کر لان کا چکر لگانے پر خنکی کا احساس ہوا تو پھر اندر دوڑی۔

مشاہر کو فون کر لوں، شاید آج جلدی گھر آجائیں تو امی کی طرف چلی جاؤں۔ فرخندہ کی مگنی طے ہوئی ہے۔ ذرا کام وغیرہ پوچھ لوں مگر دوسری طرف تیل جانی رہی۔ بقول افتخار عارف میری زندگی میں بس اک کتاب ایک چراغ ہے ایک خواب ہے اور تم ہو! مگر تم بھی کہاں؟

موبائل بھی بند آ رہا ہے۔ اب میں نے پروین شاکر کی ”خودکلامی“ اٹھالی۔ (یہ اندازہ تو آپ کو ہو ہی گیا ہوگا) میری زندگی میں ”خودکلامی“ کا کتنا زیادہ دخل ہے مگر آج مشاہر سے لڑ کر مجھے دل کی بھڑاس نکالنا ہے۔ چلو اب تماشا سیر بازار ہوگا! اس فیصلے کے بعد میں کھلی رضائی میں لیٹ کر کتاب کی طرف متوجہ ہوئی مگر کسی طرح دل نہ لگا۔ کروٹ پہ کروٹ، ابھمن اضطراب! جانے کب میں نیند کی وادی میں جا پہنچی۔

کسی کے دروازہ زور زور سے پیٹنے پر میری آنکھ کھلی۔ اسی لمحے گھڑیاں نے دس بجنے پر اپنا احتجاج ریکارڈ کرایا۔

دروازے پر اماں پریشان حال کھڑی تھیں۔ ”بیٹا! سب خیریت؟ دو دفعہ دروازہ بجایا۔ فون چلاتا رہا۔“ وہ بڑے تردد سے پوچھ رہی تھیں۔

دل تو چاہا کہہ دوں کہ ہمیشہ کے لیے سونا چاہتی

ہوں پھر خیال آیا! ان بے ضرر لوگوں سے کیا بات کرنا۔ سر درد کا بہانہ بنایا۔ وردی کو لی کھائی تو ذرا سکون ملا۔ شاید سو نہیں پاتی تھی۔

مخضن سے بے حال ہو کر میں کچھ بے ربط سی گفتگو کیوں کر رہی ہوں؟ جیسے گہرے سمندروں میں سفر کر رہی ہوں! تھکاوٹ غنودگی!

”اوہ ہاں اماں! مشاہر نہیں آئے۔ کوئی فون تو نہیں آیا۔ شام تو میں نے بہت ٹرائی کیا تھا مگر شاید آفس میں نہیں تھے۔ کئی بار ملایا، موبائل بھی بند ہے۔“ میں نے بڑی بے امید نگاہوں سے اماں کی جانب دیکھا۔

”نہیں! جب تم کمرے سے نہیں نکلیں تو میں نے بھی آفس فون کیا تھا۔ موبائل پر ریکارڈنگ چل رہی تھی۔“ اماں کے لہجے میں پریشانی تھی۔

”اچھا!“ میں نے اپنی گرتی پڑتی لٹوں کو کچر میں سمیٹا اور رات کے اندھیرے میں باہر نکل آئی۔ دھند میں لپٹا چاند بھی اداس نظر آیا۔

”کیا سوچ رہی ہے بچی رنگ خوشبو ہوا سے آگے سوچ، شکر گزاروں کی تفسیر بن کر زندہ رہو! اماں کی باتیں یاد آ رہی تھیں۔“

پریشانی میں مجھ پر جیسے ہجانی اور ہذیانی سی کیفیت طاری ہوئی تھی پھر خیال آیا کہ اماں ابا نے کچھ کھایا نہ ہوگا۔ آج تو چائے بھی اماں نے خود بنا کی ہوگی۔ اوہ! خوشگوار تہذیبی۔ جب میں حواس بحال کر کے کمرے میں آئی تو ابا تیل رہے تھے۔ اماں بھی بے چین سی ایک کرسی پر تکی ہوئی تھیں۔

”کھانا..... کھانا لاؤں؟“

”نہیں! کچھ طبیعت بوجھل ہے۔ ایک کپ دودھ دے دو۔“

”بس! کیوں عاطف صاحب؟“ اماں ہمیشہ ان کو بڑے احترام سے مخاطب کرتی تھیں۔

ہماری اماں ٹھیک کہتی تھیں کہ بڑھاپے میں شوہر کا ساتھ نعمت ہوتا ہے، نعمت۔

رات بھگتی جا رہی تھی اور میں سکتی جا رہی تھی۔ آج آ کر میری زلفوں، چھپی رنگت اور لٹکتے بکھرے بالوں میں مجھے الجھایا تو جھٹک دوں گی۔

”دیکھو جانم..... تمہاری دراز قاتمی گداز جسم چہرہ

معصوم، لمبی پلکیں! تم تو عمر خیام کی رباعی ہو۔“

میں اب جھالے میں نہیں آنے کی۔ عورت صرف تعریفوں پر زندہ نہیں رہ سکتی۔

دروازے پر تیل بچی۔ آج بھی وہی صورت حال! نڈھال! کچھ شرمندہ شرمندہ سے نظریں پٹی۔

”جانم! سوری! آج بڑا مصروف دن تھا۔ میٹنگ میں مہلت ہی نہیں ملی۔ رات کو کمرے میں سگنل ہی نہیں آرہے تھے۔“ انہوں نے بڑھ کر محبت سے کمر میں ہاتھ ڈالے۔

میں نے ایک جھٹکے میں غصے سے پرے کر دیا۔

”enough is enough! میں ان ہتھیاروں کے فریب میں آنے والی نہیں۔“

انہوں نے مجھے بڑی حیرت سے دیکھا جیسے کوئی کسی ہاؤس میڈ، کسی گھریلو ملازمہ کو دیکھتا ہے کہ اس کی یہ جرات کمر میں نے بھی اب کمان اٹھالی تھی۔

”سنیں! میں آپ کے گھر کی محافظ اور بوڑھے والدین کی خدمت کے لیے نہیں ہوں۔ میں آپ کی بیوی بھی ہوں۔“ میرے تیور دیکھ کر وہ حیرت میں پڑ گئے مگر یہ حیرت زیادہ دیر نہ رہی۔

”یہ کیا حرکت ہے؟“ وہ پھنکارتے ہوئے میری طرف مڑے۔ ”میں تو تمہارے پیار میں مرا جا رہا ہوں۔ تمہاری صرف تمہاری خاطر اتنی تکلیف اور اذیت اٹھا رہا ہوں۔ رات گیارہ بارہ بجے تک M.D. کی چاپلوسی وہ منحوس حمید جس نے مجھے M.D. کا پی۔ اے بنا کر رکھ دیا ہے اور پھر جب گھر آؤ تو بیوی شعلہ جوالہ آتھک کے میرے پاس بھی بیٹھ تو ہمد، تو خود کو مسافر مجھے دیوار سمجھ لے!“

میں نے تاسف سے ان کی جانب دیکھا پھر شعر! شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے! کسی نے ٹھیک کہا ہے کہ زیادتی ہر چیز کی بری ہوتی ہے۔

آج تو ان کی حالت دیکھ کر میں خود بھی فکر مند ہو گئی۔ ”یہ آپ کے M.D. یعنی خیام صاحب شادی شدہ نہیں ہیں جو روز رات گئے تک آفس میں کام کرتے رہتے ہیں؟ میرا مطلب، فیملی بیوی بچے؟“

”ہاں! حمید بتا رہا تھا بیوی چھوڑ کر چلی گئی ہے۔ اکیلے محل نما گھر میں رہتے ہیں۔ سال میں ایک دفعہ ملک

اکیلے محل نما گھر میں رہتے ہیں۔ سال میں ایک دفعہ ملک

اکیلے محل نما گھر میں رہتے ہیں۔ سال میں ایک دفعہ ملک

سے باہر چھٹیاں گزارتے ہیں، بس اتنا ہی معلوم ہے۔ گویا انہوں نے اس جملے پر معاملہ ختم کرنا چاہا اور اپنا سر تکیے پر رکھ کر گہری نیند میں چلے گئے۔

رات سے بارش لگاتار ہو رہی تھی۔ یوں تو اب مشاہیر اکثر دیر سے آنے ہی لگے تھے مگر بارش کی وجہ سے پریشانی ہو رہی تھی، راستے خراب، لائٹ غائب، سڑکیں سنسان، آسمان بادلوں سے بھرا ہوا..... ایسے میں یوں بھی رات جلدی آ جاتی ہے۔ آٹھ بجے ہی گھوڑا اندھیرا..... آج تو صبح جمید آ کر لے گیا ہے۔ دونوں ساتھ گئے ہیں۔ گاڑی گھر پر ہے۔ موبائل حسب عادت اپنی ہی الاپ رہا ہے کہ فی الحال آپ کے مطلوبہ نمبر سے..... برائے مہربانی تھوڑی دیر بعد نمبر ملائیں۔ ہر دو تین دن کے بعد یہی ڈرامہ نئی کہانی۔ اب میرے خیال میں ڈراپ سین ہو ہی جانا چاہیے۔

میں نے گاڑی کی چابی اٹھائی، اماں کو بتایا کہ میں ذرا کام سے جا رہی ہوں۔ بارش رک گئی ہے۔ ابھی آتی ہوں۔

اب میری گاڑی کا رخ مشاہیر کے آفس کی طرف تھا۔ ذہن میں آندھیاں چل رہی تھیں۔ آدھے گھنٹے کی مسافت پر آفس آ گیا۔ پورے آفس میں سناٹا چھایا ہوا تھا۔ کمرے بھا میں بھا میں کر رہے تھے۔ تمام سیٹیں خالی تھیں۔ گارڈ سے پوچھا کہ آفس میں کون کون ہے؟

”میڈم.....! آپ کون؟“
میں نے خفگی سے جواب دیا۔ ”مشاہیر صدیقی کی بیوی ہوں۔“

”اوہ! اچھا وہ۔ M.D. صاحب تشریف رکھتا ہے میڈم! میں جا کر بتاتا ہوں۔ ادھر ہی مشاہیر صاحب ہوگا۔“ وہ اندر کو تیزی سے لپکا۔

”نہیں خان بابا! آپ رہنے دو۔ ہمیں جلدی ہے اور میں تقریباً سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی اوپر جا پہنچی۔“
دروازے کا گولڈن ہینڈل گھمایا۔ ایئر کنڈیشنر کی خنک ہوا کا جھونکا لپکا۔ اندر نیم اندھیرے کا منظر دیکھ کر میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے، چودہ طبق روشن ہو گئے۔ اف خدایا.....! ایک ادھیڑ عمر کا مرد جو یقیناً خیام ہی ہوگا آرام وہ کاؤچ پر نیم دراز تھا اور..... اور..... ایک انتہائی حسین

لڑکی نیم عریاں لباس میں کاؤچ پر بیٹھی ساقی گری کے فرائض انجام دے رہی تھی۔

اچانک میری نظر کاؤچ کے سامنے والی کرسی پر پڑی تو مجھے ایک اور شدید جھٹکا لگا۔ میرا شوہر میرا مجازی خدا اس بت طنز کو خیام کی رباعی کہہ رہا تھا اور وہی اشعار سنار ہاتھ جو میں اکثر سنتی رہتی تھی۔

”ادھر آؤ جانم.....!“ اس نے حسینہ سے کہا۔ ”کتنی دلکش ہو تم، کتنا دل جو ہوں میں، کیا تم ہے کہ اک روز مر جائیں گے!“

ایسی باتیں مت کریں سر میں آپ کے دشمن پھر آپ کی خوب صورت سی ایک بیوی بھی تو ہے۔“ حسینہ بہت انداز سے بولی۔ ”مے بھی تو اکثر آپ ٹیلی فون پر جانم اور خیام کی رباعی کہتے ہیں۔“

”وہ اپنی دلکشی کھو بیٹھی ہے جان من، وہ اب ماں بننا چاہتی ہے۔“

”ارے تم بھی کس فضول میں پڑ گئیں جان!“
خیام صاحب نے کہا۔ ”ادھر میرے نزدیک آؤ۔ اس کی بیوی تو موجود ہے لیکن میں تو پیاسا ہوں۔ اس کی رباعیاں تو روز تبدیل ہوتی ہیں، کبھی نازلی، کبھی شازیہ، کبھی سعدیہ اور کبھی.....“

اس کے ساتھ ہی وہ دونوں انتہائی بے ڈھنگے انداز میں ہنسنے لگے۔

اچانک مشاہیر کی نظر دروازے کی طرف پڑی تو اسے میری موجودگی کا احساس ہوا۔

اس نے حیرت سے مجھے دیکھا پھر میری طرف جھپٹا اور بولا۔ ”تانی.....! تم..... تم یہاں؟“

اس سے پہلے کہ وہ مجھ تک پہنچتا، میں دو دو سیڑھیاں پھلانگتی ہوئی نیچے اتری اور بھاگ کر گاڑی میں بیٹھ گئی۔ وہ جب تک میرے نزدیک پہنچتا، میں گاڑی آگے بڑھا چکی تھی۔

سب کچھ ختم ہو چکا تھا، میرا خواب اور اس کی تعبیر! اب تو خیام کی رباعی سے کوئی فال بھی نہیں نکالا جاسکتا۔ سب کچھ عیاں تھا، کچھ چھپا نہ تھا۔ پردہ اٹھ گیا تھا۔ ڈرامہ اپنے اختتام کو پہنچ چکا تھا۔ میرا رخ مشاہیر کے گھر کے بجائے اپنے گھر کی طرف تھا۔

☆☆☆

اکتوبر 2013ء کی انعام یافتہ کہانیاں

قارئین کے ارسال کردہ نوکرن کے ذریعے مندرجہ ذیل کہانیاں اس ترتیب سے انعام کی حقدار ٹھہریں

فرزانہ آغا کی تحریر ”ایمان مجسم“ پہلے انعام کی حقدار ٹھہری، ادارے کی جانب سے مبلغ 700.00 روپے بہ طور انعام بھیجے جارہے ہیں۔

صدف آصف کی تحریر ”اے عشق جنوں“ دوسرے انعام کی حقدار ٹھہری، ادارے کی جانب سے مبلغ 500.00 روپے بہ طور انعام بھیجے جارہے ہیں۔

یٹنا مخدوم کی تحریر ”سفید پھول“ تیسرے انعام کی حقدار ٹھہری، ادارے کی جانب سے مبلغ 400.00 روپے بہ طور انعام بھیجے جارہے ہیں۔

عمران خان کی تحریر ”ایک محبت ایک مذاق“ چوتھے انعام کی حقدار ٹھہری، ادارے کی جانب سے مبلغ 300.00 روپے بہ طور انعام بھیجے جارہے ہیں۔

سیمیں غزالہ نہاں کی تحریر ”انتہا پسند“ پانچویں انعام کی حقدار ٹھہری، ادارے کی جانب سے مبلغ 250.00 روپے بہ طور انعام بھیجے جارہے ہیں۔

سیمانا صر کی تحریر ”اجل گرفتہ“ چھٹے انعام کی حقدار ٹھہری، ادارے کی جانب سے مبلغ 200.00 روپے بہ طور انعام بھیجے جارہے ہیں۔

حوصلہ افزائی

مرحوم کرمل رفیق ایس ایم کی یاد میں بدر سعید کی تحریر ”فنکار محبت“ کو بطور انعام مبلغ سو روپے پیش کیے جارہے ہیں

بہترین شعر

قارئین نے اس بار کامران عباسی کا بھیجا ہوا شعر سب سے زیادہ پسند کیا۔

میرے مولا! تیری جنت سے جدا لگتی ہے
میری دھرتی مجھے معصوم دعا لگتی ہے

آتش چٹخوں

سلیم فاروقی

وہ اپنے ملک سے عداوت کا نام و نشان مٹا دینا چاہتا تھا
اس معرکہ میں اُس نے اپنا سب کچھ ہار دیا لیکن حوصلہ نہیں ہارا

ایک شعلہ صفت نوجوان کی سرگزشت۔ قسط نمبر 20

خلاصہ

عمران اور ارسلان دو بھائی ہیں ایک دوسرے سے شدید محبت کرنے والے نہایت جرأت مند اور اپنی عزت و انا کے لیے زمانے سے لڑ جانے والے۔ ارسلان کچھ لالہ لالی ہونے کے ساتھ بہت زیادہ جذباتی بھی ہے جبکہ عمران بہت سمجھدار اور سوچ سمجھ کر فیصلے کرنے والا۔ عمران کا ایک دوست راشد ہے جس کی سمندر میں لائیں چلتی ہیں۔ عمران اور ارسلان راشد کی لائیں پر سمندر کی سیر کے لیے جاتے ہیں۔ سڑک کے دوران اُن کا راشد کی لائیں پر کام کرنے والے ایک جرائم پیشہ ملازم فنی اور اس کے ساتھیوں سے جھگڑا ہوتا ہے۔ فنی راشد کی لائیں میں اس کی لائیں کو غیر قانونی کام کے لیے استعمال کر رہا ہوتا ہے۔ راشد انہیں پولیس کے حوالے کر دیتا ہے۔ اس عمل کے بعد راشد کے پاس دھمکی آمیز فون آتے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ فنی کسی بڑے جرائم پیشہ گروہ کا آلہ کار ہے۔ ایک روز راشد کے گھر پر جب عمران اور ارسلان بھی موجود ہوتے ہیں اس جرائم پیشہ گروہ کے کچھ افراد حملہ آور ہوتے ہیں اور ان کا دونوں بھائیوں سے مقابلہ ہوتا ہے۔

معلوم یہ ہوتا ہے کہ راشد کے گھر حملہ کرنے والوں کا تعلق ایک ایرانی علی اکبر مشہدی سے ہے جو ایک بین الاقوامی گینگ کا ڈان ہے۔ پولیس کی آمد ہوتی ہے اور وہ ان مجرموں کے ساتھ عمران اور ارسلان کو بھی پولیس اسٹیشن لے جانا چاہتی ہے۔ ان کے درمیان منہ ماری ہوتی ہے اور راشد کے ایک اعلیٰ پولیس افسر سے رابطے کے باعث پولیس انہیں تھانے میں بیان ریکارڈ کرانے کا کہہ کر چلی جاتی ہے۔ دوسرے دن راشد کا مرڈر ہو جاتا ہے اور پھر مشہدی کے آدمی عمران اور ارسلان کی بہن شائستہ کو گھر سے اغوا کر کے لے جاتے ہیں۔ دوسری طرف پولیس عمران کو تھانے لے جا کر شدید تشدد کا نشانہ بناتی ہے۔

تھانے میں عمران پر شدید تشدد کا سلسلہ جاری ہوتا ہے کہ ارسلان اپنے ساتھیوں کے ساتھ اسے وہاں چھڑانے آ جاتا ہے اور آزاد کرانے کسی نامعلوم مقام پر لے جاتا ہے۔ یہاں عمران کو ارسلان بتاتا ہے کہ ان کی بہن شائستہ کو مشہدی نے کراچی سے باہر کہیں قتل کر دیا ہے۔ عمران جب گھر پہنچتا ہے تو اُس کے گھر والے خصوصاً چھوٹا بھائی عدنان اس کی حالت پر سخت پریشان ہو جاتا ہے۔ اسی دوران پولیس عمران کے گھر پر ریز کرتی ہے اور اُس کے گھر سے ہیروئن برآمد کرتی ہے۔ عمران کی ماں کی اس صورت حال میں طبیعت بگڑتی ہے اور اُن کی موت واقع ہو جاتی ہے۔

ستم یہی نہیں ہوا کہ عمران کی والدہ کا انتقال ہوا اُس کے والد بھی اس غم کے باعث زندگی چھوڑ کر موت کے مہمان ہو گئے تھے۔ عمران اور ارسلان غم سے بڑھ چکے تھے جبکہ ان کے چھوٹے بھائی عدنان پر تو سکتہ ساری ہو گیا تھا۔ ماں باپ سے محرومی کے بعد اُن کی دہشت گردوں اور پولیس سے جنگ جاری ہوتی ہے کہ انہیں پتہ لگتا ہے عدالت میں اُن کا کیس لڑنے والا بیرسٹر بھی پولیس کے ساتھ مل گیا ہے۔ ارسلان بیرسٹر بخاری کو اغوا کر کے لے آتا ہے اور پھر ایک مقام سے اس کی لاش ملتی ہے۔ ایسے میں اُن کے پاس ان کی اغوا شدہ بہن شائستہ کا فون آتا ہے اور پھر انہیں اطلاع ملتی ہے کہ شائستہ نے خودکشی کر لی ہے۔ عمران اور ارسلان اپنی بہن کے اغوا کار مشہدی سے اپنی بہن شائستہ کی ڈیڈ باڈی کا مطالبہ کرتے ہیں۔

راستے میں تیمور اور عمران شیر خان پر قابو پالیتے ہیں یہاں تک کہ وہ باہر خان کے پاس پہنچتے ہیں اور وہاں تیمور اچانک ریوالت نکال کر باہر خان کی کنپٹی پر رکھ دیتا ہے۔ باہر خان سکتے کی کیفیت میں تیمور کو دیکھنے لگتا ہے۔

فائلوں کے حصول کے بعد عمران اور تیمور گھر آتے ہیں تو اُن کے گھر پر بم سے حملہ ہو چکا تھا۔ اس حملے میں ان کا بھائی ارسلان بھی کام آ جاتا ہے اُس کا کوئی پتا نہیں ملتا۔ یہ سب کچھ مشہدی نے کرایا تھا۔ جوابی وار کے طور پر عمران اور تیمور مشہدی کے ایک قریبی ساتھی جان محمد کی دو بیٹیوں کو اغوا کر کے اسے اطلاع دیتے ہیں کہ وہ اُن کی بہن کے بارے میں بتائے ورنہ اُس کی بیٹیوں کا خاتمہ ہو جائے گا۔

جان محمد کی بیٹیاں ند اور حرا عمران کو بھائی کہہ کر مخاطب کرتی ہیں تو وہ بھی جذباتی ہو کر انہیں بہن کا درجہ دے کر اُن کے گھر چھوڑ کر آنے کا وعدہ کرتا ہے۔ اسی دوران میں عمران کے بھائی عدنان کی آمد ہوتی ہے جسے وہ مردہ تصور کر چکا تھا۔ آگے چل کر عمران تیمور اور نادیا اپنے دشمن باہر خان کو اغوا کرتے ہیں اور عمران اُسے معذور کر دینے کی دھمکی دیتے ہوئے معلومات حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔

دوسری طرف مشہدی تھا۔ نادیا عمران کو بتاتی ہے اُسے علم ہو گیا ہے کہ میں آپ کے ساتھ کام کر رہی ہوں۔ مشہدی کا دوبارہ فون آتا ہے اور وہ نادیا کو جواب آفر کرتا ہے۔ نادیا انکار کر دیتی ہے۔ جان محمد کا فون آتا ہے اور وہ عمران کو بتاتا ہے کہ وہ اب مشہدی کے ساتھ نہیں ہے۔ نادیا اور عمران ایک دوسرے کے قریب آ جاتے ہیں۔ تیمور ہاشم خان کو گولی مار دیتا ہے۔ عدنان کی امریکہ روانگی کے انتظامات مکمل ہو جاتے ہیں مگر روانگی کے وقت اُسے روک لیا جاتا ہے کہ اُس کے پاس آتش گیر مادہ ہے۔ یہ اطلاع غلط ہوتی ہے لیکن عدنان کی فلاح میں ہو جاتی ہے۔ تیمور عمران کو



بتاتا ہے کہ یہ غنی بلوچ کی سازش تھی۔ مگر آتے ہیں تو تادیہ عمران کو اپنی کہانی سناتی ہے۔ دوسرے دن تیمور عمران کو لے کر لی مارکیٹ میں موجود مشہور بادشاہ ہوٹل جاتا ہے اور کاؤنٹر پر جا کر غلام رسول کے بارے میں معلوم کرتا ہے۔

غلام رسول پھلی والے سے ملاقات کے دوران وہ انہیں کسی خطرے سے خبردار کرتے ہوئے اپنے خاص آدمی کے ذریعے روانہ کرتا ہے جہاں ان کا ایک گینگ سے جھگڑا ہوتا ہے۔ وہ لوگ انہیں مار بھگاتے ہیں راستے میں ان کا ایک جلی پولیس انسپکٹر سے رابطہ ہوتا ہے اور پھر کہانی میں ایک نئے کردار غنی بلوچ کا اضافہ ہوتا ہے۔

عمران اپنی بہن کی تلاش میں اس کی دوست وردہ کے گھر پہنچتا ہے جہاں وردہ کے والد بتاتے ہیں کہ رات میں کسی لڑکی کا فون آیا تھا، فون نمبری انکوائری پر معلوم ہوتا ہے وہ نمبر اسٹیشن کے قریب کسی پبی سی اڈا کا ہے۔ عمران اور تادیہ کینٹ اسٹیشن پہنچتے ہیں جہاں تادیہ کو اغوا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ عمران ان اغوا کاروں کو پکڑ کر پوچھ گچھ کرتا ہے۔

عمران اور تیمور شائستہ کو تلاش کرتے کرتے حاکم خان کے اڈے پر پہنچ جاتے ہیں مگر شائستہ حاکم خان کے غنڈوں کو زخمی کر کے پہلے ہی فرار ہو جاتی ہے۔ تیمور حاکم خان کو ہلاک کر دیتا ہے۔ وہ دونوں حاکم خان کے سیف سے ضروری کاغذات لے کر وہاں سے نکل جاتے ہیں۔ مشہدی فون کر کے ان کاغذات میں سے ایک ریڈ فائل کا تقاضہ کرتا ہے مگر عمران اسے قائل دینے سے انکار کر دیتا ہے۔

ٹیلی فون پر مشہدی اور عمران کی تلخ کلامی ہوتی ہے۔ مشہدی اسے دھمکیاں دیتا ہے اور ملٹری انٹیلی جنس کو اس کے پیچھے لگا دیتا ہے۔ وہ اس کے آفس میں کچھ ممنوعہ فائلیں اور دوسرا میٹر رکھوا دیتا ہے لیکن ہاشم اور تیمور کی بروقت مداخلت سے عمران بچ جاتا ہے اور ملٹری انٹیلی جنس والے ناکام لوٹ جاتے ہیں۔ ہاشم شے میں آفس کے جی ایم سمیت کئی افراد کو اغوا لیتا ہے۔ وہ آفس کے ایک بیون کو پکڑ لیتے ہیں۔ وہ سب کچھ اگل دیتا ہے۔ ہاشم اسے دیرانے میں لے جا کر ہلاک کر دیتا ہے۔ اسی دوران میں عمران کا ایک دشمن غنی بلوچ عمران سے آلتا ہے۔ بلوچ عمران کو بتاتا ہے کہ اس نے مشہدی کا جہاز غرق کرنے کی تیاری کر لی ہے۔ وہ لوگ جہاز میں ریسیوٹ بم لگا کر آتے ہیں تو جہاز کے کسی آدمی کی نظر بلوچ پر پڑ جاتی ہے۔ وہ تیزی سے اس تک کھاڑی میں گھس جاتا ہے جہاں ان کی لالچ لنگر انداز تھی۔ اچانک کھاڑی کے سامنے تیز روشنی ہو جاتی ہے اور کوئی چیخ کر کہتا ہے کہ اندر جو کوئی بھی ہے باہر آ جائے ورنہ یہ کھاڑی اس کی قبر بن جائے گی۔

(اب آپ آگے ملاحظہ کیجیے۔)

وہ درست کہہ رہا تھا وہ کھاڑی واقعی ہماری قبر بن سکتی تھی۔

”چلو بلوچ.....!“ میں نے ہارے ہوئے لہجے میں سرگوشی کی۔ ”اب ہتھیار ڈالنے کے سوا کوئی چارہ بھی تو نہیں ہے۔“

”دش.....!“ بلوچ نے بہت ہی دھیمی آواز میں سرگوشی کی حالانکہ وہاں لہروں کا شور اٹا تھا کہ اگر وہ بلند آواز سے بھی بولتا تو اس کی آواز اس کھاڑی سے باہر نہیں جاتی۔ کوست گارڈز والوں کو بھی ہائی پاور میگا فون استعمال کرنا پڑ رہا تھا ورنہ اس کے بغیر ان کے پیچھے کی آواز بھی ہم تک نہیں آتی۔

”کیا کرتا ہے ولجہ؟“ بلوچ نے سرگوشی میں کہا۔ ”وہ خالی پیلی دھمکی دے رہا ہے اسے خود بھی یقین نہیں ہے کہ اس کھاڑی میں کوئی ہے بھی یا نہیں؟“

”فرض کرو اس نے اپنی اسی بے یقینی میں کھاڑی کی طرف کوئی بم اچھال دیا..... تو.....؟“

”یہ تمہارا فرسٹ چانس ہے ولجہ!“ بلوچ ہنس کر بولا۔ ”ہم لوگ کھاڑی کے بہت اندر ہیں۔ چھوٹا موٹا بم تو ان پہاڑوں پہ اثر بھی نہیں کرے گا۔ پاور فل بم کے لیے اسے پاکستان نیوی اور وزارت خارجہ سے پرمیشن لینا پڑے گا۔ ہم لوگ کھلے سمندر میں ہے اور کراچی سے سو ڈیڑھ سو ناٹ کے فاصلے پر ہیں۔ اگر ان لوگ نے بم مارا تو اس سے انڈیا، ایران اور کسی بھی دوسرے ملک کا شب بھی زد میں آ سکتا ہے۔ اس کی جواب داری کون کرے گا؟ بس تم آرام سے بیٹھو ولجہ! وہ لوگ ابھی دو چار منٹ تک بکواس کرنے کے بعد ادھر سے نکل جائے۔ آپ فکر ہی مت کرو ولجہ! ہمارے ساتھ ایسا پہلے بھی کئی دفعہ ہو چکا ہے۔ کچھ بھی نہیں ہوگا۔ آپ بالکل بھی فکر مت کرو۔ ان لوگ میں سے کسی مانی کے لال کا ہمت نہیں ہے کہ بوٹ لے کر اس کھاڑی میں گھسنے کی ہمت کر سکے۔“

اس کا کہا ہوا ایک ایک لفظ درست تھا۔ کوست گارڈز کا آفسر تھوڑی دیر تک میگا فون پر شور مچاتا رہا پھر باہر ایک دم

اندھیرا چھا گیا۔
”واپس چل کر دوسری کھاڑیوں میں تلاش کرو۔“ کوست گارڈز کے اسی افسر کی آواز سنائی دی۔ ”اس کھاڑی میں کسی لالچ کا گھنٹا ہی ناممکن ہے۔“ وہ احمق یہ باتیں کرتے ہوئے بھول گیا تھا کہ اس کا میگا فون اس وقت بھی آن ہے۔ وہ عام انداز میں باتیں کر رہا تھا اس لیے مجھے اس کی آواز لہروں کے شور میں بہت دھیمی سنائی دے رہی تھی۔
چند منٹ بعد ان کی بوٹ کا طاقت ور انجن غرایا اور انجن کی آواز رفتہ رفتہ بم سے دور ہوتی گئی پھر بالکل وہ معدوم ہو گئی۔

ہم نے اس کے بعد آدھا گھنٹا مزید انتظار کیا۔ ہاشم کی حرکات سے لگتا تھا کہ وہ پوری تیاری کے ساتھ آیا تھا۔ اس نے بوٹ میں پینے کے پانی، خشک دسر، مہر خوراک وغیرہ کا اچھا خاصا ذخیرہ کر لیا تھا۔

”اب یہاں سے نکلنے کا بھی کوئی راستہ ہے؟“ میں نے پوچھا۔
”ٹینشن مت لو ولجہ!“ بلوچ نے کہا۔ ”آپ یہ گرما گرم کافی پیو اور آرام سے بیٹھو۔ ابھی تھوڑی دیر بعد میں باہر کی خبر لے کر آؤں گا۔ اس وقت وہ لوگ اپنے آفس میں جا کر سو چکے ہوں گے۔“

اُسی وقت ہاشم نے مجھے گرما گرم کافی کا کپ پکڑا دیا۔
”اگر بھوک محسوس ہو رہی ہے تو کسٹ سینڈ وچز اور فز فراٹی بھی موجود ہے۔“ ہاشم نے کہا۔ ”میں کم سے کم پانچ دن کی خوراک کا بندوبست کر کے چلا تھا۔ کھلے سمندر میں ایک بار نکلنے کے بعد ہم جیسے لوگوں کے لیے واپسی کا وقت مقرر نہیں ہوتا۔“

”ولجہ.....! ابھی ہم ذرا باہر جا کر دیکھتا ہوں کہ میدان صاف ہے یا ان لوگ کا کوئی لالچ اب بھی موجود ہے؟“
میں نے اپنی ریڈیو ڈائل والی ریسٹ وایج پر نظر ڈالی۔ کوست گارڈز والوں کی روانگی کے بعد ہمیں اس کھاڑی میں چالیس منٹ سے زیادہ گزر چکے تھے۔

”ابھی کچھ دیر اور انتظار کر لو بلوچ!“ ہاشم نے کہا۔ ”کوست گارڈز کے دو تین افسر انتہائی سر پھرے اور جنونی ہیں۔ اگر ان میں سے کوئی ڈیوٹی پر ہوا تو وہ بھی اپنی بوٹ کہیں چھپائے ہوئے ہماری گھات میں ہوگا حالانکہ اس کا امکان نہ ہونے کے برابر ہے لیکن احتیاط کرنے میں ہرج ہی کیا ہے؟“

”تم بھی ان کاموں کا پرانا کھلاڑی لگتا ہے ولجہ!“ بلوچ نے ہنس کر ہاشم سے کہا۔
”تم لوگ تو ہوش سنبھالتے ہی سمندر کا رخ کرتے ہو۔“ ہاشم نے کہا۔ ”میں تم لوگوں کی طرح ماہر تو نہیں ہوں لیکن کراچی سے گلف اور انڈیا تک سمندر کے چپے چپے سے واقف ہوں۔“

”ولجہ.....! تم نے تو ہم لوگ کو کھچلی بنا دیا جو سمندر میں پیدا ہوتا ہے۔“ بلوچ ہنس کر بولا۔
”کھچلی بھی شارک!“ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔

”شکر ہے عمران ولجہ! تمہارا ٹینشن تو ختم ہوا۔“ پھر وہ اپنے ایک ساتھی سے بولا۔ ”اڑے عمران ولجہ کو ایک اور اچھا سا گرما گرم کافی دو۔“

”اُنی کافی مت پلاؤ بلوچ کہ میرا بلڈ پریشر ہائی ہو جائے۔ ویسے اب مجھے کوئی ٹینشن نہیں ہے۔“
بلوچ نے پھر اپنی ریسٹ وایج پر نظر ڈالی اور بولا۔ ”اب میں جاتا ہوں۔“ اس نے غوطہ خوری کا لباس تو پہلے ہی پہن لیا تھا، چہرے پر مخصوص ہیلمٹ لگایا اور پانی میں اتر گیا۔

اس کے لیے میرے دل سے دعا تھی کہ اللہ اس کی حفاظت فرمائے۔ ہم لوگ کوئی غیر قانونی کام تو کر نہیں رہے تھے اپنے ملک کے اندر پھیلے ہوئے غداروں کے خلاف صف آرا تھے۔
کھاڑی میں پانی بہت کم تھا اس لیے بلوچ بہت آسانی سے تیرتا ہوا باہر نکل گیا۔

اس کے جانے سے چھپ چھپ کی مخصوص آواز آئی تھی پھر سناٹا چھا گیا۔ اس سناٹے میں صرف بھری ہوئی لہروں کا شور تھا۔

”کیا سوچ رہے ہو عمران؟“ اس سناٹے کو ہاشم نے توڑا۔
 ”میں سوچ رہا ہوں کہ اس علاقے میں تو شارک مچھلیاں بھی پائی جاتی ہیں۔“
 ”تو پھر؟“ ہاشم نے پوچھا۔
 ”پھر یہ کہ بلوچ.....“

”اس کی فکر مت کرو۔“ ہاشم نے ہنس کر کہا۔ ”بلوچ بچپن سے سمندر کی پھری ہوئی لہروں اور اس میں پائی جانے والی ہر قسم کی مچھلیوں سے لڑ رہا ہے۔ تمہیں اس سلسلے میں پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔“
 ”پریشانی تو ہوتی ہی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”کیا تم فکر مند نہیں ہو؟“
 پھر میں اور ہاشم ملکی سیاست سے لے کر بین الاقوامی سیاست پر بحث کرتے رہے۔

بات آخر بھارت پہ آ کر ٹھہر گئی۔ ہاشم نے کہا۔ ”ہمارے ملک میں بھارتی ایجنسیوں کی بھرمار ہے۔ اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ ان کا رنگ و روپ ناک نقشہ اور رہن بہن سبھی کچھ ہماری طرح ہے اسی لیے وہ آسانی سے پہچانے نہیں جاتے۔“

”اس کے علاوہ ایک بات اور بھی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ہمارے ملک میں ہکا بکا افراد کی تعداد کچھ زیادہ ہی ہے۔ ہماری ایجنسیوں کے علاوہ غیر ملکی طاقتوں کے ہاتھوں کے ہوئے اپنے لوگ زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔“
 ہاشم سے گفتگو کے دوران میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ میں نے جب رستہ واضح پر نظر ڈالی تو پریشان ہو گیا۔

بلوچ کو گئے ہوئے دو گھنٹے سے زیادہ ہو گئے تھے۔ مجھے یہ تشویش ہونے لگی کہ کہیں بلوچ کسی مصیبت میں گرفتار تو نہیں ہو گیا یا کہیں کو سٹ گارڈز والوں کے ہتھے تو نہیں چڑھ گیا؟
 میں نے ان خدشات کا اظہار ہاشم سے کیا تو وہ بھی فکر مند ہو گیا۔ اتنی دیر میں تو بلوچ جیسا ماہر پیراک دودھ ارد گرد کا جائزہ لے کر لوٹ سکتا تھا۔

ہاشم اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ”میں جا کر دیکھتا ہوں کہ.....“
 اس کا جملہ ادھورا رہ گیا کیوں کہ اسی وقت کھاڑی کے سرے پر چھپ چھپ کی مخصوص آواز آئی پھر کوئی سایہ سا اندر آ گیا۔

”کون ہے؟“ ہاشم نے گرج کر پوچھا۔
 ”اڑے ہم ہے ولجہ.....!“ جواب میں بلوچ نے ہانپتے ہوئے کہا۔ ”کہیں دشمن سمجھ کر ہم پہ فائر مت کر دینا۔“
 اس کی آواز سن کر میری جان میں جان آئی تو تنے ہوئے اعصاب ڈھیلے پڑ گئے۔
 وہ پھلی کی طرح تیرتا ہوا بوٹ تک آیا پھر ہاشم کا سہارا لے کر بوٹ پہ چڑھ گیا۔ اس کے لباس سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے اور وہ ٹھکن سے ٹھکا ہوا تھا۔

”تم پہلے لباس تبدیل کر لو پھر بات کریں گے۔“ میں نے کہا۔
 بلوچ لباس تبدیل کرنے چلا گیا۔ اس دوران میں ہاشم نے اس کے لیے کافی تیار کر لی۔
 کافی پینے کے بعد وہ کچھ بحال ہوا۔
 ”تمہیں اتنی دیر کیوں ہو گئی بلوچ؟“ ہاشم نے پوچھا۔

”دیر اس لیے ہوا کہ وہ کو سٹ گارڈز والا تو چلا گیا تھا لیکن نیوی کا ایک لالچ گشت پر تھا۔ ان کا لالچ دیکھ کر ہم بھی ایک کھاڑی میں چھپ گیا۔ نیوی والا ہمیشہ لمبا راؤنڈ لیتا ہے اور ان کی دو تین لالچیں ہوتی ہیں۔ کو سٹ گارڈز والوں نے شاید انہیں بتا دیا تھا کہ کوئی لالچ کھلے سمندر میں کہیں غائب ہو گیا ہے۔ ایک دفعہ تو ان لوگ کا لالچ بالکل ہمارے نزدیک سے گزرا اتنا نزدیک سے کہ اگر وہ لوگ لالچ کا اسٹیزنگ ٹھوڑا سا گھما دیتا تو ہم ان کے بالکل سامنے آ جاتا۔“ پھر وہ ہاشم سے بولا۔ ”ولجہ.....!“ ابھی دیر مت کرؤ وہ لوگ بھی اب جا چکا ہے اور مشہدی کا جہاز بھی تارک ہے۔“

اس کھاڑی کی بناوٹ ایسی تھی کہ اس میں داخل ہونے کی نسبت نکلنا بہت مشکل تھا۔
 ”ولجہ.....!“ اگر کوئی مشکل ہے تو بوٹ ہم باہر نکال لے؟“ بلوچ نے کہا۔
 ہاشم نے ہلکا سا ایک قہقہہ لگایا اور بولا۔ ”میں جانتا ہوں کہ تم بوٹ چلانے میں ماہر ہو لیکن اس وقت تم تھکے ہوئے ہو آرام کرو اور مجھے اپنا کام کرنے دو۔“

بلوچ کے اشارے پر اس کے آدمیوں نے بوٹ کا انجن اشارت کر دیا۔ اس کھاڑی میں بوٹ کے انجن کی آواز گونج رہی تھی کہ مجھے خدشہ تھا کہ یہ آواز میلوں تک جاری ہوگی۔
 ہم جس کیمین میں بیٹھے تھے وہاں اب ایک مدہم روشنی کا بلب بھی روشن تھا۔
 بلوچ نے شاید میرے خدشات کو چہرے سے بھانپ لیا۔ وہ ہنس کر بولا۔ ”فکر مت کرو ولجہ.....!“ انجن کا آواز ادھر ہی گونج رہا ہے۔ باہر تو سمندر کا شور ہے۔“

ہاشم نے بہت مہارت سے بوٹ اس تنگ کھاڑی سے باہر کھلے سمندر میں نکال لی۔ باہر آنے سے قبل مجھے ایسا لگ رہا تھا جیسے بوٹ کسی بھی وقت کسی ابھری ہوئی چٹان سے ٹکرا جائے گی۔
 کھلے سمندر میں لہروں کے شور کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔ دور بہت دور بندرگاہ کی روشنیاں تاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔

ہاشم نے بوٹ کا رخ مخالف سمت میں موڑا تو میں نے چونک کر پوچھا۔ ”ادھر کہاں جا رہے ہو ہاشم؟“
 بلوچ ہنس کر بولا۔ ”ولجہ.....!“ ابھی آپ سمندر میں گیا ہو۔ ہاشم ولجہ لمبا چکر لے کر جی کی طرف جائے گا۔ وہ بھی اس طرف اندھیرے میں جہاں ہوڑے کھڑے ہیں۔ ادھر اندھیرا ہوتا ہے۔“

ہاشم نے ایک لمبا چکر لیا اور جی کے نزدیک پہنچ کر بوٹ کا انجن بند کر دیا۔
 بلوچ اور اس کے ساتھی فوراً پانی میں کود پڑے اور بوٹ کو جی کی طرف دھکیلنے لگے۔ پانی وہاں کچھ گہرا تھا اور لہریں بھی کم تھیں ورنہ بوٹ کو یوں دھکیلنا تین آدمیوں کی طاقت بھی ناکافی ہوتی ہے۔
 ہم لوگ جی پر پہنچ گئے۔ وہاں بالکل تاریکی تھی پھر بلوچ ٹھٹھنے والے انداز میں ایک طرف روانہ ہو گیا۔ سمندر کی ہوا اتنی تیز تھی کہ دس منٹ کے اندر اندر ان لوگوں کے کپڑے اس حد تک سوکھ گئے کہ وہ بغیر کسی پریشانی کے چل سکتے تھے۔

ہمیں کاریم بوٹ اب بھی ہاشم کے پاس تھا۔
 ہم ایک لمبا چکر کاٹ کر جی کے پر رونق علاقے میں آئے۔ وہاں رات کے اس پہر بھی کچھ جہازوں سے سامان اتارا جا رہا تھا اور کچھ پر لوڈ کیا جا رہا تھا۔
 ہم ٹھٹھتے ہوئے مزید آگے نکلے اور ایک مناسب جگہ پہنچ کر رک گئے۔

ایم دی مونا راک وہاں سے صاف نظر آ رہا تھا۔ مجھے یہ دیکھ کر اطمینان ہوا کہ اس کے نزدیک کوئی دوسرا جہاز نہیں تھا۔
 مجھے فضول میں شبہ تھا کہ بلوچ نے کسی اور جہاز میں بم فٹ کر دیے ہوں گے۔ مشہدی نے شاید جان بوجھ کر ایسی جگہ جہاز لنگر انداز کیا تھا کہ اس کی خفیہ سرگرمیوں پر کسی کی نظر نہ پڑے۔

یہ ایک طرح سے اچھا ہی تھا۔ اب دھماکے سے ارد گرد کے پہاڑوں کو بہت کم نقصان پہنچتا۔
 میرے اشارے پر ہاشم نے کپڑے میں لپٹا ہوا ریموٹ کنٹرول نکالا اور اس کا سرخ بٹن دبا دیا۔
 کان پھاڑ دینے والا دھماکہ ہوا..... اس کے ساتھ ہی ایم دی مونا راک کے پر نچے اڑ گئے۔
 لوگ شور مچاتے ہوئے ادھر سے ادھر بھاگنے لگے۔

ہاشم نے ریموٹ کنٹرول کو اچھی طرح کپڑے سے صاف کیا تاکہ اس پہ انگلیوں کے نشان نہ رہ جائیں پھر اس نے ریموٹ بھی سمندر میں پھینک دیا۔
 ہم لوگوں کو یہاں سے علیحدہ علیحدہ گھر کی طرف جانا تھا۔

بلوچ ٹھہلتا ہوا بندرگاہ کے بیرونی دروازے تک پہنچا وہاں اس کے لوگ موجود تھے۔ ان کی وجہ سے ہم بغیر کسی پوچھ گچھ کے باہر نکل آئے۔

وہاں سے بلوچ کو الگ جانا تھا۔ ہاشم کو دوسری طرف اور مجھے سیدھا گھر جانا تھا۔ ہم ایک دوسرے سے ایک گھنٹے بعد گھر پہنچنے کا وعدہ کر کے روانہ ہو گئے۔ یہ محض احتیاط تھی کہ اگر کوئی ہمارا تعاقب کرنا چاہے تو مشکل میں پڑ جائے کہ میں کس گاڑی کے پیچھے جاؤں؟

میں اپنی لینڈ کروزر میں روانہ ہو گیا۔ بولٹن مارکیٹ تک پہنچ کر مجھے اندازہ ہو گیا کہ کوئی گاڑی مسلسل میرے عقب میں ہے۔ میں نے دانستہ رفتار کم کر دی۔ پیچھے والی گاڑی نے بھی رفتار کم کر دی۔

ایم اے جناح روڈ پر اسٹریٹ لائٹس کی خاصی معقول روشنی تھی۔ میں نے بیک ویو مرر میں پیچھے والی گاڑی کا جائزہ لیا۔ وہ اسی بیاسی کے ماڈل کی کرو لائی۔ اس میں خوفناک چہرے والا ایک صحت مند شخص سوار تھا۔

میں نے رفتار اچانک تیز کر دی۔ اس نے بھی رفتار بڑھا دی۔ میں اگر چاہتا تو اسے ڈاج دے کر نکل سکتا تھا لیکن مجھے تشویش تھی کہ یہ کون ہے اور کس کا آدمی ہے جو میرے تعاقب میں لگا ہوا ہے؟ کہیں اسے اس بات کا علم تو نہیں ہو گیا کہ ایم دی موٹارک کو ہم نے اڑایا ہے؟

میں ڈیٹس کی طرف جانے کی بجائے سیدھا چلا گیا۔ شاہراہ فیصل سے گزرتا ہوا میں میٹر ہالٹ سے اُس راستے کی طرف مڑ گیا جو میٹر کینٹ کی طرف جاتا ہے۔ میں جانتا تھا کہ وہاں اس وقت زیادہ ٹریفک نہیں ہوگا۔

ماڈل کالونی کے قبرستان سے کچھ آگے میں نے لینڈ کروزر سڑک کے کنارے روک دی اور یوں ہی بونٹ کھول کر کھڑا ہو گیا۔ تعاقب کرنے والا بھی میرے نزدیک سے گزرا اور کچھ فاصلے پر جا کر ٹھہر گیا۔ وہ یا تو بالکل اناڑی تھا یا پھر اتنا جی دار تھا کہ اسے یہ بھی پروا نہیں تھی کہ وہ میری نظروں میں آ جائے گا۔

میں نے بونٹ بند کیا، چند لمحوں تک ارد گرد کا جائزہ لیا پھر اپنا ریو لوئر نکال کر دائیں ہاتھ میں پکڑا اور گاڑی آگے بڑھا دی۔

میں جانتا تھا کہ جب تک میں اس کی گاڑی سے آگے نہیں نکلوں گا وہ گاڑی کو حرکت میں نہیں لائے گا۔ میں نے اس کی گاڑی کے سامنے اچانک بڑیک لگائے اور انتہائی پھرتی سے اتر کے اسے گن پوائنٹ پر لے لیا۔

”زیادہ ہوشیاری مت دکھانا خاموشی سے اتر اور میرے ساتھ چلو۔“

”لے لیکن کیوں؟“ وہ ہکلا یا۔

”اب بکواس کی تو میں فائر کروں گا۔“ میں نے سفاک لہجے میں کہا۔

وہ بہت مرے مرے قدموں سے میری گاڑی کی طرف بڑھا۔ میں نے عقبی سیٹ کا دروازہ کھول کر اسے بیٹھنے کا اشارہ کیا پھر وہ جوں ہی اندر بیٹھا میں نے اس کی کھوپڑی پر ریو لوئر کا دستہ رسید کر کے اسے ناک آؤٹ کر دیا۔ میں جانتا تھا کہ اب یہ آدھے گھنٹے سے پہلے ہوش میں نہیں آئے گا۔

میں انتہائی تیز رفتاری سے اپنے گھر پہنچا اور نعیم سے کہا۔ ”گاڑی میں ایک قیدی موجود ہے اسے اندر کمرے میں پہنچا دو۔“

اُسی وقت تیمور بھی آ گیا۔ میں نے اسے ساری صورت حال بتائی تو وہ بھی قیدی سے پوچھ گچھ کرنے میرے ساتھ چل دیا۔

وہ خاصا جاندار آدمی تھا اور خاصا ڈھیٹ تھا۔ دروازہ کھلا تو میں نے دیکھا کہ وہ فرش پر بیٹھا ہے۔ مجھے دیکھتے ہی وہ جھپٹ کر کھڑا ہو گیا اور گن نکال لی۔ وہ مجھ پر فائر کرنے ہی والا تھا کہ ایک جھٹکے سے لڑکھڑا کر پیچھے گر گیا۔ اس کے فائر کرنے سے پہلے ہی تیمور نے اپنا مخصوص خنجر پھینک کر اس کے سینے میں پست کر دیا تھا۔

”کون ہو تم۔۔۔ اور میرے پیچھے کیوں لگے ہوئے تھے؟“ میں نے ڈپٹ کر پوچھا۔

”میں مشہدی کا آدمی ہوں۔۔۔ میں نے۔۔۔ آپ کو۔۔۔ پورٹ۔۔۔ سے لپکتے دیکھا۔۔۔ تو آپ۔۔۔ کا تعاقب شروع۔۔۔ کر دیا۔۔۔ شاید۔۔۔ مجھے۔۔۔ آپ کا ٹھکانہ معلوم ہو سکے۔“

”تم مشہدی کے لیے کب سے کام کر رہے ہو اور کیا کام کرتے ہو؟“

”آپ۔۔۔ عمران۔۔۔ صاحب ہونا؟۔۔۔ میں جانتا ہوں کہ۔۔۔ میرے سینے پر ایک بوجھ ہے۔۔۔ وہ بوجھ۔۔۔ میں ہلکا کرنا۔۔۔ چاہتا ہوں۔۔۔ آپ۔۔۔ کے لیے خوشی۔۔۔ کی خبر۔۔۔ ہے کہ۔۔۔ آپ کا۔۔۔ بھائی۔۔۔ ارسلان۔۔۔ زندہ۔۔۔ ہے۔“

اگر اس وقت مجھے گیارہ سو واٹ کا کرنٹ بھی لگتا تو شاید میں اتنی بری طرح نہ اچھلتا۔

میں نے پھر قیدی سے پوچھا۔ ”تم۔۔۔ واقعی۔۔۔ سچ۔۔۔ کہہ رہے ہو؟“ میری آواز فرط جذبات سے لرز رہی تھی۔

”عمران صاحب! ایک مرتنا ہوا آدمی کبھی جھوٹ نہیں بول سکتا۔“ پھر اس کا سانس اکھڑ گیا اور وہ کھانتے ہوئے بولا۔

”میں۔۔۔ نے۔۔۔ آپ کے بھائی۔۔۔ کو۔۔۔ اپنی۔۔۔ ان گناہ۔۔۔ گار۔۔۔ آنکھوں سے۔۔۔ زندہ دیکھا۔۔۔ ہے۔۔۔ میں۔۔۔ نے۔۔۔ بہت گناہ کیے ہیں۔۔۔ عمران۔۔۔ صاحب! سوچا۔۔۔ مرتے۔۔۔ مرتے ایک۔۔۔ نیکی۔۔۔ ہی۔۔۔ کر لوں۔“ وہ گہرے گہرے سانس لینے لگا۔

تیمور کا پھینکا ہوا خنجر اس کے سینے میں کئی انچ تک پست ہو گیا تھا۔

”نہیں! میں تمہیں مرنے نہیں دوں گا۔“ پھر میں تیمور سے مخاطب ہوا۔ ”تیمور۔۔۔ اڈاکٹر ندیم کو بلاؤ۔“

”اب کوئی ڈاکٹر۔۔۔ کچھ بھی نہیں کر سکتا۔۔۔ میں جانتا ہوں کہ۔۔۔ میرے سینے۔۔۔ میں۔۔۔ پست ہونے والا خنجر زہر میں۔۔۔ بچھا۔۔۔ ہوا۔۔۔ ہے۔۔۔ اس قسم۔۔۔ کے۔۔۔ خنجر۔۔۔ ایسے ہی۔۔۔ ہوتے ہیں۔۔۔ پرانے۔۔۔ وقتوں۔۔۔ کی طرح۔۔۔ اس خنجر۔۔۔ کو بھی۔۔۔ انتہائی۔۔۔ مہلک۔۔۔ زہر۔۔۔ میں بچھایا گیا ہوگا۔“ اس کی سانس ایک مرتبہ پھر اکھڑ گئی۔ وہ تو اس جیسا مضبوط اور طاقت ور آدمی تھا جو اب تک زندہ تھا۔ اس کی جگہ کوئی عام آدمی ہوتا تو شاید اب تک مر گیا ہوتا۔

”اب ارسلان کہاں ہے؟“ تیمور نے پوچھا۔

”وہ۔۔۔ مشہدی۔۔۔ کی قید سے۔۔۔ فرار ہو۔۔۔ گیا تھا۔۔۔ پھر۔۔۔ میں نے۔۔۔ سنا کہ۔۔۔ وہ۔۔۔ ایران میں۔۔۔ ہے۔۔۔ مجھے۔۔۔ اس کے بارے میں زیادہ۔۔۔ معلومات۔۔۔ نہیں ہے۔۔۔ ہاں۔۔۔ شبو۔۔۔ جانتا ہے۔۔۔“

”کون شبو؟“ میں نے بے تابی سے پوچھا۔

”مشہد۔۔۔ مشہدی۔۔۔ کا۔۔۔“ اس کی سانس پھر اکھڑ گئی۔ وہ بہ مشکل تمام بولا۔ ”پانی۔۔۔“

تیمور نے فوراً پانی کا گلاس بھرا اور اسے سہارا دے کر گلاس اس کے ہونٹوں سے لگا دیا۔ اس نے پانی پینے کی کوشش کی لیکن اس کی گردن ایک طرف ڈھلک گئی اور پانی اس کے ہونٹوں سے بہہ کر تھوڑی سی طرف آ گیا۔ کچھ دایں بائیں بھر گیا۔

”ختم ہو گیا۔۔۔“ تیمور نے آہستگی سے اس کا سر دوبارہ زمین پر رکھتے ہوئے کہا۔

مجھے اب تک یقین نہیں آ رہا تھا کہ ارسلان زندہ ہے۔ وہ زندہ ہے تو اس نے مجھ سے یا تیمور سے رابطہ کیوں نہیں کیا؟ وہ مسخ شدہ لاش کس کی بھی جو میں نے اپنے گھر کے بلے میں دیکھی تھی؟ لاش کا چہرہ ناقابل شناخت تھا لیکن میں نے اسے ارسلان کی لاش کے طور پر شناخت کیا تھا۔

میں نے خود سے سوال کیا۔ ”کیا واقعی وہ لاش ارسلان کی تھی یا میرے حواس مغل ہو گئے تھے؟ میں نے کسی دوسرے کی لاش کو اس کی لاش سمجھ لیا تھا پھر مجھے اس کے مسخ شدہ چہرے میں بھی ارسلان کا چہرہ نظر آنے لگا۔“

”میں سوچ رہا ہوں کہ مرنے والے کی بات میں کس حد تک سچائی ہے؟“
 ”یقین تو مجھے بھی نہیں آ رہا ہے لیکن ایک مرتبہ آدی عالم نزع میں جھوٹ نہیں بول سکتا۔“
 ”لیکن تیمور! میں نے ارسلان کی ڈیڈ باڈی اپنی آنکھوں سے دیکھی تھی۔“ میں نے کہا۔
 ”اس کا چہرہ ناقابل شناخت تھا؟“ تیمور نے پوچھا۔
 ”اس کا چہرہ تو قابل شناخت نہیں تھا لیکن۔۔۔۔۔۔“

”بھیا! بعض اوقات انتہائی صدمے اور ڈپریشن کی حالت میں ہمارا دماغ ہمیں وہی دکھاتا ہے جس کا ہمیں خدشہ ہوتا ہے۔ دھماکے کے وقت آپ گھر میں بھی نہیں تھے۔ آپ کو صرف اندازہ ہے کہ وہ لاش ارسلان کی تھی۔“
 ”دوسرا سوال یہ ہے کہ اگر ارسلان زندہ ہے تو اس نے اب تک مجھ سے یا تم سے رابطہ کیوں نہیں کیا؟“
 ”اب یہ تو ارسلان ہی بتا سکے گا۔ ممکن ہے وہ رابطہ کرنے کی پوزیشن ہی میں نہ ہو۔“ پھر وہ چونک کر بولا۔ ”اس بات پر تو ہم بعد میں بھی غور کر لیں گے فی الحال تو یہ لاش ٹھکانے لگانا ہے۔“ پھر وہ ہنس کر بولا۔ ”کیسا عجیب اتفاق ہے جو تھیار میں نے بہت محنت سے اپنے دشمنوں کے لیے تیار کیا تھا آج آزمائش بھی ہو گئی۔ یہ تھیار تو بہت کام کا ہے۔“
 تیمور نے جھک کر اس کے سینے میں پیوست خنجر کا دستہ پکڑا اور خنجر کو اس کے سینے سے ہٹا لیا۔
 میرا خیال تھا کہ اس کے جسم سے خون کا فوارہ بلند ہوگا کیوں کہ اسے مرے ہوئے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی لیکن خلاف توقع اس کے جسم سے بہت کم خون نکلا جو اس کے کپڑوں میں جذب ہو گیا۔ دوسری بات میں نے یہ نوٹ کی کہ اس کا جسم آہستہ آہستہ نیلا پڑ رہا تھا جیسے اسے کسی زہریلے سانپ نے ڈس لیا ہو۔ گویا خنجر کا زہر اپنا کام دکھا رہا تھا۔
 تیمور نے پہلے گاڑی برآمدے کے ساتھ لگائی پھر ایک بڑے سے پلاسٹک میں لپیٹ کر گاڑی میں ڈال دیا۔ اس کی لاش لپیٹنے سے پہلے تیمور نے اس کی اچھی طرح تلاشی لی تھی۔ اس کی جیب سے مہنگے قسم کا ایک موبائل والٹ میں تقریباً بارہ ہزار روپے اور دو ہزار امریکی ڈالر تھے جیسا ایک خنجر جو اس کے سینے میں پیوست ہو گیا تھا اس کے علاوہ اس کی جیب سے اعشاریہ چار پانچ کاربو اور اس کی گولیاں بھی برآمد ہوئیں۔ اس کی پنڈلی پر دیسا ہی مزید ایک خنجر بندھا ہوا تھا جیسا اس کی جیب سے برآمد ہوا تھا۔

دونوں خنجروں کے لیے انتہائی بہترین چمڑے کے کور بنائے گئے تھے۔ تیمور نے دونوں خنجر ریلوور اس کا والٹ اور سیل فون وغیرہ نکال کر اسے پلاسٹک میں لپیٹا تھا۔
 ”اب تم اسے کہاں ٹھکانے لگاؤ گے؟“ میں نے پوچھا۔
 ”میرا تو کام ہی مرے ڈھونڈنا ہے عمران بھائی!“ تیمور ہنس کر بولا۔ ”اس سے پہلے بھی بہت سی لاشوں کو ٹھکانے لگا چکا ہوں ایک یہ بھی سہی۔“

”ٹھہرؤ تم اکیلے مت جاؤ، نعیم یا کسی آدی کو اپنے ساتھ لے لو۔“
 ”ہاں بھیا! میں کسی آدی کو تو اپنے ساتھ لے کر جاؤں گا۔“
 اس کے جانے کے بعد گھر میں ایک دم سناٹا چھا گیا۔

میرے احساسات عجیب تھے میرا بھائی میرا پیارا ارسلان زندہ تھا۔ مجھے اب تک اس خبر پر یقین نہیں آیا تھا لیکن دوسری طرف میں یہ بھی سوچ رہا تھا کہ آخر اس شخص کو مرتے ہوئے اتنا بڑا جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی؟
 اس وقت گھر میں نادیدہ بھی نہیں تھی نہ ہاشم تھا نہ میں یہ بات ان ہی لوگوں کے ساتھ شیئر کر لیتا۔ میری حالت اس وقت عجیب ہو رہی تھی۔

مرنے والے نے کہا تھا کہ ارسلان کے بارے میں تفصیلات کا علم شیو کو ہے۔ اب یہ شیو کون تھا اور کہاں ملتا اس معاملے میں مجھے کوئی علم نہیں تھا۔ میں تو یہ بھی نہیں جانتا تھا کہ شیو مشہدی کا آدی تھا یا اس کا مشہدی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

ابھی تک ہاشم اور نادیدہ کو تو یہ علم بھی نہیں تھا کہ ارسلان زندہ ہے۔

اس وقت دروازے پر گاڑی کے ہارن کی مخصوص آواز سنائی دی۔ وہ ہاشم کی گاڑی کا ہارن تھا۔
 چند منٹ بعد ہاشم تھکا تھکا سا اندر داخل ہوا اور ایک صوفے پر ڈھلے گیا۔
 ”کیا ہوا ہاشم؟“ میں نے پوچھا۔ ”خیریت تو ہے؟“

”ہاں خیریت ہے لیکن مجھے مشہدی کے اس آدی نے تھکا مارا۔ کم بخت کئی میل تو پیدل چلا رہا پھر اچانک ایک جگہ گاڑی میں سوار ہو گیا۔ شاید اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ میں اس کا پیچھا کر رہا ہوں۔ اس نے سیل فون پر اپنے کسی ساتھی کو گاڑی سمیت بلا لیا ہوگا۔ وہ جگہ بھی ایسی تھی کہ جہاں نہ کوئی ٹیکسی تھی نہ رکشا! وہ اطمینان سے گاڑی میں بیٹھا اور ہوا ہو گیا۔“

اس کے اندازہ پہ مجھے بے اختیار ہنسی آ گئی۔
 وہ برہان کر بولا۔ ”تم ہنس رہے ہو آئندہ اگر وہ مردود مجھے نظر آیا تو میں اسے گولی مار دوں گا۔“
 ”اسے گولی ہی تو نہیں مارتا ہے ہاشم زندہ پکڑنا ہے۔ اس سے ہمیں بہت کچھ پوچھنا ہے۔“
 وہ چونک کر بولا۔ ”ارے تیمور کہاں گیا؟ وہ قیدی جو تم لوگ اپنے ساتھ لائے تھے؟“

”اس نے تیمور پہ خنجر سے حملہ کرنے کی کوشش کی تھی۔ وہ خنجر پھینک کر مارنے میں ماہر تھا۔ بس تیمور کی زندگی ہی تھی کہ وہ بچ گیا اور خنجر اس سے دو آنچ کے فاصلے پر دروازے میں پیوست ہو گیا۔ تیمور کے ہاتھ سے سیل فون گر گیا تھا۔ وہ اسے اٹھانے کے لیے جھکا تو اس نے اچانک تیمور پر خنجر پھینک مارا۔ اگر تیمور اس وقت سیدھا کھڑا ہوتا تو وہ خنجر دروازے کی بجائے اس کے حلق یا سینے میں پیوست ہوتا۔“

”پھر؟“ ہاشم نے اضطراب سے پوچھا۔
 ”تم تیمور کی عادت تو جانتے ہی ہو وہ غصے میں بالکل پاگل ہو جاتا ہے۔ میں اسے روکتا ہی رہ گیا اس نے وہی خنجر قیدی پر کھینچ مارا۔ وہ اس کے سینے میں پیوست ہو گیا۔ جانتے ہو وہ خنجر کتنا خطرناک تھا بہ قول قیدی کے وہ زہر میں بجھا ہوا تھا۔ وہ شاید خنجر کے زخم سے توفیق جاتا لیکن زہر کے اثرات سے نہ بچ سکا۔“

”اب تیمور حسب معمول اس کی لاش کو ٹھکانے لگانے گیا ہوگا۔“
 ”لیکن ہاشم! اس قیدی نے مرتے مرتے ایک عجیب خبر سنائی اس نے بتایا کہ ارسلان زندہ ہے۔“ میں نے کہا۔
 ہاشم بری طرح اچھل پڑا۔ ”تم نے صاف صاف سنا تھا کہ اس نے یہ بھی کہا تھا؟“

”ہاں اس نے تو یہ بھی کہا تھا کہ مرتا ہوا انسان کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔“ میں نے زندگی بھر بے شمار گناہ کیے ہیں اب میں مرتے وقت ایک نیکی کمانا چاہتا ہوں لیکن یا ر مجھے اب تک اس خبر پہ یقین نہیں آیا؟“
 ”یقین نہ آنے کی وجہ؟“ ہاشم نے پوچھا۔ ”تم نے ارسلان کی ڈیڈ باڈی کو اچھی طرح شناخت کیا تھا؟ تمہیں یقین ہے کہ وہ ڈیڈ باڈی ارسلان ہی کی تھی؟“

”مجھے صرف اس کا مسخ شدہ جسم ملا تھا۔ میں نے کپڑوں اور اس کے ہاتھوں سے اندازہ لگایا تھا کہ وہ ارسلان ہے۔“

”تمہارا اندازہ غلط بھی تو ہو سکتا ہے۔ وہ مرنے والا غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ مرتا ہوا آدی کبھی جھوٹ نہیں بولتا۔ اس نے ارسلان کے بارے میں مزید کیا بتایا؟“

”اس نے کہا کہ اس سلسلے میں زیادہ معلومات شیو کے پاس ہیں۔ میں اس سے شیو کے بارے میں پوچھتا ہی رہا لیکن وہ کچھ بتانے سے پہلے ہی مر گیا۔“ پھر میں کچھ سوچ کر بولا۔ ”یا ر ہاشم! اگر ارسلان زندہ ہوتا تو وہ ہم لوگوں سے رابطہ نہ کرتا۔ اس نے آخر ہم سے رابطہ کیوں نہیں کیا؟“

”اس کا جواب تو ارسلان ہی دے سکتا ہے۔“ ہاشم نے کہا۔

”ہاں اس قیدی نے مرنے سے پہلے یہ ضرور بتایا تھا کہ اس نے سنا تھا کہ ارسلان ایران میں ہے۔“
 ”ایران میں ہے؟“ ہاشم منہ ہی میں بڑبڑایا۔ ”ایران تو مشہدی کا ملک ہے۔ وہاں اس کا سکھ چلتا ہے۔ میں نے تو

شاہ ہے کہ اس کی اجازت کے بغیر وہاں پرندہ پر بھی مار سکتا ہے۔“

”ایسا انقلاب سے پہلے شاہ کے وقت میں ہوتا ہوگا“ اب تو وہاں اس قسم کی غنڈہ گردی کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔“ میں نے کہا۔ ”یہ اور بات ہے کہ اسے ایران کے کسی طاقت ور سیاست دان کی پشت پناہی حاصل ہو۔ اچھے برے لوگ تو ہر جگہ ہوتے ہیں۔“

”وہ ایران میں ہے یا عراق میں؟“ ہاشم نے کہا۔ ”پہلے تو ہمیں اس شبوکا سراغ لگانا ہوگا یہ بھی کنفرم نہیں ہے کہ وہ مشہدی کا آدمی ہے یا اس کا تعلق کسی اور گینگ سے ہے؟“

”اس کے بارے میں تو بلوچ (غنی بلوچ) سے معلوم ہو جائے گا۔“ ہاشم نے کہا۔ ”اس کے علاوہ انڈورولڈ میں بہت سے رابطے میرے بھی ہیں میں اپنے طور پر بھی اس شبوکا کو ڈھونڈ نکالوں گا۔“

مین گیٹ کی طرف سے گاڑی کے ہارن کی آواز سنائی دی تو میں نے کہا۔ ”شاید تیمور آ گیا۔“

”اور یہ نادیا کہاں ہے؟“ ہاشم نے پوچھا۔

”وہ بھی دو گھنٹے پہلے اپنے کسی ذاتی کام سے نکلی تھی۔“

”اکیلی؟“ ہاشم نے چونک کر پوچھا۔

”ہاں اسے زیادہ دور نہیں جانا تھا اس لیے وہ اکیلی ہی چلی گئی۔“

”یار عمران! تم بھی کمال کرتے ہو!“ ہاشم نے کہا۔ ”مشہدی نے کھلی جنگ کا اعلان کر دیا ہے۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ نادیا ہمارے ساتھ کام کر رہی ہے اس کے باوجود.....“

”یہی تو حیرت انگیز بات ہے کہ مشہدی ابھی تک اس کے بارے میں نہیں جانتا۔“ میں نے ہنس کر کہا۔

”یہ تمہاری خوش فہمی ہے۔“ ہاشم نے کہا۔ ”یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ ایک لڑکی عبداللہ کے ساتھ کام کرتی ہو اور اسے مشہدی نہ جانتا ہو۔“

”میں تو یہ کہہ رہا ہوں کہ مشہدی کو اس بات کا علم نہیں ہے کہ نادیا اب ہمارے ساتھ ہے۔“ میں نے کہا۔

”ممکن ہے اسے علم نہ ہو لیکن پھر بھی احتیاط کا تقاضا تو یہی ہے کہ وہ یوں اکیلی کہیں نہ جائے۔“

اسی وقت تیمور لاؤنچ میں داخل ہوا اور صوفے پر ڈھیر ہو گیا۔ ”عمران بھائی! ذرا کلثوم سے کافی بنوائیں اور.....“

گاڑی کے ہارن کی آواز سن کر اس کا جملہ ادھور رہ گیا۔ ”یہ نادیا اب لوٹی ہے؟“ اس نے کہا۔ ”میں تو سمجھ رہا تھا کہ وہ اب تک آگئی ہوگی۔“ پھر وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ ”میں خود ہی کلثوم سے کافی اور سینڈ وچز کے لیے کہہ دیتا ہوں۔“

وہ کمرے سے باہر نکل رہا تھا کہ نادیا کمرے میں داخل ہوئی۔

”تم کہاں رہ گئی تھیں؟“ میں نے کہا۔ ”تم جانتی بھی ہو کہ مشہدی اب کھلی دشمنی پر اتر آیا ہے اس کے باوجود.....“

”میں تو فوراً ہی آجانی لیکن پہلے تو میری گاڑی پتھر ہوگئی۔ وہ تو خیر کوئی مسئلہ نہیں تھا۔ اس شہر میں ایسے بے شمار ہمدرد

مل جاتے ہیں جو کسی خاتون کو مشکل میں دیکھ کر اس کی مدد کرنے پر آمادہ ہو جاتے ہیں۔“ نادیا ہنس کر بولی۔ ”وہاں سے

گزرنے والے دونو جوانوں نے اپنی گاڑی روک کر میری گاڑی کا ٹائر تبدیل کیا اور اپنے بے داغ کپڑوں پر مٹی اور

گریس کے داغ لے کر خوشی خوشی وہاں سے چلے گئے۔ ان میں سے ایک نے تو میرا سیل نمبر بھی مانگا کہ اگر آپ مناسب سمجھیں تو دے دیں۔“

”پھر تم نے تو فوراً دے دیا ہوگا؟“ میں نے ہنس کر کہا۔

”میں نے کہا کہ میں نمبر دے تو دوں لیکن ہر بینڈ بہت شکی ہیں۔“ پھر وہ اپنی بات پر خود ہی شرم سے سرخ ہوگئی۔ ”اس

کے بعد چلتے چلتے اچانک گاڑی نے جھٹکے لیے اوپر بند ہوگئی۔ میں نے دو چار دفعہ سیلف لگایا لیکن جب اشارت نہیں ہوئی تو

میں نے فیول چیک کیا۔ گاڑی میں نہ سی این جی نہ پیٹرول پھر میں نے ایک اور گاڑی والے کو روک کر اس سے پیٹرول

مانگا۔ اس نے معذرت کی لیکن اتنا ضرور کیا کہ میری گاڑی کو نوکر کے ایک فیول پمپ تک لے گیا۔“

”بہر حال آئندہ احتیاط کرنا۔“ ہاشم نے کہا۔ ”کہیں بھی اکیلی مت جانا۔“ پھر وہ مسکرا کر بولا۔ ”تمہاری باتوں میں

الچکر ہم جنہیں ایک خوش خبری دینا تو بھول ہی گئے۔“

”کیسی خوش خبری؟“ نادیا نے کہا۔

اس وقت تیمور کمرے میں داخل ہوا۔ اس کے پیچھے پیچھے کلثوم بھی کافی اور دیگر لوازمات کی ٹرائی دھکیلتی ہوئی آ رہی

تھی۔ ”خوش خبری سنو گی تو پھر رک جاؤ گی۔“ تیمور نے کہا۔

”آپ لوگ اتنا سسپنس کیوں کری ایٹ کر رہے ہیں؟“ نادیا نے کہا۔ ”کیا آپ کی بہن کا سراغ مل گیا؟“ نادیا

نے مجھ سے پوچھا۔

”اس سے بڑی خوش خبری ہے نادیا! میں نے کہا۔“ ارسلان زندہ ہے۔“

نادیا کا منہ حیرت سے کھلا رہ گیا۔ ”کیا؟ کیا کہا آپ نے؟“ اس نے غیر یقینی سے پوچھا۔

”میں نے کہا تھا نا کہ تم پھر رک جاؤ گی؟“ ہاشم نے کہا۔ ”ہاں ارسلان زندہ ہے۔“

”یہ تو واقعی خوشی کی خبر ہے۔“ نادیا کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ میری اور تیمور کی آنکھیں بھی نم ہو گئیں۔ اس سے قبل

بھی میں رو رہا تھا لیکن آنسوؤں پر کسی کا بس کب چلتا ہے وہ تو بس بہنے لگتے ہیں موقع خوشی کا ہو یا غم کا!

”لیکن وہ ہے کہاں؟“ نادیا نے پوچھا۔

”اس واقعے کا سب سے اہم سوال یہی ہے کہ وہ کہاں ہے؟ ہمیں ایک ذریعے سے معلوم ہوا ہے کہ وہ ایران میں

ہے لیکن ابھی یہ کنفرم نہیں ہے۔ وہ اگر ایران میں بھی ہوگا تو کسی نہ کسی طرح ہم سے رابطہ ضرور کرنا۔ اب یہ ہی معلوم

کرنا ہے کہ وہ ہے کہاں؟“

”میں ٹیلی فون کر کے بلوچ کو یہیں بلا لیتا ہوں۔“

اچانک برآمدے میں قدموں کی آہٹ گونجی اور دوسرے ہی لمحے بلوچ ہمارے سامنے تھا۔

میں بے اختیار اس سے بغل گیر ہو گیا۔ وہ حیرانی سے بولا۔ ”ارے ولجہ! کیا بات ہے؟ ہم لوگ ابھی کل ہی تو ملے

تھے۔“

”کچھ ایسی ہی بات ہے بلوچ!“ میں نے کہا۔ ”تم ارسلان کو جانتے ہو؟“

”ارسلان!.....“ وہ ذہن پر زور دے کر بولا۔ ”آپ کا بھائی!..... ہاں ہم اس کو تو اچھی طرح جانتا ہوں۔ وہ تو ولجہ

بہت ہی جی دار اور نڈر آدمی تھا۔“

”وہ تھا نہیں بلکہ ہے۔“ میں نے کہا۔ ”وہ..... زندہ ہے۔“

”زندہ ہے؟“ بلوچ نے غیر یقینی سے پوچھا۔

جواب میں اسے میں نے پوری تفصیل بتادی کہ ہمیں اس کے زندہ ہونے کا علم کیسے ہوا؟

”یہ تو بہت خوشی کا بات ہے ولجہ! وہ جو کہتے ہیں نا کہ ایک اکیلا اور دو گیارہ! تو اب آپ گیارہ ہو گیا ہے۔“

”میں اکیلا کب تھا بلوچ؟ تم ہو تیمور ہے ہاشم ہے ہمارے دوسرے ساتھی ہیں نادیا ہے میں نے تو کہیں خود کو اکیلا

نہیں سمجھا۔“ میں نے کہا۔

”ولجہ.....! میری بات کا برا مت ماننا۔“ بلوچ نے کہا۔ ”ہم سب آپ کے ساتھ ہیں جہاں آپ کا پسینا گرے

وہاں اپنا خون گرا سکتے ہیں لیکن بھائی کی تو بات ہی اور ہوتی ہے اور ارسلان صاحب جیسا بھائی! وہ تو اکیلا ہم جیسے دس پر

بھاری ہے۔“ پھر وہ چونک کر بولا۔ ”لیکن وہ ایران میں کیا کر رہا ہے؟“

”پہلے تو تم یہ معلوم کرو کہ شبوکون ہے اور اس سے کہاں ملاقات ہو سکتی ہے؟“

”یہ تو میں آپ کو شام تک بتا دوں گا۔“ بلوچ نے کہا۔

نادیا نے ایک گپ کافی اور سینڈ وچز اسے بھی دے دیے۔

”ہم تو یہ بتانے آیا تھا ولجہ!“ اس نے جائے کاسب لیتے ہوئے کہا۔ ”کہ مشہدی نے امریکا کی کسی بدنام ایجنسی سے

چار خاص آدمیوں کو یہاں بلایا ہے۔“

”بدنام ایجنسی؟“ ہاشم نے الجھ کر پوچھا۔

”ہاں امریکا اور یورپ کے دوسرے ملکوں میں ایسی ایجنسیاں ہوتی ہیں جو ہر قسم کا غیر قانونی کام کرتی ہیں۔ انہیں بعض اوقات حکومتوں کی مدد بھی حاصل ہوتی ہے۔ جب کوئی حکومت کوئی مشکل کام یا غیر قانونی کام خود نہیں کر سکتی تو وہ بعض اوقات ان ایجنسیوں کی خدمات حاصل کر لیتی ہے۔“ میں نے کہا۔

”ایسے گینگ اور کرائے کے قاتل تو ہوتے ہیں لیکن سرکاری سطح پر.....“

”مشہدی نے ان لوگوں کو سرکاری سطح پر بلایا بھی نہیں ہے۔“ بلوچ نے کہا۔ ”یا تو وہ ان لوگوں سے ان سیاست دانوں کو ٹھکانے لگوائے گا جو اس کی ملک دشمن سرگرمیوں سے واقف ہیں اور جن پر وہ خود ہاتھ نہیں ڈال سکتا یا پھر ایک امکان یہ بھی ہے کہ وہ ان لوگوں کے ذریعے ہم لوگوں کو ختم کرائے گا۔“

مجھے اس کی بات پر بے اختیار ہنسی آ گئی۔ میں نے کہا۔ ”کیا مشہدی کو پورے پاکستان میں کرائے کا کوئی ایسا قاتل نہیں ملا جو ہمارا خاتمہ کر سکے؟ کیسی مضحکہ خیز بات ہے کہ اس نے ہمارے خاتمے کے لیے امریکا کی کسی جرائم پیشہ ایجنسی کی خدمات حاصل کی ہیں؟“

”اسے مذاق مت سمجھو بلوچ!“ بلوچ نے کہا۔ ”آپ کو پتا ہے کہ ہمارے مخبر مشہدی کے لوگوں میں بھی ہے۔ ان سے ہم کو پتا چلا ہے کہ وہ خنزیر آپ کی طرف سے بہت پریشان ہے۔ آپ نے اس کے کتنے اہم آدمی مار دیئے آپ کو کچھ اندازہ بھی ہے؟“ بلوچ آہستہ آہستہ جذباتی ہو رہا تھا۔ ”اس نے کئی دفعہ آپ کو مارنے کی کوشش کی لیکن الٹا آپ نے اس کے آدمیوں کو ہلاک کر دیا۔ وہ اگر باہر ملک سے آپ کے لیے قاتل بلا رہا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ آپ سے بہت زیادہ ڈر گیا ہے۔ اس کا اسلحہ سے بھرا ہوا جہاز جس میں کروڑوں ڈالرز کے ہتھیار اور سونا تھا آپ نے سمندر میں غرق کر دیا۔ یہ بات وہ بھی جانتا ہے کہ آپ کے علاوہ یہ کام کسی دوسرے کا نہیں ہے۔ کسی میں اتنی ہمت ہی نہیں ہے۔ اسے غنی بلوچ سے تھوڑا بہت خطرہ تھا لیکن اپنے خیال میں تو وہ غنی بلوچ کو بھی ختم کر چکا ہے۔“

”بلوچ کی بات میں وزن ہے؟“ ہاشم نے کہا۔ ”عین ممکن ہے کہ ہمارا یہ ٹھکانہ بھی اس کی نظروں میں ہو۔“

”ایسا نہیں ہے بلوچ!“ بلوچ نے کہا۔ ”اگر اسے معلوم ہوتا تو وہ اب تک یہاں بھی بم مار چکا ہوتا۔ اس کے لیے یہ کیا مشکل ہے لیکن اب ہاشم بھائی نے بول دیا ہے تو ہمیں یہ ٹھکانہ بھی چھوڑنا پڑے گا۔“

”میرے کہنے سے کیا ہوتا ہے؟“ ہاشم ہنس کر بولا۔ ”میں نے تو ایک امکان ظاہر کیا تھا۔ اس وقت تو ہم یہ ٹھکانہ چھوڑ بھی نہیں سکتے ہیں۔ ہمیں اس سے اچھا ٹھکانہ ملے گا کہاں؟“ پھر وہ کچھ توقف کے بعد بولا۔ ”اور اس بات کی کیا گارنٹی ہے کہ ہم جہاں جائیں گے وہ جگہ مشہدی سے پوشیدہ رہے گی؟“

”آپ کی بات میں دم ہے بلوچ!“ بلوچ نے ہنس کر کہا پھر وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ ”میں شام تک آپ لوگوں کو بتا دوں گا کہ شبو کون ہے اور وہ کہاں ملے گا؟ ہو سکتا ہے کہ میں اسے اٹھا کر یہاں لے ہی آؤں؟“ اس نے ہم سب سے ہاتھ ملایا اور روانہ ہو گیا۔

”یہ ہمیشہ بعد میں خاموشی سے آ جاتا ہے۔“ نادیر نے کہا۔ ”کیا یہ پیدل آتا ہے؟“

مجھے اس کی بات پر ہنسی آ گئی۔ میں نے کہا۔ ”وہ پیدل نہیں آتا ہے بلکہ اپنی گاڑی کو یہاں سے کافی دور چھوڑ کر آتا ہے پھر وہ ہر چندرہ دن یا ایک مہینے بعد اپنی گاڑی بدل لیتا ہے۔“

”ہمیں بھی یہی کرنا چاہیے۔“ تیمور نے کہا۔

”تم چاہو تو یہ کر سکتے ہو۔“ ہاشم نے کہا۔ ”عمران کی گاڑی پہ حکومت پاکستان کا نمبر ہے اور میری گاڑی کے وٹا سکرین پر پولیس کا وہ اسکر لگا ہوا ہے جو پولیس کے اعلیٰ افسروں کو لگانے کے لیے دیا جاتا ہے۔“

”پھر میری اور نادیر کی گاڑی پر بھی ایسا ہی کوئی اسکر لگا دیں۔“ تیمور نے کہا۔

”تم بلوچ کی طرح کچھ عرصے بعد اپنی گاڑی تبدیل کرتے رہو۔ اگر تمہیں کہیں جانا ہو تو تم میری گاڑی استعمال کر

سکتے ہو۔“ ہاشم نے ہنس کر کہا۔ میں نے اس کی گاڑی کو دیکھا وہ عام سی ایک آلٹو ہے۔ ایسی گاڑیاں بے شمار خواتین کراچی کی سڑکوں پر کیے پھرتی ہیں۔ اس پر کوئی دھیان بھی نہیں دے گا۔ بس نادیر گھر سے نکلتے وقت عبا یا استعمال کرنے لگے۔“

”میں اب عبا یا پنوں کی؟“ نادیر نے رخ الجھ میں کہا۔

”ہاں۔“ میں نے کہا۔ ”اسی میں تمہاری اور ہم سب کی سلامتی ہے۔“

”کیا آپ لوگ سمجھتے ہیں کہ مشہدی جیسا آدمی مجھے عبا یا میں شناخت نہیں کر سکتا؟“

”وہ جیسے شناخت کر سکتا ہے؟“ ہاشم نے کہا۔ ”پھر ہمیں تو اپنے طور پر احتیاط کرنا چاہیے۔ میں تو یہ کہوں گا کہ ہم سبھی کو اپنے موجودہ حلیوں میں اتنی تبدیلی کرنا چاہیے کہ مشہدی ہمیں کم سے کم پہلی نظر میں نہ پہچان سکے۔“

”عمران بھائی!“ تیمور نے کہا۔ ”میں بہت دیر سے ذہن پر زور دے رہا ہوں لیکن میرے ذہن کے کسی گوشے میں شبو نام کے کسی شخص کا وجود نہیں ہے۔“

”ممکن ہے ہاشم کو اس سلسلے میں کچھ معلومات ہوں؟“ میں نے کہا۔

”یہ نام میرے لیے بھی نیا ہے یا تو اس شخص نے پھر سے مشہدی کا گینگ جوائن کیا ہے یا پھر یہ کوئی چھوٹا موٹا بد معاش ہے جسے مشہدی نے اپنے مقصد کے لیے استعمال کیا ہے۔“

”خوشی کی خبر یہ ہے کہ ارسلان زندہ ہے۔“ نادیر نے کہا۔ ”اس موقع پر تو عمران کو ٹریٹ دینا چاہیے۔ ارسلان کی نئی زندگی کے سلسلے میں ایک پر تکلف ڈنڈہ بھی کسی فائینا اشار ہوٹل کے ریسٹورنٹ میں۔“

”تو.....!“ ہاشم نے سرد لہجے میں کہا۔ ”میں نے ابھی تو بتایا ہے کہ ہمارا یوں کھلے عام پھرنا مناسب نہیں ہے اور تم سب لوگوں کے ساتھ کسی فائینا اشار ہوٹل میں ڈنر کرنا جاتی ہو؟ اعلیٰ سے اعلیٰ ڈنر یہیں منگوا یا جاسکتا ہے۔“

”او کے!“ نادیر نے کہا اور اٹھ کر اپنے کمرے کی طرف چلی گئی۔

”میرے خیال میں نادیر میری بات کا برا مان گئی۔“ ہاشم نے کہا۔ ”خیر میں اسے منالوں گا۔“

”منانے کے لیے عمران بھائی کیا کم ہیں؟“ تیمور نے ٹکڑا لگایا۔ ”یہ تو ابھی فوری طور پر نادیر کے پیچھے روانہ ہو جاتے لیکن نہ جانے کیوں ٹھہر گئے؟“

”اس لیے کہ میں تمہاری پٹائی لگا سکوں۔“ میں نے ہنس کر کہا۔

”بہتر ہے عمران.....!“ ہاشم نے کہا۔ ”کہ اسے تم ہی منالو۔“

”میں جانتا ہوں کہ وہ کسی دوسرے شخص کی بات مانے کی بھی نہیں۔“ میں نے ہنس کر کہا اور اپنی جگہ سے اٹھ گیا۔

نادیر کا موڈ واقعی آف تھا۔ مجھے دیکھ کر وہ تڑخ کر بولی۔ ”کیا اب مجھے ہاشم اور تیمور کی ہدایات پر عمل کرنا پڑے گا؟“

”ہاشم ہمارا دشمن تو نہیں ہے نادیر! اگر وہ.....“

”عمران!“ اس نے میری بات کاٹ دی۔ ”مجھے یہ بتاؤ کہ ہمارا لیڈر کون ہے؟“

”لیڈر؟“ میں نے ہنس کر کہا۔ ”ہم کوئی تنظیم یا گینگ تو چلا نہیں رہے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”یہ تو ایک ٹیم ورک ہے ہمارے ساتھ جتنے بھی لوگ ہیں وہ ہمارے محسن ہیں نادیر!“ میں نے اسے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ”ورنہ انہیں مجھ سے کیا دلچسپی ہو سکتی ہے؟ وہ سب لوگ مجھ سے محبت کرتے ہیں میرے ساتھ انتہائی مخلص ہیں تم ان سے بدظن ہو رہی ہو؟“

”مجھے عبا یا شروع ہی سے ناپسند ہے۔“

میں نے اس کی بات سن کر کہا۔ ”اچھا تو یہ بات ہے؟“

”ہاں یہی بات ہے۔“ نادیر نے کہا۔

”تم اسکارف تو استعمال کر سکتی ہو نا؟ ایسا اسکارف جو تمہارے چہرے کو پوری طرح کور کر لے؟“

”وہ بھی تو.....“

میرے سیل فون کی بیل بجی تو نادیر کا جملہ ادھورا رہ گیا۔ میں نے سیل فون جیب سے نکالا اور اسکرین پر جان محمد کا نام

دیکھ کر چونک اٹھا اور فوراً مین دبا کر سیل فون کان سے لگا لیا۔ ”ہیلو.....!“ میں نے کہا۔ ”کیسے ہو جان محمد؟“

”آپ لوگ خاص طور پر آپ مشہدی کی طرف سے بہت محتاط رہیے گا۔ اس نے آپ اور آپ کے ساتھیوں کو قتل کرنے کا پورا انتظام کر لیا ہے۔“

”اس کی طرف سے تو ہم ہر وقت محتاط رہتے ہیں۔ تمہیں کوئی خاص اطلاع ملی ہے کیا؟“

”جب سے آپ نے میری بیٹیوں کو اغوا اور پھر رہا کیا ہے مشہدی نے مجھے خاص میننگز میں شریک کرنا چھوڑ دیا ہے۔ اس کے باوجود وہاں کچھ لوگ ایسے ہیں جو آج بھی میرے لیے جان دے سکتے ہیں۔ ان کے ذریعے مجھے اطلاع ملی ہے کہ مشہدی نے امریکا کی ایک بدنام زمانہ ایجنسی کے پانچ افراد کو پاکستان بلا لیا ہے۔ ان کا پہلا ٹارگٹ حمید اللہ قدوائی صاحب ہیں۔ وہ آج اسلحے اور ڈرگ ٹریفک کے معاملے میں بہت سرگرم ہیں اور شاید ان کے ہاتھ مشہدی کے خلاف کچھ ثبوت بھی لگ گئے ہیں۔ وہ اخبارات اور ٹی وی چینلز کے ٹاک شوز میں مل کر اس بات کا اظہار کر چکے ہیں کہ ملک کے بڑے بڑے اور بدنام زمانہ اسمگلرز اور اسلحہ ڈیلرز کو کچھ بااثر شخصیات کی پشت پناہی حاصل ہے۔“

”اس کا مطلب ہے کہ قدوائی صاحب کی جان خطرے میں ہے؟“

”نہ صرف قدوائی صاحب بلکہ ان کی پارٹی کے ایک اور عہدے دار احمد سعید کو بھی شدید خطرہ ہے کیوں کہ وہ بھی مشہدی کی ہٹ لسٹ پر ہے۔“

”یعنی طور پر میں اور میرے ساتھی بھی مشہدی کی ہٹ لسٹ پر ہیں۔“

”جی ہاں آپ تو اس کی آنکھوں میں کانٹے کی طرح کھٹک رہے ہیں۔ اسے یقین ہے کہ اسلحے سے بھرے ہوئے اس جہاز کی غرقابی میں آپ کا ہاتھ ہے۔ اسے یقین کی حد تک یہ بھی شبہ ہے کہ آپ نے ڈیگال کا گینگ جو آئن کر لیا ہے۔“

ڈیگال نسلاً فرامیسی تھا اور اپنی دراز قامت اور فرانس کے سابق صدر ڈیگال سے مشابہت کی بنا پر اس کا نام ہی ڈیگال پڑ گیا تھا۔ میں اس کے بارے میں صرف اتنا جانتا تھا کہ مشہدی کی طرح وہ بھی وہ ایک بڑے قانونی نیٹ ورک کا چیف ہے اور یورپ اور امریکا میں وہ زیادہ بار سوخ ہے اور اتنا طاقت ور ہے کہ مشہدی جیسا بین الاقوامی بد معاش بھی اس خوف زدہ ہے۔“

”ہیلو عمران صاحب!“ دوسری طرف سے جان محمد کی آواز آئی۔ ”کیا آپ لائن پر موجود ہیں؟“

”یار میں کچھ سوچ رہا تھا۔“ میں نے کہا۔ ”مشہدی کو یہ شبہ کس وجہ سے ہے کہ میں نے ڈیگال کا گینگ جو آئن کر لیا ہے؟“

”کیوں کہ اور کسی میں نہ اتنی جرأت ہے نہ صلاحیت!“

”تم نے بھی ڈیگال کو دیکھا ہے؟“

”میں نے؟“ جان محمد طنزیہ انداز میں ہنسا۔ ”اسے تو شاید کبھی مشہدی نے بھی نہ دیکھا ہو۔“

”اچھا یہ بتاؤ کہ تم شبو نام کے کسی آدمی کو جانتے ہو؟“

”شبو.....!“ جان محمد نے پر خیال انداز میں دہرایا پھر بولا۔ ”عمران بھائی! میں نے یہ نام پہلی دفعہ سنا ہے۔ خیریت تو ہے؟ آپ کو شبو سے کیا کام پڑ گیا؟“

”اس کے پاس کچھ انتہائی ضروری نوعیت کی معلومات ہیں۔“

میں نے فوری طور پر اسے ارسلان کے بارے میں کچھ بتانا مناسب نہ سمجھا۔

”تمہیں یقین ہے کہ مشہدی کے بلائے ہوئے کرائے کے قاتل پاکستان پہنچ چکے ہیں؟“

”ہاں میرے پاس بالکل کنفرم اطلاع ہے۔ میں ابھی ایک گھنٹے کے اندر اندر آپ کو ان کے بارے میں تفصیلات بھی فراہم کر دوں گا۔“

”بہت شکریہ جان محمد!“ میں نے کہا۔ ”تم نے بروقت مجھے خطرے سے آگاہ کر کے بہت اچھا کیا۔“ پھر میں کچھ

سوچ کر بولا۔ ”یار میں ایک بات کہوں؟“

”جی کیسے؟“ جان محمد نے کہا۔

”تم مشہدی کا گینگ چھوڑ کیوں نہیں دیتے؟ تم بھی ہمارے ساتھ شامل ہو جاؤ۔“

”ایسا کرنے کو تو میں ابھی کر لوں لیکن پھر مشہدی کی ہٹ لسٹ پر میری بیوی اور بچیاں بھی آ جائیں گی پھر وہاں رہ کر مجھے اندر کی خبریں ملتی رہتی ہیں۔ یہ سمجھ لیں آج کل مشہدی کے آدمی میری اور بچیوں کی مسلسل نگرانی کر رہے ہیں لیکن ابھی تک انہیں کوئی ایسی بات دکھائی نہیں دی جو مشہدی کے خلاف ہو۔ آپ فکر مت کریں یہ سمجھیں کہ آپ کا ایک ساتھی دشمن کی صفوں میں گھسا ہوا ہے۔“

”ہاں شائستہ کے بارے میں کوئی اطلاع؟“

”ابھی تک شائستہ کا کوئی سراغ نہیں ملا ہے۔ مشہدی خود بھی پریشان ہے کہ شائستہ آخر گئی کہاں؟ اسے زمین نکل گئی یا آسمان کھا گیا؟“

”اچھا جان محمد!“ میں نے کہا۔ ”تمہاری دی ہوئی اطلاعات کا بہت شکریہ! اپنا خیال رکھنا۔ اللہ حافظ!“

”اللہ حافظ! عمران صاحب!“

سلسلہ منقطع کر کے میں نے نادیدہ کی طرف دیکھا وہ بہت بے زار نظر آ رہی تھی۔

”کیا برا بلم ہے جان؟“

”تم گھنٹوں سیل فون پر مصروف رہتے ہو اور میں تمہاری شکل نکلتی رہتی ہوں۔“

”میں اس سے گپ شپ تو نہیں کر رہا تھا کام کی باتیں کر رہا تھا۔ ہاں اب ہمیں واقعی بہت زیادہ محتاط رہنے کی ضرورت ہے۔ مشہدی نے امریکا سے خاص طور پر ہمیں ہلاک کرنے کے لیے کرائے کے قاتل بلائے ہیں۔“

میری بات سن کر نادیدہ بے اختیار ہنسنے لگی۔ ہنستے ہوئے اس کے گالوں میں ڈمپل پڑتے تھے اور چہرہ سرخ ہو جاتا تھا اس لیے میں نے اسے ٹوکا نہیں۔

اس نے ہنستے ہوئے پوچھا۔ ”مشہدی نے ہمارے لیے خاص طور پر امریکا سے کرائے کے قاتل امپورٹ کیے ہیں؟ کیا پاکستان میں قاتلوں بد معاشوں اور دہشت گردوں کی کمی ہے؟“

”یہ مذاق نہیں ہے نادیدہ!“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”وہ ایک تیر سے کئی شکار کرنا چاہتا ہے۔ اصل میں تو اس کا ٹارگٹ قدوائی صاحب اور ان کی پارٹی کے ایک اور عہدے دار سعید صاحب ہیں۔ ممکن ہے کوئی اور سیاست دان یا بیوروکریٹ بھی اس کی ہٹ لسٹ پر ہو۔ وہی قاتل ہمیں بھی نشانہ بنا سکتے ہیں۔ اس میں اتنا ہنسنے کی کیا بات ہے؟“

”سوری عمران! پہلے مجھے تمہاری بات پر یقین نہیں آیا تھا۔ میں نے ابھی سیل فون پر تمہاری باتیں سنی تھیں شاید جان محمد اسی بارے میں بات کر رہا تھا لیکن میرا دھیان اس وقت کہیں اور تھا۔“ پھر وہ کچھ سوچ کر بولی۔ ”اس کے باوجود میرا سوال اپنی جگہ پر ہے۔ کیا پاکستان میں کرائے کے قاتلوں اور دہشت گردوں کی کمی ہے؟“

”میرا خیال ہے کہ وہ اپنے ہاتھ پیر بچا کر کام کرنے کا عادی ہے۔ اگر کوئی پاکستانی قاتل پکڑا گیا تو اس کے ذریعے پولیس سیدھی مشہدی تک پہنچ جائے گی لیکن اگر کوئی غیر ملکی پکڑا گیا تو سب سے پہلے تو ان کا ہائی کیشن بھی ایک کھرام برپا کر دے گا پھر ان کے ملک کا میڈیا پاکستان کے پیچھے پڑ جائے گا۔“

”لیکن وہ کرمٹل اور بدنام زمانہ لوگ ہوں گے۔ کیا ان کی حکومت کو اس بات کا علم نہیں ہوگا؟“

”یہاں تو وہ کسی معزز حیثیت سے آئیں گے۔“

اس وقت میرے سیل فون کی بیل بجنے لگی۔ میں نے اسکرین پر جان محمد کا نام دیکھا تو کال فوراً ریسیو کر لی۔ ”ہاں جان محمد!“ میں نے کہا۔

”مجھے ان لوگوں کے بارے میں تفصیلات معلوم ہو گئی ہیں۔ کل پانچ افراد ہیں۔ ان میں سے دو کا تعلق امریکا سے ہے ایک ہندو ہے اور دو یہودی۔ ان کے بارے میں تفصیلات میں آپ کو text کر دوں گا۔“

”نہیں جان محمد! text کرنے میں رسک ہے۔ تم مجھے ٹیلی فون پر تفصیلات بتا دو۔“

”دونوں امریکن انتہائی پروفیشنل اور خوف ناک قاتل ہیں۔ ان میں سے ایک کا نام آرئلڈ ہے اور دوسرا ہیک ہے۔ دوسرے دونوں تو یہودی ہیں لیکن شہریت امریکا کی ہے۔ ایک کا نام کارلٹن ہے جو بونی کے نام سے مشہور ہے۔ فرائیڈ بے ہندو کی شہریت بھی دہری ہے۔ وہ بیک وقت امریکا اور بھارت کا شہری ہے۔ اس کا نام تو کچھ اور ہے لیکن راج کے نام سے مشہور ہے۔“

”دیری گڈ! یہ لوگ کہاں ٹھہرے ہیں؟“ میں نے پوچھا۔

”مجھے اب تک اس کا علم نہیں ہو سکا ہے لیکن ہو جائے گا۔“

”بہت شکریہ جان محمد!“

”شکریے کی کیا بات ہے عمران صاحب!“ جان محمد نے کہا۔ ”آپ نے جو کچھ میرے لیے کیا ہے.....“

”بس جان محمد!“ میں نے اس کی بات کاٹ دی۔ ”اب یہ رسمی باتیں چھوڑو اور مشہدی کے ہر قدم پر نظر رکھو۔“

”یہ تو آپ کو کہنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ ویسے میری وائف اور بچیاں آپ کو بہت یاد کرتی ہیں۔ ہو سکے تو کبھی میری طرف چکر لگالیں۔“

”ان حالات میں تو ایسا سوچنا بھی مت!“ میں نے کہا۔ ”بہ قول تمہارے دنیا کے خوف ناک ترین پیشہ ور قاتل میری تلاش میں ہیں۔ انہیں اگر بھٹک بھی پڑ گئی کہ تمہارا مجھ سے رابطہ ہے تو مجھ سے پہلے تم مارے جاؤ گے اس لیے تم بھی کبھی بھول کر میری طرف مت آنا۔ ہاں حالات سازگار ہوتے ہی میں تمہارے گھر آؤں گا۔ اپنا خیال رکھنا۔ اللہ حافظ!“ میں نے سلسلہ منقطع کر دیا۔

”کیا ہم واقعی اتنے خطرے میں ہیں؟“ نادیہ نے پوچھا۔

”تو کیا تم اسے مذاق سمجھ رہی ہو؟ اگر تمہیں اپنی جان کی اتنی ہی پروا ہے تو تم کچھ دن کے لیے مجھ سے علیحدہ ہو جاؤ۔“

میں نے کہا۔

”عمران!.....!“ نادیہ برامان کر بولی۔ ”تم مجھے ایسا ہی سمجھتے ہو کہ میں خطرے میں تمہیں چھوڑ کر چلی جاؤں گی؟“ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

میں اٹھ کر صوفے پر اس کے نزدیک بیٹھ گیا اور بولا۔ ”آئی ایم سوری بابا! میں مذاق کر رہا تھا۔“

”عمران! آئندہ کبھی بھولے سے بھی ایسا مذاق مت کرنا۔“

میں نے اس کے آنسو پونچھے تو وہ میرے سینے سے آگئی اور بری طرح رونے لگی۔

اسی وقت مجھے تیمور کے کھانسنے کی آواز سنائی دی۔

نادیہ جلدی سے علیحدہ ہو گئی۔

تیمور نے معصومیت سے کہا۔ ”عمران بھائی! مجھے صبح سے کچھ نظر نہیں آ رہا ہے۔“

”کبواس مت کرو۔“ میں نے کہا۔ ”تم اچانک آ کیسے گئے؟“

”میں بلوچ کے ساتھ آیا ہوں۔ آپ تو جانتے ہیں کہ وہ اپنی گاڑی ہمارے گھر سے کافی دور کھڑی کرتا ہے۔ میں البتہ گیٹ کے سامنے ہی اتر گیا تھا۔ بلوچ بھی بس آ ہی رہا ہوگا۔“

اسی وقت بلوچ کی آواز آئی۔ ”واجبہ!.....!“

”ہاں بلوچ!.....!“ میں نے جواب دیا۔ ”اندر آ جاؤ باہر کیا مہمانوں کی طرح کھڑے ہو؟“

نادیہ شرم سے سرخ چہرہ لیے باہر نکل گئی۔ بلوچ اندر آ گیا۔ وہ خاصا پر جوش نظر آ رہا تھا۔

میں نے پوچھا۔ ”ہاں بلوچ! کچھ بات بنی؟“

”شبکو کا پتا چل گیا ہے واجبہ! بلوچ نے کہا۔“

”واقعی؟“ میں نے پوچھا۔

”بلوچ کسی کام میں ہاتھ ڈالے تو ایسا بہت کم ہوتا ہے کہ وہ ناکام ہو۔ اللہ کے فضل سے ہم ہمیشہ کامیاب رہتا ہوں۔“

”کون ہے شبو؟“ تیمور نے پوچھا۔

”شبو کسی زمانے میں چھوٹا موٹا ایک بد معاش تھا۔ جعلی شہریت اور مہر س بنایا کرتا تھا پھر وہ کہیں چلا گیا۔ وہاں سے نکلنے کے بعد اس نے چرس اور ہیروئن کا دھندہ شروع کر دیا۔ آدمی بھی جی دار ہے اس لیے مشہدی نے اسے اپنے گینگ میں شامل کر لیا۔ گینگ میں اسے شبو کے نام سے کوئی نہیں جانتا۔ اس کا اصل نام شہاب ہے اور وہ بد بخت بھی بلوچ ہے۔ اس نے شاید اپنی پرانی شناخت ختم کرنے کو اپنا نام بھی ختم کر دیا۔“

”وہ آج کل کہاں ہوتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”اس کی ڈیوٹی پورٹ پر ہوتی ہے۔ وہ بھی سمندر کا کپڑا ہے۔ مشہدی کے جتنے بھی مال والے جہاز باہر سے آتے ہیں شہاب ہی ان کا مال اتار کر بونس کے ذریعے یورپ تک پہنچاتا ہے۔ شبو تو وہ کئی سال پہلے تھا اب تو لوگ اس کا پرانا نام بھول چکے ہیں۔“ بلوچ نے کہا۔ ”شاید شانواس کا کوئی پرانا ساتھی تھا جو اسے اب بھی شبو کے نام سے پکارتا ہوگا۔“

”اگر اسے زندگی مہلت دیتی تو یہ بھی بتا دیتا کہ شبو اب شہاب بلوچ ہے۔“ میں نے کہا۔

”ابھی ہم ایسا کرتے ہیں کہ پورٹ پہ جا کر شبو یا شہاب کی مصروفیات کا جائزہ لیتے ہیں۔ وہ کس قسم کا آدمی ہے کہاں رہتا ہے ڈیوٹی پر کب آتا اور واپس کب جاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔“ تیمور نے کہا۔

اسی وقت ہاشم بھی آ گیا۔ وہ بھی شاید اپنے طور پر شبو کو تلاش کرنے آیا تھا۔

”شبو کا سراغ مل گیا ہے ہاشم بھائی!“ تیمور نے کہا۔

”کہاں ہے وہ؟“ ہاشم نے پوچھا۔

”وہ مشہدی کے ساتھیوں میں سے ہے اور اب لوگ اسے شبو نہیں بلکہ شہاب کے نام سے جانتے ہیں۔“

ہاشم چونک اٹھا۔ ”شہاب!.....!“ اسے تو میں اچھی طرح جانتا ہوں۔ بابر خان کی طرح مشہدی کے خاص آدمیوں میں سے ایک ہے۔ بہت ہی جی دار اور سخت جان انسان ہے اتنا سخت جان کہ ایک مرتبہ میں نے اسے اپنے پیروں میں لگنے والی وہ گولیاں بھی نکالتے دیکھا تھا جو اس کی ران میں خاصی اندر تک دھنس گئی تھیں۔“

”یہ تو خیر میں بھی کر سکتا ہوں۔“ تیمور نے کہا۔

”اب یہ بتاؤ ہاشم کہ شہاب کو کہاں اور کیسے گھیرا جائے؟“

”وہ بھی اکیلا نہیں ہوتا ہے ایک دو آدمی اس کے ساتھ ضرور ہوتے ہیں پھر وہ پورٹ پہ ہی مشہدی کے کسی اسٹیمر میں رہتا ہے۔ وہ پورٹ سے بہت کم باہر نکلتا ہے۔“

”کام بن گیا واجبہ!“ بلوچ نے کہا۔ ”یہ تو بہت آسان شکار ہے۔ ہمیں صرف شبو کو اس اسٹیمر سے باہر لانا ہوگا۔ اس کے اسٹیمر کے ساتھ ہی میں اپنی بوٹ لگا دوں گا۔ ہم اسے کھلے سمندر میں لے جائیں گے۔ کھلے سمندر میں اس کی چیخیں کون سنے گا؟“

”اس آپریشن میں تمہارے ساتھ میں بھی چلوں گا بلوچ!“ میں نے کہا۔

”آپ کا ضرورت تو نہیں ہے واجبہ! لیکن اگر آپ کا مرضی ہے تو ضرور چلو۔“

”ابھی تو ہم لوگ وہاں کی ریکی کریں گے۔“ تیمور نے کہا۔

”بلوچ کے ساتھ اگر تمہاری بجائے ہاشم جائے تو زیادہ بہتر ہے۔“ میں نے تیمور سے کہا۔ ”یہ شبو کو پہچانتا بھی ہے اور شاید اس کے علم میں یہ بات بھی ہوگی کہ مشہدی اپنا اسٹیمر کہاں کھڑا کرتا ہے؟“

اسی وقت کلثوم چائے کی ٹرائی لے کر آ جاتی ہے۔ اسے شاید نادیہ نے بھیجا تھا پھر نادیہ خود بھی وہاں آ گئی لیکن وہ تیمور

33

34

35

36

37

38

39

40

41

42

43

44

45

سے نظریں نہیں ملا رہی تھی۔ وہ کم بخت بھی عین موقع پر نہ جانے کہاں سے نازل ہو جاتا تھا؟
تیور نادیر کی طرف دیکھ بھی نہیں رہا تھا۔

کلوٹم نے چائے کے ساتھ بہت زیادہ اہتمام کر لیا تھا۔ وہ بھی میری مزاج شناس ہو گئی تھی۔ ہم لوگ صبح دیر سے ناشتہ کرتے تھے پھر صبح گول کر جاتے تھے۔ شام کو چائے کے ساتھ ذرا ہیوی فسم کے اسٹیکس لیتے تھے پھر رات کو کافی دیر سے ڈنر کرتے تھے۔

چائے سے فارغ ہو کر بلوچ کھڑا ہو گیا۔ اس کے ساتھ ہی ہاشم بھی اٹھ کھڑا ہوا۔

”ہاشم!.....!“ میں نے کہا۔ ”تم اپنی گاڑی کی بجائے بلوچ کی گاڑی میں جانا۔“

”نی الحال تو میں شبو کے ایک پرانے جگری دوست کے گھر جا رہا ہوں۔ وہ بھی کسی زمانے میں مشہدی کے لیے کام کرتا تھا لیکن ایک گینگ وار میں اس کے پیروں میں گولیاں لگی تھیں اور اس کے دونوں پاؤں بے کار ہو گئے تھے۔“

”وہ مشہدی اور اس ماحول سے کتنا ہوا ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میرا نہیں خیال کہ وہ تمہیں کوئی کام کی بات بتا سکے۔“

”کوشش کرنے میں کیا حرج ہے؟“ ہاشم نے ہنس کر کہا پھر وہ دونوں کمرے سے باہر نکل گئے۔

تیور مجھ سے کچھ کہنے ہی والا تھا کہ اس کے سیل فون کی بیل بجنے لگی۔ اس نے سیل فون جیب سے نکالا اور اسکرین پر نظر ڈال کر کمرے سے باہر نکل گیا۔

وہ تھوڑی دیر سیل فون پر بات کرتا رہا پھر کمرے میں آیا اور بولا۔ ”عمران بھائی! میں بھی ذرا ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں۔ آپ اکیلے میں ڈریں گے تو نہیں؟“

”بکواس کی تو جھانپڑ سید کروں گا۔“ میں نے کہا۔

تیور ہنستا ہوا باہر نکل گیا۔

”عمران!.....!“ ہم کب تک اس طرح کی غیر یقینی زندگی گزارتے رہیں گے؟“ نادیر نے کہا۔

میں نے اسے گھور کر دیکھا۔

وہ جلدی سے بولی۔ ”میرا مطلب یہ نہیں تھا کہ میں اس زندگی سے فیڈ اپ ہو گئی ہوں، میں تو صرف یہ پوچھنا چاہ رہی تھی کہ.....“

”اس کا علم تو مجھے خود بھی نہیں ہے نادیر!“ میں نے کہا۔ ”لیکن مجھے اتنا یقین ضرور ہے کہ ہم سچائی پر ہیں اور آخر میں فتح ہمیشہ سچائی کی ہوتی ہے۔“ پھر میں مسکرا کر بولا۔ ”ہاں مجھے ایک بات کا مزید یقین ہے کہ اب میں تمہارے بغیر ادھورا ہوں۔ حالات کتنے ہی خراب کیوں نہ ہوں اگر میں زندہ رہا تو.....“

”ایسی باتیں مت کرو عمران!“ نادیر نے میری بات کاٹ دی۔ ”میں نے تو.....“

اس کی بات ادھوری رہ گئی کیوں کہ میرے سیل فون کی بیل بج اٹھی تھی۔ میں نے اسکرین پر نظر ڈالی تو مجھے جان محمد کا نام نظر آیا۔

”ہاں جان محمد! کوئی خاص خبر؟“

”عمران صاحب!“ جان محمد پر جوش لہجے میں بولا۔ ”آپ کا ایک شکار اس وقت پی سی میں موجود ہے۔“

”میرا شکار؟“ میں نے الجھ کر پوچھا۔

”ہاں مشہدی کے امپورنڈ دہشت گردوں میں سے ایک اس وقت پی سی کے ایک ریسٹورنٹ میں موجود ہے۔“ اس نے مجھے ریسٹورنٹ کا نام بتایا۔

”اوکے میں تو چلا ہوں۔“ میں نے کہا اور پھرتی سے کھڑا ہو گیا۔

”کیا ہوا عمران؟ خیریت تو ہے؟ تم کہیں جا رہے ہو؟“

”ہاں اب عمل کا وقت آ گیا ہے نادیر!“ میں نے کہا اور اپنے بیڈروم کی طرف بڑھا۔ نادیر میرے پیچھے پیچھے تھی۔ میں نے الماری کھول کر اس میں سے پوائنٹ تھری ایٹ کا دوسرا ریوالور نکالا۔ ایک ریوالور تو ہر وقت میرے بگلی ہولسٹر میں رہتا تھا۔ میں نے دوسرا ریوالور بھی بگلی ہولسٹر میں لگایا۔ اس کے اوپر کوٹ پہن لیا تاکہ میرے ریوالورز نظر نہ آئیں پھر میں نے کوٹ کی جیبوں میں کئی فالتو میگزین بھی رکھ لیے۔ اگلے ہاتھ میں میں نے سائنسر بھی کوٹ کی اندرونی جیب میں رکھ لیا۔ میں اس وقت سوٹ میں تھا اس لیے جو گز نہیں پہن سکتا تھا۔ میں نے کرپ سول والے لانگ بوٹ کو ترجیح دی پھر باہر سے نکلنے سے پہلے مجھے اس خنجر کا خیال آیا جو تیور نے شانوی کی جیب سے نکالا تھا۔ میں نے پنڈلی پر اس خنجر کا کور بھی باندھ لیا۔

”تم تہامت جاؤ عمران!“ نادیر نے جذباتی ہو کر کہا۔ ”میں بھی تمہارے ساتھ چلوں گی۔“

”تمہارا جانا ابھی مناسب نہیں ہے، میں نعیم کو اپنے ساتھ لے جا رہا ہوں۔“ پھر مجھے خیال آیا کہ میں نے اس شخص کا حلیہ تو پوچھا ہی نہیں۔ میں نے جان محمد کو کال کرنے کے لیے سیل فون نکالا ہی تھا کہ اس کی بیل بجنے لگی۔ اس دفعہ بھی جان محمد ہی تھا۔

”ہاں جان محمد!“ میں نے کہا۔ ”کوئی نئی خبر؟“

”میں نے آپ کو یہ تو بتایا ہی نہیں کہ آپ اس ”شکار“ کو شناخت کیسے کریں گے؟“ جان محمد نے کہا۔ ”وہ لمبا بڑا ٹنکا امریکی ہے۔ اس نے بڑے بڑے بال رکھے ہوئے ہیں اور اس وقت چمڑے کی جیکٹ اور جینز میں ہے۔ اس کے ساتھ دو آدمی اور ہیں لیکن وہ مقامی ہیں۔“

”اوکے جان محمد!“ میں نے کہا۔ ”میں دیکھتا ہوں میں ابھی نکل رہا ہوں۔“

میں نے کلوٹم کو آواز دی۔ وہ فوراً ہی کمرے میں آ گئی۔ میں نے اس سے کہا۔ ”نعیم کو میرے پاس بھیج دو۔“

”جی صاحب جی!“ کلوٹم نے کہا اور واپس چلی گئی۔

ایک منٹ کے اندر اندر نعیم وہاں آ گیا۔ ”لیس سر آپ نے مجھے بلایا ہے؟“

”پوری طرح تیار ہو جاؤ ہم ایک مشن پر جا رہے ہیں۔“ میں نے کہا۔

”میں ہر وقت پوری طرح تیار رہتا ہوں۔“ نعیم نے کہا پھر وہ ہنس کر بولا۔ ”آپ کہیں تو میں اپنا ایک وایچ مین (کنا) بھی ساتھ لے لوں؟“

”ہم وہاں مرغابیوں کے شکار کو نہیں جا رہے ہیں؟“ میں نے درشت لہجے میں کہا۔ ”گاڑی نکالو۔“

وہ اچانک بہت زیادہ سنجیدہ ہو گیا اور فوراً ہی وہاں سے چلا گیا۔

”عمران!.....!“ نادیر نے کہا۔ ”یہ سب لوگ تمہارے ایمپلائی نہیں ہیں بلکہ تمہارے ساتھی ہیں اور اپنی جان داؤ پر لگا کر تمہارا ساتھ دے رہے ہیں۔ تم ان لوگوں سے کم سے کم گھریلو ملازموں کی طرح بات تو مت کرو۔“

اسی وقت چوکیدار نے آ کر بتایا کہ گاڑی تیار ہے۔

نعیم گاڑی کے باہر کھڑا ہوا تھا۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔ ”سر ڈرائیونگ آپ کریں گے یا.....“

”نعیم نعیم! ڈرائیونگ تم ہی کرو ہمیں پی سی چلنا ہے اور ہمارے پاس ٹائم بہت کم ہے۔“

”اوکے سر!“ وہ اسٹیزنگ پر بیٹھتا ہوا بولا۔ میں بھی پنجر سیٹ پر بیٹھ گیا۔

چوکیدار نے گیٹ پہلے ہی کھول رکھا تھا۔ ہاشم نے گاڑی جھٹکے سے آگے بڑھا دی۔ اس نے بعد میں لینڈ کروزر بھی نکالی تھی۔

”سوری نعیم!“ میں نے کہا۔ ”میں نے تم سے بہت روڈ لی بات کی تھی۔“

”سر آپ مجھے شرمندہ تو مت کریں۔ کیا آپ تیور سے یا ارسلان سے اس لہجے میں بات کرنے کے بعد سوری کریں گے؟“ اس نے کہا۔ ”میں بھی آپ کو وہی مقام دیتا ہوں جو تیور اور ارسلان نے دیا ہے۔ آپ مجھ سے بڑے ہیں عمر میں نہ سہی لیکن.....“

”زیادہ جذباتی مت ہو اور سامنے دیکھو۔“ میں نے ہنس کر کہا۔

مجھے اچانک خیال آیا کہ میری گاڑی تو چلتا پھرتا اسلحہ خانہ ہے اس کی سیٹوں کے خفیہ خانوں میں ہر طرح کا اسلحہ موجود ہے۔ میں نے نعیم سے کہا۔ ”نعیم! گاڑی ہوٹیل کے اندر مت لے جانا۔ اسے باہر ہی کہیں پارک کرنا۔“
”اوکے سر، کوشش کروں گا۔“ نعیم نے کہا۔ ”پی سی اور شیرٹن کے باہر تو پارکنگ بہت مشکل سے ملتی ہے۔“
نعیم اتنی تیز رفتار سے آیا تھا کہ ہم باتوں ہی باتوں میں پی سی پہنچ گئے۔ وہ بہترین ڈرائیور تھا۔ اس دوران میں وہ مجھ سے بات بھی کرتا رہا تھا۔ اگر وہ مجھ سے باتوں میں مصروف نہ ہوتا تو ہم اس سے بھی پہلے پی سی پہنچ جاتے۔
ہم وہاں پہنچے ہی تھے کہ مجھے ایک گاڑی وہاں کھڑی ہوئی گاڑیوں کی قطار سے باہر نکلتی نظر آئی۔
ہمیں پارکنگ مل گئی تھی۔ نعیم اس گاڑی کے نکلنے کا انتظار کرنے لگا۔

اچانک میرے سیل فون کی بیل بجنے لگی۔ دوسری طرف جان محمد تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ آرئلڈ اسی وقت پی سی سے نکلا ہے۔ وہ بلیک ٹرکی بی ایم ڈبلیو میں ہے۔ میں نے اپنے دو آدمیوں کو نگرانی پر لگا رکھا ہے۔ وہ مجھے پل پل کی خبریں پہنچا رہے ہیں۔“

اچانک مجھے اس گاڑی میں ایک امریکن اور اس کے ساتھ دو آدمی نظر آئے۔ وہ گاڑی بھی بی ایم ڈبلیو تھی۔
امریکن کا قد دراز، جسم ورزشی تھا۔ جان محمد کے بتائے ہوئے حلیے کے مطابق اس نے سیاہ چمڑے کی جیکٹ اور جینز پہنی تھی اور اس کے سر پہ بڑے بڑے براؤن بال تھے جو اس وقت اس نے چوٹی بنا کر بکھرنے سے بچا لیے تھے۔
نعیم اس خالی جگہ میں اپنی گاڑی لگانے ہی والا تھا کہ میں نے کہا۔ ”نعیم! میرا اندازہ ہے کہ اس بی ایم ڈبلیو میں ہمارا شکار ہے۔“

”سر، کیا میں اس کا پیچھا کروں؟“

”ہاں بھئی۔“ میں نے کہا۔ ”ہم اسی کے لیے تو یہاں آئے تھے۔“

”اس وقت ہمارے لیے سب سے زیادہ خطرہ اس کے دونوں گارڈز ہیں۔“

”سر، ان کا بھی کوئی نہ کوئی بندوبست ہو ہی جائے گا۔“ نعیم نے کہا۔

بی ایم ڈبلیو وہاں سے نکل کر آگے بڑھی اور پی آئی ڈی سی والے سٹنل پر رک گئی۔ اس کے اور ہمارے درمیان میں تین گاڑیاں تھیں۔

آرئلڈ کی گاڑی اسی کے گارڈز میں سے ایک چلا رہا تھا۔

وہ لوگ گھوم کر پھر اس روڈ پر آ گئے جو کلفٹن کی طرف جاتی تھی۔

ہم لوگ ایک محتاط فاصلے سے اس کا تعاقب کرنے لگے۔ کلفٹن پہنچ کر اچانک اس کے ڈرائیور نے گاڑی کلفٹن کے بڑے ڈپارٹمنٹل اسٹور کے ساتھ لا کر روک دی۔

نعیم نے بھی اپنی گاڑی ان سے کچھ آگے جا کر روک دی۔

بی ایم ڈبلیو سے صرف وہ امریکن باہر نکلا۔ شاید اسے وہاں زیادہ کام نہیں تھا اس لیے دونوں گارڈز کو بھی اس نے گاڑیوں میں چھوڑ دیا۔

میں نے انتہائی پھرتی سے اپنا ریوالور نکالا اس پر سائنلنسر چڑھایا اور ہم دونوں گاڑی سے اتر گئے۔ ہمیں کارپورج میں رک کر اس امریکن کا انتظار کرنا تھا۔ اندر جانے کی صورت میں ہمیں ایکسپریس گزرتا پڑتا۔

پورج میں پہنچ کر میں اور نعیم وہاں بس ٹہلتے رہے جیسے کسی کا انتظار کر رہے ہوں۔

تقریباً دس منٹ بعد مجھے وہ امریکن پھر نظر آیا۔ وہ اسٹور سے نکل کر دوبارہ مین گیٹ کی طرف بڑھ رہا تھا۔

میں نے آگے بڑھ کر کہا۔ ”ہیلو مسٹر آرئلڈ! کسے ہیں آپ؟“ میں نے خالص امریکن لہجے میں کہا۔ اس نے چونک کر مجھے دیکھا۔ مجھے اس کی آنکھوں میں شک و شبہ کی پرچھائیاں نظر آئیں۔ اس نے سر دھری سے کہا۔ ”میں آرئلڈ نہیں ہوں آپ کو غلط فہمی ہوئی ہے سر!“

”اچھا۔“ میں نے مایوسی سے کہا اور اچانک ریوالور نکال کر اسے ایک مکا مارا اور اسے دوبارہ کوٹ کی جیب میں رکھ لیا۔
میں نے کہا۔ ”ہاں! آپ تمہیں یاد آ گیا ہو گا کہ تم آرئلڈ ہو۔ کوئی حرکت کرنے کی کوشش مت کرنا۔ میرا ریوالور بے آواز چلتا ہے۔ میرے سامنے کے پاس بھی سائنلنسر والا ریوالور ہے اور وہ جیب کے اندر سے فائر کرنے میں بھی ماہر ہے۔“

”کیا چاہتے ہو تم لوگ؟“ اس نے پوچھا۔

”تم سے کچھ بات چیت کرنا ہے۔ اگر اطمینان سے ہماری بات سن لو گے تو فائدے میں رہو گے ورنہ فضول میں اپنی جان سے جاؤ گے۔“

”اپنے آدمیوں سے کہو کہ وہ واپس چلے جائیں، تم خود ہی آ جاؤ گے۔“

اس نے سیل فون کے لیے جیب میں ہاتھ ڈالنا چاہا تو نعیم نے درشت لہجے میں کہا۔ ”تم اپنے ہاتھ قابو میں رکھو۔ مجھے بتاؤ سیل فون کس جیب میں ہے؟ میں خود نکال کر تمہیں دے دوں گا۔“

اس نے اپنے کوٹ کی اندرونی جیب کی طرف اشارہ کیا۔

نعیم نے بجلی کی سی تیزی سے اپنا ریوالور نکالا اور اس کے پیٹ میں اڑا کر اس سے یوں بغل گیر ہو گیا جیسے برسوں بعد اپنے کسی دوست سے مل رہا ہو۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ بھی تھی۔ میں اس کی ذہانت پر خوش ہوا۔ وہ تن و توش سے نعیم سے بہت زیادہ تھا۔ ممکن ہے سیل فون نکالتے وقت وہ نعیم کی گردن دبوچ لیتا یا اس دوران میں شور شرابا کر دیتا تو ہمارے لیے بہت دشواری ہو جاتی۔

نعیم نے ایک منٹ سے بھی کم کے عرصے میں اس کی جیب سے سیل فون نکال لیا۔

”اب اسے دوسرے دروازے سے باہر نکالو۔ اپنی گاڑی میں وہیں لے آتا ہوں۔“ میں نے اردو میں کہا۔

”لیکن آپ نے اس کا سیل فون کیوں نکلوایا ہے؟“ نعیم نے پوچھا۔

”سیل فون کے ذریعے تو اس کے مزید ساتھیوں کا سراغ ملے گا۔ ممکن ہے یہ زبان نہ کھولے یا پھر اسے یہیں کہیں ختم کرنا پڑے۔ تم جا کر گاڑی لے کر آؤ، میں اسے دوسرے دروازے سے باہر لاتا ہوں۔“ میں نے کہا۔

پھر میں نے اس کی گردن میں یوں ہاتھ ڈال دیا جیسے وہ مجھ سے برسوں بعد ملا ہے۔ میں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”آرئلڈ! سیدھی طرح میرے ساتھ چلو ورنہ میں تمہیں گولی مار دوں گا۔ میرا ہاتھ اس وقت ریوالور پر ہے اور انگلی ٹریگر پر۔“

”تم ہو کون؟“ اس نے غرا کر پوچھا۔

وہ قد میں مجھ سے بھی ایک ڈیڑھ انچ بڑا ہی ہو گا لیکن وزن میں مجھ سے کہیں زیادہ تھا۔

”خاموشی سے میرے ساتھ چلو۔“ میں نے درشت لہجے میں لیکن مسکرا کر یہ جملہ ادا کیا تا کہ دیکھنے والے کسی قسم کا شبہ نہ کریں۔

وہ خاموشی سے میرے ساتھ چلتا رہا۔ مجھے ہر دم یہ ہی دھڑکا تھا کہ کہیں وہ برداشت نہ کھو بیٹھے اور اپنی جان کی پروا کیے بغیر مجھ سے بھڑ جائے یا شور شرابہ شروع کر دے۔

”تم جو کوئی بھی ہو بہت پیچھاؤ گے۔ تم مجھے جانتے نہیں ہو۔ میرا سفارت خانہ یہاں ایک اودھم مچا دے گا۔“

”خاموشی سے چل الو کے ٹھے۔۔۔۔۔“ میں نے پھر درشت لہجے میں مسکراتے ہوئے کہا۔

اس دوران میں ہم ڈیپارٹمنٹل اسٹور کی پارکنگ سے باہر نکل آئے تھے۔ نعیم کچھ فاصلے پر گاڑی لیے موجود تھا۔

ہم گاڑی کے نزدیک پہنچے تو نعیم نے جلدی سے عقبی سیٹ کا دروازہ کھول دیا۔

میں نے آرنلڈ کو بیٹھنے کا اشارہ کیا پھر خود ہی بیٹھ گیا۔ ہمارے بیٹھے ہی نعیم نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

”میں پھر پوچھ رہا ہوں کہ تم لوگ کون ہو؟“ آرنلڈ نے کہا۔

”پولیس.....“ میں نے کہا۔

”پولیس.....“ اس نے حیرت سے پوچھا۔ ”کیا میں نے کوئی جرم کر دیا ہے؟“

”یہ تو تمہیں پولیس اسٹیشن جانے کے بعد ہی معلوم ہوگا۔“ میں نے کہا۔

میں نے اسی لیے پولیس کا نام لیا تھا کہ وہ مطمئن ہو جائے۔ وہ جانتا تھا کہ یہاں کی پولیس غیر ملکیوں خصوصاً امریکیوں کے ساتھ زیادہ سخت سے پیش نہیں آتی۔ اس کا خیال ہوگا کہ پولیس اسٹیشن پہنچ کر میں پولیس کے کسی اعلیٰ اہل کار کو ایک ٹیلی فون کروں گا اور یہ لوگ معذرت کر کے مجھے رخصت کریں گے۔

”اگر تمہاری اجازت ہو تو میں سگار سلگالوں؟“ اس نے کہا۔

”تم اپنے باپ کے ولیم ڈنر میں نہیں جا رہے ہو باسٹرڈ۔“ میں نے کہا۔ ”خاموش بیٹھو ورنہ اب میں زبان کی بجائے ہاتھ سے بات کروں گا۔“

پھر وہ واقعی خاموش ہو گیا۔

”سراسر انا غفیل کر دیں۔“ نعیم نے کہا۔ ”تاکہ یہ ہمارے ٹھکانے کی نشان دہی نہ کر سکے۔“

میں نے جیب سے ریوا لور نکالا اور اس کا دستہ اچانک آرنلڈ کے سر پر رسید کر دیا۔ وہ سیٹ پر ایک طرف ہی لڑھک گیا۔

”دھیان رکھنا نعیم کہ کوئی گاڑی ہمارے تعاقب میں نہ آ رہی ہو۔“

”میں نے اس پر پوری طرح دھیان رکھا ہے سراسر!“ نعیم نے کہا۔ ”اس کے باوجود اس نے احتیاطاً دو چار موڑ کاٹے کچھ اسٹریٹس پر گھسا اور نکلا پھر برق رفتاری سے اپنے گھر پہنچ گیا۔

اُس وقت تک تیمور بھی آچکا تھا۔ وہ اور نادیا بے تابانی سے برآمدے میں ہماری واپسی کا انتظار کر رہے تھے۔ ہماری گاڑی دیکھ کر ان کے چہرے پر رونق آ گئی۔

جب میں نے ان لوگوں کو بتایا کہ ہم ان پانچ امپورٹڈ کرائے کے قاتلوں میں سے ایک کو پکڑ لائے ہیں تو وہ حیران رہ گئے۔ قیدی کو فوراً ایک اندرونی کمرے میں شفٹ کر دیا گیا۔ اس کے ہاتھ پیر باندھ دیے گئے تاکہ وہ زیادہ اودھم نہ مچا سکے۔ وہ اُس وقت تک بے ہوش تھا۔

میں لاؤنج میں آ بیٹھا۔ نعیم حسب معمول اپنی ڈیوٹی پر چلا گیا تھا۔ لاؤنج میں اب صرف میرے ساتھ تیمور اور نادیا تھیں۔

”آپ نے تو چھوٹے ہی جھکا مار دیا عمران بھائی!“ تیمور نے کہا۔

”ہاں لیکن یہ بات مجھے کچھ ہضم نہیں ہو رہی۔“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ”انتابڑا اور نامی گرامی ٹیررسٹ اور پروفیشنل قاتل اتنی آسانی سے ہمارے ساتھ کیسے آ گیا؟ اس کی جگہ کوئی عام بد معاش بھی ہوتا تو وہ مزاحمت ضرور کرتا پھر وہ تو امریکی ہے اس کی چیخ نکار پر یہاں کی سیکورٹی کے ساتھ ساتھ پولیس بھی فوری طور پر حرکت میں آ جاتی۔“ پھر میں چونک کر بولا۔ ”ہمارے ساتھیوں میں آئی ٹی کا ماہر کون ہے؟“ عدنان بھی خاصا ماہر تھا لیکن وہ تو اب امریکا میں ہے۔

”آئی ٹی کا ماہر اور کمپیوٹر کا کٹر اعامر ہے۔“ تیمور نے کہا۔

”وہی عامر جو اپنے چہرے سے فلاسٹر لگتا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”جی ہاں وہی عامر!“ تیمور نے کہا۔

”اسے ذرا بلاؤ۔“

تیمور نے سیل فون پر عامر کو بلا لیا۔ وہ اپنے چہرے سے واقعی فلاسٹر اور پڑھا کو قسم کا لڑکا لگتا تھا لیکن تیمور نے مجھے بتایا

تھا کہ اس کے چلیے اور چہرے پر مت جائیں یہ بہترین کمائنڈ ہے۔

”جی تیمور بھائی!“ اس نے مجھے سلام کرنے کے بعد کہا۔

میں نے جیب سے آرنلڈ کا سیل فون نکالا اور عامر کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”عامر! دیکھو اس سیل فون میں کوئی لوکیشن فائنڈر یا اسی قسم کی کوئی ڈیوائس تو نہیں لگی ہے؟“

عامر نے سیل فون ہاتھ میں لیا۔ وہ بلیک بیری سیل فون تھا۔ اس نے پہلے ہاتھ پر رکھ کے اس کے وزن کا اندازہ لگایا پھر اس کا پچھلا حصہ کھول لیا۔ اس نے سیل فون کی بیٹری نکالی تو اس میں مجھے دو سیم نظر آئیں۔

عامر نے غور سے اس کا جائزہ لیا پھر چٹلی سے پکڑ کر چھوٹی سی ایک چپ کھینچ لی جیسے عموماً سیل فونز میں میموری کارڈ ہوتا ہے۔

”یہ لوکیشن فائنڈر ہے۔“ عامر نے کہا پھر اس نے پوچھا۔ ”آپ نے اس سیل فون کو آف کب کیا تھا؟“

”میں نے گاڑی میں بیٹھنے کے بعد اسے آف کر دیا تھا۔“ میں نے کہا۔

”ٹھیکس مگڈ!“ عامر نے کہا۔ ”اگر آپ اسے آف نہ کرتے تو اب تک آرنلڈ کے ساتھی یہاں پہنچ چکے ہوتے۔ ویسے اس چپ میں ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ اس کے ذریعے دوسروں سے کی جانے والی بات بھی اس طرح کے کسی دوسرے سیل فون پر سنی جاسکتی ہے۔ اب آرنلڈ کے ساتھیوں کو یہ اندازہ تو ہو گیا ہوگا کہ آرنلڈ کو اغوا کر لیا گیا ہے۔“

”تیمور.....!“ میں نے چونک کر کہا۔ ”تم آرنلڈ کے جسم سے اس کا ایک ایک کپڑا اتار دو۔ گھڑی، پین اور سگار کیس ہر چیز نکال لاؤ۔ اس کے جوتے بھی اتار لینا۔“ پھر میں نے عامر سے کہا۔ ”تم تیمور کے ساتھ جاؤ۔“

ان کے جانے کے بعد میں نے نادیا سے کہا۔ ”تم نے ابھی تک مجھے ایک کپ کافی کے قابل بھی نہیں سمجھا؟“ اسی وقت کلثوم کافی لے کر آ گئی۔

”دیکھو تم سے زیادہ خیال تو کلثوم کو ہے۔ وہ جانتی ہے کہ مجھے کب کافی کی طلب ہوتی ہے۔“

”ابھی تو جی! مجھ سے نادیا ہی نے کہا تھا۔ اس وقت آپ کافی کب پیتے ہیں؟“

”اچھا۔“ میں نے سر کھینچ کر کہا اور کافی کا گگ اٹھا لیا۔

میں نے کافی ختم ہی کی تھی کہ تیمور اور عامر آ گئے۔ ان کے ہاتھوں میں آرنلڈ کی چیزیں تھیں۔

”اس کی گھڑی میں بھی ٹرائسمیٹر تھا اور انگلی میں بھی۔“ تیمور نے کہا۔ ”اگر اس کے منہ پر کپڑا نہ ہوتا تو شاید اب تک یہ ٹرائسمیٹر کے ذریعے اپنے ساتھیوں کو ہمارے بارے میں بتا چکا ہوتا۔“

اس کے جوگرز میں تو کوئی چیز نہیں تھی؟“ میں نے پوچھا۔ ”اس کے جوگرز میں ہمیں کوئی چیز نہیں ملی۔“ تیمور نے کہا۔

”ویسے وہ ہوش میں آچکا ہے اور ہمیں یوں دیکھ رہا ہے جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں کھا جائے گا۔ اس کے منہ میں تو کپڑا ٹھسا ہوا ہے ورنہ وہ زبان سے بھی گالیاں دیتا۔“

”چلو ایک نظر میں بھی اسے دیکھ لوں۔“ میں نے کہا۔ ”کچھ پوچھ گچھ کر لوں۔“

”میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔“ نادیا نے کہا۔

”تم ہوش میں تو ہو؟“ میں نے کہا۔ ”جانتی ہو اس وقت وہ کس حالت میں ہوگا؟“

”مارے جھینب کر رہ گئی اور بولی۔“ سوری! میں بھول گئی تھی کہ.....“

”یہ بھی کوئی بھولنے والی بات ہے؟“ میں نے کہا اور اٹھ کر تیمور کے ساتھ آرنلڈ کے کمرے کی طرف چل دیا۔

آرنلڈ فرش پر لیٹا تھا۔ کمرے میں فرنیچر نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔

”اس کا منہ کھولو۔“ میں نے تیمور سے کہا۔

تیمور نے اس کا منہ کھلوا دیا۔ پہلے تو اس نے دو چار گہری گہری سانسیں لیں پھر مجھے گھور کر بولا۔ ”تم کہہ رہے تھے کہ تم

”تو پھر؟“ میں نے درشت لہجے میں کہا۔

”تو پھر یہ تم کہ مجھے یہاں کیوں لائے ہو باسٹرڈ؟“

میں نے جھک کر اس کے چہرے پر اتنی زور سے تھپڑ مارا کہ میری انگلیوں کے نشانات اس کے گال پر ثبت ہو گئے۔

”آئندہ بات کرتے ہوئے اپنی زبان کو لگام دینا ورنہ میں تمہارے بدن کی کھال اتار لوں گا۔“

”تم ہو کون؟“ اس نے وہ سوال شاید چوتھی مرتبہ کیا تھا۔

”پہلے تم بتاؤ کہ تم کون ہو اور یہاں پاکستان میں کیا کر رہے ہو؟“

”میں States کا ایک بزنس مین ہوں اور ایک بزنس ڈیل کے سلسلے میں یہاں آیا ہوں۔“

”وہ ڈیل کہیں تم مشہدی کے ساتھ تو نہیں کر رہے؟“ میں نے اچانک پوچھا۔

وہ بری طرح چونکا پھر سبھل کر بولا۔ ”ہاں“ مشہدی کے ساتھ ہی کر رہا ہوں۔ وہ بھی بزنس مین ہے۔ کم سے کم اس نے مجھے یہ بتایا ہے۔“

”کتنے اسلحے کی ڈیل ہوئی ہے؟“

”میں اسلحے کا ڈیل نہیں ہوں۔“

”پھر مشہدی سے اس کے علاوہ ایک ہی ڈیل ہو سکتی ہے اس نے تمہیں کسے قتل کرنے کی ذمہ داری سونپی ہے؟“ میں نے اچانک کہا۔

وہ یوں چونکا جیسے اس کا پاؤں بجلی کے ننگے تار پر پڑ گیا ہو۔

”چوگومت آرٹلڈ.....!“ میں نے کہا۔ ”میں جانتا ہوں کہ تم ایک پروفیشنل قاتل ہو اور اب تک بہت سے اہم سیاست دانوں اور بیوروکریٹس کو ہلاک کر چکے ہو۔“ میں نے اندھیرے میں تیر پھینکا۔

”میں نے اب تک تمہارے ملک میں کسی کو ہلاک نہیں کیا۔“ اس نے گویا تسلیم کر لیا کہ وہ کرائے کا قاتل ہے۔

”میں اپنے ملک کی بات نہیں کر رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”تم نے یورپ اور امریکا میں جن لوگوں کو ٹھکانے لگایا ہے میں ان کی بات کر رہا ہوں۔“

”تم کون ہو اور یہ سب کچھ کیسے جانتے ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”میں نے اپنی شناخت بتائی تو تمہیں ہارٹ اٹیک ہو جائے گا۔ میں ڈیگال کا آدمی ہوں۔“

اس نے چونک کر مجھے دیکھا پھر اس کے چہرے پر مایوسی چھا گئی۔ ”تم ڈیگال کے آدمی ہو؟“ اس نے غیر یقینی سے پوچھا۔

”ہاں“ میں ڈیگال کا آدمی ہوں۔“ میں نے کہا۔

”لیکن مشہدی نے تو مجھے ایسی کوئی بات نہیں بتائی تھی؟“

”میں اگر بتا دیتا تو کیا تم راضی ہو جاتے؟“ میں نے کہا۔ ”اور اگر راضی بھی ہوتے تو اس کے مقابلے میں چوگنے معاوضے پر اب ذرا یہ بھی بتا دو کہ تم یہاں کسے قتل کرنے آئے تھے؟“

آرٹلڈ عجیب سے انداز میں مسکرایا اور بولا۔ ”میں جانتا ہوں کہ تم ڈیگال کے آدمی ہو اور وہ لوگ اپنے مخالفین کو کسی بھی حال میں زندہ نہیں چھوڑتے چاہے وہ کچھ بتائیں یا نہ بتائیں لیکن تم مجھ سے کچھ اگلا نہیں سکو گے۔“

”مجھے کچھ اگلا جانے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ میں جانتا ہوں کہ مشہدی نے پانچ آدمی باہر سے بلائے ہیں۔ ان سب کا مقصد ایک ہی ہے یہاں کی مقامی شخصیات کو قتل کرنا۔ تم اگر چاہو تو اپنے عقیدے کے مطابق خدا کو یاد کر لو کیوں کہ میں تم پر زیادہ وقت ضائع نہیں کروں گا۔“

آرٹلڈ پھر مسکرایا اور بولا۔ ”میں تو مرنے کے لیے تیار ہوں لیکن میرے بعد تم بھی بچ نہیں سکو گے۔ میرے آدمی یہاں پہنچنے ہی والے ہوں گے۔“

”تم شاید اس سیل فون کی وجہ سے ایسا کہہ رہے ہو جس میں لوکیشن فائنڈر چپ لگی تھی یا پھر اس گھڑی اور انگلی کی وجہ سے ان دونوں چیزوں میں ٹرانسمیٹر تھا۔ میں نے تمہاری ہر چیز تباہ کر دی ہے۔ ڈیگال کے آدمی اتنے احمق نہیں ہوتے ہیں جتنا تم نے سمجھ لیا تھا۔“

میں نے پہلی دفعہ اس کے چہرے پر زردی دیکھی۔ اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ ”تم واقعی ڈیگال کے آدمی ہو“

میں مرنے کے لیے تیار ہوں۔“

”تمہارا رابطہ یہاں کس سے تھا؟“

”تم تو خود ہی جانتے ہو کہ مجھے مشہدی نے یہاں بلایا تھا۔“ اس نے کہا۔

”سرنائم ضائع مت کریں، ہمیں ابھی اس کے دوسرے ساتھیوں کو بھی پکڑنا ہے۔“

”تو کیا تم اسے یہیں گولی مارو گے؟“

”میں اسے گولی نہیں بلکہ اس زہریلے خنجر سے ہلاک کروں گا جس کے زخم کے بعد انسان زندہ نہیں رہتا پھر میں اس کی لاش کوڑے کے کسی ڈھیر پر پھینک دوں گا۔“

”تم ایسا بھی تو کر سکتے ہو کہ اس کے ہاتھ پاؤں پکڑ کر اسے زندگی بھر کے لیے معذور کر دو۔ اس کی ریڑھ کی ہڈی توڑ دو کہ اس کے بقیہ زندگی عبرت کا نمونہ بنی رہے۔“

”ہاں یہ زیادہ آسان ہے۔“ تیمور نے کہا۔

”تم لوگ مجھے مار کیوں نہیں دیتے؟“ آرٹلڈ چیخ کر بولا۔

”یہ سزا تمہارے لیے موت سے بدتر ہے آرٹلڈ.....! تم نے اب تک جتنے لوگوں کا خون بہایا ہے اس کے مقابلے میں یہ سزا تو کچھ بھی نہیں ہے۔ تمہارا جس تنظیم سے بھی تعلق ہے وہ لوگ خود اپنے ہاتھوں سے تمہیں گولی مار دیں گے یا پھر تمہاری بقیہ عمر کراچی یا امریکا کے کسی فٹ پاتھ پر بھیک مانگتے گزرے گی۔“

”تم ایسا نہیں کر سکتے۔“ آرٹلڈ ہڈیالی انداز میں بولا۔

”میں ایسا ہی کروں گا۔“ میں نے کہا پھر تیمور سے مخاطب ہوا۔ ”تیمور.....! جاؤ! پانچ کلوا والا ہیر اور پلاس وغیرہ لے آؤ۔“

تیمور فوراً کمرے سے باہر نکل گیا۔

”دیکھو میں تم سے ریکونسٹر کر رہا ہوں کہ مجھے گولی مار دو یا جس طریقے سے تمہارا دل چاہے مجھے ہلاک کر دو لیکن میرے ساتھ یہ سلوک مت کرو۔ ڈیگال نے ہنگری میں ایک شخص کے ساتھ یہی سلوک کیا تھا وہ آج بھی ہنگری کی سڑکوں پر گھسٹا پھر رہا ہے۔ آدمی ناکارہ ہو جائے تو تنظیم والے بھی اسے نہیں پوچھتے۔“

میں نے اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ اس دوران میں تیمور ایک بھاری ہتھوڑا دو تین مختلف قسم کے پلاس اور ایک وارنر لے آیا۔

آرٹلڈ کے چہرے پر ہوائیاں اڑنے لگیں۔

”دیکھو میں تم سے زندگی کی بھیک نہیں مانگ رہا ہوں۔“ آرٹلڈ نے کہا۔ ”تم مجھ پر اتنا رحم تو کرو کہ مجھے اس اذیت ناک سزا کی بجائے ختم کرو۔“

”اس کے بدلے میں تم ہمارے ساتھ کتنا تعاون کرو گے؟“

تیمور نے پوچھا۔ ”بتاؤ تم یہاں کسے قتل کرنے آئے تھے؟“

”مجھے واقعی نہیں معلوم۔“ آرٹلڈ نے کہا۔ ”مشہدی کے آدمی نے ابھی تک ان لوگوں کی لسٹ ہمیں نہیں دی ہے۔“

”تم لوگ ایک جگہ تو ٹھہرے نہیں ہو گے۔“ میں نے کہا۔ ”بقیہ چار آدمی کہاں ہیں؟“
 ”ہم لوگ علیحدہ علیحدہ یہاں پہنچے ہیں۔ مجھے اتنا معلوم ہے کہ میرے علاوہ چار آدمی اور ہیں لیکن میں یہ نہیں جانتا کہ وہ کون ہیں اور کہاں مقیم ہیں؟“
 ”تیور.....!“ میں نے کہا۔ ”یہ تو کچھ بتانے پر راضی ہی نہیں ہے۔ تم اپنا کام کرو۔“
 تیور آگے بڑھا اور اس کے دائیں پاؤں پر اپنا پاؤں رکھ دیا۔ اس کے ہاتھ میں بھاری ہتھوڑا تھا۔ اس نے ہتھوڑے والا ہاتھ بلند کیا تو مجھے امید تھی کہ ابھی آرنلڈ چیخ کر گے گا کہ میں ابھی سب کچھ بتاتا ہوں لیکن اس نے بالکل چپ سا رہا۔

میرے اشارے پر تیور نے اس کی پنڈلی کو نشانہ بنایا اور ہتھوڑا خاصی قوت سے اس کی پنڈلی پر دے مارا۔
 مجھے آرنلڈ کی قوت برداشت پر حیرت ہوئی۔ اس کے منہ سے اگر چیخ نکلی بھی ہوتی تو اس نے وہ اپنے حلق میں گھونٹ لی۔

”دیکھو آرنلڈ.....!“ میں نے کہا۔ ”ابھی تمہاری صرف ایک ہڈی ٹوٹی ہے یہ دوبارہ جڑ سکتی ہے لیکن اگر یہ ہتھوڑا تمہارے گھٹنوں، ٹخنوں اور کہنیوں کے جوڑوں پر پڑا تو دنیا کا ماہر ترین آرٹھروپیدک سرجن بھی اسے نہیں جوڑ سکے گا۔ ہاں تم مصنوعی ہاتھ پیروں کی مدد سے کام چلا لو گے لیکن اپنی بیک بون کا کیا کرو گے؟ اگر وہ ٹوٹ گئی تو پھر ساری زندگی زمین پر کسی حقیر کیڑے کی طرح رہتے رہو گے۔“

میں نے تیور کو کمرے سے باہر نکلنے کا اشارہ کیا۔
 باہر آ کر میں نے اس سے کہا کہ سے کسی دیرانے میں لے جا کر گولی مار دو اور اس کے سینے پر ایک ٹیگ لگا دینا۔ ”مشہدی کے لیے اس کے ایک پرانے دوست کا تحفہ۔“

”کیا واقعی آپ نے اسے مارنے کا فیصلہ کر لیا ہے؟“
 ”ہاں وہ بھی تو یہاں سیر و تفریح کرنے نہیں آیا تھا، ہمیں مارنے ہی آیا تھا۔ جب آرنلڈ جیسے شخص کی لاش مشہدی کو ملے گی تو اس کا کیاری ایکشن ہوگا؟ اس کی موت کے بعد اس کے ساتھ آنے والے بقیہ چار آدمیوں کا حوصلہ بھی پست ہو جائے گا۔ ہاں اسے اسی طرح برہنہ حالت میں گولی مارنا اور لاش کے سینے پر پین کے ذریعے ٹیگ لگا کر اسے کوڑے کے کسی ڈھیر پر پھینک دینا۔“ میں نے یوں کہا جیسے کسی انسان کی نہیں بلکہ کسی پاگل کتے کی بات کر رہا ہوں۔

میں دوبارہ لاؤنج میں آ کر بیٹھ گیا۔ تھوڑی دیر بعد تیور، نعیم کی مدد سے چادر میں لپیٹا ہوا ایک انسانی جسم لے کر گاڑی کی طرف بڑھا۔ تیور نے شاید اسے ایک مرتبہ پھر ناک آؤٹ کر دیا تھا۔ اس کی گردن ایک طرف ڈھکی ہوئی تھی۔

”کیا یہ مر گیا؟“ نادیر نے پوچھا۔
 ”یہ ابھی تو نہیں مرا ہے لیکن کچھ دیر بعد مر جائے گا۔“ میں نے جواب دیا۔
 ابھی تیور اسے لے کر نکلا ہی تھا اور سے مشکل سے دس منٹ ہوئے تھے کہ مجھے گھر کے نزدیک پولیس موبائل کے سائرن کی کرخت آوازیں آئیں۔

پھر موبائل میں ہمارے دروازے کے سامنے آ کر رک گئی۔
 پولیس موبائل کے سائرن کی آوازیں کر میں گھبرا کر برآمدے میں نکل آیا۔ اس کا سائرن مسلسل بج رہا تھا اور میرے دماغ پر گویا ہتھوڑے برس رہے تھے۔

یہ پرتحس سنسنی خیز اور لہورنگ آپ بیتی ابھی جاری ہے
 بقیہ واقعات آئندہ شمارے میں ملاحظہ فرمائیں۔

☆☆☆☆

آوارہ حسینہ

عظیم الدین انصاری

دو جہد کی ایجاد موبائل کا شاخسانہ اس نے
 ایک بھولے بھالے نوجوان کو ذہنی مریض بنادیا تھا

انوکھی اور بڑے اثر کہانی



وہ دیکر کامیاب تھا، سردی اپنے عروج پر تھی۔ رات کو آٹھ بجے میں نے اپنا موبائل نکالا اور ایک ایس ایم ایس کیا۔ جس نمبر پر میں نے ایس ایم ایس کیا، وہ کسی لڑکی کا نمبر نہیں تھا مگر غلطی سے وہ ایس ایم ایس لڑکی کے موبائل پر چلا گیا۔

تھوڑی دیر بعد اسی نمبر سے مجھے کال آئی۔

میں نے کال ریسیو کی تو وہاں سے ایک آواز آئی۔ ”ہیلو۔“

یہ نسوانی آواز تھی اور میں پریشان ہو گیا کہ آج تک تو کبھی کسی لڑکی سے بات نہیں کی اور یہ کیا ہو گیا؟

میں نے ڈرتے ڈرتے جواب دیا۔ ”ہیلو۔“

پھر دوسری طرف سے آواز آئی۔ ”جی آپ کون؟“

میں نے کہا۔ ”کچھ نہیں۔“ اور لائن کاٹ دی مگر پریشان رہا کہ یہ لڑکی ہے پھر میں بھول گیا۔

اگلے دن میں نے پھر اسی نمبر پر sms کیا۔ کوئی عام سی شاعری تھی وہ۔ اس کے بعد اس نمبر سے بھی ایک میسج آیا کہ آپ کون ہیں؟

میں پھر پریشان ہو گیا تھا اور اپنا نام بتا دیا کہ عمیر ہوں۔ اس کے کافی دیر بعد ایک میسج آیا کہ کون عمیر؟

میں نے کہا۔ ”عمیر یعنی عمیر اور آپ کون صاحبہ ہیں؟“

اس نے اپنا نام سحر لکھ کر بھیجا۔ اس کے بعد بات سے بات نکلتی چلی گئی۔ میں نے اسے بتایا کہ میرا گاڑیوں کا شوروم ہے اور نام نہیں ملتا، بہت مصروف رہتا ہوں اور

اس نے بھی مجھے اپنی فیملی کے بارے میں بتایا۔ خیر وہ ہفتہ کی رات تھی جب ہم ایس ایم ایس پر بات کر رہے تھے۔ مجھے لگا کہ میں غلطی کر رہا ہوں۔ مجھے اس طرح اس لڑکی سے بات نہیں کرنا چاہیے۔ کچھ بھی ہے مگر ہے تو

میرے لیے ابھی مگر کیا کرتا؟

اگلے دن اتوار تھا اور پھر وقفے وقفے سے میسج پر بات کا سلسلہ جاری رہا۔

اتوار کی رات 11 بجے میں نے اس سے کہا کہ ہم اب ہر ہفتے کی رات سے اتوار کی رات تک ہی بات کر سکیں گے کیونکہ میں کام میں بہت مصروف رہتا ہوں اور گاڑیوں وغیرہ کی خرید و فروخت میں الجھا رہتا ہوں۔

وہ مان گئی۔ میں نے اسے بتایا کہ میرے ساتھ میری بہن کرن اور مکی پاپا ہیں یعنی گھر میں چار افراد رہتے ہیں اور گھر اپنا ہے۔ اس نے بھی بتایا کہ وہ بھی اپنے بھائیوں کی اکلونی بہن ہے اور ای ابو ساتھ ہیں یعنی اس کی فیملی بھی زیادہ بڑی نہیں تھی۔

رہی سی بات چیت کے بعد ہم نے ایک دوسرے کو الوداع کہا کہ اب آنے والے ہفتے کو بات ہوگی۔

اس کے بعد میں سو گیا۔ صبح اٹھا، کام پر گیا اور اس لڑکی کو بھول گیا۔ اسی طرح پورا ہفتہ گزر گیا اور ہفتے کی

شام کو اس کا sms آیا۔ اس میں لکھا تھا۔ ”عمیر! کیسے ہیں آپ؟“

میں نے اس وقت کوئی جواب نہیں دیا اور گھر واپس آ کر کھانا وغیرہ کھایا اور فریش ہو کر اپنے کمرے میں چلا آیا۔

پھر موبائل جیب سے نکال کر جواب دیا۔ ”ٹھیک ہوں اور آپ کیسی ہیں؟“

چند سیکنڈ کے بعد ہی اس کا بھی جواب آ گیا کہ ٹھیک ہوں پھر اس نے کہا۔ ”اتنی دیر سے انتظار کر رہی تھی آپ کے میسج کا!“

میں نے کہا۔ ”مصروف تھا، ابھی گھر آ کر کھانا کھایا ہے اور فریش ہو کر سب سے پہلے آپ ہی کو میسج کیا ہے۔ وہ خوش ہوئی۔ یہ میرا اندازہ تھا۔

رہی علیک سلیک کے بعد اس نے بتایا کہ وہ کالج میں پری انجینئرنگ میں پڑھتی ہے۔

جب اس نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کی تعلیم کیا ہے؟

میں نے کہا۔ ”MBA“

اسی طرح ایک دوسرے کے بارے میں جانتے ہوئے 11 بج گئے پھر میں نے کہا کہ نیند آرہی ہے، میسج بات کریں گے اور میں نے ایک آخری میسج سونے سے پہلے اسے لکھا کہ اپنا بہت خیال رکھنا، بائے بائے اور میں

سو گیا۔

اگلے دن یعنی اتوار کو صبح آٹھ بجے سوکر اٹھا۔ موبائل اٹھا کر دیکھا تو اسی وقت اس کا میسج آیا کہ عمیر صبح ہوئی اٹھ جائیں۔

میں مسکرایا اور لکھ کر بھیجا۔ ”سحر! میں اٹھ گیا ہوں۔“

اب داش روم جا رہا ہوں۔“

اس کا میسج آیا۔ ”گندے میسج آپ جب فری ہو جائیں تو بتا دیجیے گا۔“

میں ok کر کے داش روم چلا گیا اور اپنے سارے کام کرنے کے بعد یعنی فری ہونے کے بعد تقریباً 12 بجے اسے میسج کیا کہ کیا ہو رہا ہے؟

اس نے کہا کہ کھانا بنانے کی تیاری۔

میں نے کہا۔ ”ok“ بعد میں بات کرتے ہیں۔“

اس نے کہا۔ ”ٹھیک۔“

اسی طرح رات ہو گئی اور اس اتوار کو میں نے سحر کے بارے میں سوچنا شروع کیا کہ کتنی اچھی ہے۔ صبح مجھے اٹھانے کے لیے میسج کیا۔ میں بہت خوش تھا، پتا نہیں شاید مجھے اس سے محبت ہو گئی تھی۔ میں بہت بے تاب تھا، بہت پریشان تھا کہ کیسے بتاؤں اسے کہ سحر مجھے تم سے محبت ہونے لگی ہے۔

یہی سوچ رہا تھا کہ اس کا میسج آ گیا۔ ”فری ہو گئے آپ؟“

میں نے کہا۔ ”جی!“

پھر اس کا میسج آیا۔ ”کھانا کھایا؟“

میں نے کہا۔ ”نہیں۔“

اس نے کہا کہ جاؤ ابھی جا کر کھاؤ ورنہ میں ناراض ہو جاؤں گی۔

میں نے میسج پڑھتے ہوئے میں کتنا خوش ہوا تھا کہ آج تک مجھ سے کبھی کسی نے ایسا نہیں کہا تھا۔ وہ کتنا خیال رکھتی ہے میرا میں خوش خوش اٹھ کر کھانا کھانے چلا گیا۔

واپس آ کر میں نے اسے میسج کیا۔ ”آپ نے کھایا؟“

اس نے کہا۔ ”جی، کھایا۔“

مجھے ایک بات کا افسوس ہوا کہ اسی وقت میں نے کیوں نہیں پوچھا؟ پتا نہیں کیا سوچ رہی ہوگی کہ عمیر کو میرا خیال نہیں۔ میں نے اس سے پوچھا۔ ”سحر! پورا ہفتہ کیسے گزرا؟“

اس نے تفصیلات لکھ کر دیں کہ کالج جانا ہوتا ہے کالج سے واپس آ کر گھر کا کام پھر شام کو کوچنگ سینٹر اور پھر گھر آ کر کام بس پورا ہفتہ ایسے ہی گزرا۔ میں نے بھی اسے اپنی روٹین بتا دی کہ پورا دن شوروم میں گزارتا

ہوں، بہت تھک جاتا ہوں پھر کچھ ادھر ادھر کی بات کرتے ہوئے میں نے کہا کہ نیند آرہی ہے مجھے سونا ہے اور اس نے bye کہہ کر میسج کا تبادلہ ختم کر دیا۔

پھر پورا ہفتہ ایسے ہی گزرا۔ اس کے بارے میں سوچتا رہا اور اپنے کام میں بھی مصروف رہا پھر ہفتہ آ گیا اور شام کو میں نے میسج کیا۔ ”کیسی ہو؟“

10 منٹ بعد اس کا بھی جواب آ گیا۔ ”ٹھیک ہوں، آپ کیسے ہیں؟“ میں نے کہا۔ ”اللہ کا احسان ہے۔“ پھر میں نے کہا۔ ”رات کو بات کرتے ہیں ابھی گھر جانا ہے اور کچھ کام بھی ہے۔“

رات کو تقریباً 10 بجے میں نے اسے میسج کیا کہ اب میں فری ہوں۔ اس کا بھی میسج آ گیا۔ تھوڑی دیر تک ایسے ہی ادھر ادھر کی بات ہوئی اور اس نے کہا کہ عمیر میں نے آپ سے ایک جھوٹ بولا تھا۔ میں پریشان ہو گیا اور لکھا۔ ”کیا؟“

اس نے کہا کہ میرا نام سحر نہیں ہے، میرا نام عائشہ ہے۔ میں نے کہا۔ کوئی بات نہیں پھر اگلا میسج آیا کہ آپ سے ایک بات اور کہنا ہے۔ I'm really affectional with u. (مجھے آپ سے محبت ہو گئی ہے۔)

اُف! میں کتنا خوش ہوا تھا کہ جو میں کہتا چاہتا تھا وہ خود اس نے کہہ دیا مگر میں انجان بن کر بولا۔ ”affection کیا ہوتا ہے؟“

اس کا جواب آیا کہ آپ latest dictionary میں اس کا مطلب دیکھ لیں۔

میں نے ہنس کر کہا۔ ”عائشہ! me too!“

بس پھر کیا تھا ہماری محبت کی ابتدا ہو گئی مگر میں بہت پریشان تھا کیونکہ عائشہ نے تو سب سچ بتا دیا تھا اور میں جھوٹ پر جھوٹ بول رہا تھا۔ میں نے بہت جھوٹ بولا تھا اس سے سوائے اس کے کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں، میرا کوئی شوروم نہیں تھا، میری زیادہ آمدنی بھی نہیں تھی، ایک چھوٹی سی فیکٹری میں جاب کرتا تھا مگر میں نے اسے یہ سب نہیں بتایا اور کسی اچھے موقع کی تلاش میں رہا کہ وقت آنے پر سب سچ سچ بتا دوں گا۔

میں جانتا تھا کہ وہ سچ بول رہی ہے۔ میں نے اسے جب پہلی بار sms کیا تھا اس وقت مجھے نہیں پتا تھا کہ

سچی کہانیاں

سچی کہانیاں

سچی کہانیاں

سچی کہانیاں

سچی کہانیاں

سچی کہانیاں

وہ عائشہ ہوگی۔ میں تو اس کے بھائی کو میچ کر رہا تھا مگر یہ نہیں پتا تھا کہ میں جس نمبر پر میچ کر رہا ہوں وہ نمبر عائشہ کا ہے بس یہی سوچتا رہتا تھا میں ہر وقت کہ کیسے بتاؤں اسے کہ میں عمیر نہیں ہوں میں ایک عام سی شکل و صورت کا لڑکا ہوں زیادہ آمدنی نہیں ہے۔

ہماری بات دسمبر کے آخری ہفتے سے شروع ہوئی تھی اور اب پورے ڈیڑھ دو مہینے ہو گئے تھے وہ سچ بتا چکی تھی مگر میں نے نہیں بتایا تھا۔ میں جھوٹ پہ جھوٹ بول رہا تھا۔

اس نے مجھ سے پوچھا تھا کہ عمیر کیا ہم روز بات نہیں کر سکتے؟ میں نے کہا کہ نہیں کیونکہ میں مصروف رہتا ہوں اور کبھی کبھی شہر سے باہر بھی رہتا ہوں۔

اس کے سچ بتانے کے بعد اگلے دن اتوار تھا۔ میں نے اس سے کہا کہ میں آپ سے cell پر بات کرنا چاہتا ہوں۔ اس نے منع کر دیا کہ گھر میں سب ہیں مگر میں بغور رہا تو اس نے کہا کہ میں بولوں گی نہیں۔ میں نے کہا کہ اچھا سلام کر لیتا بس۔

پھر میں نے اسے کال کی اور کہا۔ ”Hi.“ اس نے کہا۔ ”السلام علیکم!“ اور میں جواب دینے ہی لگا تھا کہ کال کٹ گئی۔ ہم پھر میچ پر بات کرنے لگے۔ اس کی آواز ایسی تھی جیسے گرمیوں کے دنوں میں نیم کے درخت پر کوئل کی آواز ہوتی ہے اتنی مدھر اور میٹھی آواز میں اگلا پورا ہفتہ خود سے یہی کہتا رہا۔ ”السلام علیکم! السلام علیکم!“ میں بہت خوش تھا کہ مجھے بھی زندگی میں کسی لڑکی نے پیار کیا۔

میں اس کے سلام کرنے کی آواز کو بھول نہیں رہا تھا بلکہ یاد کر کے خوش ہوتا رہا اور عائشہ کی حالت کیا تھی یہ مجھے نہیں پتا تھا۔

پھر ایک دن میں نے سوچا کہ اب بہت ہو گیا ہے عائشہ نے اپنا نام سچ بتا دیا اپنے گھر کا ایڈریس ٹھیک دے دیا سب کچھ تو اس نے سچ بتا دیا اور ایک میں ہوں کہ جھوٹ بول رہا ہوں پھر میں نے ایک فیصلہ کیا کہ اب میں اسے سب سچ بتا دوں گا ہر حقیقت سے پردہ ہٹا دوں گا۔ چاہے کچھ بھی ہو۔ وہ مجھ سے بات کرے یا نہ کرے چاہے مجھ سے نفرت کرے مگر میں سچ بتا دوں گا۔ ایک دن ہمت کر کے میں نے اسے سچ بتا ہی دیا۔

وہ اتوار کا دن تھا دوپہر ایک بجے کا وقت ہو گا۔ میں نے اسے کال کی مگر اس سے پہلے sms پر اس سے کہا کہ میں نے آپ سے جھوٹ بولا ہے میں عمیر نہیں ہوں۔ اس نے کہا۔ ”مجھے پتا تھا کہ آپ عمیر نہیں ہیں اور ایک دن آپ خود سچ کہیں گے۔“

پھر میں نے کہا۔ ”میں نے اور بھی جھوٹ بولے ہیں میں کال کرتا ہوں اور آپ کال پر بات کریں۔ میں نے اسے کال کی اور اسے بتانے لگا کہ اصل میں میرا نام عمیر نہیں ہے میرا نام عاصم ہے اور میرا کوئی شوروم بھی نہیں ہے میں ایک فیکٹری میں اسٹنٹ انچارج ہوں۔ میری سیکری بھی کم ہے۔“ یہ بتاتے ہوئے میری آواز رونے کی وجہ سے خراب ہو گئی تھی۔

اس نے کہا کہ عمیر! آپ رورہے ہیں؟ میں نے اس کی بات کا جواب نہیں دیا اور کہا۔ ”آپ سے میں نے جان بوجھ کر بات نہیں کی تھی۔ میں آپ کے بھائی سے بات کرنا چاہتا تھا کیونکہ آپ کے بھائی جس لڑکی کو پسند کرتے ہیں میں اسے اپنی بہن کہتا ہوں۔ وہ لڑکی بھی آپ کے بھائی کو پسند کرتی ہے مگر آپ کے والدین اس رشتے پر راضی نہیں ہیں اور میں چاہتا تھا کہ آپ کے بھائی سے وجہ معلوم کروں کہ آپ کے والدین راضی کیوں نہیں ہیں؟ اسی وجہ سے میں نے آپ کے بھائی کا نمبر اپنی اس منہ بولی بہن کے سیل سے نکالا تھا مگر غلطی سے وہ آپ کا نمبر نکلا اور میری اس بہن کو تو پتا تک نہیں ہے کہ میں یہ کام کروں گا اور پلیز آپ اس کو جانتی ہیں آپ بھی ان سے کوئی ذکر مت کرنا پلیز یہ کہتے کہتے میں تقریباً رو پڑا۔

پھر اس کی طرف سے بھی خاموشی تھی اور میری طرف سے بھی۔

تھوڑی دیر بعد میں پھر بولا۔ ”میں آپ سے محبت کرتا ہوں جسی آپ کو سب سچ بتا دیا اور آپ میری اس بہن ثناء کے توسط سے مجھے جانتی بھی ہیں۔ وہ ایک الگ بات ہے کہ ہم نے کبھی بھی ایک دوسرے کو نہیں دیکھا۔ میرا یہ سب سچ سننے کے بعد آپ چاہیں تو مجھ سے بات کریں چاہیں تو نہ کریں مگر پلیز آپ اپنے ذہن میں میرا یہ میسج مت رکھیے گا کہ میں جھوٹا ہوں مکار ہوں میں آپ سے بہت محبت کرتا ہوں۔“

اس کے بعد مجھے عائشہ کی آواز سنائی دی کہ
عاصم! آپ نے مجھے use کیا، صرف اپنی بہن وہ بھی
منہ بولی بہن کی خاطر، شام کی خاطر! آپ مجھ سے بھی یہی
چاہتے تھے کہ میں آپ کی بہن کو اپنی بھابی
بتاؤں۔ never ایسا ہو نہیں سکتا کیونکہ مجھے شام پسند
نہیں اور رہی بات ہمارے تعلقات کی تو وہ میں آپ کو
سوچ کر بتاؤں گی۔“

یہ سب بتاتے ہوئے عائشہ بھی رو رہی تھی اور میں
بھی۔ خیر اس نے bye کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔
میں اتوار کی رات کو اس کے میسج کا ویٹ کرتا رہا مگر
نہیں آیا اور نیند بھی نہیں آرہی تھی۔ میں پوری رات
جاگتا رہا اور سوچتا رہا کہ میں نے اچھا کیا جو اسے سب سچ
بتا دیا ورنہ سچ تو اسے آخر معلوم ہو ہی جاتا پھر اس کے
ذہن میں میرا کیا ایجنڈا بنتا۔
صبح ہو گئی۔ میں فیکٹری چلا گیا۔
خلاف توقع دن میں اس کا میسج آیا۔ ”عاصم! کیسے
ہو؟“

میں اتنا خوش ہوا کہ میرے پاس الفاظ نہیں
ہیں لکھنے کے لیے۔ میں نے جواب دیا۔ ”ٹھیک ہوں اور
آپ؟“

”بس ٹھیک ہوں۔“ اس نے جواب دیا۔

میں نے پوچھا۔ ”ہفتے کو بات کرو گی؟“

اس نے کہا۔ ”مجھے آپ کی آواز سننا ہے۔“ پھر میں
نے اسے کال کی اور ہم بات کرنے لگے۔ اس وقت اس
نے کہا۔ ”عاصم! میں نے جب پہلی بار تمہاری آواز سنی تھی
تو تم نے Hi کہا تھا اور میں بہت دن تک خود سے
Hi کہتی رہی اور بھائیوں سے بھی امی ابو سے بھی اپنے
فریڈز سے کہتی رہی اور سب مجھے پاگل سمجھنے لگے تھے۔“
میں نے پوچش میں میری تھی مگر میں نے اسے نہیں بتایا اور
جب میں نے اس سے کہا کہ میں نے تم سے جھوٹ بولا
تھا اور اب آج کے بعد کبھی بھی کوئی جھوٹ نہیں بولوں گا۔
کیا تم مجھ سے اب بھی پیار کرتی ہو؟“

تو اس نے کہا۔ ”عاصم! اگر نہیں کرتی تو کبھی بھی تم
سے بات نہ کرتی اور مجھے پتا ہے کہ اب تم سچے ہو اور واقعی
مجھے چاہتے ہو۔“

پھر ہم نے اللہ حافظ کہہ کر رابطہ منقطع کر دیا۔

ہفتے کا دن آیا تو ہماری بات ہوئی۔ یہ جولائی کا مہینا
تھا اور ہمارے بیچ ایک ایسی بات ہوئی تھی جو میں قارئین
کو بھی نہیں بتا سکتا۔

اس مہینے میں نے خود کشی کی کوشش کی تھی اور عائشہ کو
بتا کر یہ کام کر رہا تھا مگر اپنا موبائل آف کر دیا تھا کہ عائشہ
بھی مجھے نہ روک سکے مگر بد قسمتی سے میں بچ گیا۔

میں ہسپتال میں تھا تو ہوش آتے ہی میری زبان پر
عائشہ ہی کا نام تھا۔

خیر جیسے تیسے کر کے میں گھر واپس آیا۔ موبائل آن
کیا تو عائشہ کے 5,6 میسجز میرے منتظر تھے۔

میں میسج پڑھ ہی رہا تھا کہ فوراً اس کی کال آ گئی۔ میں
نے ریسپونڈ کیا تو وہ مجھے برا بھلا کہنے لگی کہ تم کتنے خود غرض
ہو مرنے چلے گئے اتنی سی بات پر اور وہ رونے لگی۔

مجھے لگا کہ پورا دن وہ روتی رہی ہے۔ میں نے
کہا۔ ”ہاں سچ گیا“ زندہ ہوں بعد میں بات کرتے
ہیں۔“

میں نے لائن کاٹ دی اور اس کے آئے ہوئے میسج
پڑھنے لگا۔ ان میں سے ایک میسج تھا کہ عاصم! اگر تمہیں
کچھ ہو گیا تو میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی اور نہ
ہی تمہارا بیٹا علی!

”علی! ارے یہ علی کون ہے؟“ میں نے فوراً اسے
میسج کیا کہ یہ علی کون ہے؟

اس نے کہا۔ ”ہمارا بیٹا علی اور اب وہ چھ مہینے کا ہو گیا
ہے۔“ میں بہت پریشان ہو گیا کہ عائشہ یہ سب کیا
کر رہی ہے؟ کیوں میرے ساتھ ایسا کر رہی ہے؟ پھر
فوراً ہی اس کا میسج آ گیا کہ عاصم! تصور میں وہ ہمارا بیٹا
ہے یعنی ہماری بات کو چھ مہینے ہو گئے اور وہ ہمارا بیٹا بھی
چھ مہینے کا ہے۔“

اوہ تو اب سمجھ میں آیا کہ مستر مہ کو تو ماں بننے کا بھی
شوق ہے۔ میں اپنے سارے غم بھلا کر خوش ہو گیا کہ ہاں
واقعی علی میرا اور عائشہ کا بیٹا ہے۔

دن گزرتے رہے ہمارا پیار بھی بڑھتا گیا اور تصور
ہی تصور میں ہمارا بیٹا بھی ہمارے ساتھ ساتھ۔

ایک وقت وہ بھی آیا کہ ہماری جاب ختم ہو گئی کیوں
کہ کمپنی کو نقصان ہوا اور وہ بند ہو گئی تھی۔ یہ بات میں نے
عائشہ کو بتائی تھی۔ اس نے کہا کہ فکر مت کرو۔ انشاء اللہ

سبزی منڈی

نئی بیوی کے حسن کی تعریف کرتے ہوئے شوہر نے کہا۔ ”تمہاری انگلیاں بھنڈی کی طرح خوب صورت ہیں، گال سیب کی طرح لال ہیں، آنکھیں آلو جیسی بڑی ہیں اور.....“

رہیں اور میری جاب پھر چلی گئی۔ میں چاہتا تھا کہ کوئی مستقل جاب مل جائے پھر میں عائشہ کے گھر جاؤں اور جاب بھی کر لے کے ہی نہیں دے رہی تھی۔ جوتی بھی گئی وہ عارضی اور کم سٹری والی تو کیا کرتا؟ تقریباً ایک مہینہ گزر گیا۔

میں نے عائشہ سے کہا۔ ”عائشہ، کیا ہم مل سکتے ہیں؟“

اس نے کہا۔ ”نہیں، ہم مل نہیں سکتے مگر ہاں دیکھ سکتے ہیں۔ تم کالج کے پاس آ جاؤ۔“

میں نے اس سے کہا۔ ”میں کب آؤں؟“

اس نے کہا۔ ”مجھے کی صبح 8 بجے آ جاؤ۔“

جمعرات کی رات کو میں بہت خوش تھا۔ مجھے پتا تھا کہ ہم ملیں گے۔ وہ کم از کم میرے پاس تو آئے گی، تھوڑی دیر تو رکے گی۔ میں پوری رات سو نہیں سکا۔

میں نے رات کو تین بجے ایک اچھا سا سوٹ نکالا۔ رات کو 3 بجے پر بس کیا۔

صبح تیار ہو کر میں نے اپنے آپ کو آئینے میں دیکھا تو چونک گیا کہ عاصم تو خود کو دیکھ پہلی بار ڈیٹ پر جا رہا ہے اور تو ہنڈسم بھی نہیں، خوبصورت بھی نہیں۔

میں افسردہ ہو گیا کہ پتا نہیں اسے پسند آؤں گا بھی یا نہیں؟ پھر میں نے پہنا ہوا سوٹ اتار دیا کہ نہیں، میں عام سا بندہ ہوں، عام سی صورت ہے تو عام سے ہی کپڑے پہنوں گا۔ وہ مجھے ضرور پسند کرے گی۔

میں عام سی پینٹ شرٹ پہن کر بغیر ناشتا کیے گھر سے نکل گیا اور ساتھ میں ایک گلاب کی کٹی بھی لے لی تھی اس کے لیے۔ وہ میں رات میں ہی لے آیا تھا۔

جیسے تیسے کر کے میں وہاں پہنچ گیا۔ وہاں پہنچ کر سب سے پہلے میں نے ایک ہوٹل پر چائے پی۔ اس

مل سکتے ہیں ایک بار؟

میں نے کہا۔ ”ہاں، ہم مل سکتے ہیں۔“

اس دوران ہی میری جاب لگ گئی تھی وہ بھی عام سی ہی جاب تھی اور میں نے عائشہ سے کہا تھا کہ جیسے ہی میری اچھی جاب لگی میں خود تمہارے گھر آؤں گا امی ابو سے تمہارا ہاتھ مانگنے۔“

خیر اس نے ملنے کو کہا تھا اور میں نے کہا کہ ہاں دیکھو، ہم ملیں گے انشاء اللہ اور ایک دوسرے کو دیکھیں گے مگر مجھے پتا ہے کہ تم جب مجھے دیکھو گی تو منع کر دو گی، تم مجھے رجیکٹ کر دو گی۔“

اس نے کہا۔ ”ایسا نہیں ہوگا۔ میں تم سے محبت کرتی ہوں۔ اگر تم ایک عام سی شکل و صورت کے مالک ہو تو میں بھی ایسی ہی ہوں اور اگر تم میری گردن دیکھو تو تم خود مجھے منع کر دو گے۔“

میں نے کہا۔ ”امپا سبل، تم جیسی بھی ہو میرے لیے حسین پری کی طرح ہو، بہت خوبصورت ہو۔“

اسی طرح ایک مہینہ گزر گیا اور ہم ملے نہیں مگر ہماری بات بدستور ہوتی رہی۔

ایک دن میں نے اسے صبح کے وقت کال کی اس نے بتایا کہ سب سو رہے ہیں گھر میں اور ابھی کھل کر ہم بات کر سکتے ہیں۔ وہ کچن میں تھی اور بولی کہ عاصم! میرے ذہن سے تمہاری وہ بات نہیں جاتی جو تم نے اس رات کہی تھی۔

میں نے کہا بھی کہ یار پلیز، غلطی ہو گئی تھی، کیا تم نے ابھی تک معاف نہیں کیا؟

اس نے کہا۔ ”ہاں، کر تو دیا معاف مگر دل میں دراڑ آ گئی ہے اس کا کیا کروں؟“

میں نے کہا۔ ”ایسا ہے تو بات کرنا چھوڑ دو مجھ سے“

”o.k.“

وہ ہنسنے لگی۔ ہم پھر محبت بھری باتیں کرتے رہے اور اس نے بتایا کہ میں پھر سے ماں بننے والی ہوں۔ میں خوش ہو گیا۔ واقعی علی کے بعد اب ہماری بیٹی ہوگی اور اس کا نام ہوگا دعا۔ دعا! ہماری بیٹی ہوگی۔

اسی طرح بات کرتے کرتے اس کے امی ابو اٹھ گئے اور ہمارا رابطہ ختم ہو گیا۔

ہمارے درمیان پھر اسی طرح محبت بھری باتیں چلتی

صبح ہو گئی تھی مگر اس کا پتا نہیں تھا پھر دس بجے صبح اس کا میسج آیا کہ عاصم! تم نے مجھے ایسا کہا۔ میں اپنے ایک منہ بولے بھائی سے بات کر رہی تھی۔ میں نے لکھ کر بھیجا کہ کوئی بھی لڑکی اپنے بھائی سے اس طرح چار گھنٹے بات نہیں کرتی تو تم نے کیوں کی؟ اگر یہی حرکت میں کرتا تو تم کیا کہتیں مجھے؟ یہی تاکہ میں بدکردار ہوں؟“

اس کے بعد اس کا کوئی میسج نہیں آیا اور میں اس کو ہر پانچ دس منٹ بعد اسی طرح کے میسج کرتا رہا۔

شام ہو گئی تھی پورا دن اپنے کمرے میں رو رہا۔

میں رات سے رو رہا تھا اور اب اگلی رات آنے والی تھی۔ آنسو رک ہی نہیں رہے تھے پھر شام کو اس کا میسج آیا کہ میں آپ کے گھر آنے کا اور آپ سے شادی کا انتظار کروں گی۔

اس نے مجھ سے پوچھا کہ کھانا کھایا؟ تو میں نے کہا۔ ”نہیں!“ میں چاہتا تو کہہ دیتا کہ ہاں، کھالیا مگر نہیں کہا کیوں کہ وہ جھوٹ ہوتا اور میں نے اسے جب اپنی حقیقت بتائی تھی تب ہی بتا دیا تھا کہ اب تم سے بھی جھوٹ نہیں بولوں گا۔

اس نے مجھے سکٹ کھانے کا مشورہ دیا اور میں نے دوسکٹ کھا لیے۔

اگلے دن اس کا میسج آیا کہ پلیز، معاف کر دو پھر میں نے کال کی تو ساری بات اس نے کلیئر کر دی کہ عاصم! وہ میرا بھائی ہے اس کا نام مزل ہے اور میں اس سے بات کر رہی تھی۔ میں اس لڑکے کے بارے میں جانتا تھا کیوں کہ عائشہ بہت پہلے اس کا ذکر کر چکی تھی مگر میں نے کہا کہ رات میں کیوں وہ بھی چار گھنٹے اور میں اتنے میسج کر رہا تھا، تمہیں پتا نہیں چلا؟

اس نے کہا۔ ”میسج میموری فل تھی، جب صبح پرانے میسج delete کیے تو پھر تمہارے میسج پڑے اور میں بھی روتی رہی تمہاری طرح۔ خیر اس نے مجھ متا لیا اور ہمارے بیٹے کی قسم کھائی کہ میں پاک ہوں۔ ہم پھر سے پہلے کی ہی طرح ہو گئے تھے مگر اس کے اور میرے دل میں ایک غلط یاد دراڑ تو پیدا ہو گئی تھی پھر بھی ہم بات کرتے تھے۔

ایک بار ہم رات میں بات کر رہے تھے۔ عائشہ نے کہا۔ ”عاصم! ہم نے ایک دوسرے کو دیکھا نہیں، کیا ہم

اس سے اچھی جاب ملے گی۔

پھر میں دوسری جاب کی تلاش میں پھر تارہا مگر اس دوران عائشہ اور میری بات مسلسل ہوتی رہی تھی۔ اب ہم ہفتے میں نہیں بلکہ روز بات کرتے تھے اور اکثر تو رات میں کال پر ہی بات کرتے تھے اور پھر روزانہ پوری پوری رات کال پر بات کرتے تھے۔

پھر اچانک ایسا ہوا کہ میں رات کو عائشہ سے میسج پر بات کر رہا تھا اور اس کے اچانک میسج آنا بند ہو گئے۔ میں نے سوچا کہ شاید سو گئی ہے۔ پتا نہیں کیا ہوا تھا مجھے؟ میں نے اسے کال کر دی مگر اس کا نمبر مصروف جارہا تھا۔

دس منٹ بعد پھر ٹرائی کیا مگر مصروف پھر دس منٹ بعد پھر مصروف اسی طرح ایک گھنٹہ گزر گیا۔

میں اپ سیٹ ہو گیا پھر میں نے میسج کیا کہ تم سوئیں نہیں؟

اس کا کوئی جواب نہیں آیا۔ میں نے پھر کال کی تو بیل جا رہی تھی اور لائن کاٹ دی گئی۔ میں نے دوبارہ کی تو مصروف اب تو غم اور غصے سے میرا برا حال تھا۔

میں نے میسج کیا کہ دو گھنٹے ہونے والے ہیں اور تم مصروف ہو؟

اس کا کوئی جواب نہیں آیا۔ اس کا موبائل مسلسل مصروف تھا پھر تو جو میرے دل میں بات آئی وہ کرتا گیا کہ تم غلط لڑکی ہو میں نے غلطی کی تم سے پیار کر کے تمہارے نزدیک محبت کچھ نہیں، بس ہوس ہے اسی لیے پتا نہیں آدھی رات کو کس سے لگی ہوئی ہو؟ اس کے علاوہ بھی اسے پتا نہیں کیا کیا میسج کر دیے۔

تقریباً 60،70 میسج کے تھے جن میں اسے میں نے خراب لڑکی کہا تھا اور میں مسلسل روئے جارہا تھا بہت رو رہا تھا میں اس رات۔

پھر رات چار بجے اس کا میسج آیا کہ عاصم! تم سو جاؤ، صبح بات کریں گے۔

وہ سو گئی تھی اور میری آنکھیں رو رو کر سو ج گئی تھیں۔ میں صبح ہونے کا بھی انتظار کر رہا تھا کہ اب محترمہ کہیں گی کہ تم غریب ہو، ایک جاب تک نہیں تمہارے پاس اور میں جس سے بات کر رہی تھی وہ امیر ہے شادی بھی اسی سے کروں گی۔ یہ سوچتے سوچتے میں اور زیادہ رو پڑا تھا۔

کے بعد اس کا میسج آیا۔ ”کہاں ہو؟“
میں نے کہا۔ ”ہوسٹل پر ہوں چائے پی رہا ہوں۔“
اس نے کہا۔ ”جلدی آؤ“ میں گھر سے نکل گئی
ہوں۔“

میں فوراً ہوسٹل سے باہر آیا اور دوست سے ادھار
مانگی ہوئی بایک اشارت کر کے مطلوبہ جگہ پہنچ گیا جہاں کا
اس نے ایڈریس دیا تھا۔

پھر میں اس کا انتظار کرنے لگا۔ وہ دور سے مجھے نظر
آ گئی۔ وہ عبایا میں تھی سر پر اسکارف تھا۔ شولڈر پر ایک
بیک تھا۔ میرے دل نے کہا۔ یہ وہی ہے یہی ہے میری
عائشہ۔ وہ میرے تھوڑے فاصلے سے مسکراتی ہوئی چلی
گردن کرتی ہوئی چلی گئی۔

پھر ایک میسج آیا کہ تم بیوشرٹ میں ہونا؟
میں نے کہا۔ ”ہاں تم کہاں ہو؟ آ جاؤ۔“
اس نے کہا۔ ”میں نے تمہیں دیکھ لیا۔ اب تم جاؤ
جانو!“

کیا بتی ہوگی مجھ پر۔ میں نے کہا۔ ”تم کہاں ہو؟“
اس نے کہا۔ ”کانج کے پاس ہوں۔ تم وہاں
آ جاؤ۔“

میں نے کہا کہ اچھا اپنی دوستوں کو دکھاؤ گی پھر تم
سب مل کر میرا مذاق بناؤ گی کہ دیکھو کتنا برا لڑکا ہے۔
میں کانج کے پاس گیا۔ اسے کال کی اس نے ریسیو
نہیں کی اور اس کے بعد میسج کیا کہ میں کانج کے پاس
ہوں۔ اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔

وہ کانج کے اندر جا چکی تھی۔ میں تقریباً ایک گھنٹا
وہیں کھڑا رہا اور واپس گھر کی راہ لی اور واپس آتے
ہوئے وہ گلاب کی کٹی ایک کوڑے کے ڈھیر پر پھینک
دی۔ اس کے کانج اور میرے گھر تک کا فاصلہ ایک گھنٹے کا
ہے مگر میں بایک پر تھا تو غصہ میں اتنی تیز رفتاری سے
بایک چلائی کہ پتا ہی نہیں چلا اور میں بیس منٹ میں گھر
پہنچ گیا۔

دو پہر دو بجے کے قریب میں نے اسے میسج کیا کہ
عائشہ! تم نے ایسا کیوں کیا؟ جب ملنا ہی نہیں تھا تو بلایا
کیوں تھا؟

اس نے کہا۔ ”میں نے ملنے کو نہیں کہا تھا صرف
دیکھنے کو کہا تھا۔“

میں نے عائشہ کو گلاب کی کٹی کے بارے میں بتا دیا
تھا کہ وہ میں تمہارے لیے لایا تھا اور اسے پھینک دیا۔
پھر اس نے کہا۔ ”بعد میں بات کرتے ہیں۔ میں
ابھی مصروف ہوں۔“

اس کے بعد اگلے دن ہفتے کو ہماری بات نہیں ہوئی
کیوں کہ میں تو میسج کر رہا تھا مگر وہ جواب نہیں دے رہی
تھی۔ میں نے اسے میسج پر کہہ دیا کہ عائشہ! میں تمہیں پسند
نہیں آیا؟

شام کو تقریباً 7 بجے اس کا میسج آیا۔ ”عاصم! میرے
پھوپھو کی ڈیٹھ ہو گئی ہے۔ ہم سب جا رہے ہیں۔ تم میسج
مت کرنا۔“

میں نے کوئی میسج نہیں کیا۔ پورا ایک ہفتہ گزر گیا مگر
اس کے بعد میں نے اسے بہت میسج کیے بہت کالز کیں نہ
کسی میسج کا جواب آیا نہ وہ کال ریسیو کرتی تھی۔

میں دو مہینے تک مسلسل اسے کال اور میسج کرتا رہا
تب کہیں جا کر اس کا میسج آیا۔ ”عاصم! میں نے تمہیں
ٹھیک طرح سے دیکھا تک نہیں تھا۔ میں نے تمہیں مسترد
نہیں کیا۔ کوئی اور بات ہے۔“

میں نے بہت پوچھا مگر اس کا کوئی جواب نہیں آیا۔
اس کے بعد میں نے اسے ایک آخری میسج کیا کہ
عائشہ! یہ عاصم کا وعدہ ہے کہ جب تک تم مجھے مجبور نہ
کردو میسج یا کال کرنے پر میں بھی تمہیں کوئی میسج یا کال
نہیں کروں گا۔

اس کے بعد میں نے کبھی بھی اس سے کسی بھی طرح
سے رابطہ نہیں کیا بس جب یاد آتی ہے تو آنکھ سے آنسو
نکل آتے ہیں۔

لڑکیاں کتنی ظالم ہوتی ہیں بس اچھی شکل کے
مردوں ہی کو پسند کرتی ہیں یہ میں جان گیا ہوں۔

ایک انتہائی اہم اور بنیادی بات تو میں آپ کو بتانا
ہی بھول گیا بلکہ شرمندگی کے باعث نہیں بتائی۔

مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ عائشہ کا اصل نام عائشہ بھی
نہیں بلکہ نسرین تھا اور وہ پہلے سے شادی شدہ تھی۔ اس کا
شوہر دوپٹی میں تھا۔ وہ محض وقت گزاری کے لیے مجھ سے
فلرٹ کر رہی تھی۔ وہ واقعی ایک بیٹے علی کی ماں تھی لیکن
اس کا باپ میں نہیں تھا۔

.....☆☆.....

انوکھی کہانیاں جن کا انوکھا پن آپ بھی محسوس کریں گے

جسے چاہا تھا

عبدالحمید جانی

زندگی نام ہے خوشیوں، مسرت، شادمانی اور کامیابی
کا لیکن اس کے برعکس زندگی پانی کا بلبل بھی ہے

ملتان سے پہلی انوکھی کہانی



زندگی کیسے؟ اللہ تعالیٰ کا خوبصورت عطیہ خوبصورت نعمت، یوں تو خوشی و غمی زندگی کا حصہ ہیں۔ زندگی اس وقت اور بھی حسین ہو جاتی ہے جب اپنی جان سے بڑھ کر چاہنے والا مل جائے۔ زندگی پھولوں کی طرح کھلکھلا اٹھتی ہے۔ ہر طرف بہار ہی بہار ہوتی ہے۔ پرندے گیت گاتے ہیں۔ کوئل نغمے سناتی ہے۔ دنیا کا ہر ذرہ حسین لگتا ہے۔ ہر چیز مبارک باد دیتی محسوس ہوتی ہے مگر یہی زندگی اس وقت ویران عذاب مسلسل لگتی ہے جب جان سے زیادہ عزیز جان لینے پر تل جائیں۔ عزت کے رکھوالے عزت نیلام کرنے لگیں، زندگی ویران، سنان کنڈرات کی ہو جاتی ہے۔ بے رونق سی زندگی اجڑی سی زندگی، لمحہ لمحہ عذاب مسلسل، آنسوؤں میں نہاتی زندگی بے جان سی ہو جاتی ہے۔

سیانے سچ ہی تو کہتے ہیں اگر زندگی میں دکھ، درد، غم، الم، آہیں، سسکیاں، آنسو نہ ہوتے تو یہ بھی فنا نہ ہوتی۔ زندگی کو موت نہ آتی۔ یہ بھی نہ مرنی، یہ بھی نہ مڑ جھانی۔ کون بشر ہے جو خوشیوں بھری زندگی نہیں چاہتا؟ پیار کرنے والا محبوب نہیں چاہتا۔ ہر زندگی کے حسین سنے ہوتے ہیں لیکن جب یہی سنے پل بھر میں ریزہ ریزہ ہو کر بکھرتے ہیں تو روح تک زخمی ہو جاتی ہے۔ دل خون کے آنسو روتا ہے۔ اپنے پرانے ہو جاتے ہیں۔ دوست دشمن بن جاتے ہیں۔ جان دینے والے، آنکھوں میں حسین سنے سجانے والے، آنسوؤں کی سوغات دے جاتے ہیں۔ خون سے تر بہ تر آنکھیں کیسے زندگی چاہتی ہوں گی؟ آنسو دینے والا خود تو کسی اور کی زلفوں کا اسیر ہو جاتا ہے لیکن جس کے سنے ٹوٹے ہوں جن کے یار بچھڑے ہوں، اپنے پرانے ہوئے ہوں وہ کیسے چین کی زندگی بسر کر سکتا ہے؟ ان کی تو نیندیں روٹھ جاتیں ہیں۔ آنکھیں چھم چھم برتی ہیں۔

جب پیار کرنے والے سچ راہوں میں کانٹوں کے حوالے کر کے خود پھولوں کی تاج پر سو جاتے ہیں تو دل کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جاتے ہیں۔ روح زخمی ہو جاتی ہے۔ انگ انگ سے خون کی بوندیں ٹپکتی ہیں۔ زبان، بے زبان ہو جاتی ہے ہونٹوں پہ قفل لگ جاتے ہیں۔ آنکھیں سنان، بھر وادی کی طرح ہو جاتی

ہیں۔ آنسو، آہیں، سسکیاں مقدر بن جاتے ہیں۔ ہزاروں سنے آنکھوں میں سجا کر حسین خواب دکھا کر جب پل بھر میں چکنا چور کر دیے جاتے ہیں تو موت سے پہلے موت آ جاتی ہے۔ قیامت سے پہلے قیامت برپا ہو جاتی ہے۔ ساتھ جینے مرنے کے عہد و پیمان کرنے والے پل بھر میں بھی وعدے، قسمیں توڑ کر روح زخمی زخمی کر کے بدل جاتے ہیں۔ جن کی خاطر اپنوں کو چھوڑ دیا جاتا ہے جن کی خاطر زمانے بھر سے دشمنی مول لی جاتی ہے جب وہی پیار کے خوبصورت حسین محل کو گرا کر تباہ ویران، رقیب کی ہاتھوں میں جا جھولتے ہیں، کیا منظر ہوتا ہوگا؟ آسمان بھی روتا ہوگا؟ چاند بے بسی، اداسی کا لبادہ اوڑھ کر خاموش تماشا بنی ہوگا۔۔۔ یہ تو ان سے پوچھیے جن کے یار بچھڑے ہیں۔ جن کے اپنے پرانے ہوتے ہیں۔ جن کا زندگی بے رونق سی ہو جاتی ہے۔ درد، درک ٹھوکریں مقدر بن جاتی ہیں۔ وہ پیار کے پجاری پیار کا کیسے ماتم کرتے ہوں گے؟ اپنوں کے غم کیسے بھلاتے ہوں گے؟ اپنے زخموں پہ کیسے مرہم رکھتے ہوں گے؟ آنسو جو تیزاب بن کر دل کو جھلساتے ہوں گے پل پل مرتے ہوں گے ان کی زندگی، موت کی آغوش میں چلی جاتی ہوگی۔ جب اعتبار کے بندھن ٹوٹے ہیں تو زندگی سسکتی، تڑپتی ہے۔ دل خون کے آنسو روتا ہے بالکل اسی طرح جس طرح لمبی مسافت کرنے والے مسافر کی منزل کہیں کھو جائے۔

میں نے پیار کی خاطر اپنوں کو ٹھکرا دیا۔ زمانے بھر سے ٹکرا گئی۔ ہر طوفان کا مقابلہ ڈٹ کر کیا۔ اذیت برداشت کی، زخموں سے چور ہوئی۔ بدنامی کے طوق گلے میں لٹکائے۔ مجھے بدلے میں ملا بھی تو کیا ملا۔ محبوب ہر جانی ہو گیا۔ اپنے بھی روٹھ گئے۔ زندگی سنان صحرا کی مانند ہو کر رہ گئی۔ آنسوؤں نے اپنے ڈیرے جما لیے۔ غموں نے اس گھر کا راستہ دیکھ لیا۔ آہیں، سسکیاں مقدر بن گئیں۔ جس کا اعتبار کیا، جسے دل دیا وہی دل توڑ گیا۔ اسی نے ہزاروں زخم نام کر دیے۔ اسی نے زندگی کے پھول مرجھا دیے جلتے چراغ بجھ گئے۔ حسین سنے بھر گئے۔ کیا یہی پیار ہوتا ہے؟ کسی کی زندگی سے کھیل کر نجانے ان جھوٹے عاشقوں کو کیا ملتا ہے۔ محبت کے جال پھینک کر جسموں کی خواہش رکھنے والے خود کیسے خوش

رہتے ہوں گے؟ کیسے جیتے ہوں گے؟

میرا نام عندلیب ہے۔ ہم چار بھائی اور دو بہنیں ہیں۔ سب سے بڑا بھائی بیرون ملک رہتا ہے۔ دوسرا نمبر میرا ہے۔ باقی مجھ سے چھوٹے ہیں۔ میرا بچپن اٹھلیاں کرتے گزر گیا۔ ماں باپ کی محبت، چاہت سے زندگی کا سفر دھیرے دھیرے طے کرنے لگی۔ جب تھوڑی سمجھ بوجھ آئی تو مجھے گاؤں کے پرائمری اسکول میں داخل کروا دیا گیا۔ روز صبح سویرے امی بڑے ناز، لاڈ سے میری یونیفارم تیار کرتیں۔ میری کتابیں بیگ میں رکھتیں، پیارے پیارے ہاتھوں سے محبت بھری نگاہوں سے ناشتا کرواتیں اور پھر بیگ میرے کندھوں پر سجا دیتیں، ماتھے پر ماں جی کی محبت کا بوسہ لیتیں۔ اپنی سہیلیوں کے ہمراہ اسکول روانہ ہو جاتی۔ میری سہیلیاں اسی گاؤں کی تھیں۔ اسکول بھی تھوڑے ہی فاصلے پر تھا۔ میں جلد ہی سہیلیوں کی کمپنی پا کر کھل مل گئی۔ میری استانیایاں بڑی رحم دل تھیں۔ بڑی محبت، محنت سے ہمیں پڑھاتی تھیں۔ انہی محبتوں، چاہتوں کے زیر اثر ایک کلاس سے، دوسری کلاس کا سفر ہوتا رہا اور پھر پرائمری اعلیٰ نمبروں سے پاس کر لیا۔ پانچ سالہ دوستی جدائی کے کرب ناک لمحوں میں بدل گئی۔ سبھی سہیلیاں جدا ہو گئیں۔ وہ استانیایاں وہیں رہ گئیں۔ گھر والوں نے آگے پڑھانے سے انکار کر دیا۔ نہ جانے ہمارے معاشرے میں یہ پابندیاں کب ختم ہوں گی لیکن میرے شوق، چاہت نے ہتھیار نہ ڈالے۔ میں امی کے آگے التجائیں کرتی رہی۔ ابو تو بیرون ملک کام کرتے تھے۔ ان کے آگے بھی ریکوئسٹ کی گئی لیکن بے سود پھر آخر ماموں جان کے قدم پکڑے۔ آخری اُمید وہی تھی۔ ماموں جان مجھے بہت پیار کرتے تھے۔ میں ہر بات ان سے منوا لیتی تھی۔ ماموں جان کی گھر میں کوئی بات ٹالی نہیں جاتی تھی۔ جب میں نے ماموں جان سے ریکوئسٹ کی تو انہوں نے شفقت بھرا ہاتھ میرے سر پر رکھا اور وعدہ کیا کہ عندلیب تم ضرور آگے پڑھو گی۔ میں ابھی آپ کے امی، ابو سے بات کرتا ہوں پھر واقعی انہوں نے میرے والدین کو راضی کر لیا۔ میں بہت خوش ہوئی، میری خوشی دیکھتی تھی۔ میں ہواؤں میں اڑنے لگی۔ پھول گلیاں، میرے آنکھن میں خوشبو پھیلانے لگیں۔

میں پھر سے کتابیں اٹھائے ہائی اسکول میں داخل ہو گئی۔ پرائمری سے ہائی اسکول کا سفر سہانا تھا۔ سہیلیوں کے ساتھ شرارتیں، کھیل کود نجانے اب کہاں رہ گئے ہیں؟ اب تو وہ کلاس روم یاد آتا ہے، جہاں کبھی بیٹھنے سے گھبراتی تھیں۔ چھٹی کلاس میں چند دن تو بوریت رہی۔ ماحول نیا تھا۔ دوست نئے تھے، استاد نئے تھے۔ آہستہ آہستہ جان پہچان ہوتی گئی۔ دوستیاں بڑھتی گئی، ہنسی مذاق، کھیل کود نے زندگی کو چار چاند لگا دیئے تھے۔ چھٹی سے ساتویں، ساتویں سے آٹھویں اور پھر نوٹی میٹرک پاس کر لیا۔ ایک مرتبہ پھر جدائیاں آڑے آ گئیں۔ سہیلیاں بچھڑ گئیں۔ کئی نے کالج جوائن کر لیا، کئی میری طرح گھر بیٹھ گئیں۔ کئی پیا گھر سدھار گئیں۔ نہ وہ ماحول رہا، نہ وہ کلاس روم رہا، نہ وہ دوست رہے۔ سب کچھ ختم ہو گیا۔ زندگی نے اپنا رخ بدل لیا۔

میں آگے پڑھنا چاہتی تھی لیکن وہی گاؤں کی رسم و رواج میری راہوں میں رکاوٹ بن گئے۔ گھر والوں نے معاشرے کی حیوانیت کا لمبا چوڑا سبق سنا کر ترک پڑھائی کا اعلان کر دیا۔ میں بہت روئی، چیختی، چلائی رہی۔ میری کسی نے آہ و فریاد نہیں سنی، میری التجائیں رائیگاں گئیں۔ میں نے ماں جی کے آگے ہاتھ جوڑے۔ ابو کے سامنے گڑ گڑائی۔ بھائی کو راضی کرنے کی کوشش کی مگر بے سود، وہی دیہاتی رسمیں، وہی رواج سب نے میرے سہانے سنے چکنا چور کر دیئے، میرے مستقبل کو نگل لیا۔

امی کہتیں۔ پڑھ لکھ کر کیا کروں گی؟ آخر کسی کا گھر ہی تو آباد کرتا ہے۔ کون سی نوکری کرنی ہے۔ نہ جانے ہماری سوچیں کب بدلیں گی؟ لڑکوں کو اس لیے پڑھایا جاتا ہے کہ انہیں جاب کر کے گھر کا نظام چلانا ہوتا ہے اور لڑکیاں بے چاری تعلیم سے محروم رہتی ہیں۔ لڑکیوں نے کسی نہ کسی کا گھر بسانا ہوتا ہے۔ ان کو کیا ضرورت پڑھائی کی۔ ارے نادانوں ماں پڑھی لکھی ہوگی تو معاشرہ پڑھا لکھا ہوگا۔ شعور کی تمام حدیں عبور کرے گا۔ کیا تعلیم صرف اور صرف جاب حاصل کرنے کے لیے حاصل کی جاتی ہے؟ تعلیم تو انسان کو بے شعوری زندگی سے نکال کر شعور کی منزلیں طے کرواتی ہے۔ نہ جانے ہم جاہلیت کے دور کی پرانی رسمیں، پرانے رواج کب چھوڑیں گے؟

آج دنیا نے ترقی تو کر لی مگر عورت آج بھی جاہلیت کے دور کی طرح مظلوم ہے۔ عورت کے ساتھ وہی ناروا سلوک کیا جاتا ہے۔ جو گھر کی رونق ہوتی ہے، اسے در بدر کیا جاتا ہے۔ جو مردوں کی شان، عزت ہوتی ہے اسی کو بازاروں میں نیلام کیا جاتا ہے۔ مرد ہی عورت کا محافظ ہے اور مرد ہی عورت کا بیوپاری۔ نجانے مغربی کچر، مغربی تہذیب ہماری جان کب چھوڑے گا؟

خیر میں گھر کی ہو کر رہ گئی۔ میرا تعلیمی سلسلہ یہیں تک تھا۔ قسمت کا لکھا سمجھ کر خاموشی اختیار کر لی۔ گھریلو کام کاج میں سارا دن گمن رہتی۔ زندگی دھیرے دھیرے گزر رہی تھی۔ پڑھائی کا جنون تھا لیکن یہ جنون کہیں دب رہا تھا۔ میں مختلف جرائد، بکس، رسائل لے کر پڑھنے لگی۔ مجھے شعر و شاعری بہت پسند تھی۔ چڑھتی جوانی، نیارنگ روپ، ابھرتے جذبات، انگلیں جنم لے رہے تھے۔ میں نے گھر والوں کو یہاں تک کہا، چلو مجھے حافظہ کا کورس کرنے دو۔ قرآن مجید حفظ کرنے دو لیکن اس کی سہولت ہمارے گاؤں میں نہیں تھی۔ اس کے لیے راولپنڈی جانا پڑتا۔ راولپنڈی گھر والے بھی جانے نہیں دیتے تھے۔ یونہی یہ شوق بھی دفن ہو کر رہ گیا۔ میں قیدی پرندے کی طرح پنجرے میں پھڑپھڑاتی رہی۔ کس کو فکر تھی جو میرے لیے سوچتا؟ کون تھا میرا؟ کوئی بھی تو نہیں تھا جو درد دل کی سنتا۔ جب اپنے ہی گیس کو آگ لگا دیں تو غیروں سے کیا امیدیں رکھنی اور لڑکیاں تو ہوتی ہی ظلم سہنے کے لیے ہیں۔ یہ معصوم کلیاں بھی اپنوں کے ہاتھوں لگتی ہیں۔ کبھی غیروں کے جال میں پھنس جاتی ہیں۔ کبھی عزت کی حفاظت کرتے، کرتے جان دے دیتی ہیں۔ کبھی رسوں و رواجوں کی بھینٹ چڑھ جاتی ہیں۔ دنیا چاند ستاروں پر تو پہنچ گئی ہے لیکن اس کی سوچ نہیں بدلی، عورت پر ظلم نہیں بدلے، عورت کی تقدیر نہیں بدلی۔ کبھی بھائی پر قربان، کبھی گھر پر قربان۔ عورت کی اپنی زندگی کہاں ہوتی ہے؟ وہ تو پیدا ہوتے ہی مرجاتی ہے۔ لڑکی، عورت اپنی زندگی جیتی ہی کب ہے؟ کبھی باپ کے گھر، کبھی بھائی کے گھر، کبھی شوہر کے گھر اور بالآخر مٹی کے گھر میں ہمیشہ کے لیے سو جاتی ہے۔ بے نام کی زندگی گھر کی چار دیواری میں گزار دیتی ہے اور یونہی گھٹ گھٹ کر مر جاتی ہے۔ اس کی بھی خواہشیں دفن ہو

جاتی ہیں۔ اس کے احساسات، جذبات کی قدر کہاں ہوتی ہے۔ اسے تو صرف اور صرف کھلوتا سمجھا جاتا ہے۔ وقت گزاری کے لیے جھوٹی تسکین کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ کبھی بازاروں میں فروخت کی جاتی ہے، کبھی محفلوں کی رونق بنائی جاتی ہے۔ اے عورت! تیرے نصیب ایسے کیوں ہوتے ہیں؟ کیا تمہیں بائیں پسلی سے جنم لینے کی سزا دی جا رہی ہے؟ تو اس لیے مظلوم ہے کہ تیرا وجود مرد ذات سے جنم لے کر آیا ہے؟ تیری اپنی زندگی کوئی بھی نہیں؟

ظلم بچے بچن رہا ہے کوچہ و بازار میں عدل کو بھی صاحب اولاد ہوتا چاہے کاش نیلے آسمان والا مجھے لڑکا پیدا کرتا۔ کم از کم آزاد زندگی تو جیتی۔ اپنی خواہشات، اپنے جذبات دفن نہ کرنے پڑتے۔ پابندیوں کے جال نہ ہوتے۔ ظلم کی زنجیریں میرے پاؤں میں نہ ڈالی جاتیں۔ کاش لڑکیاں اپنی زندگی جی سکتیں۔ میری زندگی میں لفظ کاش ہی ہے۔ میری خوشیاں، میری حسرتیں، میرے ارمان، میرے خواب سب ٹوٹ گئے۔ جو سنے تھے، طوفان کی نذر ہو گئے۔ میرے خواب چکنا چور ہو گئے۔ اپنے غیر ہو گئے۔ من میں بسنے والے دور بہت دور چلے گئے۔ گھر میں بوریٹ کے سوا کچھ تھا ہی نہیں۔ نہ جانے یہ سننے ٹوٹنے کے لیے کیوں ہوتے ہیں؟ ارمان بکھرنے کے لیے کیوں ہوتے ہیں؟ دوست بچھڑنے کے لیے کیوں ہوتے ہیں؟ میں نے بوریٹ ختم کرنے کے لیے جرائد پڑھنے شروع کر دیے۔ ساتھ ساتھ شاعری کی ڈائری بناتی گئی۔ مجھے شاعری اچھی لگتی تھی۔ میرے جذبات کی ترجمانی ہوتی تھی جیسے یہ غزل ہے۔

اشک گرتے ہیں میری سانس سنہل جاتی ہے دے کے اک درد نیا شام نکل جاتی ہے اس کو دیکھوں تو میرے درد کو ملتا ہے سکون اس سے بچھڑوں تو میری جان نکل جاتی ہے عشق کچھ ایسے بھاتا ہے نشان ہستی جیسے ہر رات اُجالے کو نکل جاتی ہے زخم بھرتا ہی نہیں اس کی جدائی کا گھر پھر اس کی یاد نیا درد اُگل جاتی ہے

وہ اگر دل پہ میرے ہاتھ ہی رکھ دے تو نے سانس بھی کچھ دیر سنہل جاتی ہے بچپن کب کا بیت چکا تھا۔ میں جوانی کی دلہیز پر قدم رکھ چکی تھی۔ جوانی تو سرچڑھ کر بولتی ہے۔ میری انگلیں جوان ہو گئیں۔ مجھ پر بھی شباب آیا۔ جھیل سی آنکھیں جھلکتے دودھیا دانت۔ گلابوں جیسے ہونٹ، ستواں ناک، اسارت جسم، مستانی چال، جوان ادائیں، کیا کچھ نہیں تھا میرے پاس۔ میرے رب نے خوب حسن سے نوازا تھا۔ آئینے کے سامنے میں جب سنورتی تھی تو خود سے ہی شرمایا جاتی۔ آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر اپنے شہزادے کے سنے دیکھتی۔ مجھے بھی کسی کی تلاش تھی، کسی کا انتظار تھا۔ من ہی من میں کسی کو یاد کرتی تھی۔ وہ میرے سپنوں کا راج کمار تھا لیکن کون تھا؟ کہاں تھا؟ نہیں معلوم تھا۔ میرے اندر محبت کے جذبات جنم لے رہے تھے پھر محبت تو ذات پات، عمر کچھ بھی نہیں دیکھتی۔ رنگ روپ نہیں دیکھتی، محل جھونپڑی نہیں دیکھتی۔ محبت دین، مذہب نہیں دیکھتی، امیری، غریبی نہیں دیکھتی اسی لیے تو کہتے ہیں کہ محبت کی نہیں جانی، ہو جاتی ہے۔ میری آنکھوں میں سنے تھے۔ دل میں ارمان تھے۔ اللہ تعالیٰ نے مجھے خوب رنگ روپ دیا تھا۔ گندمی رنگ، گھنے سیاہ بال، قد و قامت دیدنی تھی، نشی آنکھیں۔ جو بھی دیکھتا، دیکھتا رہ جاتا۔ میں اپنی دنیا میں مگن صرف سنے دیکھتی تھی۔ سپنوں کی دنیا میں رہتی تھی۔

پھر ایک دن زندگی نے نیا موڑ لیا۔ سب کچھ بدل گیا۔ میری امی کے موبائل پر کال آئی۔ اُن نوں نمبر سے کال آ رہی تھی۔ اکثر میں ہی کالز اٹینڈ کرتی تھی۔ مجھے زمانے کی ادھیچ سچ کا پتا نہیں تھا۔ میں نے کال ریسیو کی۔ مردانہ آواز مجھ سے مخاطب تھی جو مجھ سے میرا نام، تعلیم پوچھنے لگا تھا۔ نجانے کوئی اخبار والا جیسے انٹرویو لے رہا ہو لیکن میں نے گھری گھری سنا دی۔ اے لڑکے! کس قصد کے لیے کال کی ہے؟ مطلب بتاؤ، میرے نام سے کیا غرض ہے؟ کیسا دیوانہ تھا؟ میری آواز پر مر مٹا تھا۔ آپ کی آواز بہت خوبصورت ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے ندی کنارے، کسی درخت پر بیٹھی کوئل سریلے گیت گار رہی ہو۔ شش آپ کیا بکواس ہے؟ انہی الفاظ کے ساتھ میں نے کال بند کر دی۔ اس دن کے بعد نجانے مجھے کیا ہو

گیا، وہ کیسے میرے دل میں بس گیا، میں نہیں جانتی۔ اس نے کیسے، کب دل میں جگہ بنالی؟ روز ایس ایم ایس کرتا۔ اس میں شاعری ہوتی، شاعری بہت اچھی ہوتی، شاعری کی تو میں دیوانی تھی۔ اسے اپنی ڈائری میں محفوظ کرتی رہتی پھر یوں ہونے لگا جس دن اس کا بیج نہیں آتا تھا۔ مجھے بے چینی سی ہوتی۔ دل کو قابو کرتی۔ بار بار نظریں موبائل پر جا رکھتی۔ دل کو سلی کراتی مگر دل تھا کہ بے قابو ہوا جا رہا تھا۔ مجبوراً اسے بیج کر دیتی کہ مجھے اچھے اچھے بیج سینڈ کرو پھر یونہی ہماری دوستی ہو گئی۔

اس کا نام ابرار تھا۔ کبھی بکھار ہماری کال پر بات ہو جاتی۔ اسی طرح سلسلہ چلتا رہا۔ دوستی کا رشتہ کب محبت میں تبدیل ہو گیا؟ معلوم نہیں ہوا۔ ہم ایک دوسرے کو چاہنے لگے۔ کالز کا لبا سلسلہ چل نکلا۔ ایک دوسرے سے پسند ناپسند پوچھی جاتی۔ ہمارا کھانا، پینا، اٹھنا، بیٹھنا، جاگنا ایک وقت ہوتا تھا۔ ساتھ جینے مرنے کے عہد و بیان ہوتے۔ حسین سنے ہوتے اور ہم ہوتے۔ روز نہ جانے کتنے خواب آنکھوں میں سجاتے تھے۔ اپنا گھر ہوگا، اپنا آشیانہ ہوگا، پھول کھلیں گے، کلیاں بہکیں گی، کوئل کو کے گی، بلبل گائے گی، چاند ہوگا، ستارے ہوں گے، چاندنی ہوگی، ہم ہوں گے ہاتھوں میں ہاتھ ہوں گے، ساتھ جیئیں گے، ساتھ مریں گے، ہزاروں سنے ہوتے مگر کہتے ہیں ناں سنے بھی پورے نہیں ہوتے سنے ہوتے ہی ٹوٹنے کے لیے ہیں۔ وہ خواب ہی کیا جو بکھریں نا خواب تو کرچی کرچی، ریزہ ریزہ ہو کر بکھرنے کے لیے ہوتے ہیں پھر جاگتی آنکھوں کے خواب زیادہ اذیت دیتے ہیں۔

ہماری محبت پروان چڑھتی رہی۔ عہد و بیان ہوتے رہے۔ ایک دن ابرار نے کہا۔ ”عندلیب! انا دیدار تو کرا دو۔“ ملنا مشکل اور دشوار ضرور تھا مگر ناممکن نہیں تھا۔ ابرار راولپنڈی میں رہتا تھا۔ گھر کا واحد نفیل تھا، دو سسٹرز اور بوڑھی ماں بھی۔ اس کے والد وفات پا گئے تھے۔ میری خالہ بھی راولپنڈی میں رہتی تھیں۔ کافی عرصہ ہوا تھا، میں خالہ کے ہاں بھی نہیں گئی تھی پھر کیا محبوب کے دیدار کے لیے سو، سو جتن کیے، بہانے بنائے۔ آخر کار اجازت مل گئی اور چند دن کے لیے خالہ کے ہاں چلی گئی پھر ایک دن موقع پا کر ابرار کو کہہ دیا کہ جانو دیدار

مثالی شوہر

دو خواتین چڑیا گھر دیکھنے گئیں۔ جب شترمرغ کے پنجرے کے پاس پہنچیں تو چڑیا گھر کے گائیڈ نے تعارف کراتے ہوئے کہا۔ ”یہ شترمرغ ہے۔ یہ بڑا سیدھا سادہ جانور ہے۔ اسے دکھائی بھی کم دیتا ہے۔ یہ تقریباً ہر چیز کھا لیتا ہے اور ہضم بھی کر لیتا ہے۔“

ایک خاتون نے چپکے سے دوسری خاتون سے کہا۔ ”یہ تو مثالی شوہر معلوم ہوتا ہے۔“

میرے ساتھ ہے، میرے پاس محفوظ ہے۔ میں نے موبائل اٹھایا۔ اپنی جان کا شکر یہ ادا کیا کیونکہ سم میں کافی بیلنس موجود تھا۔ پریشانی کیا ہوئی تھی۔ میری جان ابرار اتنا پیارا گفٹ اور لیٹر لکھنے کا شکر ہے۔ میری جان میں اپنی جان دے دوں گی، مگر تمہارا ساتھ بھی نہیں چھوڑوں گی۔ میری جان میں بھی تمہیں حد سے زیادہ چاہتی ہوں۔ زندگی کی آخری سانس تک ساتھ دوں گی۔ زمانہ جا ہے لاکھوں ستم کرے۔ جو وعدے کیے ہیں، نبھائیں گے۔ جو قسمیں کھائی ہیں، پوری کریں گے۔ میرا جینا مرنا آپ کے لیے ہے۔ میرے سینوں میں تم ہو۔ میری روح میں تم ہو۔ تم ہی میری خوشی، تم ہی میری چاہت ہو۔ سدا مسکراتے رہنا۔ بھی بے وفائی نہ کرنا ورنہ میں مرجاؤں گی۔

محبت نامہ کا جواب میں نے کال پر دے دیا۔ ڈھیر دن پیار بھری باتیں ہونی رہیں۔ رات بھی اپنا سفر کر رہی تھی۔ پوری دنیا کو خواب بھی اور یہ پریمی مستقبل کے پلان بنا رہے تھے۔ ہزاروں وعدے، قسمیں کھائیں، ساتھ جینے مرنے کا اقرار کیا پھر میں نے یہ اشعار اپنی جان کے نذر کیے۔

مت پوچھو کہ میری زندگی کیسے بسر ہوتی ہے میرا ہر لمحہ ہر گھڑی تیرے نام ہوتی ہے دن تو کٹ ہی جاتا ہے کسی نہ کسی طرح لیکن میری ہر شام اب تیرے نام ہوتی ہے

ابراہیم کی تصویریں مجھے بہت پسند آئیں۔ ڈبے کے اندر آخر میں ایک لیٹر پر فیوم میں نہایا ہوا برآمد ہوا جس کی تحریر یہ تھی۔

”میری جان سے پیاری عندلیب!

سلام محبت!

میرے سینوں کی شہزادی، میری راج کمار، اُمید ہے ٹھیک ٹھاک ہوگی۔ جب سے آپ سے رابطہ ہوا ہے میرے دل کی دنیا خوشیوں کی وادیوں میں سیر پانے لگی ہے۔ زندگی معطر معطر ہے۔ ایسا لگتا ہے میرے سینے پورے ہونے والے ہیں۔ میرا ویران آنگن آباد ہونے کو ہے۔ صبح آپ سے ملاقات ہونے چلی ہے۔ میں خوشی سے لوٹ پوٹ ہو رہا ہوں۔ اپنے آپ کو خوش نصیب ترین انسان سمجھ رہا ہوں۔ آپ کے لیے ایک موبائل اور سیم خرید لی ہے۔ صبح پیش کرنا ہے۔ یہ موبائل میری یاد دلاتا رہے گا۔ اسے دل سے قبول کرنا۔ ہاں محبت کا اقرار کیا ہے تو میرا گفٹ دل و جان سے قبول کرنا ہوگا۔ زندگی کی راہوں میں کبھی اکیلا، تنہا مت چھوڑنا زمانے کی بے رحم رسموں کے آگے دیوار بن جانا۔ ہر طوفان کا مقابلہ کرنا۔ میں آپ کو بہت خوشیاں دوں گا۔

ہاں میں آپ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ انکار مت کرنا۔ زمانے بھر کی تمام خوشیاں تمہارے قدموں میں بچھا دوں گا۔ اگر تم نے ٹھکرادیا تو جیتے جی مرجاؤں گا۔ موت کو گلے لگا لوں گا بس میری محبت کا بھرم رکھنا تمہارا ساتھ ہی میری زندگی ہے۔ اس زندگی کو موت کے حوالے نہ کرنا۔ نظروں کی پیاس اُمید ہے صبح بچھ جائے گی۔ من کی حسرت، دیکھنے کی تمنا، دیدار کی چاہ پوری ہوگی۔ واپسی کا انتظار ہے گا۔ دعاؤں کے ساتھ اجازت طلب ہوں۔ اللہ حافظ!

فقط

آپ کا چاہنے والا

ابراہیم

خط کیا تھا میری جان تھا میں نے لیٹر پڑھ کر چوم لیا۔ کئی بار جینے سے لگایا۔ دل بہت خوش ہوا۔ کوئی تو ہے جو مجھے دلی دجان سے چاہتا ہے۔ مجھے پیار کرتا ہے۔ مجھے اپنا چاہتا ہے۔ میرا ہونا چاہتا ہے۔ یہ محبت نامہ آج بھی

کیا سکتی تھی؟ زمانے کی نظروں سے بچنا بھی تھا۔

ابراہیم میرے لیے موبائل لے کر آیا تھا۔ اس نے دور سے آتے شخص کو دیکھ کر جلدی سے ڈبا بند موبائل زمین پر رکھ کر جانے لگا۔ مجھے اشارہ کیا کہ اٹھالو۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ وہ شخص ابھی دور تھا۔ میں نے فوراً موبائل اٹھا کر کپڑوں میں چھپا لیا اور ہاتھوں کے اشاروں سے محبوب کو الوداع کیا اور گھر کی طرف چل پڑی۔ یہ ہماری محبت کی پہلی ملاقات تھی۔ محبوب کا دیدار ہو گیا تھا۔ نظروں کی پیاس بجھ گئی تھی۔ دل مسرتوں کی وادیوں میں ناچ رہا تھا۔ انگ انگ خوشبو سے معطر تھا۔

عجیب سی خوشی تھی۔ اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھ رہی تھی۔ ایسا لگتا تھا سڑک کے ارد گرد لگے درخت میری محبت کے گیت گارہے ہوں، ہواؤں کی مستی میں جھونے پھول سر جھکائے سلامی پیش کر رہے تھے۔ گھر پہنچی تو دروازہ مبارک باد دے رہے تھے۔ میرے لبوں پر پھیلی مسکراہٹ کو خالہ نے پھانپ لیا تب ہی تو خالہ نے پوچھا لیا تھا۔ ”ارے عندلیب بیٹا! آج بہت خوش نظر آ رہی ہے۔ جب سے میرے گھر میں آئی ہو آج ہی کھلکھلا رہی ہو۔ خیر تو ہے؟“

”بس خالہ! کوئی خاص بات نہیں ہے۔ ایک انجان سی خوشی ہے۔ میں کوڑا کرکٹ باہر پھٹکنے گئی تھی۔ ایک دیوانہ، مستانہ، فقیر پیاسا تھا۔ اس نے پانی مانگا۔ پانی پلایا تو مجھے ہزاروں دعا میں دے رہا تھا۔ دلی مرادیں پوری ہونے کی نوید دے رہا تھا تب سے خوش ہوں۔“

اب خالہ کو کیا خبر وہ دیوانہ، مستانہ، کوئی اور نہیں میرے دل کا شہزادہ تھا۔ یہ عشق بھی نا جانے کیا کچھ کرواتا ہے۔ اپنے ہی ہاتھوں، اپنوں کے گلے کٹواتا ہے۔ ہائے رے عشق تیرا ستاناں ہو۔

خیر دن گزر گیا۔ سورج ڈھل گیا۔ پرندے واپس گھونسلوں کو لوٹ آئے۔ اندھیرا پھیلنے لگا، شام ہو گئی۔ کبھی کام کاج ختم ہو گئے، تب ہی کھانا کھانے کے بعد میں اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اند سے دروازہ لاک کیا۔ محبوب کا دیا گفٹ کھولنے لگی۔ اس ڈبے میں پیارا سا موبائل تھا ساتھ سم بھی تھی۔ موبائل نکالا، آن کیا۔ اس میں بے شمار پیارے پیارے ایس ایس ایم ایس قید تھے۔ میرے من کے شہزادے کی بہت سی تصویریں تھیں۔

کرا جاؤ۔ ابرار میری خالہ کے گھر سے تھوڑے ہی فاصلے پر نوکری کرتا تھا۔ میرے پاس موبائل نہیں تھا۔ اپنی سہیلی سے ادھار لے آئی تھی کیونکہ گھر والا موبائل کیسے لے آتی؟ صبح سویرے ہی اس نے کال کی۔ میں آ رہا ہوں۔ کہاں ملوگی عندلیب؟ میں نے اسے سارا راستہ سمجھا دیا۔ خالہ کے گھر کے ساتھ ہی چھوٹا سا پارک بنا ہوا تھا۔ میں گھر سے کوڑا کرکٹ باہر پھٹکنے کے بہانے نکل آئی۔ گھر سے پکرا اٹھائے، دروازہ کراس کر کے سڑک کے پار جانا تھا۔ سڑک کے اس پار گھر کے سامنے ابرار کھڑا تھا۔ اس نے مجھے نشانی بتائی کہ میں نے ایسے کپڑے پہنے ہوئے ہیں اور ویسے بھی محبوب، عاشق ایک دوسرے کو دور سے پہچان لیتے ہیں۔ میں کوڑا کرکٹ پھٹکنے سڑک کے اُس پار چلی گئی۔ ابرار درخت کے سائے میں کھڑا مسکرا رہا تھا۔ پارک کے کونے میں لگا سایہ دار درخت ہماری محبت کا راز داتا تھا۔ ابرار بلیو پینٹ، شرٹ میں بہت سنڈر لگ رہا تھا۔ رنگ سانولا تھا۔ محبت، رنگ روپ تھوڑا دیکھتی ہے۔ یہ تو دلوں کے بندھن ہوتے ہیں جو اعتبار کے کچے دھاگے میں بندھے چلے جاتے ہیں۔ درمیانہ قد، اسماٹ جسامت، آنکھوں پر سیاہ چشمہ سجائے، بال سنوارے ہوئے میرا منتظر تھا۔ اس کے مقابلے میں، میں حسین خوبصورت تھی۔ قد کاٹھ بھی اس سے تھوڑا بڑا تھا۔ ڈبلی پتلی جسامت، بلیک کلر کے کپڑے زیب تن کیے ہوئے تھے۔ میں نے جاتے ہوئے سلام کیا۔ ابرار نے ہاتھ آگے بڑھا دیا۔ میں نے صرف ہاتھ ملایا۔ محبت کا تقاضا تھا ورنہ ہاتھ بھی نہیں ملانا تھا۔ فقط ایک دوسرے کا دیدار کرنا تھا۔ نظروں کی پیاس بجھ گئی۔ دیدار کی حسرت جو بھی پوری ہو گئی۔ جس کے سینے روز دیکھتی تھی آج آنکھوں کے سامنے تھا۔ نظروں نے خوب پیاس بجھائی۔ ارد گرد کوئی شاپ نہیں تھی۔ میں اپنے دلبر کی مہمان نوازی کرتی۔ گھر لے کر جا نہیں سکتی تھی۔ خالہ کا گھر تھا، شکر ہے ڈرتے ڈرتے دیدار تو کر لیا تھا۔

میں نے اپنے من کے شہزادے کو کہا۔ ”میری جان! ادھر رکھو میں پانی لے کر آتی ہوں۔“ واپس گئی۔ پانی لیا اور اپنے ہاتھوں سے محبوب کو پانی دیا اور معذرت کی کہ ابرار میں معذرت خواہ ہوں۔ میں آپ کی کوئی خدمت نہیں کر سکی۔ پر اپنا گھر تھا اور اپنے گھر سے کوسوں دور میں کر بھی

ناچا ہے ہوئے بھی ایک دوسرے کو الوداع کیا۔
کال منقطع ہوئی اور میں محبوب کے سپنوں میں گم ہو کر
حسین وادیوں میں سیر کرنے نکل گئی۔ میرے
خوابوں، خیالوں میں صرف اور صرف میرا محبوب تھا۔ اس
کی باتیں تھیں، اس کی مسکراہٹ تھی۔ پھر یونہی ہماری
محبت پر دان چڑھتی رہی۔ میں خالہ کے گھر چند دن رہنے
کے بعد اپنے در و دولت لوٹ آئی۔

ہماری محبت کی ٹرین مختلف اسٹیشنوں سے ہوتی ہوئی
منزل کی طرف محو سفر تھی۔ کبھی دشوار راستے، کبھی حسین
وادیوں، ہوتیں۔ کبھی بہتی آبشاریں، کبھی دریا عبور
کرتی۔ کبھی پہاڑوں کو چیر کر آگے بڑھتی رہی، کبھی
پتھروں سے، کبھی کھلے میدانوں، کبھی ریگستانوں، کبھی
جنگلوں سے گزرتی منزل کی طرف رواں دواں تھی۔

اسی طرح ہماری محبت کو چار سال بیت گئے۔ کسی کو
کچھ خبر نہیں تھی۔ دو پریمی پیار کے نگر آباد کے ہوئے تھے
پھر طوفان برپا ہوا، ایک سیلاب آیا اور زندگی کی ساری
خوشیاں اس میں بہہ گئیں۔ کہتے ہیں ناں عشق اور مشک
چھپائے نہیں چھپتے، سو میری محبت بھی عیاں ہو گئی، میری
ماں کو خبر ہو گئی کہ عندلیب کے پاس ذاتی موبائل ہے اور
یہ کسی لڑکے سے بات کرتی ہے پھر کیا تھا ایک نہ ختم
ہونے والا درد کا سمندر زہریلے سانپ کی طرح منہ
پھیلائے کھڑا تھا۔ زمانے نے ستم ڈھائے۔ ریمیوں
نے قربانی دی۔ زمانہ ہنستا رہا، پریمی تڑپتے رہے، غلم ہوتا
رہا، زخم ملتے رہے۔ روز سولی چڑھتے تھے، روز مرتے
روز جیتے تھے۔

میرے والد صاحب بھی وطن واپس آ گئے۔ مجھے
خوشی کیا ہوئی تھی میری تو دنیا برباد ہو رہی تھی۔ حسین سنے
ٹوٹ رہے تھے۔ آنکھیں برس رہی تھیں۔ دل خون کے
آنسو روتا تھا پھر کیا تھا اب کو بھی پتا لگ گیا۔ ناراض ہونے
لگے، عرصے بعد گھر آئے تھے، محبت جتاتے لیکن وہ بھی
ستم ڈھانے لگے۔ مجھے مارنے لگے۔ پابندیاں لگائی
گئیں لیکن پریمی کب ڈرتے ہیں۔ محبوب کے لیے جان
دینے والے، محبوب کو تڑپاتے تھوڑی ہیں۔ میرے لبوں
پر صرف ایک ہی نام مچلتا تھا وہ تھا ابرار، میرا سب کچھ
وہی تھا۔ اپنوں نے ستم یہ کیا کہ میری شادی کا عندیہ دے
دیا۔

میرا کزن احمد جو بچپن میں ہمارے گھر رہتا تھا، ہم
اکٹھے اٹھتے بیٹھتے تھے، اکٹھے پڑھتے، کھیلتے کودتے
تھے۔ بچپن میں ہی اس کے والدین اللہ کو پیارے ہو
گئے۔ میرے ماما، پاپا اسے اپنے گھر لے آئے
تھے۔ معصوم سی صورت، شرمیلہ سا، اپنی دنیا میں گم رہنے
والا۔ گم سم سا۔ میں اُسے بھائی سمجھتی تھی۔ مجھے کیا خبر تھی
وہی میرے ابرار کا رقیب بن کر سامنے آئے گا۔ میں نے
کبھی سوچا بھی نہیں تھا۔ صرف کزن کی حد تک ہمدردی
تھی۔ اس کا کوئی نہیں تھا اس کے ساتھ ہنس کھیل لیتے
تھے۔ اس کا یہ مطلب ہر گز نہیں تھا کہ اسے زندگی کا ہم
سفر بنا لیتی۔ اپنی زندگی اس کے نام کر دیتی۔ میرے
ماما، پاپا نے جب یہ عندیہ دیا کہ احمد سے تمہاری شادی
طے کر دی ہے۔ کسی اور کے سنے دیکھنے بند کرو اور نہ ہی
ایسا ہم کرنے دیں گے۔ بہتر ہے ہماری ہی مرضی میں
ڈھل جاؤ ورنہ کھرجاؤ گی، کوئی تمہارا نہیں رہے گا لیکن
میری ضد ایک ہی تھی۔ چاہے مجھے سولی پہ لٹکا دو، پروا
نہیں۔ شادی ہوگی تو صرف ابرار سے ہوگی ورنہ کبھی نہیں
ہوگی۔ ابرار نہیں تو کوئی نہیں۔ میں نے اپنی محبت کا پردہ
فاش کر دیا۔ سب کو بتا دیا کہ میرے سپنوں کا راج کمار
ابرار ہی ہے۔ میری زندگی اسی کے نام وقف ہے۔ جب
ماما، پاپا کی نہ مانی تو انہوں نے میری خالہ کو گھر بلوایا۔
خالہ نے مجھے ہزاروں سبز باغ دکھائے۔ احمد ایسا
ہے۔ احمد یہ ہے، وہ ہے تم اس سے شادی کر لو۔ ابرار کا کیا
پتا غیرے کھل کو دھوکا دے دے۔ تمہاری زندگی تو برباد
ہو جائے گی۔ تم کہیں کی نہیں رہو گی۔ زمانہ تمہیں چینی
نہیں دے گا۔ درد و رنج تھو کریں تمہاری مقدر بن جائیں
گی۔ بکھرے، ٹوٹے لوگوں کو کوئی گلے نہیں لگاتا۔ لوگ تو
گرے ہوئے مکان کی اینٹیں تک اٹھا لیتے ہیں۔ بے
سہارا لوگوں کو زمانے والے اذیتیں دیتے ہیں۔ زخموں پر
مرہم نہیں رکھتے۔ زخموں پر نمک چھڑکنے والے بہت
ہیں، میری بات مانو تم احمد سے شادی کر لو۔ اچھا لڑکا ہے
اور اپنی برادری کا ہے۔ خوبصورت بھی ہے۔ تمہیں خوش
رکھے گا۔ تمہاری ہر خواہش پوری کرے گا۔ تمہارے
سارے سنے، سارے ارمان پورے ہوں گے۔

خالہ مجھے سپنوں کی وادیوں میں سیر کرانے لے گئی
مگر اس کی ہر بات سر سے اوپر گزر جاتی۔ وہ کیا کہہ رہی

ہے کچھ علم نہیں تھا۔ عشق کا بھوت سوار تھا۔ ابرار نے نا
جائے کیسا جاؤ کر دیا تھا اس کے سوا کچھ نظر ہی نہیں آتا
تھا۔ میرا سب کچھ تو ابرار تھا، بس وہی میری منزل
تھی۔ اس کے علاوہ میرے من مندر میں کوئی نہیں
تھا۔ میرا اعتبار وہی تھا، میری صبح شام، دن رات وہی
تھا پھر جن کو دل میں بسایا جاتا ہے، بیچ سفر میں چھوڑا نہیں
جاتا۔ ان کے ارمانوں کا جنازہ نہیں نکالا جاتا۔

ایک دن موقع پا کر میں نے ابرار کو ساری صورت
حال سے آگاہ کر دیا۔

”جان! میرے گھر والوں نے موبائل چھین لیا
ہے۔ میرے اوپر ظلم ڈھائے جا رہے ہیں۔ تم جلد ہی کوئی
حل نکالو ورنہ تیری عندلیب تیری نہیں رہے گی۔ عندلیب
تیری نہ بنی تو موت کو گلے لگا لے گی۔“

ابرار نے مجھے حوصلہ دیا۔ ”عندلیب! میری جان! تم
حوصلہ رکھو! میں جلد کچھ کرتا ہوں! بس تم انکار ہی کرتی
رہو۔ تم نے رضامندی نہیں کرنی۔ تم میری ہو! میری ہی
ہم سفر ہوگی۔ میں تمہیں اپنا لوں گا۔ تم میری ہی دلہن بنو
گی۔ جلد ہی میں اس قید خانے سے آزاد کراؤں گا۔ تھوڑا
وقت دو۔ میں غریب ضرور ہوں مگر اپنی محبت کو رسوا نہیں
ہونے دوں گا۔ اپنی چاہت ضرور حاصل کروں گا۔“

مجھے بھی حوصلہ ہوا کہ ایسے حالات میں ابرار میرے
ساتھ ہے۔ وہ ہر طوفان، ہر ستم کا مقابلہ کرے گا، ظلم کی ہر
دیوار گرا دے گا۔ وہ مجھے مرنے نہیں دے گا۔ وہی میرا
سرتاج بنے گا۔ اسی کے نام کی مہندی لگاؤں گی۔ اسی کی
ڈولی میں بیٹھوں گی۔ وہ آئے گا۔ بارات لائے گا، ڈھول
بجیں گے۔ شہنائیاں گونجیں گی، لوگ رقص کریں
گے، سہیلیاں گیت گائیں گی۔ میرا شہزادہ گھوڑی پہ آئے
گا۔ مجھے لے جائے گا۔

باہر تو طوفان برپا تھا مگر دل کی دنیا خوش تھی۔ مجھے
یقین تھا۔ کیا ہوا ابھی کتنی بھنور میں ہے۔ جلد ہی کنارے
پہنچوں گی۔ معاملہ دور نہیں، جلد خوشیاں لوٹیں گی۔ زندگی
پھولوں کی تاج پہ تاجے گی۔ پھولوں کی تاج پہ رقص ہو
گا۔ محبت جیت جائے گی۔ زمانہ ہار جائے گا۔ میرے
اندھ مہر تھا۔ حوصلہ تھا، ہمت تھی۔ ابرار سے بات ختم کی
اور مدت کر کے احمد کو کال کر دی۔ دیکھو! احمد میں عندلیب
بات کر رہی ہوں۔ گھر والے بضد ہیں۔ مجھے تم سے

منسوب کر رہے ہیں لیکن میں تم سے نہیں، کسی اور سے
شادی کرنا چاہتی ہوں۔ میں اس سے پیار کرتی
ہوں۔ میں نے انکار تو کر دیا ہے۔ یہ لوگ میری نہیں سن
رہے۔ تم ہی انکار کر دو۔ تم لڑکے ہو، تمہاری بات مانی
جائے گی۔ میں تمہاری عزت کرتی ہوں، تمہارے نام کی
مہندی نہیں لگا سکتی۔ تمہارے آئین کی رونق نہیں بن
سکتی۔ میں ابرار کو چاہتی ہوں۔ وہی میری منزل
ہے۔ پلیز! میری بات سمجھو۔ میری زندگی برباد ہونے
سے بچالو۔ مجھے یقین ہے تم ہی مجھے بچا سکتے ہو۔ میری
زندگی پر رحم کرو۔ میں تمہاری احسان مند رہوں گی۔

میں نے ساری داستان احمد کے گوشِ سماعت کر
دی۔ محبت میں حوصلہ آتی جاتا ہے۔ محبت تو ہر طوفان کا
مقابلہ کر سکتی ہے۔ چاہے تھا کہ احمد میرا ساتھ دیتا، مجھے
ہی برا بھلا کہنے لگا۔ آگ بگولہ ہو گیا، ہزاروں گالیاں
میرے نام کر دیں۔

”تم ہماری عزت کا جنازہ نکال رہی ہو۔ کون ہے
کمینہ! ابرار جس نے ہماری عزت پر ہاتھ ڈالا؟ میں اُسے
زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ مجھے نبرد میں ابھی اس سے پوچھ
لیتا ہوں۔“

محبت اور اپنا کی جنگ چھڑ گئی پھر کیا تھا ایک نئی
قیامت میری منتظر تھی۔

احمد نے میرے پاپا کے خوب کان بھرے۔ موبائل
تو کب کا چھین لیا گیا تھا اب پابندیوں کی زنجیریں ڈال
دی گئیں۔ مجھے ایک کمرے میں بند کر دیا گیا۔ میں روٹی
رہی، تڑپتی رہی۔ کسی کو احساس نہیں تھا۔ میں مرجانی
، موت کو گلے لگا لیتی اگر ابرار کا خیال نہ ہوتا۔ مرنا تو چاہتی
تھی لیکن ابرار کا کیا ہوگا؟ یہی سوچ کر صبر کے کڑوے
گھونٹ پی جاتی۔ زمانے کے زہر شدہ تیر روز میرے
سینے میں پوست ہوتے۔

گھر میں شادی کی تیاریاں ہونے لگیں۔ جہیز بنایا جا
رہا تھا۔ میری خالہ نے مجھ سے وعدہ کیا۔

”عندلیب! فی الحال تم احمد سے شادی کر لو۔ میری
عزت رکھ لو، میں جلد تمہاری طلاق کرادوں گی پھر تم ابرار
سے شادی کر لینا۔ ابھی برادری کی عزت کا سوال
ہے۔ تمہارے انکار سے بہت خون خرابہ ہوگا۔“ خالہ نے
نہ جانے کیا سے کیا سبز باغ دکھائے، سورج کی روشنی میں

چمکتے ستارے دکھائے۔ اس کی شیریں، میٹھی باتیں دل کو لگتی ہیں لیکن میرے من مندر میں صرف ابرار کا پہرہ تھا۔ میں کیا کرتی؟ خالہ سے کہا مجھے موبائل دلوادو۔ میں ابرار سے آخری بار بات کر کے کہہ دیتی ہوں کہ مجھے بھول جاؤ۔ خالہ نے پیار سے ماتھا چوما۔ مجھے دعائیں دینے لگی۔ خالہ نے میرا یقین کر لیا۔ شام کو موبائل مل گیا۔ میں نے خالہ سے کہا۔ میں ابرار سے تنہائی میں بات کروں گی۔ خالہ نے میری بات مان لی پھر جب سب سو گئے میں نے اپنے دل کے شہزادے کو کال کی۔ خوب گلے شکوے کیے پھر ساری صورت حال بتائی، مگر ابرار کا رویہ تبدیل تھا، ابرار پہلے والا نہیں رہا تھا۔ کہنے لگا۔ ”عندلیب“ تم ابھی شادی کے لیے ہاں کر دو۔ خالہ کی بات مان کر شادی کر لو۔ میں بعد میں تمہیں اپنا لوں گا۔ ابھی کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ تمہارے گھر والے تمہارے ساتھ ساتھ مجھے بھی ختم کر دیں گے۔ ابھی حالات سے سمجھو تا کر لو۔ تھوڑے عرصے بعد تم طلاق لے لیتا۔ جب تمہیں طلاق ہو جائے گی پھر ہماری راہیں صاف ہوں گی پھر کوئی نہیں روکے گا، ہمارا ملن ہوگا ضرور ہوگا۔“

میں رو دی۔ خوب آنکھوں کا سمندر چھلکا۔ ابرار یہ تم کہہ رہے ہو۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم بھی ایسا کرو گے۔ نہ جانے کس نے اس کے کان بھر دیئے تھے؟ کس نے دھمکی دی تھی، ابرار ایسا کبھی بھی نہیں تھا۔ ابرار مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”ہاں عندلیب“ وقت کی نزاکت کو سمجھو۔ وقت کی لہریں مخالف ہیں۔ میرا یقین کرو، تم تو میری روح میں سمائی ہو۔ ابھی میں مجبور ہوں کچھ بھی نہیں کر سکتا۔ میرے اوپر بہت دباؤ ہے۔“ نہ جانے ابرار کو کیا ہو گیا تھا؟ پیار کرنے والے ایسا کب کرتے ہیں؟ پر مجبوریاں ناکوں چنے چبوا دیتی ہیں پھر کال منقطع ہو گئی۔ ساری رات اپنی بے بسی پر آنسو بہاتی رہی۔ اشکوں کے دریا بہتے رہے۔ لیکن موتی آنکھوں کے گھر سے نکل کر رخساروں کو چومتے ہوئے، دامن بھگوتے زمین بوس ہوتے رہے۔

یہ آنسو کتنے وفادار ہیں۔ خوشی ہو، غمی ہو، درد ہو، آہیں ہوں، کبھی بھی ساتھ نہیں چھوڑتے۔ ظالم لوگوں سے، بے درد زمانے سے یہی آنسو اچھے جو مرتے

دم تک ساتھ نبھاتے ہیں۔ پیدا ہوتے ہیں تو آنکھوں میں چمکتے ہیں۔ مرتے ہیں تو دوسروں کی آنکھوں سے نکلتے ہیں۔ کالی سیاہ رات گزرتی رہی، چاند بھی میری بے بسی پر اداس تھا وہ ستاروں کو میری داستان سنا رہا تھا۔ آسمان خاموش تماشا شائی تھا۔ بادل تو میرا غم برداشت نہ کر سکے، خوب ٹوٹ کر برسے۔ بے درد زمانے نے اسے رحمت قرار دے دیا۔ بادلوں نے دل کا غبار نکال لیا، ہر طرف جھل جھل ہو گئی۔ زمین سیراب ہو گئی۔ درخت نہا دھو کر صاف شفاف ہو گئے تھے۔ ہر سول بہار ہی بہار کا سماں تھا۔

میرے سارے غم اسی رات آنسوؤں میں بہ گئے۔ رات اپنا سفر مکمل کر چکی تھی۔ صبح کا سورج طلوع ہونے کو تھا۔ میں فیصلہ کر چکی تھی۔ اپنے غموں کو من میں دفن کیے، آنسوؤں کو آنکھوں میں سجایا۔ غموں کا زہر پی لیا۔ میں ہار گئی بے درد زمانہ جیت گیا۔ صبح کا سورج زندگی کا اک نیا موڑ لیا کھڑا تھا۔ میں نے حامی بھر لیا۔ شادی کے لیے ہاں کر دی لیکن یہ من کی مرضی نہیں تھی، ظاہری خوشیوں میں شریک ہونا تھا۔ خالہ کا وعدہ تھا شادی کے بعد میرا ساتھ دے گی۔ کبھی میرا فیصلہ من کر بہت خوش تھے۔ خالہ کے دل میں نہ جانے شک کہاں سے پیدا ہو گیا؟ یقین سے بے یقین ہو گئی۔ اسے شک تھا کہ میں نکاح کے وقت اپنا فیصلہ بدلوں گی۔ نکاح کے وقت ان کو برادری کے سامنے رسوا کروں گی۔ اس نے یقین کے لیے کلمہ پڑھوایا۔ عہد لیا۔ تب اسے یقین ہوا۔ پھر کیا تھا؟ ادھر زندگی کی شہنائی بج رہی تھی ادھر زندگی ماتم کر رہی تھی۔ کبھی خوش تھے، سب تیاریاں کرنے میں لگے تھے۔ ایک میں ہی تھی جو زندگی کا ماتم کر رہی تھی۔ صرف میرے اندر غموں کی بارش ہو رہی تھی۔ میرے ارمان جل رہے تھے۔ میری دنیا ٹپ رہی تھی۔ میرے سینے بکھر رہے تھے۔ میرا شہزادہ چھین لیا گیا تھا۔ جو ہم سفر تھا، کہیں کھو گیا تھا۔ میں رو رہی ادھر شہنائی بجتی رہی۔ میرے اندر آگ کا طوفان تھا، سہیلیاں میرے ارد گرد بیٹھی گیت گات رہی تھیں۔

محلے والے حیران تھے کہ چند دنوں میں شادی، اتنی جلدی ہی کیا ہے؟ نہ جانے کیا ماجرا ہے؟ بات بھی سچ تھی سب کچھ چند دنوں میں ہی ہوا تھا۔ میں سوچ بھی نہیں سکتی

تھی کہ اتنی جلدی میری شادی ہو جائے گی۔ وہ بھی اس سے جس کے بارے میں کبھی سوچا نہیں تھا۔ واہ ری تقدیر!

مہندی کا دن بھی آ گیا۔ مجھے مہندی احمد کے نام کی لگائی گئی۔ یہ مہندی نہیں تھی، میرے ارمانوں کا خون تھا۔ میرے جذبات کا خاموش قتل تھا۔ ادھر احمد کے گھر والے مہندی لگا کر گئے ہی تھے کہ میں اٹھی اور جا کر مہندی والے ہاتھ دھو دیئے۔ میں تو صرف اور صرف ابرار کے نام کی مہندی لگانا چاہتی تھی۔ وہی میرا ہم سفر تھا۔ وہی میری زندگی کا ساتھی تھا۔ اس کے لیے میری زندگی واقف تھی۔ ساری سہیلیاں گیت گات رہی تھیں اور میں رو رہی تھی۔ ایک ایک آنسو میرے من، میری روح کو زخمی کرتا جا رہا تھا۔ روتے دھوتے وہ دن، وہ رات بھی گزر گئی۔ دوسرا دن چڑھ گیا۔ سورج میرے ارمانوں کو جلانے کے لیے بے تاب تھا، اسی دن تو بارات تھی۔ لوگ گھر میں جمع ہونے لگے۔ گھر کا صحن عورتوں، لڑکیوں، معصوم بچوں سے سج گیا۔ مختلف لباس میں ملبوس عورتیں، ڈانس کرنی لڑکیاں خوشی کا سماں پیش کر رہی تھیں۔ کہیں خوشیاں تھیں تو کہیں ارمان جل رہے تھے۔ ایک میرے اندر آگ کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا، باقی تمام خوشیاں منا رہے تھے۔ میرے گھر میں اندھیرا تھا۔ میرے گھر کو الیکٹرک لائٹوں سے روشن کیا گیا تھا۔ میرے سپنوں کے چراغ تو کب کے بجھ گئے تھے اور یہاں چراغوں سے گھر کے درود یوار سجادیئے گئے تھے۔

شام کے سائے ڈھلتے ہی احمد سر پر سہرا سجائے، ڈھول کی تال کے ساتھ، باراتیوں کو لے کر ہمارے گھر آ گیا۔ رقص کرتے اس کے دوست، بھنگڑے ڈالنے من چلے، خوشیاں منا رہے تھے۔ شہزادانی میں احمد مجھے ایک آنکھ بھی نہیں بھار رہا تھا۔ بارات کا استقبال کیا گیا۔ کھانا کھلایا گیا پھر نکاح کی رسم ادا کی گئی۔ رات گئے تاروں کی چھاؤں میں ایک بے جان جسم کو گاڑی میں ڈال کر لے جایا گیا۔ احمد میرا سرتاج بن گیا۔

ہائے کتنا بے بس ہوتا ہے وہ انسان جس کے ارمان جل جھل ہوں، جس کے سینے ٹوٹے ہوں، جس کی دنیا ویران ہوئی ہو، جس کی مرضی کے بغیر فیصلے ہوئے ہوں۔ وہ تو جیتے جی مر جاتا ہے۔ اس کا جسم تو ہوتا ہے

روح نہیں ہوتی۔ اس کی زبان پر قفل لگ جاتے ہیں۔ اس کی آنکھیں خشک ہو جاتی ہیں اس کا دل درو کی آہیں بھر رہا ہوتا ہے۔ کاش ایک انسان دوسرے انسان کی جان نہ لیتا۔ دوسرے کے ارمان نہ توڑے جاتے۔ دوسروں کے نشین نہ چلتے، دوسروں کی زندگیاں برباد نہ ہوتیں۔ کاش انسان، انسان کا دشمن نہیں دوست ہوتا لیکن یہ دنیا ہے یہاں لمحہ لمحہ زندگیاں ویران ہوتیں ہیں۔ پل پل اذیت ملتی ہے۔ یہاں خوشیاں دینے والے کم، خوشیاں چھیننے والے ہزاروں ہیں۔ آنسو دینے والے قدم قدم پر ملتے ہیں۔ آنسو صاف کرنے والے نہ جانے کس دلیں بستے ہیں؟ یہاں آنکھوں سے کھیلا جاتا ہے، آنکھیں سروں پر ڈالنے والے نہیں ہیں۔ یہاں آبرو برباد کی جاتی ہے عزتیں نیلام ہوتی ہیں۔ آبرو کے رکھوالے نہیں ہیں۔ اس دنیا میں انسان کے روپ میں سانپ بستے ہیں۔ جن کو جتنا دودھ بھی پلایا جائے، ڈستے ضرور ہیں۔ ان کی فطرت میں ڈسنا ہے۔ زندگیاں برباد کرنا ہے۔ یہ انسان اُس ماں کو معاف نہیں کرتا جو دودھ پلاتی ہے، باقی رشتوں کی حفاظت کیا کرے گا۔ رشتوں کی پامالی کر کے جھوٹی خوشیاں، جھوٹی دولت حاصل کرتا ہے۔ اے میرے رب! تو یہ انسان اس دنیا میں نہ ہی بھیجتا تو تیرا کیا جاتا؟ تیرے خزانے میں کیا کمی تھی؟ تیری عبادت کو فرشتے ہی کافی تھے پھر تو نے یہ کارواں کس لیے چلایا؟

احمد راولپنڈی میں رہائش پذیر تھا۔ عرصہ ہوا تھا ہمارے گھر سے گئے ہوئے۔ وہیں پر کام کرتا تھا۔ رات گئے دلہا بارات کے ہمراہ بے جان دلہن کو لے کر پنڈی پہنچ گیا۔ احمد کے گھر میری خوب آؤ بھگت کی گئی۔ ڈھول پر بھنگڑے ڈالے گئے۔ آتش بازی ہوتی رہی۔ اسلحے کی نمائش، فائرنگ ہوتی رہی۔ شہنائیاں گونجتی رہیں۔ میں بیت بنی جگہ عروسی میں بیٹھی اپنی بے بسی کا ماتم کر رہی تھی۔ رات گئے لوگوں کا شور بہلہ گلہ کم ہوا، دھیرے دھیرے کبھی محو خواب ہونے لگے۔ احمد دوستوں سے فراغت پا کر جگہ عروسی میں آیا۔ میرے پاس سہیلیاں بیٹھی تھیں۔ احمد کو دیکھتے ہی مسکراتی، ہنستی اٹھ کر چلی گئیں۔ احمد میرے پاس آ بیٹھا، میرا گھونگھٹ اٹھایا۔ میں سر جھکائے آنسوؤں میں نہا رہی تھی۔ اس نے

میرا ہاتھ پکڑنا چاہا میں نے ہاتھ پیچھے کر لیا۔ ”عندلیب! میں تمہیں گولڈن انگوٹھی پہنانا چاہتا ہوں۔“

”عندلیب! اب تم میری بیوی بن گئی ہو۔ ابرار کو پہنانا سمجھ کر بھول جاؤ، بس ایک پہنانا تھا جو ٹوٹ گیا۔ میں تمہیں ہر خوشی دوں گا۔“

”نہیں احمد! تمہاری بھول ہے۔ پہنانا نہیں وہی میرا شہزادہ ہے۔ میں نے تمہیں پہلے بتا دیا تھا، میں تمہاری نہیں ہوں۔ نہ ہی تمہاری بن سکتی ہوں۔ میرے جسم و روح کا مالک تم نہیں، ابرار ہے۔“

احمد ڈھیٹ تھا! اس سے مس نہ ہوا، میرے جسم کو چھونا چاہا۔ میں نے سختی سے منع کر دیا پھر وہ رات درد ناک عذابوں میں گزرتی ہی گئی۔ احمد دوسرے بیڈ پر سو گیا اور میں آنسو بہاتی وہیں پر سو گئی۔ وہ رات بھی ہزاروں غموں کی سوغات دے کر گزرتی جس کا انتظار ہر لڑکی، لڑکا کرتا ہے۔ سہاگ رات کا خواب ہر کوئی دیکھتا ہے۔ زہریلی ناگن جیسی یہ رات بھی ہزاروں آنسو میرے نام کر گئی۔ صبح سویرے سہیلیاں آ کر مذاق کرنے لگیں۔ رات بھر کیا ہوا ارے دیکھو، دیکھو اس کی تو آنکھیں سرخ ہو گئی ہیں۔ احمد نے رات بھر اپنی میٹھی شیریں باتیں سنائی ہوں گی، تبھی تو سو نہیں سکی بے چاری! خوب سپنوں کے محل تو تعمیر کیے ہوں گے۔ اب انہیں کیا جواب دیتی، بھلا کسی کی زبان کو کوئی روک پایا ہے جو میں روکتی۔

احمد بھی صبح سویرے اٹھ کر دوستوں کی محفل میں مصروف ہو گیا۔ ولیمہ ہوا۔ لوگ آئے پیٹ کی آگ بجھائی، باتیں سنتے، سناتے اپنے اپنے گھروں کو لوٹ گئے۔ ایک کے سینے ٹوٹے، ایک کا سہرا سجا۔ وقت کا کام ہے گزرتا، سو بے رحم وقت گزرتا رہا۔

اسی طرح شادی کو آٹھ دن گزر گئے۔ آٹھویں روز احمد نے میرے جسم کو حاصل کر لیا لیکن میری روح، میری محبت، میری چاہت، میری آرزو، صرف ابرار تھا۔

دستور زمانہ ہے عورت ظلم سہتی آئی ہے۔ بے چاری کمزور عورت کر بھی کیا سکتی ہے۔ مرد مرنا ہی عورت کے شباب پر ہے۔ اس رات احمد وحشی بن گیا۔ مجھ پر تشدد کیا۔ مجھے مارنے لگا، گالیاں دیں، میں روتی رہی، جسکتی

رہی، تڑپتی رہی اور وہ میرے جسم سے کھلتا رہا۔ احمد نے میرا جسم تو حاصل کر لیا تھا مگر من میں جگہ نہ بنا سکا۔ میں طلاق مانگنے لگی۔ احمد تھا کہ بار بار ابرار کا نام لے کر طے دیتا۔ بھول جاؤ اس کہنے کو ورنہ اس کے ساتھ تمہیں بھی قتل کر دوں گا۔ ضد اور انا کی جنگ، میں دونوں جیتے رہے۔ وقت محو پرواز رہا۔ میں ابرار کو نہ بھول سکی اور ابرار بھی دل میں جگہ بنانے میں ناکام رہا۔ شادی کو ایک ماہ گزرا تھا کہ چھوٹے چھوٹے جھگڑے طول پکڑنے لگے۔ میں بھی یہی چاہتی تھی کہ کسی طرح بات طول پکڑے اور مجھے طلاق مل جائے۔ پھر میں اپنے محبوب کو لولہ۔ شاید میں پہلی عورت تھی جو خود ہی طلاق کی طلب گار تھی جو اپنے ہاتھوں اپنے نشین کو آگ لگانا چاہتی تھی۔ احمد بغض تھا کہ میں تمہیں اس بندھن کی زنجیروں میں قید رکھوں گا۔ بل، بل اذیت دوں گا۔ چاہے جو ہو جائے، تمہیں آزاد ہرگز نہیں کروں گا۔ میں نے خالہ کو کہا۔ ”اپنا وعدہ نبھاؤ۔ میں احمد کے ساتھ خوش نہیں ہوں۔ بس مجھے طلاق چاہیے، صرف طلاق۔“

خالہ مجھے سمجھانے لگیں۔ ”دیکھو عندلیب! ہوش کے ناخن لو۔ تھوڑا عرصہ ہوا ہے تمہاری شادی کو اور تم طلاق مانگنے لگی ہو۔ لوگ کیا کہیں گے، زمانہ کیا کہے گا؟ برادری کیچڑ اچھالے گی۔ اپنی اور ہماری عزت کا کچھ تو خیال کرو۔ ہماری عزت خاک میں نہ ملاؤ۔ کم از کم ایک سال خاموشی سے گزارو۔“ خالہ کا خیال تھا وقت کے ساتھ میں سمجھوتا کر لوں گی مگر یہ خالہ کی بھول تھی۔

احمد اور میری نہ بن سکی۔ خالہ تو چاہتی تھی کہ ہم دونوں میں محبت پیدا ہو جائے لیکن جس کی بنیاد ہی نفرت سے رکھی گئی ہو وہاں محبت کا کیا کام۔ احمد کوشش کرتا رہا لیکن میں بھی مجبور تھی۔ عشق کا بھوت جو سوار تھا۔ میں نے ابرار کے ساتھ وعدے کیے تھے۔ قسمیں کھائی تھیں، ابرار پر مہر مٹی تھی۔ وہی میری منزل تھی، بس یہی میری سب سے بڑی بھول تھی میں ہی غلط تھی۔ احمد اذیت دیتا رہا۔ شامی روز روز کی مار کھا کھا کر ڈھیٹ ہو گئی پھر ابرار سے رابطہ کر لیا۔ ہماری بات ہونے لگی۔ ابرار بھی یہی چاہتا تھا کہ میں احمد سے طلاق لے لوں اور ہمیشہ کے لیے اس کی ہم سفر بن جاؤں۔

ابرار کہتا، میں تمہیں اپنا لوں گا، زمانے کی سادگی

خوشیاں تمہارے قدموں میں لا کر رکھ دوں گا۔ ایک طرف احمد میرا شوہر تھا تو دوسری طرف میرا پیارا ابرار۔ میں کس کا ساتھ دیتی؟ کس کو چھوڑتی؟ فیصلہ نہیں کر پاتی تھی۔ احمد میرے پیار کے لیے ترس رہا تھا اور میں ابرار کے لیے ترس رہی تھی۔ عجیب زندگی تھی میری، کوئی مجھے چاہتا تھا اور میری چاہت کوئی اور تھی۔ یہ چاہنا اور چاہے جانا کتنا عجیب کھیل ہے۔ احمد نے ہزار ہا کوشش کی مگر بات نہ بن پائی۔ میں اپنی ضد پر قائم رہی اور احمد مجھ سے ناراض ہو کر بیرون ملک چلا گیا۔ احمد کا بیرون ملک جانا تھا۔ میں روز ابرار سے باتیں کرنے لگی۔ احمد نے جاتے ہوئے ایک ظلم اور کیا۔ میرے ماما، پاپا کو سب کچھ بتا دیا کہ عندلیب طلاق لینا چاہتی ہے مگر میں اسے زندگی بھر طلاق نہیں دوں گا، دوسری شادی کر لوں گا۔ جس طرح میں تڑپا ہوں، عندلیب کو بھی تڑپاؤں گا۔

احمد چلا گیا۔ ماما پاپا مجھے سمجھاتے رہے۔ عندلیب! تم پاگل ہو۔ سائے کے پیچھے بھاگ رہی ہو۔ شادی شدہ عورت کو کوئی نہیں اپنا تا اور تو اور طلاق شدہ عورت زمانے میں بدنام ہو کر رہ جاتی ہے۔ لوگ اسے بڑی نظروں سے دیکھتے ہیں۔ اسے ذلیل و خوار ہونا پڑتا ہے۔ تم بکھر جاؤ گی، تم برباد ہو جاؤ گی۔ ہماری بات مان لو، ہم نے تمہیں بالائے۔ تمہارا اندر نہیں چاہتے۔ کچھ ہماری عزت کا خیال کرو۔ کون سی کسر ہم سے رہ گئی تھی جس کی اتنی بڑی سزا دے رہی ہو۔ ہماری ہی مان لو۔ احمد برا نہیں ہے۔ جانتی ہو آج کے مرد سانپوں سے بھی زیادہ زہریلے ہیں۔ ڈستے ہیں ان کا ڈسا پانی بھی نہیں مانگ سکتا۔ شکر کرو احمد ان میں سے نہیں ہے۔ اپنا ہے، خاندان سے ہے۔ اس کے پاس سب کچھ ہے۔ خدا نہ کرے کل کو اس نے کسی اور کو اپنا لیا تو تم بچھڑاؤ۔ کی آگ میں جل کر راکھ ہو جاؤ گی۔ بکھرو گی تو کوئی تمہیں سہارا نہیں دے گا۔ زمانہ تمہیں جینے نہیں دے گا۔ ہم آج نہیں تو کل اس دنیا سے چلے جائیں گے پھر کوئی تمہارا نہیں ہو گا۔ آج تم جس کے لیے دیوانی ہو گئیں ہزاروں غم دے کر کسی اور کی زلفوں کا اسیر ہو جائے گا۔ مرد کی فطرت میں شامل ہے۔ یہ تو ہر کئی کی ہنسنے کی طرح ہر بھول، ہر کٹی، ہر گلشن میں آوارگی

کرتا ہے۔ کوئی سچا پیار نہیں کرتا۔ سب ہوس کے غلام ہیں۔ سب جسموں کے پجاری ہیں۔ تم تو پھر اجڑی ہوئی بے سہارا عورت ہو گی۔ کون تمہیں اپنا بنائے گا۔ ہماری بات مان لو، بیٹی! ہماری بات مان لو۔

ماما پاپا کی باتیں ابھی تک میری کھوپڑی میں نہیں بیٹھ رہی تھیں۔ وہ ٹھیک کہتے تھے لیکن میں کیا کرتی؟ ابرار کے پیار میں پاگل تھی۔ اس نے نہ جانے کیسا جادو کر دیا تھا؟ میری منزل صرف اور صرف ابرار ہی تھا۔ مجھے یقین تھا مجھے کبھی دھوکہ نہیں دے گا۔ میرا سہارا بنے گا۔ میں اسی کے گن گاتی رہی زمانے والے چاہے جو مرضی کہتے رہیں مجھے پروا نہیں تھی۔ میرا شہزادہ وہی تھا۔ وہ بھی ابھی تک میرا ساتھ دے رہا تھا۔ کوئی اور ہوتا تو شاید کب کا راہیں بدل چکا ہوتا۔ تبھی تو مجھے اعتبار تھا کہ وہ مجھے سے سچا پیار کرتا ہے۔ مجھے دھوکہ نہیں دے گا۔ دن مہینوں میں تبدیل ہوتے گئے۔ زندگی کی گاڑی ہچکولے کھاتی رہی۔ اسی طرح دو سال بیت گئے۔ شادی کے بعد بھی ابرار سے متواتر رابطہ رہا۔ بات ہوتی رہتی تھی پھر اچانک نہ جانے کیا قیامت ٹوٹ پڑی۔ ابرار کا نمبر آف ہو گیا۔ میں روز ٹرائی کرتی مگر نمبر پاور آف ہی ملتا۔ میں پریشان بھی تھی۔ خدا خیر کرے! پہلے تو کبھی ایسا نہیں ہوا تھا۔ اگر کوئی پر اہم ہوتی تو مجھے بتا دیا کرتا تھا۔ خدا خیر کرے!

ابرار کا ایڈریس میرے پاس تھا لیکن گھر سے نکلتا دھواں تھا۔ گھر والوں کی نظریں میرا تعاقب کرتی رہتی تھیں۔ یہ راز تو بعد میں عیاں ہوا۔ میری خالہ ہی میری رقیب بن گئی تھی۔ اس نے ہی ابرار کو کال کی اور کہا۔ ”دیکھو ابرار! عندلیب کو بھول جاؤ۔ وہ اپنے گھر میں خوش ہے۔ اب اس کی زندگی سے دُور بہت دُور چلے جاؤ۔ اس کے آنگن کو برباد مت کرو۔ پیار کرنے والے محبوب کو اذیت نہیں دیتے۔ تمہیں کوئی اور اچھی لڑکی مل جائے گی۔ عندلیب کا پیچھا چھوڑ دو۔“

خالہ نے ابرار کا نمبر احمد کو دے دیا۔ احمد نے نمبر ماما پاپا کو دے دیا۔ سبھی نے اپنی اپنی جگہ اسے دھمکیاں دیں، اسے ڈرایا۔ تمہیں ختم کر دیں گے ساتھ میں عندلیب کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیں گے۔ زندگی کی سلامتی چاہتے ہو تو عندلیب کی زندگی سے ہمیشہ کے لیے نکل

جاؤ تب سے ابرار نے نمبر بدل لیا تھا۔ بزدل تھا ڈر گیا۔ پیار کرنے والے ڈرتے تھوڑے ہیں۔ وہ مرد ہو کر بھی بزدل نکلا اور میں عورت ذات ہو کر مقابلہ کر رہی تھی۔ خیر میں وہ جگہ جانتی تھی جہاں ابرار کام کرتا تھا۔ میں اُسے تلاش کر سکتی تھی۔ ایک ہی شہر میں تو رہتے تھے۔

ابھی اسی حالات میں زندگی کے شب و روز گزر رہے تھے کہ احمد وطن واپس آ گیا۔ نہ جانے اُسے کیا ہو گیا تھا۔ اب کی بار اس کے تیور کچھ زیادہ بدلے ہوئے تھے۔ اُسے میری ضرورت نہیں تھی۔ بیرون ملک نہ جانے ہزاروں زندگیوں سے کھیلتا رہا ہوگا۔ جسموں سے ہوس کی پیاس بجھاتا رہا ہوگا۔ گوری رنگت والیوں کو کیا خبر، عزت، آبرو کیا ہوتی ہے۔ مغربی کچر میں عزت نام کی کوئی چیز نہیں ہوتی۔ شادی کسی سے، اولاد کسی اور کی ہوتی ہے۔ وہ صرف انجوائے کرتے ہیں۔ وہاں رشتوں کی کوئی اہمیت نہیں ہے۔ احمد بھی وہاں رہ کر آیا تھا۔ اب اسے میری ضرورت نہیں تھی۔ وہ اپنی انا کی جنگ میں جھلس رہا تھا۔ مجھے آزاد بھی نہیں کرنا چاہتا تھا، میرا ہونا بھی نہیں چاہتا تھا۔ اس نے تو مجھے سزا دینی تھی جس کی پوری پوری تیار کر رکھی تھی۔ میری زندگی ویران گھنڈرات جیسی بنادی۔ روز اذیت دیتا، روز مارتا تھا۔ ماما پایا بھی اسی کے گن گاتے تھے۔ اسی کی بات بانی جاتی تھی۔ جب میں نے ہی ماں باپ کی نہیں مانی تھی وہ میرا اعتبار کیسے کرتے، سو میں اکیلی تنہا ہو کر رہ گئی۔ مجھے اپنوں نے برباد کر دیا۔ میری خوشیاں، غموں میں بدلنے والے میرے اپنے ہی تھے۔

پھر ایک دن وہ ہوا جس کا میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔ باتوں باتوں میں احمد اور میرا جھگڑا طول پکڑ گیا۔ احمد وحشیوں کی طرح مجھے مارنے لگا۔ پھر ایک عورت بغاوت پر اُتر آئی۔ اپنوں کی عزت آبرو پس پردہ ڈال کر گھر کی دہلیز پار کر گئی۔ میری منزل صرف اور صرف ابرار ہی تھا۔ میں نے اسے تلاش کرنا تھا۔ مجھے یقین تھا، وہی ایک سہارا ہے جو مجھے اپنا لے گا۔ بس اسے تلاش کرنا تھا۔ میں گھر سے راولپنڈی اڈے کی طرف محو سفر ہوئی۔ لاری اڈے پر پہنچ کر ابرار کی فیکٹری کی طرف روانہ ہوئی۔ مجھے یقین تھا وہ ابھی بھی وہیں کام کرتا ہوگا۔ جب وہاں پہنچی تو واقعی ابرار وہیں کام کرتا تھا۔ اس

وقت ابرار وہاں موجود نہیں تھا۔ وہاں سے اس کا نیو نمبر حاصل کر کے کال کی۔ میں نے بھی نیو نمبر سے کال کی تاکہ ابرار کو پہلے معلوم نہ ہو۔ ابرار نے فوراً کال ریسیو کی۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں ہوگا کہ اچانک عندلیب کال کر سکتی ہے۔ ہیلو ابرار، میں، میں عندلیب بات کر رہی ہوں۔ میری بات دھیان سے سنو۔ میں سب کچھ چھوڑ کر سب حدیں پھلانگ کر تمھاری ہونے آئی ہوں۔ مجھے لے جاؤ۔

ابرار حیران تو ہوا مگر میری دھمکی کام کر گئی کہ اگر تم آئے تو میں ابھی جان دے دوں گی اور نام تمھارا کر دوں گی۔ میری موت کے ذمہ دار تم ہو گے۔ ”عندلیب“ پاگل مت بنو۔ تم ہو کہاں؟“ میں نے اسے جگہ بتائی۔ ”اوکے تم وہاں ٹھہرو میں آتا ہوں۔“

میں پریشانی کے عالم میں انتظار کی سولی پر لٹکی ابرار کی راہیں تنگ رہی تھیں۔ نہ جانے ابرار مجھے اپنائے گا بھی یا نہیں۔ سوچوں کی وادی میں گم تھی کہ ابرار بایک لے کر میری نظروں کے سامنے تھا۔ نظروں کی پیاس بجھی، دیدار یار ہوا۔ ”ابرار تم نے نمبر تبدیل کیوں کر لیا تھا؟“

”بس یار تمھارے گھر والوں نے مجھے بہت دھمکیاں دیں۔“ پھر اس نے ساری کہانی میری سماعتوں کی نذر کی جو میں پہلے بیان کر چکی ہوں۔

ابرار مجھے ہونٹ لے گیا۔ وہاں سے کھانا کھایا۔ ”ابرار جلدی سے مجھ سے نکاح کر لو۔ میں تمھاری ہونا چاہتی ہوں۔“ لیکن ابرار آمادہ نہیں تھا۔ شریعت اس کام کی اجازت نہیں دیتی۔ میں کسی کی بیوی تھی۔ نکاح پر نکاح نہیں ہو سکتا تھا، ایسا کرنا حرام تھا۔ ایسا ہو بھی نہیں سکتا تھا۔

ابرار کہنے لگا۔ ”میں ایسا نہیں کر سکتا۔ پہلے تم اچھے سے طلاق لے لو پھر میں تمھیں اپنالوں گا۔“ اس کے لیے لمبا انتظار کرنا پڑتا۔ عدالت سے رجوع کرتی، تب بھی مہینے لگ جاتے لیکن میں تو گھر سے روٹھ کر آئی تھی۔ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر آئی تھی۔ میں رونے لگی۔ ابرار تسلیاں دینے لگا۔ ”اچھا عندلیب! چلو گھر چلتے ہیں۔ میں اپنے گھر والوں سے ملواتا ہوں پھر کوئی راہ نکالتے ہیں۔“

ابرار کی ایک بہن اور اس کی ماں گھر پر تھی جو کہ ابرار نے بتایا تھا۔ والد اس کا بہت پہلے فوت ہو چکا تھا گھر کا واحد نگین ابرار ہی تھا۔ ایک بہن کی شادی ہو گئی تھی۔ میں راضی ہو گئی۔ ابرار مجھے ایک عمارت کے سامنے کھڑا کر کے اندر چلا گیا۔ ”عندلیب! تم روکؤ میں ابھی آتا ہوں۔“ مجھے شک سا ہوا جیسے کوئی گڑبڑ ہے۔ کچھ ہونے والا ہو۔ دوسرے ہی لمحے میں نے اس خیال کو رد کر دیا کہ ابرار میرے ساتھ کبھی دھوکہ نہیں کر سکتا لیکن کیا خبر نئی موسم کی طرح انسان بدلنے میں دیر نہیں لگتی۔ چند لمحوں کے بعد ابرار واپس آ گیا۔ ”آؤ عندلیب! اندر آؤ۔“ میں اندر چلی گئی۔ تین منزلہ گھر تھا۔ ابرار مجھے سیکنڈ فلور پر لے گیا۔ مجھے بٹھایا۔ ”عندلیب! تم بیٹھو، میں امی کو بلا کر آتا ہوں۔“ ابرار چلا گیا، میں کمرے کا جائزہ لینے لگی۔ خوبصورت بیڈ سجا ہوا تھا۔ دیواروں پر خوبصورت، دلکش تصویریں آویزاں تھیں۔ گھڑی کی ٹنگ تک ماحول میں شور برپا کرنے میں مشغول تھی۔ ابھی میں کمرے کا جائزہ لے ہی رہی تھی کہ ابرار ہاتھوں میں شروب لیے نمودار ہوا۔

”لو عندلیب! ڈرنک پیو۔“

”ابرار! ابھی تو پی کر آئے ہیں۔“

”کوئی بات نہیں پانی ہی تو ہے۔ امی سو رہی ہیں جیسے اُٹھتی ہیں آپ سے ملواتا ہوں۔“ باتیں کرتا ابرار میرے ساتھ بیڈ پر آ بیٹھا۔ میرے ہاتھوں کو پکڑتے ہی پیا رہی باتیں کرنے لگا۔ باتوں، باتوں میں میرے قریب ہوتا گیا۔ میں پریشان ہو گئی۔ اس کے ارادے ٹھیک نہیں لگ رہے تھے۔ ابرار کے منہ سے بدبو آ رہی تھی جیسے شرباب پی رہی ہو۔ اس کے ارادوں سے شیطانیت ٹپک رہی تھی۔ شیطانیت اس پر حاوی تھی۔ ”عندلیب! کل کو تم میری بیوی ہی بنو گی۔ تمھارے جسم پر میرا ہی حق ہے۔ مجھے پاس آنے دو۔ میں تمھیں اپنا مانتا ہوں۔ میرے دل کی پیاس بجھا دو۔“

”تم نہیں آتی ابرار تم کیا کہہ رہے ہو؟ تمہارا دماغ تو ٹھیک ہے؟ عورت کے لیے اس کی عزت ہی سب کچھ ہوتی ہے۔ میں اپنی عزت کو داغدار نہیں کرنا چاہتی۔ دور ہو جاؤ۔“ میں غصے میں لال پیلی ہو گئی۔ ابرار نشے میں تھا۔ ابرار آگے بڑھنے لگا میں نے زوردار پھٹراس کے منہ

پر رسید کر دیا۔ ابرار گال پر ہاتھ رکھے میرے بدلتے تیور دیکھ رہا تھا۔ میں اٹھ کھڑی ہوئی۔ ابرار زبردستی پر اُتر آیا۔ شکر خدا کا، ٹیبل پر گلدان پڑا تھا جو میرے ہاتھ میں آ گیا۔ وہی گلدان دوسرے لمحے ابرار کے سر پر برس چکا تھا اور میں بھاگ کھڑی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے میری عزت بچالی تھی۔ ابرار دھوکے باز نکلا۔ پیار کا ڈھونگ رچانے والا اصل میں شیطان بن گیا تھا۔ شیطانیت اس پر حاوی تھی۔ بے بس، تنہا عورت کی مجبوری سے فائدہ اٹھانا چاہتا تھا۔ میں مجبور ضرور تھی، گھر سے ظلم و ستم سہتی فرار ہوئی تھی مگر عزت کی پاسداری کر سکتی تھی۔

رب تعالیٰ عزتوں کا رکھوالا بھی ہے۔ شاید کبھی جانے انجانے میں کوئی نیکی کی تھی جو آج کام آگئی تھی۔ رب تعالیٰ کتنا بے نیاز ہے۔ وہ اپنے بندے سے کتنی محبت کرتا ہے۔ مگر اس کے بندے..... اُف تو بہ! جو رب ماں سے بھی ستر گنا بڑھ کر پیار کرنے والا ہے، اس کے احکام نہیں مانتے۔ میری آنکھیں سمندر میں غوطہ زن تھیں۔ اشکوں کی برسات چھم چھم برس رہی تھی۔ دل پر لگا زنگ، ٹھیکین پانی کے قطروں سے اُتر رہا تھا۔ آج خدا تعالیٰ کے عذاب سے خوف اور اس کی رحمتوں کا شکر کرنا یاد آرہا تھا۔ ماما پاپا گھر والوں کی باتیں یاد آرہی تھیں۔ میں ہی غلط تھی جو ایک سراب کے پیچھے بھاگتی رہی۔ شیطان ہی روپ میں ایک انسان سے سچا پیار کرتی رہی۔ جو انسان نہیں درندہ تھا، عزتوں کا درندہ۔ وہ تو میرے جسم کا خواہاں تھا۔ اس کا پیار مطلبی تھا۔ میری آنکھوں سے پردہ ہٹ چکا تھا۔ پردے کے پیچھے چھپی تصویر کی حقیقت عیاں ہو گئی تھی۔ میں حقیقت کو دیکھ چکی تھی۔ مطلبی پیار سے نجات پا کر حقیقی رشتوں کی طرف چل پڑی۔

درندے کے جال سے نکلنے ہی ہانتے ہوئے خالہ کو فون کیا۔ ”خالہ! میں راولپنڈی میں ہوں آپ کے پاس آتا ہے۔“ خالہ حیران تھی۔ ”یوں اچانک خیر تو ہے؟“ مجھ سے پوچھا۔ ”عندلیب! کہاں ہو؟“ میں نے ایڈریس بتایا تو خالہ کہنے لگی۔ یہاں سے ٹیکسی لے کر فلاں جگہ پر آ جاؤں۔ میں نے مطلوبہ گاڑی پکڑی اور خالہ کی طرف رواں دواں ہو گئی۔ ابھی ٹیکسی میں سوار ہوئی تھی کہ ابرار کی کال آنے لگی۔ میری آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں۔ میں

نے کال کینسل کر دی۔ وہ بار بار کال کرتا رہا۔ میں کینسل کرتی رہی پھر اس نے مسج کیا۔ ”پلیز عندلیب! ایک بار صرف ایک بار کال سن لو۔“ پھرنا چاہتے ہوئے بھی میں نے کال اوکے کر لی۔ وہ بولتا رہا، میں خاموش بت بنی سنی رہی۔ آنکھیں بہہ رہی تھیں۔ ”عندلیب! خدا کے لیے مجھے معاف کر دو۔ میں بہک گیا تھا۔ مجھے ہوش نہیں رہا تھا۔ میں شیطانی بہکاوے میں آ گیا تھا۔ اب آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔ میرا یقین کرو مجھے معاف کر دو۔ واپس آ جاؤ۔ کہاں جاؤ گی، کون سہارا دے گا؟“

”خدا کی دنیا بہت بڑی ہے۔ کہیں نہ کہیں چھت مل ہی جائے گی۔ ابرار“ پیار کے رشتے اعتبار کے دھاگے سے بندھے ہوتے ہیں۔ جب شک کی دراڑیں پڑ جائیں تو رشتے کچے دھاگے کی طرح ٹوٹ جایا کرتے ہیں۔ مضبوط سے مضبوط رشتے بھی ریت کی دیوار ثابت ہوتے ہیں۔ تم نے پیار صرف میرا جسم حاصل کرنے کے لیے کیا تھا۔ مجھے آباد کرنے کی بجائے، برباد کرنا چاہتے تھے۔ مجھے اپنی ہی نظروں میں گرانا چاہتے تھے۔ ایک میں ہی پاگل بھی جو اندھا اعتبار کرتی رہی۔ میرا رب میرے ساتھ ہے۔ میری عزت و آبرو کا وہی رکھوالا ہے۔ اب مجھے کسی کا سہارا نہیں چاہیے۔ مجھے انسان سے نفرت ہے، پیار سے نفرت ہے۔ مجھے تمہارے سہارے کی ضرورت نہیں ہے۔“

میری باتیں ٹیکسی ڈرائیور سن رہا تھا۔ جب میں نے کال کاٹ دی تو ڈرائیور مجھ سے مخاطب ہوا۔ ”میڈم! میں نے آپ کی تمام گفتگو سن لی ہے۔ کیا میرے ساتھ رہو گی؟ مجھے خوش کروؤ میں تمہیں نوٹوں سے خوش کر دوں گا۔“

”گاڑی روکو کیمنے.....“ ڈرائیور کی باتیں سننے ہی میں غصے میں لال پیلی ہو گئی۔ ”تمہارے گھر میں ماں، بہن بیٹی نہیں ہے۔ اپنی ماں، بہن، بیٹی کو کہنا آپ کو خوش کریں گی۔ شیطان، کیمنے، کبھی مرد ایسے ہوتے ہیں۔ شباب کے بھوکے، اپنی عزتوں کے رکھوالے، دوسروں کی عزتیں نیلام کرنے والے۔“

مرد ہی عزت نیلام کرتا ہے اور عزتوں کا رکھوالا بھی ہے۔ اب عورت ذات کیسے پہچان کرے؟ کون سا مرد نیک ہے اور کون سا شیطان؟ غصے میں نہ جانے ڈرائیور

کو کیا کچھ کہتی گئی۔ میں نے گاڑی روکادی۔ اس سے پوچھا کہ ڈرائیور کوئی حرکت کرتا میں نے شور کرنا شروع کر دیا۔ گاڑی رکی ہی تھی کہ میں دروازہ کھولتے ہی بھاگ کھڑی ہوئی۔ ارد گرد کے لوگ مجھے دیکھ رہے تھے۔ انہوں نے ڈرائیور کو پکڑ لیا۔ وہ اسے مار رہے تھے۔ میں وہاں سے بھاگ کھڑی ہوئی۔ ڈرائیور کو تو سزا مل گئی تھی۔ میں نے خالہ کو فون کیا۔ روپائی آواز میں کہا۔ ”خالہ مجھے لے جاؤ، نہیں تو یہ درندے مجھے مار دیں گے۔“

”میری جان، تم ہو کہاں؟“ میں نے خالہ کو جگہ بتائی۔ خالہ کا گھر قریب ہی تھا۔ فوراً خالہ وہاں آ گئی اور یوں شیطانوں کی نگری سے نجات پا کر محفوظ جگہ پر پہنچ گئی تھی۔ دنیا سے اعتبار اٹھ گیا تھا۔ مردوں سے اعتبار اٹھ گیا۔ خالہ کے گلے لگ کر خوب آنسو بہائے۔ خوب دل کا غبار آنسوؤں کی صورت میں نکلا۔ من صاف ہو گیا۔ میری آنکھیں کھل گئیں۔ میں رو رہی تھی خالہ مجھے دلا سے دے رہی تھی پھر میں نے خالہ کو ساری کہانی سنا دی۔ کیسے احمد سے جھگڑا ہوا، کیسے وہاں سے نکلی، کیا ہوا سب کچھ بتا دیا۔

”عندلیب! خدا کا شکر ادا کرو۔ ابھی کچھ نہیں بگڑا۔ صبح کا بھولا شام کو واپس آ جائے تو اسے بھولا نہیں کہتے۔ حقیقت تم پر عیاں ہو گئی، اب سنبھل جاؤ۔“ قریبی رشتے داروں کو خالہ نے یہی بتایا کی عندلیب مجھے ملنے آئی ہے۔ گھر والوں کو بھی یہی یقین تھا کہ عندلیب غصے میں گھر سے نکلی ہے اپنی خالہ کے ہاں ہی گئی ہوگی۔

شام کو خالہ نے احمد کو فون کر کے بلوایا۔ خالہ نے اسے سمجھایا۔ ”دیکھو احمد! عندلیب اب بدل گئی ہے۔ وہ تمہیں خوش رکھنے کی پوری کوشش کرے گی۔ تم بھی محبت سے پیش آیا کرو۔“ خالہ نے احمد کو سمجھایا پھر سورج غروب ہوتے ہی احمد مجھے لے کر گھر آ گیا۔ میں خوش ہو رہی تھی کہ احمد مجھے خوش رکھے گا۔ رات کو جب میرے پاس آئے گا، میں اس کے قدموں میں گر جاؤں گی اور اپنے کیے کی معافی مانگ لوں گی۔ باقی کی عمر خدمت کروں گی لیکن ایسی رات کبھی آئی بھی نہیں، میں احمد سے معافی کیسے مانگتی؟ اسی رات احمد نے اپنے گھر والوں کو کہہ دیا۔ عندلیب کو کہہ دو۔ میرے ساتھ وہی چلے یا اپنے گھر

چلے جائے۔ میں وہی نہیں جانا چاہتی تھی۔ نہ جانے وہاں احمد میرے ساتھ کیا سلوک کرے گا؟ یہاں ماما پاپا، خالہ تو ہیں، وہاں احمد کے سوا کوئی نہیں ہوگا۔ میں کہاں جاؤں گی؟ احمد بھی اپنی اپنا پر قائم رہا اور میں اپنی ضد پر قائم رہی پھر احمد ہمیشہ کے لیے وہی چلا گیا۔

کچھ دن گزرے تھے کہ میری طبیعت خراب ہونے لگی۔ ڈاکٹروں سے چیک اپ کروایا تو انہوں نے خوش خبری دی کہ آپ ماں بننے والی ہیں۔ میں خوش ہوئی کہ میری گود ہری ہو گئی۔ احمد کو پتا چلے گا تو خوش ہوگا۔ مجھے معاف کر دے گا مگر ایسا نہیں ہوا اور وہ دن بھی آ گیا جب ڈیوری ہوئی۔ آپریشن سے اللہ تعالیٰ نے مجھے بیٹا عطا کیا تھا۔ بالکل احمد کے من نقش تھے۔ احمد بیٹے کی پیدائش پر بھی وطن واپس نہ آیا۔ میں احمد کی نشانی کو دل و جان سے محبت کرتی، اس کو سینے سے لگاتی۔ مگر شاید خوشیاں میرے نصیب میں نہیں تھیں۔ قسمت کی دیوی مجھ سے ناراض تھی۔ تھوڑے ہی عرصے میں اللہ تعالیٰ نے احمد کی نشانی کو اپنے پاس بلوایا۔ میں پھر تنہا ہو گئی۔ میری گود اجڑ گئی۔ غموں نے مجھے چکنا چور کر دیا۔ اب سوائے آنسوؤں کے کچھ باقی نہیں بچا تھا۔ تنہا زندگی، مسلسل عذاب میں تھی آہیں تھیں اور یہ بے بس زندگی تھی۔

ابرار کب کا میری زندگی سے جا چکا تھا۔ اس نے اپنی دنیا بسالی تھی۔ اپنی بیوی کے ساتھ خوش تھا۔ میرے چلے جانے کے بعد اس نے شادی رچا لی تھی۔ سننے میں آیا تھا اللہ تعالیٰ نے اسے دو بچیوں سے نوازا ہے۔ وہ اپنی دنیا میں خوش ہے۔ نہ جانے ایک لڑکی کا دل توڑ کر دوسری لڑکی کو کیسے خوش رکھتا ہوگا؟ جو اپنے پیار کو داغدار کرنا چاہتا تھا اپنے گھر کی عزت کا خیال کیسے رکھتا ہوگا۔ عورت سے جسمانی تسکین چاہنے والا محبت کیسے کرتا ہوگا؟ شاید بے مروت مرد ہوتے ہی ایسے ہیں۔ اپنی بیٹی باقوں سے محسوم کلیوں کی زندگیاں برباد کرتے ہیں۔ وقتی تسکین کے لیے عمر بھر کے پیار کو ترستے ہوں گے۔ جسم کے خواہش مند کبھی پیار نہیں کر سکتے اور نہ ہی پیار پاسکتے ہیں۔ شاید ابرار بھی انہی میں سے ایک تھا۔

میری بھول تھی کہ اپنے والدین، اپنے شوہر کو چھوڑ کر صرف اور صرف ایک بے وقاف، بے حس انسان کو چاہا تھا جو پیار کے جذبے سے آشنا نہ تھا جو پیار کے مطلب

سے ناواقف تھا۔ شاید دنیا میں کبھی مرد ایسے ہوتے ہیں۔ رب سے محبوب کے طلب گار تو ہیں رب تعالیٰ کے عظیم تحفے کی قدر نہیں کر پاتے۔ اسے بازاروں میں نیلام کر دیا۔ اسے محفلوں کی رونق بنا دیا۔ اسے گھر کی رونق کی بجائے نمائشی بنا دیا۔ حیرت ہے ایسے مردوں پر جو اپنے رب سے اپنی تنہائی کے خاتمہ کے لیے دلی سکون کے لیے رب سے محبوب، ساتھی طلب کرتے ہیں۔ لیکن رب کے عطا کردہ محبوب کی قدر نہیں کرتے۔ جو ان کے گھروں کو سنوارتی ہیں ان کی زندگی برباد کر دیتے ہیں۔ اس کا حق کھا جاتے ہیں۔ اس کی جائیدادیں ہڑپ کر جاتے ہیں۔ نفرت ہے، نفرت ہے مجھے ایسے مردوں سے۔

احمد نا جانے کس خطا، کس ستم کی سزا دے رہا ہے۔ مجھے چھوڑنا بھی نہیں چاہتا، میرا ہونا بھی نہیں چاہتا۔ اس بے درد دنیا میں، میں گھٹ گھٹ کے جی رہی ہوں، اب تو بس موت ہی مجھے سکون دے گی ورنہ یہ انسان اپنے آپ کو اشرف المخلوقات کہلوانے والے، اپنے ہم منصب کی زندگی برباد کرتے رہیں گے۔

میں مرنا چاہتی ہوں، اس بے درد دنیا میں رکھا ہی کیا ہے؟ میرا ہے ہی کون جس کا انتظار کروں جس کے لیے زندگی مانگوں؟ میری گود اجڑ گئی۔ میرا پیار مٹ گیا۔ میرا شوہر دنیا کی رنگینوں میں کھو گیا۔ میں آج بھی احمد کا انتظار کر رہی ہوں۔ کاش احمد واپس آ جائے۔ میں اس سے معافی مانگ سکوں پھر چاہے موت آ جائے، کوئی غم نہیں۔ ہاں احمد ایک بار مجھے معاف کر دو مجھے اپنی ہم سفر مان لو۔ صرف میرے ہو جاؤ۔ میں آپ کی خدمت کر سکوں تاکہ میرا رب مجھے معاف کر دے اور آخرت میں نجات حاصل کر سکوں۔ احمد! خدا کے لیے واپس آ جاؤ مجھے معاف کر دو۔

ابھی میں اپنے رب سے دعا مانگ کر مصلے سے اٹھی ہی تھی کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ دروازہ کھولا تو میرا سر تاج مسکراہٹ سجائے بازو پھیلائے کھڑا تھا اور میں اس کے قدموں میں گر گئی۔ احمد نے مجھے کندھوں سے پکڑ کر اٹھایا اور سینے سے لگا لیا۔ میری زندگی میں بہاریں لوٹ آئی تھیں۔

☆☆☆

عادت بد

روینہ شاہین

اُس میں تمام تراچھائیاں موجود تھیں لیکن اُس کی ایک عادت ایسی تھی جو اُسے لے ڈوبی

دوسری انوکھی آپ بیتی



”نہیں! کام جلدی مکمل کرو اور انگلش گرامر ریمس بھی کر لو سب بچے پڑھ کر اپنا ہوم ورک کر کے جا چکے اور اب لائٹ بھی جانے والی ہے۔“

”شرہ بیٹا! جلدی آ جاؤ روٹی بنا دو تمہارے ڈیڈی کو کھانا وقت پر چاہیے ہوتا ہے ورنہ پھر ایک ہنگامہ ہوگا۔“

”آپ کام کرو میں ابھی آئی چکن سے۔“ شرہ تیزی سے چکن کی طرف چل پڑی۔

”سالن دم پر لگا دیا ہے اب جلدی روٹی رکالو۔“ شرہ کی امی عرشہ بیگم نے چہرے سے پسینہ صاف کرتے ہوئے کہا۔

”اوہو یہ لائٹ کو بھی ابھی جانا ہوتا ہے اور یہ چکن کا کیس لیب بھی خود کم جلتا ہے جان زیادہ جلاتا ہے۔ اسے بھی ٹھیک کرائیں امی!“ شرہ نے مشورہ دیتے ہوئے شکوہ بھی کیا۔

”ٹیچر! پلیز مجھے گھر جانا ہے باقی کام گھر پر کر لوں گی۔“

”کیا ہوا نرمیہ! تم اتنی گھبرائی ہوئی کیوں ہو؟ کیا بات ہے؟“

”ٹیچر! لائٹ گئی تو کمرے میں بہت اندھیرا تھا۔ میں ڈر گئی تھی۔“

”اوہو آج پھر امیر جنسی لائٹ چارج نہیں ہوئی ہوگی اس لیے تم شاید اندھیرے سے گھبرائی ہو۔“

”نہیں! ٹیچر! مجھے یوں لگا جیسے کوئی بھیا تک جانور تھا جو مجھے پکڑ رہا تھا۔ میں نے اپنے چہرے پر اس کی سانسوں کی گرمی کو محسوس کیا ہے ابھی بھی اپنے جسم پر اس کے گندے وجود کا بوجھ محسوس ہو رہا ہے۔“ نرمیہ نے بے ترتیب سانسوں اور سہمے سہمے لہجے میں کہا۔

”تم پاگل ہو ابھی تو میں اس کمرے سے آئی ہوں سب ٹھیک تھا۔ ڈیڈی برابر والے کمرے میں ہیں اور ہمارے یہاں تو پالتو جانور بھی نہیں ہے بھیا تک جانور کہاں سے آ گیا؟“

”ٹیچر! میں بالکل سچ کہہ رہی ہوں اس نے مجھے پکڑا تو بالکل وہ جنگلی جانور جیسا تھا۔ یہ دیکھیں اس کا ناخن بھی مجھے جھکا ہے۔“ نرمیہ اپنے بیان پر قائم تھی۔

”سہمیں وہم ہوا ہے۔ شکر ہے لائٹ بھی آگئی ہے سب کام گھر چلی جاؤ۔“

”شرہ! ذرا جلدی سے میرے کپڑے استری

کرو۔“ شرہ کے والد سرفراز نے سخت لہجے میں حکم دیا۔

”نرمیہ ٹیوشن نہیں آ رہی شاید اس روز وہ کچھ زیادہ ہی ڈر گئی ہے۔“

”ہاں مجھے یاد آیا جب تم اسکول گئی ہوئی تھیں تو نرمیہ کی امی آئی تھیں۔ فیس بھی دے گئی ہیں اور اب ٹیوشن نہ بھیجنے کی اطلاع بھی دے گئی ہیں۔ 9th کلاس کی اسٹوڈنٹ تھی۔ فیس بھی اچھی مل رہی تھی لیکن یہ کیسا آسیب ہے جو ٹیوشن سینٹر کی لڑکیوں کے پیچھے پڑ گیا ہے؟ اس سے پہلے بھی چار لڑکیاں ٹیوشن سے جا چکی ہیں۔ اس مرتبہ تو کمیٹی کے پیسے بھی پورے نہیں ہوں گے اور آپا عشرت تو تاریخ سے پہلے ہی کمیٹی لینے آ جاتی ہیں۔“

”میں تو روزانہ تلاوت بھی کرتی ہوں۔ وظائف بھی پڑھتی ہوں۔ نا معلوم یہ سب کیوں ہو رہا ہے؟“ شرہ کے لہجے میں حیرت اور پریشانی تھی۔

”یہ سب آسیب کا سلسلہ ہے۔ میں خالہ شمس کی طرف جاؤں گی۔ وہ مجھے کسی اچھے عامل کے پاس لے جائیں گی۔ اس سے ہی یہ معاملہ حل ہوگا۔“

”رہنے دیں امی! پہلے بھی وہ ڈیڈی کی دوسری شادی روکنے کے لیے بھی عامل صاحب کے پاس آپ کو لے گئی تھیں اور پھر ہوا کچھ بھی نہیں تھا اور ڈیڈی کی دوسری شادی بھی ہو گئی۔“ مہوش نے عرشہ بیگم کو عامل صاحب کے پاس جانے سے روکنے کے لیے کہا۔

”تم خاموش رہو مہوش! امی! عامل صاحب کے پاس آپ ضرور جائیں۔ یہ کام جلد ہی ہونا چاہیے ایسا نہ ہو کہ ساری لڑکیاں ٹیوشن چھوڑ دیں اور ہمیں چھوٹی چھوٹی ضرورتوں کے لیے پریشان ہونا پڑے کیونکہ ڈیڈی تو لگا بندھا خرچ دے کر فارغ ہو جاتے ہیں۔ مہوش اور میں اسکول اور ٹیوشنز پڑھا کر ہی اپنی تعلیم اور دوسری ضروریات پوری کرتے ہیں۔ شہیر بھی ابھی پڑھ رہا ہے۔ جب اپنے پیروں پر کھڑا ہوگا تو کچھ آسانی ہوگی۔“

”چھوڑو بیٹا! جان مت جلاؤ۔ اللہ تعالیٰ بہتر کرے گا۔“

”جان تو جلتی نا امی! جب ڈیڈی اپنی نئی بیگم صاحبہ کو بڑے بڑے مالٹے سے شائنگ کرائیں گے اور میری فرینڈز اور کولیگز مجھے یہ سب کچھ بتائیں گی۔ نہ

جانے نئی بیگم کے شوق پورے کرنے کے لیے پیسے کہاں سے لاتے ہیں؟ شہیر کی ایڈمیشن فیس کے لیے صاف انکار کر دیا تھا۔

”آہستہ بولو ابھی وہ اپنے کمرے میں ہیں۔ اگر انہوں نے سن لیا تو ایک ہنگامہ کھڑا کر دیں گے اور سارا محلہ ان کی گالیاں اور شور شرابہ سنے گا۔ مجھے تو اس بے عزتی کا خوف پریشان رکھتا ہے۔ تم دونوں بہنوں کی خیر سے شادی ہو جائے اور اپنے اپنے گھروں میں آباد ہو جاؤ تو میری زندگی آسان ہو جائے گی۔ تم جلدی سے اپنے ڈیڈی کے لیے کھانا گرم کرو۔ میں انہیں کھانا دے آؤں۔“

اور پھر عاطلوں کے عملیات اور پھر عمل کی کاٹ پلٹ کی بھرمار شروع ہو گئی۔

”امی! اگر بتی کی خوشبو اور مختلف دھونیوں کی مہک سے اب یہ گھر نہیں کسی عامل بابا کا آستانہ لگنے لگا ہے۔ ان مرغیوں اور بکروں کی سریوں کے عمل سے کچھ نہیں ہوگا۔ اب بھی لڑکیاں لائٹ جانے کے بعد اسی طرح ڈر جاتی ہیں اور ایمر جنسی لائٹس بھی بار بار خراب ہو رہی ہیں۔ کیس لیمپ کے مینٹل جھڑنے لگے ہیں۔ میں تو کہتی ہوں آپ لوگ اس گھر کو کرائے پر دے دو اور کوئی دوسرا گھر کرائے پر لے لو۔“ مہوش نے اپنی عقل مندی کا اظہار کیا۔ ”یہ سب اسی آسب کا اثر ہے۔ عامل صاحب نے کہا ہے کالے بکرے کے لیے رقم لے آؤ۔ ایسا عمل کریں گے کہ آسب عائب ہو جائے گا۔“

”امی! یہ کیسا آسب ہے جو صرف ٹیوشن آنے والی اس لڑکی کو پریشان کرتا ہے جو اکیلی رہ جاتی ہے اور یہ سب وہ لائٹ جانے پر ہی کرتا ہے؟ آپ یا میں جب تک کمرے میں ہوتے ہیں تو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ اس وقت یہ آسب کہاں چلا جاتا ہے؟“

”مہوش! تم تو سوال پر سوال کرتی رہو کسی ٹاک شو کی اینکر کی طرح“ کام کچھ مت کرنا۔ چلو جاؤ پکن کی صفائی کرو۔“ عرشہ بیگم نے مہوش کے سوالات سے گھبرا کر اسے ڈانٹ دیا۔

”امی! نوٹی آج پڑھنے نہیں آئے گی۔ اسے کچھ کام ہے۔ مجھے اسکول کے کام کے سلسلے میں پرنسپل صاحبہ کے گھر جانا ہے۔ ہم سب بیچرز وہاں سے تقریباً دو سے

تین گھنٹے میں فارغ ہوں گی۔“

”ٹھیک تم جاؤ اور ہاں یوں کرو مہوش کو واپسی پر کوچنگ سینٹر سے ساتھ لے آنا۔“

”ٹھیک ہے امی! میں لے آؤں گی اسے۔“

”میں شمرہ کے کمرے کی صفائی کر کے فرنیچر کی سیٹنگ اور پردے وغیرہ بدل دیتی ہوں“ بک شیلٹ بھی بہت بے ترتیب ہے اسے بھی ٹھیک کرنا ہوگا۔ شکر ہے ہمارے شوہر محترم اسد بیگ صاحب بخواب ہیں۔ میں یہ تمام کام آسانی سے کر سکوں گی ورنہ صاحب بہادر کا چائے ناشتا اور کھانا چلتا رہتا ہے اور یوں ہی وقت گزر جاتا ہے۔“ عرشہ بیگم خود کلامی کرتے ہوئے کمرے کی جھاڑ پونچھ کرنے لگیں اور یہ سب کام کرتے کرتے شام کے دھندلکے میں رات کی سیاہی گھٹنے لگی۔ عرشہ بیگم نے کام ختم کر کے شاور لیا، لائٹ پنک کٹر کا ایمر ایڈری والا سوٹ پہنا۔ بہت لائٹ سائیک اپ کیا۔ اپنا پسندیدہ پرفیوم لگایا اور کمرے میں بیٹھ کر کتابوں کی ورق گردانی کرنے لگی۔

”اوہو پھر لائٹ چلی گئی۔ یہ ایمر جنسی لائٹ بھی شاید چارج نہیں ہوئی۔ اتنی دیر کے لیے تو لائٹ جانی ہے چارجنگ بھی کیا خاک ہوگی۔“

”چھوڑو مجھے کون ہو؟“ عرشہ پر کسی اُن دیکھے وجود کا دباؤ بڑھتا جا رہا تھا۔ اس کا منہ انتہائی سخت سے دبایا گیا تھا اور اسے سانس لینا بھی دشوار ہو رہا تھا۔ اس کا جسم نامعلوم بوجھ تلے دبا جا رہا تھا۔ کلائیوں پر بھی مضبوط گرفت سے تکلیف بڑھ رہی تھی۔ اسے یوں لگ رہا تھا کہ سارا وجود بے جان ہوتا جا رہا ہے اور خلاف معمول لائٹ آگئی۔ تیز روشنی سے گھبرا کر وہ سایہ اسے چھوڑ کر دور کھڑا تھا۔ عرشہ کی آنکھیں اس کے چہرے پر ٹھہری ہوئی تھیں۔ اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آ رہا تھا کہ جو کچھ وہ دیکھ رہی ہے وہ سچ ہے۔

”تو وہ تم ہو۔ مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم اپنی خوشی اور نفسانی خواہشات کے پیچھے دوڑتے دوڑتے اس قدر پستی میں جا کر دو گے۔ تمہارا یہ بدنما چہرہ تمہاری بیٹیوں پر ظاہر ہو جاتا تو کہاں یہ منہ لے کر جاتے۔ شکر ہے اس اندھیرے کی سیاہ چادر نے تمہاری بری حرکتوں کی پردہ

داری رکھ لی اور محلے میں رسوائی سے بچ گئے۔ میں دعا کرتی ہوں کہ خدا تمہیں اس اندھیرے کی چادر میں گم کر دے اسد۔“

اسد صاحب کے منہ تو جیسے زبان ہی نہیں تھی اور اسد صاحب بیرونی دروازے سے باہر نکل گئے اور عرشہ صدمے کی کیفیت میں فرش پر بیٹھتی چلی گئی۔

(کچھ عرصے بعد) صبح کا تازہ اخبار میری ٹیبل پر ردا تھا۔ آج مس شمرہ کو اسکول سے چھٹی کرتے چوتھا دن تھا۔ میں نے تہیہ کر لیا تھا کہ آج آدمی چھٹی کر کے شمرہ کے ہاں ضرور چکر لگاؤں گی۔ ان کی والدہ عرشہ بیگم کی بے وقت موت ہی اس خاندان کے لیے سب سے بڑا دھچکا تھی، بھلا کس طرح یہ غلام ہو سکتا تھا مگر خیر خدا اس کے باپ کو زندگی دے۔ اسد صاحب بہت اچھے انسان تھے۔ شمرہ سے بھی سنا تھا۔

دروازے پر بیل بجانے پر کچھ توقف کے بعد دروازہ کھلا تھا اور میرے سامنے جو شمرہ تھی وہ..... کئی یار مجھے ذہن پر زور ڈالنے پر ماننا ہی بڑا کہ وہ شمرہ ہی تھی مگر ان چار روز میں ایسا کیا ہوا کہ تلی جیسی لڑکی کے رنگ ہی دھل گئے؟

”آجائیں مس حمیرا!“ میں اس کی سنگت میں ڈرانگ روم نما کمرے میں آ گئی۔

”کیا ہوا شمرہ؟ یہ کیسی حالت بنائی ہوئی ہے تم نے؟“ میری بات سنتے ہی اچانک شمرہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”بتاؤ نا کیا ہوا ہے بھئی؟“

”کچھ باتیں شیر نہیں کی جاسکتیں حمیرا جی!“ اس کا سوتا سا انداز جس نے مجھے اس کے قریب کیا تھا مجھے اس کی کرید پر مجبور کر گیا۔

”اگر تم مجھے غیر مجتبیٰ ہو تو As you wish لیکن بار انسان کو ایک کاندھا ہمیشہ اپنے پاس رکھنا چاہیے جس پر سر رکھ کر وہ اپنا دکھ دور کر سکے۔ میں تمہیں مجبور نہیں کر رہی ہوں۔ اگر اپنا مجتبیٰ ہو تو بتاؤ یہ تمہاری حالت مجھے طبیعت کی خرابی والی نہیں لگ رہی بلکہ بات بہت سنگین ہے جو تمہاری ناتواں جان سہ نہیں پاتی ہے۔“

اب تک میرے ذہن میں صرف یہی تھا کہ شاید اس کی شادی کسی اُن چاہے بندے سے طے کر دی گئی ہے اور وہ اپنوں پر قربان ہونے کے دکھ سے دوچار ہے۔

”وعدہ کریں حمیرا جی! کہ آپ میری بات سن کر اسے اپنے دل کی زمین میں دفن کر دیں گی؟ وعدہ کریں؟“ اس نے میرے ہاتھ تھام لیے اور میں نے بھی کوشش کی کہ اس کے ٹھنڈے منہ ہاتھوں کو اپنی تسلی کی گرمائش دے سکوں۔

”حمیرا جی..... Saturday! ٹائٹ کو ایک طوفان آیا تھا، میرے کمرے میں ایک درندہ گھس آیا اور..... حمیرا جی! میں اپنے باپ کے ہاتھوں پر بادل ہو گئی.....“ اس کی ہچکیاں نہیں رک رہی تھیں۔ اس کی باتیں سن کر میں نے سختی سے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔

”اف..... یہ کیسا اندھیرے مالک! ایک بیٹی اپنے باپ پر بھی بھروسہ نہیں کر پائے گی کیا؟“ سوالوں کے ٹھمرے میرے ذہن کی اسکرین کو اپنے حصار میں لے رہے تھے۔ مجھے کچھ نہ سوچا، میں نے شمرہ کو گلے لگا لیا اور خود بھی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

”کل سے اسکول لازمی آنا۔“ میں یہ کہہ کر رکی نہیں واپس اپنے گھر کی راہ ہوئی تھی۔ میں اس کے باپ اسد صاحب کے آنے سے پہلے ہی وہاں سے چلی جانا چاہتی تھی۔

آج اس واقعے کو تین سال گزر چکے ہیں۔ شمرہ کے والد کا چھ ماہ پہلے انتقال ہو گیا ہے۔ عرشہ بیگم کی اپنے مجازی خد کی عادت بد چھپانے کی غلطی نے سارا کا سارا ملبہ ان کی اپنی بیٹیوں پر گرادیا۔ اگر عرشہ بیگم اپنی بیٹیوں کو اعتماد میں لے کر اسد صاحب کے متعلق سب حقیقت اپنی بیٹی کے گوش گزار کر دیتیں تو یہ سانحہ رونمانہ ہوتا۔ شمرہ نے تین سال اپنے باپ کا زنا با لکچر سہا مگراف نہ کی۔ آج بھی نہ جانے کتنے اسد صاحب جیسے لوگ شرافت کی پاداش میں اپنی ہی عزتوں کو پیروں تلے روند کر شیطان کے پیروکار بنے ہوں گے۔

احتیاط کیجئے ہر رشتے کے درمیان حدود کا تعین کیجئے یہی ہر ماں سے میری التجا ہے۔

☆ ☆ ☆

شع جلتی رہے گی

دیے سے دیاروشن ہوتا ہے اور چراغ سے چراغ جل کر
چراغاں ہوتا ہے صرف ایک شع کو روشن رکھنا ہی مسئلہ ہوتا ہے

راولپنڈی سے قارئین کے لیے تحفہ خاص



ایسا ایک تصوراتی پرندہ ہے جس کے بارے میں یہ روایت ہے کہ وہ جس کے سر پر بیٹھ جائے اُس کا سویا مقدر جاگ اٹھتا ہے لیکن یہ واقعات ایک جیتی جاگتی ہمارے وابستہ ہیں اور آج کے دور میں ایسی خصوصیات رکھنے والے لوگ شاید مقدر والوں کو ہی ملتے ہیں اور جنہیں مل جائیں وہ انہیں زندگی کی راہوں میں کیسے بھلا سکتے ہیں۔ آج کے اس ترقی یافتہ مگر خود غرض دور میں انسان کی یہ فطرت بن گئی ہے کہ وہ جھوپڑے کے عالم کی قدر نہیں کرتا لیکن محل کے جاہل کو سر پر بٹھاتا ہے کیونکہ قدریں بدل رہی ہیں۔ معیار زندگی بلند سے بلند تر ہوتا جا رہا ہے ضروریات زندگی میں اضافہ ہو رہا ہے اور معیار برقرار رکھنے کے لیے دولت مند ہونا ضروری ہے۔ دولت کی اسی کشش نے خونی رشتوں میں بھی تقسیم پیدا کر دی ہے۔ امیر رشتے دار غریب رشتے داروں کو نزدیک نہیں آنے دیتے۔ امیر اُن سے نفرت کرتے ہیں اور کئی تو غریبوں کو اپنا رشتے دار ہی تسلیم نہیں کرتے۔

میراجنم بھی ایک غریب خاندان میں ہوا۔ ابا جان گاؤں میں زمینداری کرتے تھے۔ زمین اتنی زیادہ نہ تھی اس لیے گزر بسر مشکل سے ہوتی تھی۔ میرے ماں باپ دونوں ہی معمولی پڑھے لکھے تھے جبکہ ہماری برادری کے کچھ افراد نے زیادہ تعلیم حاصل کی اور شہر میں جا کر ملازمت کرنے لگے۔ ان میں سے کچھ مستقل شہر کے ہو کر رہ گئے اور وہاں اپنے ذاتی گھر بھی بنا لیے۔ ان میں میری خالہ بھی شامل تھیں۔ میرے خالو کا تعلق بھی اسی گاؤں سے ہے مگر انہوں نے گریجویشن کرنے کے بعد کچھ اضافی کورس کیے اور گورنمنٹ کے کسی ادارے میں اچھی پوسٹ پر فائز ہو گئے۔ میرے امی اور ابا اکثر انہیں ملنے جاتے رہتے تھے۔ میری امی غیر معمولی طور پر حسین تھیں۔ میری خالہ بھی کچھ کم نہ تھیں اس لیے ان کی اولاد بھی حسین ہی تھی۔ خالہ کی بیٹی نورین مجھ سے ایک سال بڑی تھی۔ بچپن میں ہم دونوں میں گاڑھی چھنتی تھی۔ جب بھی میں اس کے گھر شہر جاتا یا کبھی وہ ہمارے گھر آتی تو ہم جی بھر کر کھیلا کرتے۔ ہم میں لڑائی جھگڑے بھی ہوتے اور پھر خود ہی راضی ہو جاتے۔ نورین کا شمار خاندان کی خوبصورت ترین بچیوں میں ہوتا تھا جبکہ لڑکوں میں بہت ہی خوبصورت کہلاتا تھا اسی لیے خاندان اور برادری کے سب

لوگ ہم دونوں سے بے حد پیار کرتے تھے۔ میں اُن دنوں چھٹی کلاس میں پڑھتا تھا کہ باپ کی شفقت سے محروم ہو گیا۔ ابا کی بے وقت موت نے ہم یاں بیٹے کو بے آسرا کر ڈالا۔ مجھ سے چھوٹی ایک بہن تھی۔ خاندان والوں نے بہت چاہا کہ امی دوسری شادی کر لیں مگر وہ نہ مانیں۔ انہوں نے میری اور کنیز کی خاطر اپنی جوانی کی پروا نہ کی اور خود محنت مزدوری کر کے گھر کا خرچ چلانے لگیں۔ تھوڑی بہت جو زمین تھی وہ پٹے پر دے دی اور ہماری خاطر دن رات ایک کر ڈالا۔ انہوں نے لوگوں کے گھروں میں کام کیا اور میری پڑھائی کا سلسلہ ٹوٹنے نہ دیا۔ جب ابو زندہ تھے تو اُس وقت مجھے تعلیم حاصل کرنے کا بے حد شوق تھا مگر اب جب ابو اس دنیا میں نہ رہے تو پڑھائی سے میرا جی اچاٹ ہو گیا۔ میں اکثر ابو کو یاد کر کے روتا رہتا تھا۔ امی میری ڈھارس بندھاتی تھیں مگر اب میں مزید پڑھنا نہیں چاہتا تھا مگر امی نے مجھے ایسا کرنے نہیں دیا۔

ابا جان اس دنیا سے کیا گئے کہ رشتے داروں نے ہم سے منہ موڑ لیے۔ دکھ اور درد کے اس عالم میں کسی نے بھی ہمدردی کے دو بول ہم سے نہ کہے کیونکہ ہم غریب تھے اور وہ سب امیر۔ سب نے رکی الفاظ کہے اور رخصت ہو گئے۔ میرے خالو اور خالہ نے بھی ہماری دلجوئی نہ کی وہ صرف ایک رات گاؤں ٹھہر کر واپس چلے گئے اور پلٹ کر ہماری خبر تک نہ لی۔ خالہ جیلہ کا تعلق اسی گاؤں سے تھا اور وہ معمولی پڑھی لکھی تھیں مگر اب ان کے ناز و انداز ایسے ہو گئے تھے کہ وہ خود کو بیگم صاحبہ کہلوانے لگی تھیں۔ نورین اور اس کے دوسرے بہن بھائی بھی کم نہ نکلے بلکہ وہ تو اپنی ماں سے بھی دو ہاتھ آگے تھے۔ نورین کا تو اب گاؤں کے ماحول میں دم گھٹتا تھا۔ میں نے بچپن میں ہی خونی رشتوں کی بے حسی اور بے قدری دیکھی تو میں تڑپ اٹھا پھر جیسے تیسے کر کے میں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور یہ عہد کیا کہ میں بھی اب شہر جا کر کوئی نہ کوئی ملازمت تلاش کروں گا۔

میں اب جوانی کی حدود میں داخل ہو گیا تھا اور اپنے دراز قد سرخ و سپید رنگت اور خوب صورت نقوش کے باعث ہمیشہ ہی صنف مخالف میں مقبول رہا تھا مگر میں نے کسی کو بھی گھاس نہ ڈالی کیونکہ میرے خوابوں اور

خیالوں میں تو نورین بسی تھی۔ میں دن رات اس کے ملن کے خواب دیکھا کرتا تھا حالانکہ ہم دونوں میں بھی اس موضوع پر بات نہ ہوئی تھی مگر پھر بھی مجھے یقین تھا کہ نورین میری محبت کو نہیں ٹھکرائے گی۔ وہ حسن اور خوبصورتی کا ایک جیتا جاگتا مکمل شاہکار تھی۔ وہ بچپن میں بھی کچھ کم نہ تھی مگر جوانی میں اس کا حسن دو چند ہو گیا تھا۔ اس کی رعنائیاں میرے جسم و جان میں لہو بن کر دوڑنے لگی تھیں۔ جب بھی مہینوں بعد اس کا دیدار نصیب ہوتا تو جی چاہتا کہ میں اسے دنیا کی نظروں سے چھپا لوں مگر یہ سب تو میرے خواب تھے جو میں روز دیکھتا تھا جبکہ نورین تو اب مجھ سے سیدھے منہ بات ہی نہ کرتی تھی۔ وہ بچپن کی محبت بھول گئی تھی بے پناہ خوبصورتی اور امارت نے اسے مغرور بنا ڈالا تھا۔ وہ ہر وقت امیری کے نشے میں سرشار رہنے لگی تھی۔ شہری ماحول نے اسے بالکل ہی بدل ڈالا تھا۔ وہ دن بدن نکھرتی اور مزید خوبصورت ہوتی جا رہی تھی۔ شاید یہ پیسا چیز ہی ایسی ہے جو کیونوس میں رنگوں کو سمیٹ کر دلکش شاہکار تخلیق کرتا ہے۔ نورین کی مجھ سے یہی بے مروتی کبھی مجھے وسوسوں میں مبتلا کر دیتی مگر اس دل کا کیا کرتا جو مانتا ہی نہ تھا۔ یہ تو ان کو معلوم ہو گا جن کے دل میں کوئی بسا ہوتا ہے اور وہ اسے دل سے نکال کر اپنی دسترس میں لانا چاہتے ہوں مگر وہ لائیں سکتے کیونکہ وہ اتنا نزدیک ہوتا ہے کہ جب ذرا گردن جھکائیں دیکھ لیں اور اس قدر دور ہوتا ہے کہ ہاتھ بڑھانے پر ہاتھ نہ آئے اور چاند کو دیکھنے والے بچے کی طرح ہمک کر رہ جائیں۔ ایسے لوگوں پر تو ایک ایک لمحہ صدیوں سے زیادہ بھاری ہوتا ہے۔

کئی بار من میں آئی کہ نورین پر اپنی چاہت کا اظہار کر دوں اسے کہہ دوں۔ ”نورین! میں تمہیں بہت چاہتا ہوں اپنے آپ سے بڑھ کر۔ تم میری رگوں میں میرے لہو کے ساتھ ساتھ دوڑتی ہو۔“ مگر میں یہ سب کہنے کی ہمت نہ کر پاتا اور چپ چاپ اپنی غربت کا ماتم کرنے لگتا۔ ایسے میں مجھے ماں اور کنیز کا خیال آنے لگتا، میں نے نوکری کے لیے کئی جگہوں پر درخواستیں بھیج رکھی تھیں مگر کہیں سے بلاوہ نہیں آیا تھا اور اگر انٹرویو کا بلاوا آ بھی جاتا تو رشوت اور سفارش نہ ہونے کی وجہ سے ناکام اور نامراد ہی رہتا پھر بھی میں نے ہمت نہ ہاری تھی۔

ای میری کامیابی کے لیے ہر لمحہ دعا گو رہتی تھیں اس لیے مجھے یقین تھا کہ ایک نہ ایک دن میں ملازمت حاصل کرنے میں کامیاب ہو جاؤں گا۔ دو سال ٹھوکرین کھانے کے بعد تقدیر کو مجھ پر رحم آ ہی گیا اور مجھے ایک گورنمنٹ ادارے میں کلرک کی نوکری مل گئی۔ اس دن میرے گھر میں عرصہ بعد خوشیاں اتری تھیں پھر میں اپنی سے بہت دور راولپنڈی چلا آیا جہاں میری پوسٹنگ ہوئی تھی۔ چند دن نئے ماحول اور نئے شہر میں پریشانی ہی رہی مگر رفتہ رفتہ میں اس ماحول کا عادی ہوتا گیا۔ دو تین ماہ بعد میرا وہاں سے تبادلہ ہو گیا اور میں اس شہر آ گیا جہاں خالو خالہ اور نورین رہتے تھے۔ وہ شہر ہمارے گاؤں سے بھی نزدیک تھا۔ میں بہت خوش تھا۔ خوشی کی وجہ ظاہر ہے یہی تھی کہ اب نورین سے ملنے کا موقع مجھے ملتا رہتا۔ میں نے جارج سنبھالا پھر رہائش کا بندوبست کرنے کے بعد خالہ کے گھر چلا گیا اور انہیں بتایا کہ میرا تبادلہ اب اس شہر میں ہو گیا ہے مگر کسی نے بھی میری آمد پر خوشی کا اظہار نہ کیا بلکہ ان سب کا رویہ بیگانوں جیسا لگا۔ صرف خالہ نے میری تھوڑی بہت آؤ بھگت کی مگر اس میں بھی بناوٹ کا عنصر نمایاں تھا۔ مجھے اندازہ ہو گیا کہ ان لوگوں کو میرا ان کے گھر آنا اچھا نہیں لگا کیونکہ میری موجودگی میں ہی خالہ اور نورین پڑوس میں کسی کے گھر چلی گئیں اور گھر میں خالو اور دوسرے بچے رہ گئے۔ میں اداسی سے لوٹ آیا۔ اب مجھے یہ یقین ہو گیا تھا کہ میرے مقدر کے آسمان میں نورین کا ستارہ نہیں ہے۔ وہ اور میں بھی ایک نہیں ہو سکیں گے کیونکہ میں ٹھہرا غریب کلرک اور وہ لاکھوں پتی لیکن میرا دل ان حقائق کو قبول کرنے کو تیار نہ تھا۔ دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر میں نے نورین کے نام ایک خط لکھا جس میں اسے بتایا کہ میں اس سے محبت کرتا ہوں اور اسے اپنا جیون ساتھی بنانا چاہتا ہوں اور یہ میری ہی نہیں میری ماں کی بھی تمنا ہے۔ میں اسے بچپن ہی سے چاہتا ہوں اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میری محبت بھی جوان ہو گئی ہے۔ تمہیں پانے کی خواہش میرے دل کے آئینے میں واہلا مچانی رہتی ہے اور اب تمہارا حصول میری زندگی کا مقصد ہے۔

میں خط لے کر پھر نورین کے گھر چلا گیا اور جلدی میں خط اس کے حوالے کر کے اس کے گھر سے نکل

آیا۔ اگلے دو دن خیریت اور انتظار میں گزر گئے۔ تیسرے دن وہ میرے گھر آ گئی۔ وہ نہایت غصہ میں لگ رہی تھی۔ وہ کسی نوجوان کے ساتھ گاڑی میں آئی تھی۔ میں نہیں جانتا تھا کہ وہ نوجوان کون تھا اور اس کا نورین کے ساتھ کیا رشتہ ہے؟ نورین نے آتے ہی غصہ میں پولٹنا شروع کر دیا۔

”ساجد! میں تمہاری یہ پہلی بدتمیزی معاف کر رہی ہوں اس کے بعد معافی کی گنجائش ختم ہو جائے گی۔“ اتنا کہہ کر اس نے میرا لکھا ہوا خط میرے سامنے ہی پھاڑ کر ریڑھ پر تھکڑا کر ڈالا۔ ”تم اپنی اوقات تو دیکھو زمین کی خاک ہو کر آسمان کے خواب دیکھتے ہو تمہاری حیثیت ہی کیا ہے؟ جتنی تمہاری ایک ماہ کی تنخواہ ہے اس سے زیادہ تو میرا جیب خرچ ہے۔ میں تو تم جیسے انسان سے بات کرنا بھی گوارہ نہیں کرتی۔ ہمارے درمیان زمین آسمان کا فرق ہے۔ تم زمین کی خاک ہو اور زمین پر ہی رہو تو بہتر ہے۔ تم جو خواب دیکھ رہے ہو ان کی تعبیر تمہیں کبھی نہیں ملے گی اس لیے اپنی اوقات پہچانو اور اوقات میں ہی رہو۔“

نورین نے مجھے کچھ کہنے کی مہلت ہی نہ دی اور غصہ سے پاؤں پچختی ہوئی چلی گئی۔ میرے دل و دماغ سے نورین سے عشق کا بھوت لکھوں میں اتر گیا۔ ان دنوں وہ کالج میں پڑھ رہی تھی۔ میں جان گیا کہ نورین کے ساتھ جو لڑکا گاڑی میں آیا تھا وہ یقیناً اس کا محبوب ہی ہو گا اور کسی امیر خاندان سے تعلق رکھتا ہو گا جبکہ میں ایک مفلس اور پینڈو شخص تھا، میرا اور ان کا بھلا کیا جوڑ اور کیا مقابلہ؟ وقتی طور پر نورین کی سچ باتوں نے مجھے بہت دکھ پہنچایا۔ مجھے اپنی غربت اور بے بسی پر رونا بھی آیا لیکن میں نے یہ سب کچھ حقیقت جان کر قبول کر لیا اور عہد کر لیا کہ آج کے بعد نورین کے سینے نہیں دیکھوں گا اور آئندہ کبھی بھول کر بھی اس کے گھر نہیں جاؤں گا۔

میں نے اپنے اس عہد پر عمل بھی کیا اور اپنی تمام توجہ ملازمت پر لگا دی۔ میں نے حالات سے سمجھوتا کر لیا کہ غربت ہی میرا مقدر ہے اور تمام عمر یہ طوق میرے گلے میں پڑا رہے گا۔ میں خوابوں کی دنیا سے نکل آیا کیونکہ امیر اور غریبی کے درمیان حائل خلیج کبھی بھی پُر نہیں ہوتی تھی بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ اس خلیج میں اور بھی

اضافہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ یہ انسانی زندگی کی ایک تلخ حقیقت ہے اور بعض اوقات اتنی بھیانک ہوتی ہے کہ اس پر یقین کرنا مشکل ہو جاتا ہے خصوصاً اس وقت جب رشتے اپنا بھرم کھو بیٹھیں۔ امیر رشتہ داروں کی آنکھوں پر ہوس کی پٹی بندھ جاتی ہے اور وہ دولت کی خاطر محبت جیسے پاک اور مقدس جذباتوں کا بھی خون کرنے لگتے ہیں حالانکہ محبت تو ایک پاکیزہ جذبہ ہوتا ہے۔

میں جس ادارہ میں ملازمت کرتا تھا وہاں اوپر کی کمائی خوب ہوتی تھی۔ میرے ساتھی کچھ کلرک لاکھوں میں کھیل رہے تھے مگر میرے ضمیر نے مجھے حرام کی طرف راغب نہ ہونے دیا۔ میں جانتا تھا کہ حرام کی کمائی وقتی طور پر بہت لذت دیتی ہے اور جب یہ رگوں میں خون بن کر گردش کرنے لگتی ہے تو انسان سے اچھائی اور برائی کی تمیز چھین لیتی ہے اور پھر ایک دن ایسا ضرور آتا ہے جب یہی خون کینسر بن کر رگوں میں دوڑنے لگتا ہے اور اس وقت پہچھتاؤں کے سوا کچھ ہاتھ نہیں آتا۔ نورین کا باپ بھی ان ہی طریقوں سے دولت کما کر امیر بنا تھا اور ایک نہ ایک دن اس کو بھی اس کا حساب دینا تھا کیونکہ غلط راستوں سے آنے والی دولت اپنے ساتھ برائیوں کا انبار بھی لاتی ہے فاسد خون اعضائے جسمانی کو ناکارہ بنا دیتا ہے اور فاسد دولت سے پیدا ہونے والا خون اور اولادیں بھی ناکارہ ہی ہوتی ہیں۔

ایک سال بعد میری تبدیلی پھر راولپنڈی ہو گئی۔ میں نے ایک چھوٹا سا مکان کرائے پر لے لیا پھر امی اور بہن کنیز کو پنڈی لانے کی بہت کوشش کی مگر وہ رضامند نہ ہوئیں۔ ہمارا راولپنڈی کا زول آفس بہت بڑا تھا جس میں پچاس کے قریب آفیسرز بیٹھتے تھے ہر افسر کا اپنا حلقہ اور اسٹاف تھا۔ چند ایک لڑکیاں بھی اس دفتر میں کام کرتی تھیں۔ میں شروع میں اتنے بڑے دفتر میں اور نئے ماحول میں بہت ہی نروس رہا مگر پھر اس ماحول میں رچ بس گیا۔ اسی دفتر میں ایک لیڈی آفیسر تھی جس کا نام ہما تھا۔ اس کے بارے میں دفتر کے لوگوں سے سن رکھا تھا کہ وہ بہت ہی سخت قسم کی آفیسر ہے اور اسٹاف اس سے ہمیشہ تنگ رہتا ہے۔ وہ غیر شادی شدہ اور حد سے زیادہ حسین تھی اور دفتری کام کے معاملہ میں وہ کسی کے ساتھ نرمی نہیں برتی تھی یہی وجہ تھی کہ اعلیٰ حکام

اس کی کارکردگی سے مطمئن تھے۔ کئی بار یونین والوں نے اس کے خلاف بہت سے جھکنڈے استعمال کیے مگر وہ سب ناکام رہے جس وجہ سے میڈم ہما کی اہمیت اور بھی بڑھ گئی تھی۔

وہاں کے حالات اور ساتھیوں کی باتیں سن کر میں نے دعا کی کہ میری ڈیوٹی میڈم ہما کے ساتھ نہ لگے کیونکہ اس کے بارے میں ساتھیوں سے جان کر اس سے خوف آنے لگا تھا۔ وہ دفتر کے قریب ہی سرکاری کالونی میں رہتی تھی۔ دفتر کے لوگوں نے مختلف آفیسرز کے ساتھ اس کے عشق کی داستانیں بھی گھڑ رکھی تھیں مگر ان میں حقیقت نہ تھی اس کا کردار اور کام ہی اس کو سب سے ممتاز اور نمایاں بناتا تھا۔

ایک سال یوں ہی گزر گیا تو میری ڈیوٹی میڈم ہما کے ساتھ کر دی گئی۔ لیٹر پڑھ کر میرا خون خشک ہونے لگا کہ اب آزادی اور بے فکری کے دن ختم ہو جائیں گے۔ دل پر پتھر رکھ کر میں نے حاضری کی رپورٹ دے دی۔ جب روزانہ کی ڈاک میں میری حاضری کی رپورٹ میڈم کے پاس گئی تو انہوں نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا۔ میں نے ڈرتے ڈرتے کمرے میں قدم رکھا۔ انہوں نے نظر اٹھا کر میری طرف دیکھا اور پھر نگاہیں نیچی کرتے ہوئے بولیں۔ ”ساجد تمہارا نام ہے؟“

”جی.....“

”ساجد! میں نے تمہیں اس لیے بلایا ہے کہ تم میرے ساتھ پہلی مرتبہ ڈیوٹی کر رہے ہو۔ چند ضروری باتیں ذہن نشین کر لو وقت پر دفتر آنا اور وقت پر ہی چھٹی کرنی ہے۔ مکمل چھٹی کرنے کی صورت میں مجھ سے پیشگی اجازت لینا ضروری ہے۔ میں بھی انکار نہیں کروں گی اور اگر بغیر اطلاع اور درخواست سے چھٹی کی تو میں بھی معاف نہیں کروں گی۔ پبلک کو شکایت نہیں ہونی چاہیے۔ رشوت اس دفتر میں عام ہے مگر میں اس کے خلاف ہوں اگر تم نے ایک روپیہ بھی رشوت لی اور مجھے خبر ہوگئی تو میں تمہیں نوکری سے نکلوا دوں گی۔ ہر کام وقت پر کرنا ہے روزانہ کا کام اسی دن ختم ہونا چاہیے کوئی فائل اتنا میں نہیں ہونی چاہیے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ جھوٹ نہیں بولنا کیونکہ مجھے جھوٹ سے شدید نفرت ہے۔ ہاں اگر تمہیں کسی قسم کی پریشانی یا مسئلہ درپیش ہو خواہ وہ

گھریلو ہی کیوں نہ ہو تو مجھے ضرور بتانا میں تمہاری ہر ممکن مدد کرنے کی کوشش کروں گی۔“

میں ان کی ہر بات پر ”جی میڈم!“ اور ”ہی میڈم!“ ہی کہتا رہا۔ انہوں نے ایک بار پھر میرا ہجر پار جائزہ لیا اور کہنے لگیں۔ ”اب تم جا سکتے ہو۔“

میں کمرہ سے باہر نکلا تو میرا تمام ڈر اور خوف ختم ہو گیا تھا کیونکہ وہ تو ویسی نہ تھیں جیسا اسٹاف کے لوگوں نے مجھے ان کے بارے میں بتایا تھا۔ میں میڈم ہما کے اخلاق سے بہت ہی متاثر ہوا تھا۔ وہ صرف خوبصورت ہی نہ تھیں بلکہ خوب سیرت بھی تھیں۔ جلد ہی میں اس دفتر کے ماحول میں گھل مل گیا۔ میڈم ہما کا خوف ختم ہو گیا۔ میں نے میڈم کی ہر بات پر عمل کیا اور انہیں کسی قسم کی شکایت کا موقع نہیں دیا۔ وہ میرے کام سے بہت خوش تھیں اور میں بھی ان کے اعلیٰ کردار کا معترف ہو گیا تھا۔ لوگ کہتے تھے کہ میڈم ہما بدتمیز عورت ہے اسٹاف کے لوگوں کو ذلیل کر کے رکھ دیتی ہے مگر میرے ساتھ کبھی ایسا نہ ہوا تھا جس سے لوگوں کی باتیں جھوٹی ثابت ہوگئی تھیں۔ وہ یقیناً غلط کام کرتے ہوں گے اور اسی وجہ سے میڈم کی ان کے ساتھ نہیں بنتی ہوگی اور یہ حقیقت تھی وہی لوگ میڈم ہما کے خلاف پروپیگنڈہ کرتے تھے جو رشوت لیتے تھے اور میڈم ان کی راہ میں رکاوٹ بن جاتی تھیں۔

مجھے میڈم کے ساتھ کام کرتے ہوئے ایک سال سے زیادہ ہو گیا تھا پھر میری تبدیلی کسی دوسرے دفتر میں ہونے لگی تو میڈم نے میرا ٹرانسفر رکوا دیا۔ اس میں میری مرضی بھی شامل تھی۔ اسٹاف کے دیگر لوگ بھی حیران تھے کہ میں میڈم کے ساتھ کیوں رہنا چاہتا ہوں؟ کچھ نے تو یہ الزام بھی لگایا کہ میڈم اور میرے درمیان کوئی خفیہ سمجھوتا ہو گیا ہے اور اب ہم دونوں مل کر رشوت لیتے ہوں گے مگر جھوٹ کے پاؤں نہیں ہوتے جلد ہی یہ افواہ دم توڑ گئی۔ میڈم کے بارے میں تو اب کم ہی بات ہوتی تھی مگر میرا جی بھر کر مذاق اڑایا جاتا۔ شہر میں کام کرنے کے باوجود میرا لباس مکمل طور پر دیہاتی ہوتا تھا۔ میں عموماً شلوار اور کرتا پہن کر دفتر جاتا تھا۔ پاؤں میں سستی قسم کی چپل ہوتی تھی جو ہمارے گاؤں کے موچی گلو کے ہاتھوں کی بنی ہوئی تھی۔ پینٹ شرٹ اور کوٹ خریدنے کی استطاعت نہیں رکھتا تھا ویسے بھی مجھے اپنی سادگی اور غربت سے

جدا تھا اس لیے مجھے ماڈرن بننے اور فیشن کرنے کی قطعی خواہش نہ تھی۔ میرے لباس اور حلیے کا مذاق اڑایا جاتا۔ کچھ سماجی تو مجھے کہتے ہی پینڈو تھے اور طرح طرح کے طنز کرتے تھے۔ میں ان کا ہر طنز برداشت کرتا اور خاموش رہتا تھا۔ غریب ہونے کے باوجود میں تمام سیکشن میں کام کرنے والے ساتھیوں سے منفرد تھا۔ میرے پاس مردانہ حسن کی انمول دولت تھی جس پر مجھے ناز تھا۔ یہ تحفہ مجھے قدرت کی طرف سے ملا تھا اس لیے میں اللہ تعالیٰ کا ہر وقت شکر ادا کرتا رہتا۔ میں نماز کی پابندی بھی کرتا تھا اور ہر قسم کی برائی سے خود کو بچاتا تھا۔

ایک روز میڈم نے مجھے اپنے کمرے میں طلب کیا کہ میں فلاں فلاں فائل لے کر آ جاؤں۔ ان کے حکم کی تعمیل کرتے ہوئے میں مطلوبہ فائلیں لے کر ان کے کمرہ میں پہنچ گیا۔ انہوں نے اپنے سامنے والی کرسی پر مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا اور مجھے ہدایت دیتے ہوئے کہا۔ ”ان فائلوں میں کچھ کام کرنا ہے تب تک تم یہاں ہی بیٹھو اور کام ختم ہونے کے بعد ہی تم اس کمرے سے باہر جاؤ گے۔ میں بھلا کیسے انکار کر سکتا تھا میں نے کام کا آغاز کر دیا۔ کام کرتے کرتے چھٹی کا وقت ہو گیا۔ میڈم نے مجھے چھٹی دے دی اور میں گھر لوٹ آیا پھر یہ سلسلہ چل نکلا۔ میڈم مجھے روزانہ ہی اپنے کمرے میں بلا کر کام پر لگا دیتیں یوں میرا زیادہ وقت ان کے کمرے میں گزرنے لگا۔ اس طرح کام کرنا یہ میری مرضی کے خلاف تھا کہ میں قیدی کی طرح ان کے کمرے میں اور ان کے سامنے بیٹھنا نہیں چاہتا تھا مگر مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ میں میڈم سے یہ بات کہہ سکوں لہذا مجبوراً دن گزار رہا تھا۔ کام کے دوران مجھ سے کئی غلطیاں بھی ہوئیں مگر میڈم نے مجھے کسی بھی غلطی پر نہیں ڈانٹا بلکہ وہ ان غلطیوں کو خود ہی درست کر دیتیں۔ میں ان کی اس مہربانی اور نرمی پر حیران تھا کہ وہ تو ماتحت اسٹاف میں سے کسی کی املا کی غلطی بھی برداشت نہیں کرتی تھیں اور کھڑے کھڑے ہی اسے ذلیل کر کے رکھ دیتی تھیں۔ کام کے دوران میں نے محسوس کیا تھا کہ میڈم کی نظر میں تمام وقت مجھ پر ہی مرکوز رہتی تھی۔ ان کو اپنی طرف دیکھتا پا کر مجھ پر گھبراہٹ سی طاری ہو جاتی تھی۔ ایک روز میں نے کام کرتے کرتے

میرے پاؤں میڈم کی ٹانگوں سے جا ٹکرائے۔ میں نے گھبرا کر فوراً ٹانگیں پیچھے کھینچیں کہ اب میری خیر نہیں مگر میڈم نے صرف اتنا کیا۔ ”ساجد! اپنی حد میں رہو۔“ ان کے لہجے میں سختی نہیں تھی وہ مجھے ہلکی سی سرزنش کر کے دوبارہ اپنے کام میں مصروف ہو گئیں اور میں نے سکون کا سانس لیا۔ کام کا یہ سلسلہ چلتا رہا۔ اس دوران میڈم نے مجھ سے میرے گھریلو حالات کے بارے میں تمام معلومات حاصل کر لیں۔ میں نے بھی انہیں سب کچھ بتا دیا۔ نورین اور خالہ کے بارے میں بھی بتا دیا اور یہ بھی کہا کہ مجھے دولت سے کوئی دلچسپی نہیں رہی میں صرف زندگی کی گاڑی چلانے کے لیے سروس کر رہا ہوں امیر بننے کے لیے نہیں کیونکہ امیروں کو خونی رشتوں سے زیادہ دولت عزیز ہوتی ہے۔ میڈم کو میرے گھریلو حالات جان کر مجھ سے ہمدردی سی ہوگئی تھی۔ اکثر میں نے محسوس کیا تھا کہ وہ مجھ سے کچھ کہنا چاہتی ہیں مگر کہہ نہیں پاتیں۔ میڈم کے کمرے میں مجھے چھ ماہ تک کام کرنا پڑا تب میری جان چھوٹی اور میں گویا آزاد ہو گیا۔ اس دوران میڈم میرے بارے میں بہت کچھ جان گئی تھیں کہ میں ایک سیدھا سادہ دیہاتی نوجوان ہوں جو من کا سچا اور کھرا ہے جسے جھوٹ بولنا نہیں آتا جسے دولت سے پیار نہیں انہیں یہ یقین ہو گیا تھا کہ میں نے نہ کبھی رشوت لی ہے اور نہ ہی اس کے بارے میں سوچا ہے۔ میرے متعلق اتنا کچھ جان کر انہوں نے میری سالانہ کارکردگی کی رپورٹ ایسی بنائی کہ میری پروموشن ہوگئی۔ میں سینئر کلرک بن گیا تاہم ترقی ہونے کے باوجود بھی میرے رویے اور انداز میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔

میں اپنی ترقی پر میڈم کا شکریہ ادا کرنے ان کے کمرے میں گیا تو وہ بولیں۔ ”ساجد! اس میں کوئی کمال نہیں اگر تم اسی طرح محنت سے کام کرو گے تو مزید ترقی کرو گے۔ محنت کا پھل انسان کو ضرور ملتا ہے اور زندگی کام کرنے کا دوسرا نام ہے۔ زندگی ایک عظیم نعمت ہے اور انسان کو اعلیٰ وارفع مقصد کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔“

میڈم ہما کا رویہ دن بہ دن میرے ساتھ مہربان ہوتا جا رہا تھا۔ ان کا برتاؤ میرے ساتھ ایسا ہوتا جیسے میں ان کا کوئی عزیز ہوں۔ وہ مجھ سے اکثر میری خیریت اور گھریلو حالات کے بارے میں پوچھتیں اور کہتیں کہ اگر کبھی بھی

کوئی مسئلہ ہو تو ضرور بتانا۔ وہ چاہتی تھیں کہ میں کسی ریسٹورنٹ کالج میں شام کی کلاسز جوائن کر لوں اور اپنا مستقبل روشن کروں مگر مجھے مزید پڑھنے کا طبعی شوق نہیں رہا تھا، تاہم میڈم کے اصرار پر میں نے شام کی کلاسز میں داخلہ لے لیا اور دل لگا کر پڑھائی شروع کر دی۔ میڈم نے بھی اس سلسلہ میں میری یہ مدد کی کہ دفتر کے کام کا بوجھ مجھ پر سے ہلکا کر دیا۔ بعض اوقات دفتر میں دیر تک بیٹھنا پڑتا تھا مگر میڈم نے مجھے اس سے بھی نجات دلا دی۔ میں میڈم کی ان مہربانیوں پر ان کا احسان مند تھا۔ وہ میری نظر میں انسان نہیں، فرشتہ تھیں۔ دن بہ دن میں ان کی مہربانیوں اور احسانوں کے بوجھ تلے دبا جا رہا تھا۔ ان کا احترام میرے دل میں بڑھتا گیا۔ وہ سب باتیں غلط ثابت ہوئی تھیں جو دفتر کے لوگوں نے ان کے بارے میں پھیلا دی تھیں۔ میرے نزدیک میڈم ہمارے عظمت کا مینار تھیں اور اخلاق و کردار کی بلندی کی حامل تھیں۔ میں ان کا بے حد احترام کرتا تھا۔ ان دنوں میرے فرسٹ ایئر کے امتحان چل رہے تھے کہ میڈم کا تبادلہ اسلام آباد والے دفتر میں ہو گیا۔ وہ چاہتی تھیں کہ میں بھی اسلام آباد آ جاؤں مگر میں راضی نہیں تھا۔ میڈم اسلام آباد تو چلی گئی تھیں مگر انہوں نے رہائش راولپنڈی میں ہی رکھی تھی۔ ان کے جانے کے بعد مجھے کسی حد تک ان کی کمی محسوس ہوتی تھی۔ ایک سال بعد وہ پھر ٹرانسفر ہو کر راولپنڈی والے دفتر میں آ گئیں اور پھر سے میری ڈیوٹی ان کے ساتھ لگ گئی۔ مجھے حیرانی تھی، میڈم کو مجھ سے اتنی دلچسپی کیوں ہو گئی ہے؟ میں تو ایک معمولی سا کلرک تھا اور وہ گریڈ اٹھارہ کی آفیسر۔ ان کی اس دلچسپی اور توجہ سے بعض اوقات نہ جانے کیوں مجھے ایک خوف سا محسوس ہونے لگتا تھا۔

میں نے ایف اے کا امتحان فرسٹ ڈویژن میں پاس کیا تو میڈم بہت خوش ہوئی تھیں۔ انہوں نے میری کامیابی پر مجھے مبارک باد دیتے ہوئے ایک گفٹ پیکٹ بھی دیا۔ میڈم اس قدر خوش تھیں کہ یوں لگتا تھا جیسے یہ کامیابی میں نے نہیں بلکہ انہوں نے حاصل کی ہو۔ میڈم نے مجھے تاکید کی کہ اب میں بی اے میں داخلہ لے لوں۔ چھٹی کے بعد جب میں گھر آیا اور میڈم ہمارا دیا ہوا تحفہ کھول کر دیکھا تو اس میں میرے لیے ایک قیمتی کپڑے کا

سوٹ ساتھ ہی ایک بند لفافہ بھی تھا۔ وہ لفافہ کھولا تو اس میں ایک ہزار روپے کا نوٹ اور ایک خط نکلا۔ میڈم ہمارے اس مہربانی پر میں خوش بھی ہوا اور حیران بھی۔ میں نے تجسس سے وہ خط کھولا اور پڑھنا شروع کیا۔

”ساجد.....! سلام خلوص!“

ایف اے کے امتحان میں شاندار کامیابی پر میری طرف سے دلی مبارک باد۔ ساجد.....! ہر انسان زندگی میں ایک بار ضرور محبت کرتا ہے جس طرح تم نے نورین کو چاہا، اس کو پوچھا، مجھے اپنے اور تمہارے عہدوں کے لحاظ سے یہ بات زیب نہیں دیتی مگر کیا کروں میں مجبور ہوں اور پھر محبت تو مذہب، اونچ نیچ، رنگ و نسل اور عہدوں کی پابند نہیں ہوا کرتی، بس ہو جاتی ہے اور انسان کو پتا بھی نہیں چلتا جیسے تمہیں بھی خبر نہیں ہے۔ میں نے تمہیں دیکھا ہی نہیں، پرکھا بھی ہے۔ میں نے تمہیں خود غرض اور نفسا نفسی کے اس دور میں دوسروں سے مختلف پایا ہے۔ تم ایک مخلص، سچے اور بے ضرر انسان ہو اور تمہاری یہی خوبیاں میرے دل میں گھر کر گئی ہیں۔ تم یقیناً میرے اس اظہار سے حیران اور پریشان ہو گے اور سوچ رہے ہو گے کہ ایک کلرک اور ایک آفیسر کا ملن کیونکر ممکن ہوگا؟ لیکن میں تمہیں یقین دلاتی ہوں کہ میں تم سے سچی محبت کرتی ہوں اور تمہیں اس محبت کے سہارے ایک ایسا اعتماد بخشوں گی کہ تم نہ صرف مجھ پر بلکہ اپنے آپ پر فخر کرو گے۔ میری اس محبت کو ترس اور رحم نہ سمجھنا، میری چاہت تمہیں ایک مقام دے گی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ شاید تمہیں یقین آ جائے کہ میں صرف نام کی ہمارا نہیں بلکہ سچ سچ کی ہمارا بن کر تمہارے سر پر بیٹھ گئی ہوں۔ تم زمانے والوں کی پروا نہ کرنا، یہ تو سچے کوچھوٹا اور جھوٹے کو سچا بنادیتے ہیں، بس یاد رکھنا کہ میں ایک عورت ہو کر پہل کر رہی ہوں۔ امید ہے، تم میری محبت کی قدر کرو گے۔“

میڈم ہمارا خط پڑھ کر میرے وجود پر لرزہ سا طاری ہو گیا۔ میں نے تو کبھی خواب میں بھی ایسا نہ سوچا تھا۔ مجھے یقین نہیں آ رہا تھا کہ میڈم جیسی شخصیت مجھے اس قدر بھی چاہ سکتی ہے۔ نورین نے مجھے اسی لیے ٹھکرا دیا تھا کہ وہ دولت مند باپ کی بیٹی تھی جبکہ میڈم تو خود دولت مند تھیں۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ تقدیر اپنا کون سا رنگ مجھے دکھا رہی تھی؟ تمام رات میں اسی سوچ میں غرق

جانتا رہا، صبح مجھے بخار کی سی کیفیت ہو گئی، سو میں نے دو دن کی چھٹی کی درخواست بھیج دی۔ بخار تو ایک بہانہ تھا دراصل مجھ میں میڈم کا سامنا کرنے کی ہمت نہ تھی۔ اسی روز شام میں میڈم ہمارے مکان میں دیکھ کر میں حیران رہ گیا۔ ان کے ہاتھ میں پھولوں کا گلہستہ، پہلوں کا لفافہ اور ہونٹوں پر لبسم تھا۔ میں نے ان کے احترام میں اٹھنا چاہا تو وہ فوراً آگے بڑھیں اور مجھے سہارا دے کر بٹھایا۔

”ساجد.....! کیسے ہو تم؟“

”جی میڈم! کچھ بہتر ہوں۔“

”یہ دفتر نہیں تمہارا گھر ہے۔ یہاں مجھے میڈم نہ کہو“ صرف میرا نام لو اور میرا نام میڈم نہیں ہمارا ہے۔“ اس کے لہجے میں شیرینی اور محبت کا سمندر ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ میں نے نظر اٹھا کر انہیں دیکھا مگر ان کے حسن اور رعب کی تاب نہ لا سکا اور گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں۔

انہوں نے میری پیشانی پر ہاتھ رکھا۔ ”ساجد.....!“

میں نے انکار کر دیا مگر کچھ ہی دیر میں وہ ڈاکٹر کو گھر لے آئیں۔ اگلے دن میری طبیعت کچھ سنبھل گئی مگر وہ پھر آ گئیں۔ میری حالت بہتر دیکھ کر وہ خوش ہو گئیں۔ وہ جانتی تھیں کہ میں ان کے ساتھ کھل کر بات کروں مگر میں شرم رہا تھا، مجھ میں اتنی ہمت ہی نہ تھی کیونکہ مجھے اپنی حیثیت کا احساس تھا۔ میں اپنی سوچوں میں گم تھا کہ ہمارے آواز نے چونکا دیا۔

”ساجد.....! لگتا ہے تمہیں میری محبت اور باتوں کا یقین نہیں آیا؟“

”نہیں میڈم! ایسی بات نہیں ہے، میں تو پہلے ہی آپ کے احسانوں تلے دبا ہوا ہوں، دوسرے محبت غریبوں کو اس نہیں آتی پھر میرا اور آپ کا ملن ناممکن ہے اور اگر یہ ممکن ہو بھی جائے تو یہ معاشرہ جینے نہیں دے گا۔ ایک کلرک اور آفیسر کی محبت پر دنیا خوب باتیں بنائے گی اس لیے جس کام کا انجام پہلے سے معلوم ہو وہ کام کرنا ہی نہیں چاہیے۔ میں ایک دیہاتی اور سادہ سا انسان ہوں مگر شہری ماحول میں رہ کر جان گیا ہوں کہ اس دور میں کوئی کسی کا نہیں ہے سب اپنے مفاد اور اپنی غرض کے پھل سے ہیں اس لیے مجھے میرے حقیقی مقام پر ہی رہنے

دیں میڈم! آپ سے ایک ہی درخواست ہے کہ آپ میرا تبادلہ اس شہر سے کہیں دور کر دیں۔ مجھ میں اب آپ کا سامنا کرنے کی ہمت نہیں ہے۔“

”کیسی بے وقوفی کی باتیں کرتے ہو شاید تم مجھے ابھی تک سمجھ نہیں پائے ہو۔ میں نے تم پر کوئی احسان نہیں کیا ہے اور میں جو کچھ کرنے جا رہی ہوں وہ بھی تم پر کوئی احساس نہیں ہوگا۔ میں زمانے سے مختلف ہوں اور منفرد ہی رہنا چاہتی ہوں۔ میں تمہیں یہ بتا دینا ضروری سمجھتی ہوں کہ میرا تعلق ایک بہت بڑے خاندان سے ہے، بہت وسیع جائیداد کے علاوہ ابا جان میرے لیے بہت کچھ چھوڑ گئے ہیں چونکہ میں ان کی اکلونی اولاد ہوں اس لیے ابا جان نے مجھے بہت ہی لاڈ اور پیار دے رکھا تھا۔ وہ چاہتے تھے کہ میں آفیسر بنوں سو میں نے ان کا خواب پورا کر دیا ہے۔ میں آفیسر بن گئی ہوں۔ میری ماں حیات ہے اور میں ان کی خاطر زندہ ہوں۔ ابا جان کی وفات کے بعد میرے لیے کئی رشتے آئے تھے ان میں میرے سوتیلے چچا کے بیٹے سرفہرست تھے لیکن وہ سب میرے نہیں بلکہ اس دولت اور جائیداد کے طلب گار تھے جو مجھ سے شادی کے بعد ان کی ہو جاتی۔ میں بخوبی جانتی ہوں کہ یہ اجلے چہرے اندر سے کتنے سیاہ اور بھیا نک ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں برادری کے کسی بھی مرد سے شادی نہیں کروں گی۔ میرے چچا زاد نے اس بات پر مجھے دھمکی دے رکھی ہے کہ اگر میں سیدھی طرح نہ مانی تو وہ مجھے زبردستی اٹھا لے گا مگر میں نے اس دھمکی کی کوئی پروا نہیں کی کیونکہ میں اپنے ہاتھوں کی کمائی کھاتی ہوں۔ ملازمت کے دوران بھی کئی لوگوں نے میری طرف بڑھنے کی کوشش کی مگر ان میں سے کسی کو بھی میری روح سے نہیں بلکہ میرے حسن اور میری دولت سے پیار تھا۔ یہ سمجھتے ہیں کہ میں تنہا ہوں مگر وہ یہ نہیں جانتے کہ میں خود دار بھی ہوں اسی لیے میں نے ہر ایک کے ساتھ سخت رویہ اختیار کر رکھا ہے۔ میں یہ بھی جانتی ہوں کہ اکیلی عورت اس جنگل میں جہاں ہر طرف بھیڑیے منہ کھولے کھڑے ہوں جی نہیں سکتی۔ اسے کسی مرد کے مضبوط سہارے کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے آج تک میں کسی ایسے انسان کی تلاش میں بھٹک رہی تھی جو میرے معیار پر پورا اترے۔ وہ خلوص کا مجسمہ ہو، محبتوں کا قدرداں ہو اور تمہاری صورت میں مجھے وہ شخص مل گیا ہے جس کی مجھے تلاش

تھی۔ تمہاری سادگی، تمہاری محصویت اور تمہاری سچائی سے میں بے حد متاثر ہوئی ہوں اس لیے میں نے تمہیں اپنا جیون ساتھی بنانے کا فیصلہ کیا ہے۔ میں نے تم سے پاکیزہ محبت کی ہے ساجد! اب میں آئندہ تمہیں کوئی محبت نامہ نہیں لکھوں گی۔ تم سے باغوں اور پارکوں میں نہیں ملوں گی بلکہ پہلے تم سے شادی کروں گی رہا مسئلہ کلرک اور آفسر کا تو میں تمہیں اس مقام تک لانے کی بھی کوشش کروں گی کہ تم مجھ سے بھی اعلیٰ افسر بن جاؤ اور اگر ایسا نہ ہوا اور تم مجھ سے آگے نہ بڑھ سکے تو میں صرف تمہاری خاطر ہمیشہ کے لیے ملازمت کو خیر باد کہہ دوں گی۔ یہ میرا وعدہ ہے۔ ساجد! اہمیت سے کام لو میں عورت ہو کر پہل کر رہی ہوں اور تم مرد ہو کر گھبرا رہے ہو۔ سو چومت، فیصلہ کرو میں سب کچھ جلدی میں اور رازداری میں کرنا چاہتی ہوں کیونکہ میرے رشتے داروں کو پتا چل گیا تو وہ ہنگامہ کھڑا کر دیں گے اور ہمارا ملن نہیں ہو سکے گا۔“

ہما کے لہجے میں سچائی کھلی ہوئی تھی چنانچہ میں نے مزید کچھ نہ سوچا اور اسے زندگی بھر کے لیے ہم سفر بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ ہمارے اپنی ماں کو پہلے ہی سب کچھ بتا رکھا تھا۔ جب میں نے اپنی والدہ سے بات کی تو انہیں یقین ہی نہ آیا کہ ان کا بیٹا اتنا خوش قسمت بھی ہو سکتا ہے۔ میں ان کو لے کر شہر آ گیا۔ ہمارے پہلے مجھے ایک ماہ کی چھٹی دے دی اور پھر خود بھی چھٹی لے لی یوں خاموشی سے ہماری شادی ہو گئی۔

ہمارا میری زندگی میں آئی تو مجھے یوں لگا جیسے مجھے زمانے بھر کی دولت مل گئی ہو۔ میں محبت کی اس کرشمہ سازی پر حیران تھا اور اکثر سوچتا تھا کہ میں کیا تھا اور اب کیا بن گیا تھا۔ ہمارے مجھے اتنا پیار دیا کہ میں احساس کمتری کے حصار سے نکل آیا۔ چھٹی کے دوران ہی ہما نے اپنی جائیداد میرے نام کر دی۔ میرے نام سے بینک میں اکاؤنٹ کھلو کر اس نے اپنی تمام دولت میرے اکاؤنٹ میں ٹرانسفر کرادی۔ میں نے ایسا کرنے سے منع کیا مگر وہ نہ مانی۔

کہنے لگی۔ ”سب لوگ جائیداد اور دولت کے طلب گار ہیں اس لیے میں سب کچھ تمہارے نام کر رہی ہوں کہ اب میری شناخت اور پہچان تم ہی ہو۔ اب ہم الگ الگ نہیں جو کچھ میرا ہے وہ تمہارا ہے اور جو کچھ تمہارا ہے

وہ میرا ہے۔“

ہماری چھٹیاں ختم ہونے سے قبل ہی دفتر والوں کے یہ بات بچھ چکی تھی کہ میڈم ہمارے سینئر کلرک ساجد سے شادی کر لی ہے۔ جب ہم دفتر گئے تو ہر طرف سے مبارک باد کا شوراٹھا مگر ساتھ ہی عجیب سی طنزیہ باتیں بھی سننے لگیں۔ ہمارے ڈائریکٹر نے طلب کیا۔ وہ جب ان کے کمرے سے واپس آئی تو اس کا چہرہ لٹکا ہوا تھا۔ دفتر میں تو ہم نے کوئی بات نہ کی مگر گھر آتے ہی ہما کی آنکھیں چمک اٹھیں۔ ہمارے مجھے پوری بات تو نہ بتائی البتہ مجھے یہ کہا کہ کل سے تم دفتر نہیں جاؤ گے بلکہ تمہارا اس استعفیٰ جائے گا۔ میں جلد ہی تمہیں کوئی اچھا سا بزنس کروادوں گی۔

میں نے ہما کا کہا مان لیا کیونکہ میں خود بھی یہی چاہتا تھا کہ اس دفتر میں کام نہیں کروں گا۔ اگلے روز میں نے استعفیٰ بھیج دیا جبکہ ہمارا دفتر چالیس دنوں بعد ہما نے مجھے ٹریول ایجنسی کا لائسنس لے دیا اور مال روڈ پر ایک دفتر بھی دلوا دیا۔ ابھی میں نے کام شروع نہیں کیا تھا کہ ہما کی تبدیلی پشاور ہو گئی۔ یہ اس کے خلاف انتقامی کارروائی تھی کہ اس نے ایک کلرک کے ساتھ شادی کیوں کی؟ اس کارروائی میں وہ افسر پیش پیش تھے جو ہما کے چاہنے والوں میں سے تھے مگر ہمارے پروانہ کی اس نے کرائے پر ایک کوٹھی لے کر سامان شفٹ کیا اور مجھے وہاں چھوڑ کر پشاور چلی گئی پھر کچھ ہی عرصہ بعد جب ہما کی ٹرانسفر کراچی کی گئی تو اس نے تنگ آ کر ملازمت چھوڑ دی۔ اس کا کہنا تھا کہ میں خود ہی یہ ملازمت چھوڑ دینا چاہتی تھی۔

ہما کے اس فیصلے سے میں مطمئن ہو گیا۔ ہم دونوں نے مل کر کاروبار پر توجہ دی۔ اس فیلڈ میں مجھے کچھ اچھے لوگ مل گئے اور میرا کام ترقی کرنے لگا۔ ہم نے اپنی ایک پرائیوٹ اسلام آباد میں بھی کھول لی یوں مالی طور پر ہم پہلے سے بھی زیادہ خوش حال ہو گئے۔ اب ہمیں کوئی پریشانی اور بچھتاوا نہ تھا۔ ہماری چھوٹی سی دنیا چنت کا نمونہ تھی۔ میں نے اپنی بہن کینر کی شادی کر دی تھی اور میری امی اب ہمارے ساتھ ہی رہتی تھیں۔ جب ہما کے چچا زاد کو ہماری شادی کی خبر ہوئی تھی تو اس نے بہت واویلا مچایا تھا۔ وہ ہمارے گھر بھی آیا اور ہمیں طرح طرح کی دھمکیاں دی تھیں مگر ہم نے اس کی کسی دھمکی کی پروانہ کی البتہ میں اس کی طرف سے ہمیشہ ہی خوفزدہ رہتا تھا۔

اس طرح ایک سال بیت گیا۔ اُن دنوں میری اور ہما کی امی دونوں ہی خوش تھیں کیونکہ وہ وادی اور تانی بننے والی تھیں۔ جب بچے کی ولادت کا وقت قریب آیا تو ہما کو ایک پرائیویٹ نرسنگ ہوم میں داخل کر دیا گیا۔ لیبر روم میں کافی دیر لگ گئی تو ایک لیڈی ڈاکٹر باہر آئی۔ اس کے چہرے پر پریشانی تھی۔

”ساجد صاحب! آپ کی بیگم کا کیس کافی پیچیدہ ہے۔ ہماری کوشش ہے کہ سب کچھ ٹھیک ٹھاک رہے لیکن پھر بھی کوئی اونچ نیچ ہو سکتی ہے۔“

”نہیں ڈاکٹر صاحب! مجھے بچہ نہیں چاہیے اور والدہ اور دے دے گا مگر ہما کو کچھ نہ ہونے پائے۔ اگر اسے کچھ ہو گیا تو میں مر جاؤں گا۔“

”آپ فکر نہ کریں میں پوری کوشش کرتی ہوں۔ ڈاکٹر عظیمہ کو بھی بلا لیتی ہوں۔ ہم مل کر کیس کر لیں گی۔ میں اپنی پیاری بیوی کی سلامتی کی دعا میں مانگنے لگا۔ ایک ایک لمحہ سدیوں پر محیط ہو گیا۔ جب ڈاکٹر عظیمہ باہر نکلیں تو میں ان کی طرف لپکا۔ ان کے چہرے پر اداسی چھائی ہوئی تھی۔

”مجھے بے حد افسوس ہے کہ ہم زچہ اور بچہ دونوں کو نہیں بچا سکے۔ شاید خدا کو یہی منظور تھا۔ اس کی رضا کے آگے ہر انسان بے بس ہوتا ہے۔“ ڈاکٹر یہ کہہ کر آگے بڑھ گئی اور میں دکھوں اور غموں کے بوجھ تلے سسکتا رہ گیا۔ ہمارے یوں روٹھ جائے گی مجھے گمان بھی نہ تھا۔ میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا مگر رونے سے جانے والے لوٹ کر تو نہیں آیا کرتے۔ موت ایک اٹل حقیقت ہے اور اس حقیقت کو قبول کرنا ہی پڑتا ہے۔ ہما کیا گئی میری زندگی اندھیر ہو گئی۔ میں نے دفتر جانا بھی چھوڑ دیا۔ دن بیکے اور بے زار سے گزرنے لگے شفق اب بھی ہوتی تھی رات اب بھی ہوتی تھی چاند بھی نکلتا تھا ستارے اب بھی غمناک تھے آبشاروں کی آواز کانوں میں اب بھی آتی تھی ہر چیز جوں کی توں تھی مگر ہما کے بغیر مجھے ساری زندگی سونی سونی سی لگتی تھی۔ زندگی میں اب کوئی رنگینی اور دلکشی نہیں رہی تھی۔

اسی طرح تین سال کا عرصہ بیت گیا اس دوران میری امی بھی زندگی سے ناطہ توڑ گئیں تو میں ایک بار پھر فوت کر رہ گیا۔ میں ابھی تک ہما کو نہیں بھلا سکا تھا۔ وہ میری یادوں میں میرے خوابوں اور میری سانسوں میں زندہ

تھی۔ اسے بھلا میں کیسے بھول سکتا تھا وہ تو میری محنت تھی۔ میں مالی لحاظ سے بہت مضبوط ہو گیا تھا مگر زندگی میں ذہنی سکون ناپید تھا۔ امی کی وفات پر خالہ اور نورین سے ملاقات ہوئی تو وہ میرے ٹھانڈے ہاتھ دیکھ کر حیران رہ گئیں۔ جب ان لوگوں کو علم ہوا کہ میں لاکھوں کا مالک ہوں تو انہوں نے نورین کے کہنے پر مجھے نورین سے شادی کرنے کی پیشکش کر دی مگر میں نے صاف انکار کر دیا۔ میں حیران بھی ہوا کہ نورین نے ابھی تک شادی کیوں نہیں کی؟ میں نے ٹوہ لگائی تو علم ہوا کہ نورین جس بھنورے سے محبت کرتی تھی وہ اس کا رس چوس کر اڑ گیا ہے اور نورین ابھی تک اس کی بے وفائی کا ماتم کر رہی ہے۔ اس دوران اسے اسی محبوب کی بخشش ہوئی ذلت سے بھی چھٹکارہ حاصل کرنا پڑا تھا۔ یہ سب کچھ جان کر مجھے نورین اور اس کے کردار سے نفرت ہو گئی۔ میں نے ان لوگوں سے دور رہنا ہی مناسب سمجھا۔

ایک روز نورین میرے دفتر آ گئی۔ اسے پتا چل گیا تھا کہ میں اس کے ماضی سے باخبر ہو گیا ہوں شاید وہ اپنی صفائی پیش کرنے آئی تھی۔ اسے دیکھ کر مجھے ماضی کا وہ وقت اور وہ لمحہ یاد آ گیا جب نورین نے میرے گھر آ کر مجھے میری اوقات یاد دلائی تھی مجھے ذلیل کیا تھا محض اس لیے کہ میں غریب تھا وہ وقت یاد آیا تو میرے خون کی گردش تیز ہو گئی۔ میں نے بھی اسے معاف نہ کیا اور اسے بے غیرت بے حیا جیسے القابات سے نواز کر دفتر سے نکال دیا۔ میں نے اس پر واضح کر دیا کہ میں اس کے ماضی سے آگاہ ہو چکا ہوں اس لیے اس جیسی گندگی سے دور رہنا چاہتا ہوں۔ اس کے ساتھ یہ سلوک کر کے مجھے قرار سا آ گیا۔ ایک بوجھ سادل و دماغ سے اتر گیا۔ تقدیر بھی کیسے کیسے کھیل کھیلتی ہے زندگی میں ایسے موڑ بھی آ جاتے ہیں کہ وہ انسان جو کسی سے نفرت کرتا ہے کبھی کبھی تقدیر اسے بھکاری بنا کر اس کے در پر بھی لے آتی ہے۔ یہ مکافات عمل ہے جو اب تک جاری رہے گا۔

ایک روز میں دفتر میں بیٹھا تھا کہ ایک نوجوان لڑکی دفتر میں داخل ہوئی۔ اسے سروں کی تلاش تھی۔ وہ واقعی مجبور اور ضرورت مند لگ رہی تھی مگر میں بھی مجبور تھا کہ میرے دفتر میں کوئی دیکھنی نہ تھی۔ اس نے میرا انکار سنا تو اس کی آنکھیں بھر آئیں اور وہ رونے لگی۔ اس کی

بہت بُرا ہوں میں

محمد آصف عاطر

اس نے ایک معمولی جالی لٹکی کی زندگی بسر کر دی
لیکن خود بھی قدرت کے انتقام سے بچ سکا

کوہاٹ سے پہلی جگہ بقی



ہوسکتا تھا پھر ان لوگوں نے اسے کراچی پہنچا دیا جہاں ایک بار پھر اس کا سودا کر دیا گیا، یوں وہ مختلف ہاتھوں میں گھلونا بنی رہی۔ جب ایک خریدار کا جی اس سے بھر جاتا تو وہ اسے آگے فروخت کر ڈالتا پھر قسمت سے اسے فرار ہونے کا موقع مل گیا اور وہ وہاں سے بچ نکلنے میں کامیاب ہو گئی۔ اس کے بعد اس نے ملازمت کی تلاش شروع کر دی مگر ہر جگہ اسے ہوس بھری نگاہوں کا ہی سامنا کرنا پڑا۔ کراچی سے حیدرآباد پھر لاہور اور اب تقدیر اسے یہاں لے آئی تھی۔ روزینہ نے درور کی ٹھوکریں کھائی تھیں۔ اس کی روح زخمی تھی اور دنیا میں سوائے خدا کے اس کا کوئی ہمدرد نہ تھا۔ اس کے من میں اب کوئی تمنا، کوئی آرزو نہ رہی تھی مگر وہ پھر بھی زندہ تھی اس آس پر کہ کاش ایک بار اسے محبت کے نام پر لوٹنے والا پرویز اسے مل جائے تو وہ اس سے اتنا تو پوچھ سکے کہ کیا محبت کو اس طرح رسوا کیا جاتا ہے؟ محبت تو کائنات کی تخلیق کا سبب بنی ہے مگر تم نے محبت کے نام پر مجھے ایسی آگ میں جھونک دیا ہے جس میں تمام عمر جلتی رہوں گی۔

وہ اپنا دکھ سنا کر رونے لگی۔ اس کی زخم زخم داستان نے مجھے بھی رلا ڈالا۔ اس نے اپنے ساتھ ہونے والے ظلم و ستم کی ایسی داستانیں سنائیں کہ میں کانپ اٹھا۔ میں نے روزینہ کو دلاسا دیا۔

”اب تم محفوظ ہاتھوں میں آ گئی ہو اور تمہیں فکر کرنے کوئی ضرورت نہیں ہے۔“

کئی برس بیت گئے ہیں وہی روزینہ اب میری بیوی ہے۔ میں نے اسے صرف تین ماہ ہی اپنے دفتر میں کام کرنے دیا تھا اور اس کے بعد اس سے شادی کر لی تھی۔ مجھے اس کے ماضی سے کوئی غرض نہیں ہے۔ وہ بہت ہی خوش اور مسرور ہے جو مشن ہمارے مجھ سے شادی کر کے شروع کیا تھا میں نے اس مشن کو آگے بڑھایا ہے۔ میں ہمارے انسان دوستی کا جلا یا ہوا چراغ مجھے نہیں دوں گا۔ ہمارے اب دو بچے ہیں اور ہم پرسکون زندگی گزار رہے ہیں۔ میں ہمارا کوئی تک نہیں بھول پایا ہوں اور نہ ہی بھولنا چاہتا ہوں۔ وہ میرے دل میں زندہ ہے اور زندہ رہے گی کیونکہ میں جو کچھ بھی ہوں اس کی وجہ سے ہوں۔ میرے سینے میں ہمارا محبت کی شمع ہمیشہ روشن رہے گی۔

آنکھوں میں محرومی اور بے بسی کے سائے نمایاں نظر آ رہے تھے جو ظاہر کرتے تھے کہ وہ بہت ہی مجبور اور مظلوم لڑکی ہے۔ اسے دیکھ کر میرا دل بھر آیا لہذا میں نے اسے اپنے دفتر میں ملازم رکھ لیا۔ نوکری ملنے پر اس کی آنکھیں خوشی و تشکر سے چمک اٹھیں۔ اس نے اپنا نام روزینہ بتایا تھا۔ میں نے اسے منیجر کے پاس بھیج دیا کہ وہ تمہیں کام سمجھا دے گا۔ ایک ماہ بعد میں نے منیجر سے اس کی کارکردگی کی رپورٹ طلب کی تو مجھے بتایا گیا کہ روزینہ محنتی اور ایمان دار لڑکی ہے۔ وہ ہمارے دفتر کے لیے فائدہ مند ثابت ہوئی۔ کئی بار میرا اس سے آسنا سامنا ہوا تو میں نے اس کو نہایت معمولی لباس میں ہی دیکھا۔ اس کا چہرہ بھی میک اپ سے عاری ہوتا تھا جبکہ میرے دفتر میں موجود دوسری لڑکیاں تو اشتہار بن کر آئی تھیں جیسے وہ کسی بیوٹی شو میں حصہ لینے آئی ہوں۔ مجھے روزینہ کا یہ روپ بہت اچھا لگا۔ میں یہ جان گیا تھا کہ وہ نہایت ہی مجبوری کے عالم میں سروس کر رہی ہے۔ ایک دن میرے اصرار پر اس نے مجھے اپنے ماضی کے متعلق بتایا کہ وہ ماں باپ کی اگلی بیٹی ہے۔ اس سے بڑے دو بھائی تھے جو مشرقی پاکستان میں کئی بھائی کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ وہ اپنے ہی شہر کے ایک لڑکے سے محبت کرتی تھی۔ وہ دونوں کالج میں ساتھ ہی پڑھتے تھے۔ وہ ایف اے کر کے گھر بیٹھ گئی جبکہ پرویز ملازمت کے سلسلہ میں سلہٹ چلا گیا۔ اس دوران ان کی خط و کتابت جاری رہی۔ وہ پرویز کو بے حد چاہتی تھی اور وہ بھی اس کا دیوانہ تھا۔ ایک بار اس نے روزینہ کو خط لکھا کہ وہ اس سے ملنے کے لیے سلہٹ آ جائے۔ وہ گھر والوں سے کوئی بہانہ کر کے پرویز سے ملنے سلہٹ روانہ ہو گئی۔ وہ پرویز کی محبت اور چاہت میں اندھی ہو گئی تھی اور کسی اونچ نیچ کا خیال نہیں کیا۔ روزینہ محبوب کی محبت میں کھو کر اپنا آپ سب کچھ گنوا بیٹھی۔ پرویز نے مشروب میں کچھ ملا کر اسے پلا دیا۔ اس کے بعد اسے کچھ ہوش نہ رہا۔ جب کئی گھنٹوں بعد اسے ہوش آیا تو وہ اپنے ملک میں نہ تھی اور بد معاشوں کے جال میں پھنس چکی تھی۔ انہوں نے اسے اغتباہ کیا کہ اگر اس نے شور مچایا تو وہ اسے مار ڈالیں۔ وہ بہت روئی اور تڑپی مگر اس کی ایک نہ سی گئی وہ جان گئی کہ اس کے محبوب پرویز نے اس کے دام کھرے کر لیے ہیں۔ پرویز فریبی اور دھوکے باز نکلا تھا مگر اب کچھ بھی نہ

میرا نام عاقب ہے۔ میں نے ایک ایسے گھرانے میں آنکھ کھولی جن کی اس ملک میں اکثریت ہے یعنی جہاں کمانے والا ایک اور کھانے والے بہت ہوتے ہیں اور گزارہ بہ مشکل چلتا ہے۔ میں آپ کو اپنی زندگی کے ان چند سالوں کے بارے میں بتانا چاہتا ہوں جو میں نے لاہور میں گزارے اور کس طرح اس لڑکی کا دل توڑا جس نے میری خاطر اپنوں سے ناتا توڑ لیا جو صرف میری خاطر ڈٹ گئی اور میں بزدل کسی کے سامنے یہ بھی نہیں کہہ پایا کہ ہاں یا نہیں میری محبت ہے میں اسے چاہتا ہوں۔ اب سوچتا ہوں کاش وہ وقت دوبارہ لوٹ آئے تو میں بھی ایسا نہیں ہونے دوں گا اور پھر اپنی ہی سوچ پر ہنسی آتی ہے کہ ایسا بھی کبھی ہوا ہے؟ وقت کا تیر جب کمان سے نکل جائے تو پھر پچھتانے کے سوا کچھ باقی نہیں رہ جاتا۔ میں بھی کیا پہیلیاں بچھو رہا ہوں۔ چلیے شروع سے سناتا ہوں۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب میں میٹرک کا امتحان دے کر فارغ تھا۔ والد لاہور میں ملازم تھے۔ دوسرے بہن بھائی چھوٹے تھے اور امی کا مجھ پر سوائے کوسنوں اور ڈانٹ کے کوئی بس نہ چلتا تھا۔ بس سارا دن دوستوں کے ساتھ گھومنا پھرنا اور شرارتیں کرنا ہی روٹین۔ والد جب چھٹی پر آئے تو امی نے سب کچھ میرے بارے میں بتا دیا جس پر والد نے مجھے رزلٹ آنے تک لاہور لے کر جانے کا فیصلہ سنایا اور یوں میں والد کے ساتھ لاہور آ گیا۔ میں جو پہاڑوں کا رہنے والا تھا لاہور کی رونقیں دیکھ کر دنگ رہ گیا۔ میں نے کچھ دن تو خوب سیر و تفریح میں گزارے پھر والد نے بتایا کہ میں نے صاحب سے بات کر لی ہے کل سے تم بھی پیکنگ ڈپارٹمنٹ میں ڈیوٹی کرو گے۔ یہ مختلف دوائیاں بنانے کا ایک چھوٹا سا کارخانہ تھا جس میں میرے والد بھی ملازم تھے۔ کارخانے کے مختلف شعبوں میں مرد و خواتین دونوں کام کرتے تھے۔ خواتین کو لانے اور لے جانے کے لیے گاڑیاں مخصوص تھیں۔ میں اس وقت والد صاحب کے ساتھ گیٹ سے ملحقہ کمرے میں بیٹھا ہوا تھا جب اچانک ایک لڑکی جو نقاب پہنے ہوئے تھی اندر آئی اور والد سے مخاطب ہوئی۔

”انکل.....! سب گاڑیاں چلی گئی ہیں؟“

میرے والد نے کہا کہ ہاں گاڑیاں تو چلی گئی ہیں جس پر اس نے کہا۔

”لگتا ہے آج قسمت میں پیدل جانا ہی لکھا ہے۔“

میں جو سر جھکائے بیٹھا تھا اس کی بات سن کر ویسے ہی اس کی طرف دیکھا۔ وہ بھی مجھے دیکھ رہی تھی۔ ہم دونوں کی نظریں ملیں جیسے جادو ہو گیا ہو..... میں دم بخود اس کی طرف اطراف سے بیگانہ دیکھتا رہا جبکہ اس نے آنکھیں جھکا دیں اور چلی گئی۔ وہ کیا گئی مجھے یوں لگا کہ جیسے حسین خواب ٹوٹ گیا ہو ہر سواند میرا چھا گیا ہو۔ میں ابو کو بغیر بتائے اس کے پیچھے باہر نکل گیا۔ وہ کافی دور جا چکی تھی۔ میں دیوانہ وار اس کے پیچھے چلتا رہا۔ تقریباً تین چار کلومیٹر چلنے کے بعد وہ گلیوں میں میری نظروں سے اوجھل ہو گئی اور میں بہت تلاش کے باوجود کسی ہارے ہوئے جواری کی طرح واپس لوٹ آیا۔ اس رات جب میں سونے کے لیے لیٹا تو یوں لگتا تھا کہ جیسے نیند کی دیوی مجھ سے روٹھ گئی ہو اور نقاب سے جھانکتی دو آنکھیں ساری رات مجھے بے چین کرتی رہیں۔ اپنے پاگل پن پر مجھے ہنسی بھی آئی کہ یہ آج میں نے کیا حرکت کی؟ میں جو محبت کے مفہوم سے نا آشنا تھا میں جو نہیں جانتا تھا کہ یہ معاملہ کیا ہے پھر بھی وہ آنکھیں میرے سامنے تھیں۔ صبح میں دیر سے اٹھا بلکہ والد نے ہی مجھے اٹھایا اور کہا کہ آج تمہارا ڈیوٹی کا پہلا دن ہے جلدی کرو۔ والد نے پیکنگ انچارج سے مجھے ملایا اور چلے گئے۔ انچارج نے اجمل نامی لڑکے کو بلایا اور اس سے کہا کہ اس کو اپنے ساتھ لے جاؤ اور کام سمجھاؤ۔ وہاں پر زیادہ تر لڑکیاں کام کرتی تھیں اور دوائیوں کو مختلف ڈبوں میں پیک کرتی تھیں۔ اجمل نے مجھے سمجھایا کہ تمہاری ڈیوٹی ان کو چیک کرنا ہے۔ اجمل خود بھی چیکر تھا۔ میں جو ایک ایسے علاقے کا باسی تھا جہاں غیر لڑکیوں سے بات کرنا تو ناممکنات میں سے ہے بلکہ رشتہ دار خواتین سے بات کرنے کے لیے بھی کئی بار سوچنا پڑتا ہے وہاں اب میرا واسطہ صحت نازک کے ساتھ تھا اس لیے ان سے بات کرتے ہوئے قدرتی طور پر جھجک محسوس ہوئی۔ اجمل نے اس سلسلے میں میری بہت مدد کی۔ اس نے مجھے کہا کہ اپنے آپ میں اعتماد پیدا کرو اور یہ سمجھو کہ تم اس وقت لڑکوں سے بات کر رہے ہو۔ اس

طرح شرمانے سے تو کام نہیں چلے گا۔ یوں آہستہ آہستہ میں نے خود کو ایڈجسٹ کر لیا۔ دوسری طرف چھٹی کے وقت گیٹ پر کھڑے ہونا اور اس نقاب پوش کی راہ دیکھنا بھی میرا معمول تھا اور میرے اس معمول کو پندرہ دن ہو گئے تھے لیکن وہ مجھے پھر نظر نہیں آئی۔ دوسرے دن میں ڈیوٹی پر جلدی چلا گیا۔ اس وقت تک بہت کم لڑکیاں آتی تھیں۔ کچھ دیر بعد اور لڑکیاں بھی آ گئیں اور ان میں وہ بھی تھی جس کا مجھے انتظار تھا۔ اس دن بھی اس نے وہی کپڑے اور نقاب پہن رکھا تھا۔ گویا وہ ہمارے ساتھ ہی کام کرتی تھی لیکن وہ اتنے دن کہاں رہی؟ اس سوال نے مجھے پریشان کیا۔ اس کا جواب بھی مجھے اسی دن مل گیا اور اس کا نام بھی معلوم ہو گیا کیوں کہ کوئی لڑکی اس سے پوچھ رہی تھی کہ یا نہیں بہت زیادہ چھٹیاں کر لیں خیریت کئی ناں؟ جس کے جواب میں اس نے کہا کہ ہاں خالہ کے بیٹے کی شادی تھی۔ یا نہیں عام سے نقوش اور گندی رنگت والی لڑکی تھی۔ اس کے چہرے پر صرف اس کی آنکھیں تھیں جن میں کشش تھی اور اپنی طرف پھینکتی تھیں۔ مجھے اس وقت معلوم نہیں تھا کہ وہ کون سا جذبہ تھا جو مجھے مجبور کرتا تھا کہ میں اس سے بات کروں اور اس کو اپنا بنا لوں؟ کافی دنوں تک میں سوچتا رہا کہ اس سے اپنے دل کی بات کیسے کروں کہ تم مجھے اچھی لگتی ہو؟ بالآخر میں نے اجمل کو اعتماد میں لینے کا فیصلہ کیا اور اس کو اپنے دل کی بات بتادی۔ وہ میری بات سن کر پہلے تو حیران ہوا پھر اس نے ہنسنا شروع کر دیا۔ میں نے پوچھا۔

”کیا ہوا؟“

اس نے کہا۔ ”لگتا ہے صاحب جی کو محبت ہو گئی ہے۔ پہلے تو جناب لڑکیوں کی طرح شرماتے تھے اور اب سبحان اللہ! سبحان اللہ!..... محبت.....“

میں نے کہا۔ ”یاز میں یہ تو نہیں جانتا مگر میں اس کے بغیر نہیں رہ سکتا۔“

اجمل نے کہا۔ ”یاز یہاں ایک سے بڑھ کر ایک خوبصورت لڑکی کام کرتی ہے اور تمہیں ایک عام سی لڑکی پسند آئی ہے؟ تم نے اس میں دیکھا ہی کیا ہے؟ مجھے تو تمہاری دماغی حالت یہ شبہ ہے۔“

”اچھا یاز میں پاگل سی مگر تم کچھ کرو۔“

”اچھا اچھا۔“ اس نے کہا اور مزید گویا ہوا۔ ”لیکن

وہ لڑکی ہے بڑے غصے والی کہیں بے عزتی نہ کر دے لیکن خیر اب تو کچھ کرنا ہی پڑے گا۔“ اور اسی وقت اٹھ کر یا سیمین کی طرف چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد جب وہ واپس آیا تو اس کا منہ لٹکا ہوا تھا۔ میں نے پوچھا۔

”کیا ہوا؟“

اس نے کہا۔ ”ہو گئی بے عزتی اور کیا ہونا تھا؟ اس نے مجھے کہا ہے کہ تم مجھے اس لڑکے کا نام بتاؤ میں تمہاری اور اس کی شکایت انچارج سے کروں گی لیکن میں نے نہیں بتایا۔ میری تو توبہ ہے بھی!“

”اس کا مطلب ہے مجھے ہی کچھ کرنا پڑے گا۔“

میں نے کہا۔

”کیا؟“ اجمل بولا۔

میں نے جاتے ہوئے اس سے کہا کہ میں خود اس سے بات کروں گا اور آج ہی کروں گا۔ عموماً وہاں پر یہ ہوتا تھا کہ لڑکے یا لڑکیاں باہر چلے جاتے تھے اور لڑکیاں لائیں بچا دیتی تھیں اور وہیں کھانا کھاتی تھیں لیکن میں اس دن نہیں گیا۔ وہیں رہ گیا۔ تقریباً آدھے گھنٹے بعد یا سیمین پانی کی بوتل ہاتھ میں لیے کور کی طرف جاتی ہوئی دکھائی دی۔ میرے لیے اس سے اچھا موقع اور نہیں تھا۔ میں بھی وہاں چلا گیا۔ میں نے سلام کیا۔ اس نے سلام کا جواب دیا اور کہا۔

”پانی پینا ہے؟“

میں نے کہا۔ ”نہیں مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔“

”مجھ سے؟“ اس کے ماتھے پر شکنیں گہری ہو گئیں جبکہ مجھے پسینا آ گیا۔ ”مجھ سے کیا کہنا ہے؟“ اس نے کہا۔

”آپ مجھے اچھی لگتی ہیں میں آپ کو اپنا چاہتا ہوں۔“ میں نے آخر دل کی بات کہہ دی۔

”کیا؟“ اس نے غصے سے مجھے گھورا اور کہا۔

”آپ کو شرم آتی جاوے ایسی بات کرتے ہوئے میں آپ کو ایسی ویسی لڑکی نظر آتی ہوں؟ میں آپ کی شکایت کروں گی۔“ یہ کہہ کر وہ رکی نہیں اور خالی بوتل ہی لے کر چلی گئی۔ میں نے اجمل کو ساری بات بتائی۔ اس نے مجھے اور ہی ڈرا دیا کہ اللہ خیر کرے اب کیا ہوگا؟ میں بھی سوچ رہا تھا کہ اگر والد صاحب کو علم ہو گیا تو کیا

ہوگا؟ تین دن تک میں اور اجمل ایک دوسرے سے یہی کہتے رہے کہ اب پیشی ہوگی اور اب ہوگی لیکن ایسا نہیں ہوا چوتھے دن میں یاسمین کے پیک کے ہوئے کارٹن چیک کر رہا تھا وہ بھی نگاہیں جھکائے میرے ساتھ کھڑی تھی۔ نہ جانے میرے دل میں کیا آئی کہ میں نے اس سے کہا۔

”یاسمین دیکھو مجھے غلط مت سمجھو میں اپنے دل کا کیا کروں جو ہر وقت تمہارا ساتھ چاہتا ہے؟“

اس نے کہا۔ ”لگتا ہے مجھے واقعی اب شکایت کرنی پڑے گی۔ آپ کیوں چاہتے ہیں کہ آپ کے ساتھ ساتھ میری بے عزتی ہو اور لوگ باتیں بنائیں؟“ اس نے بے بسی سے کہا۔ ”میں ایسی دیسی لڑکی نہیں ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”میں بھی آپ کو ایسی دیسی لڑکی نہیں سمجھتا“ آپ کی عزت کرتا ہوں آپ کو اپنانا چاہتا ہوں آپ ایک بار میری بات سن لیں پھر میں آپ کو بھی تنگ نہیں کروں گا۔“

”نہیں سنی مجھے کوئی بات۔ چلے جائیں خدا کے لیے اس سے پہلے کہ میرا صبر جواب دے جائے۔“ یاسمین نے غصے سے کہا۔

میں نے کہا۔ ”میں چلا جاتا ہوں لیکن میں تمہیں سچے دل سے اپنانا چاہتا ہوں مجھے غلط مت سمجھو۔“

اس پر اس نے کہا کہ تمہارے منہ سے ایسی باتیں اچھی نہیں لگتیں تم تو ابھی بچے ہو تمہارا مستقبل کیا ہے اور تم کس بنا پر یہ باتیں کر رہے ہو؟ ہمارے درمیان معاملہ آپ سے تم پر آ گیا۔ اس سے اگلے دن میں نے پھر پانی کے کولر کے پاس اسے روک لیا اس کے ساتھ ایک اور لڑکی بھی تھی لیکن میں نے اس کی موجودگی کی پروا نہیں کی تھی مجھ پر تو صرف یہ دھن سوار تھی کہ کس طرح اس پتھر دل کو موم کروں؟ میں نے اس سے پھر جواب کا تقاضہ کیا جس کے جواب میں اس نے کہا کہ مجھے تم اور تم جیسے ان تمام لوگوں سے نفرت ہے جو نہ اپنی عزت کا خیال رکھتے ہیں اور نہ دوسروں کی عزت کا اور ہاں سن لو یہ آخری دفعہ ہے آئندہ میں تمہارا لحاظ نہیں کروں گی۔ یہ کہہ کر وہ چلی گئی اور مجھے یوں لگا جیسے میرے چار سو اندھیرا چھا گیا ہو۔

اُس رات میں بہت رویاؤں میں میری آنکھوں سے

کوسوں دور تھی ساری رات جاگنے کا اور رونے کا نتیجہ نکلا کہ مجھے بخار نے آ لیا اور میں ڈیوٹی پر نہ جا سکا۔ صبح ناگوار پراجمل مجھے دیکھنے آیا میں نے سوچا کہ کل والی بات کے بارے میں اسے بتا دوں لیکن میرے کہنے سے کل ہی اس نے کہا۔

”مجھے شازیہ نے سب کچھ بتا دیا ہے۔“

”شازیہ.....؟ کون شازیہ؟“ میں نے کہا۔

”وہی شازیہ جو کل یاسمین کے ساتھ تھی۔“

”یاریہ تم نے کیا شروع کر دیا ہے دفعہ کرو اور ختم کرو اس سلسلے کو۔“ اجمل بولا۔

میں نے کہا۔ ”یاریہ تم بتاؤ میں کیا کروں؟ یہ سب کرنا میرے اختیار میں نہیں ہے۔ دل ہے کہ ہر پل اس کو ہی سوچتا رہتا ہے۔“ یہ کہتے ہی میں رو پڑا۔ اجمل میرے قریب آتے ہوئے بولا۔ ”کیا ہوا یاریہ؟“

میں نے کہا۔ ”کچھ کرو یاریہ۔“

اس نے مجھے تسلی دی اور کہا۔ ”میں شازیہ سے کہتا ہوں اور تمہاری حالت کے بارے میں میں بھی بتاتا ہوں شازیہ یقیناً ہماری مدد کرے گی۔“ تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد وہ واپس چلا گیا۔

دوسرے دن میری طبیعت ٹھیک تھی اس لیے میں ڈیوٹی پر چلا گیا۔ اجمل نے مجھے بتایا کہ میں نے شازیہ کو سب کچھ بتا دیا ہے وہ آج یاسمین سے بات کرے گی اور کل مجھے جواب دے گی۔ یہ سن کر میرے دل کو کچھ تسلی ہوئی۔ وہ دن بہت بور گزرا رات کو دیر تک میں یاسمین کے بارے میں اجمل سے باتیں کرتا رہا۔ اگلے دن میں اور اجمل بیٹھے تھے کہ شازیہ آئی دکھائی دی۔ سلام کے بعد اس نے اجمل سے کہا کہ سنا ہے مرد اور وہ بھی پٹھان ساری ساری رات روتے ہیں۔ اس کا اشارہ میری طرف تھا۔ میں نے اجمل کو گھورا جس پر شازیہ ہنس پڑی پھر اس نے بتایا کہ میں نے یاسمین سے بات کی تھی اور اس کو راضی کر لیا ہے کہ وہ عاقب کی بات ایک بار تسلی سے سن لے اس لیے عاقب آپ لٹچ ٹائم میں کولر کے پاس پہنچ جائیں۔ شازیہ کے جانے کے بعد میں نے اجمل کو گلے لگایا جس پر اس نے کہا۔

”ابھی نہیں پہلے دل کی بات اس سے کہو اس کو سناؤ پھر چھپیاں ڈالتے رہنا۔“

مقررہ وقت پر میں کولر کے پاس چلا گیا۔ تھوڑی دیر بعد شازیہ اور یاسمین بھی پانی لینے کے بہانے وہاں آ گئیں۔ شازیہ نے مجھے سلام کیا جبکہ یاسمین خلاف توقع نکلیں جھکائے خاموش کھڑی ہو گئی۔ شازیہ نے مجھے بات شروع کرنے کا اشارہ کیا۔ میں نے کہا۔

”یاسمین کیسی ہو؟“

”ٹھیک ہوں۔“ اس کا جواب مختصر تھا۔

میں دوبارہ اس سے مخاطب ہوا۔ ”دیکھو یاسمین مجھے غلط مت سمجھو ہوتا نہیں مجھے کیا ہو گیا ہے لیکن میرا دل میرے قابو میں نہیں ہے۔ میں تو تمہاری بے عزتی کا تصور بھی نہیں کر سکتا بس تم مجھ پر رحم کرو ایک بار تم کہہ دو کہ میرا ساتھ دو گی پھر میں تمہاری خاطر ہر مشکل ہر مصیبت کا مقابلہ کر لوں گا۔“

یاسمین نے میری بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ”یہ سب کہنا آسان اور نبھانا مشکل ہے۔“

میں اسے جواب دینا چاہتا تھا لیکن دوسری لڑکیاں بھی پانی کے لیے آرہی تھیں۔ شازیہ نے جلدی سے کہا کہ آج چھٹی پر باہر ملنا پھر بات ہوگی۔ یاسمین شاید اس کے حق میں نہیں تھی کیونکہ میں نے اس کے چہرے پر افسوس کے اثرات دیکھ لیے تھے لیکن اب دیر ہو گئی تھی چھٹی ہونے کے تھوڑی دیر بعد وہ دونوں گیٹ سے باہر نکلیں۔ میں پہلے ہی ان کے انتظار میں باہر کھڑا تھا۔ شازیہ نے مجھے اشارے سے اپنے پیچھے آنے کو کہا۔ میں تھوڑی دیر ان سے فاصلے پر پیچھے پیچھے چلتا رہا پھر شازیہ اور یاسمین دونوں رک گئیں۔ جب میں پہنچ گیا تو ہم تینوں پھر روانہ ہوئے۔ یاسمین نے کہا۔

”تم روزانہ مجھے تنگ کرتے ہو آج میں نے بھائیوں کو کھڑا کیا ہے تاکہ تمہیں سبق سکھایا جاسکے۔“

میں دل میں گھبرا گیا کہ سچ سچ ایسا نہ ہو وہ دونوں غور سے میری طرف دیکھ رہی تھیں شازیہ نے کہا۔ ”کیوں ڈر گئے کیا؟“

میں نے کہا۔ ”نہیں نہیں ایسی تو کوئی بات نہیں۔“

”اچھا چھوڑو یاسمین نے تو ویسے ہی مذاق کیا ہے تم اپنا بات کرو اور تفصیل سے کرو۔“

میں کچھ دیر خاموش رہا اور پھر شازیہ سے مخاطب ہوا۔ ”بات تو یاسمین کو پتا ہے اور شاید تمہیں بھی۔“ یاسمین

بولی۔ ”مجھ میں تمہیں کیا نظر آ گیا ہے؟“ میں نے کہا۔ ”یہ تو میں نہیں جانتا لیکن یہ جانتا ہوں کہ میرا یہ دل صرف تمہارے لیے دھڑکتا ہے اور تمہارا نام لیتا ہے میں تمہیں ہمیشہ کے لیے اپنانا چاہتا ہوں۔“ یاسمین کے لبوں پر مسکان سی آئی اور پھر وہ یکدم سنجیدہ ہو کر مجھ سے یوں گویا ہوئی۔ ”دیکھو جو کچھ تم کہہ رہے ہو اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ تم ایک ایسا خواب دیکھ رہے ہو جس کی تعبیر کا تمہیں بھی پتا نہیں۔ ہماری عمروں میں ذات برادری میں فرق ہے دوسرے ابھی تمہارا مستقبل ہی کیا ہے تم تو خود ابھی دوسروں کے محتاج ہو۔“

میں نے کہا۔ ”میں ذات برادری کو نہیں مانتا اور دل کو عمروں کا فرق کون سمجھائے رہ گئی بات مستقبل کی تو تم ایک بار میرا ساتھ دینے کا کہو تو میں تمہاری خاطر ہر مصیبت ہر مشکل کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہوں۔“

یاسمین بولی۔ ”تمہیں سمجھانا بہت مشکل ہے۔“

”تو تم میری بات سمجھ جاؤ۔“ میں نے کہا جس پر وہ خاموش ہو گئی پھر تھوڑی دیر بعد بولی۔

”تمہارے لیے نہ سہی لیکن ہمارے خاندان میں برادری سے باہر لڑکی دینے کا رواج نہیں۔ رواج بھی تو ہم نے بنائے ہیں ہم ہی توڑیں گے۔“ یاسمین نے کہا۔ ”اچھا یہ تو بتاؤ تم پٹھان بے وفا کیوں ہوتے ہو؟“ اس کی بات سن کر میں نے کہا۔ ”لگتا ہے تمہیں بڑا تجربہ ہے۔“

میری بات سن کر اسے غصہ آ گیا اور بولی۔ ”مجھے ایسی دیسی لڑکی مت سمجھو تم پہلے لڑکے ہو جس سے میں نے بات کی ہے اور میں جو کام کرتی ہوں تو یہ بھی میری مجبوری ہے اچھا۔“

اس کا جواب سن کر میں نے شازیہ کو اشارہ کیا کہ وہ چپ رہے کیونکہ وہ کچھ بولنے کا ارادہ کر رہی تھی اور منکراتے ہوئے بولا۔

”میں بھی کوئی ایسا ویسا لڑکا نہیں ہوں اور تم سے بات بھی میں دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر کر رہا ہوں۔“ میں تھوڑی دیر تک خاموش رہا پھر کہا۔ ”اچھا چلو میں اپنی بات واپس لیتا ہوں سوری۔“ اور کان پکڑ لیے۔ مجھے

دیکھ کر اس کے لبوں پر مسکراہٹ آگئی۔ میں نے سانس کھینچ کر کہا۔ ”شکر ہے۔“

”کیسا؟“ شازیہ نے کہا۔

”ہماری منزل بھی قریب آ رہی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”میری بات کا جواب تو پھر رہ گیا؟“

یاسمین نے کہا۔ ”اف ایک تو میں تمہارے جواب سے تنگ آگئی ہوں اچھا ایسا ہے کہ میں سوچ کر جواب دوں گی۔“

”ٹھیک ہے تو پھر کل ملاقات ہوگی۔“ میں نے کہا۔ شازیہ بولی۔ ”کل نہیں جعرات کو یعنی تین دن بعد۔“

یہ تین دن جس طرح میں نے گزارے وہ میں ہی جانتا ہوں۔ اجمل میری کیفیت پر میرا مذاق اڑاتا رہا جس دن یعنی جعرات کو ہمیں ملنا تھا اس دن یاسمین ڈیوٹی پر نہیں آئی۔ میں کافی پریشان تھا۔ میں نے اجمل سے کہا کہ وہ شازیہ سے پوچھے۔ وہ شازیہ کے پاس گیا۔ واپس آنے پر بتایا کہ یاسمین کے گھر مہمان آئے ہیں لیکن وہ مقررہ وقت پر باہر تمہارا اور شازیہ کا انتظار کرے گی یوں میری جان میں جان آئی۔ چھٹی ہونے پر میں اور شازیہ پہلے کی طرح ایک دوسرے سے فاصلہ رکھ کر روانہ ہوئے۔ ابھی ہم تھوڑی دور ہی گئے تھے کہ وہ ایک درخت کے نیچے کھڑی نظر آئی۔ اسے دیکھتے ہی میرا دل زور زور سے دھڑکنے شروع ہو گیا اور میں یہ سوچنے لگا کہ پتا نہیں یاسمین کیا جواب دے گی؟ ہمارے قریب پہنچنے پر اس نے سلام کیا اور ہمارے ساتھ روانہ ہوئی۔ میں نے اس کا حال پوچھا پھر ہمارے درمیان کچھ دیر خاموشی رہی جسے شازیہ نے توڑا۔ اس نے کہا۔ ”بھئی کیا گونگوں کی طرح چلے جا رہے ہو؟ کچھ بولو بھی؟“

میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ یاسمین گویا ہوئی۔ ”دیکھو عاقب میں جو کچھ کہوں اسے غور سے سننا میں نے تمہارے بارے میں سوچا ہے اور اللہ گواہ ہے کہ میری زندگی میں تم پہلے شخص ہو جس کے متعلق میں نے اس طرح سے سوچا ہے۔ میں ایک غریب ماں باپ کی اولاد ہوں ہمارا گزارہ بہت مشکل سے ہوتا ہے اس لیے مجھے کام کرنا پڑتا ہے۔ بھائی ہے لیکن کچھ عرصہ پہلے وہ بھی

معذور ہو گیا۔ اب ساری ذمہ داری مجھ پر ہے۔ تمہارے خلوص پر تمہاری محبت پر کوئی شبہ نہیں مگر مجھے نہیں لگتا کہ تم ثابت قدم رہو گے۔ تم نے بار بار مجھ سے جو کچھ کہا ہے وہ حقیقت میں مشکل ہے۔ سب سے بڑھ کر میرے گھر والے میری شادی کبھی ایسے نہیں ہونے دیں گے لیکن میں پھر بھی تم پر اعتبار کرتی ہوں۔ تم اپنے والدین کو میرے گھر بھیجوان سے بات کرو باقی بعد میں دیکھیں گے۔“ اس نے یہ سب کچھ کہہ کر گھر اسانس لیا پھر دوبارہ بولی۔ ”اور ہاں سب سے اہم مجھے بھی دھوکہ مت دینا اور بھی سچ راستے میں مت چھوڑنا ورنہ میں تمہیں کبھی معاف نہیں کروں گی۔ ٹھیک ہے ناں؟“ اس نے بغیر کسی لپٹی مجھے سب کچھ یوں بتایا جیسے کسی چھوٹے کو نصیحت کی جانی ہے۔ میرے لیے اس کا اقرار ہی بہت تھا۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور اسے یقین دلایا کہ میں ثابت قدم رہوں گا اور اس کے سارے خدشات غلط ثابت کروں گا۔ شازیہ نے جواباً کہا۔ ”اللہ کرے ایسا ہی ہو۔“ میں نے کہا۔ ”آمین!“

اب تقریباً ہر دوسرے دن میں اور یاسمین ملنے اور ایک دوسرے سے دل کی باتیں کرتے اور مستقبل کے منصوبے بناتے۔ وہ آہستہ آہستہ مجھ پر کل رہی تھی عام سی شکل و صورت والی یاسمین کا دل بہت خوبصورت تھا۔ میں نے اس سے یہ وعدہ بھی کیا کہ میں تمام عمر لاہور میں ہی اس کے پاس رہوں گا۔ مجھے یہاں آئے ہوئے ڈیڑھ ماہ سے اوپر ہو گیا تھا جب ایک دن والد نے کہا کہ تمہاری والدہ کا فون آیا تھا ایسا کرو کچھ دنوں کے لیے گھر چلے جاؤ وہ تمہارے لیے پریشان ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”ٹھیک ہے جی.....!“

اس دن میں نے اجمل کو کہا کہ میں کل شام گھر جا رہا ہوں۔ اس نے کہا۔ ”یاسمین کو کیا بتاؤ گے؟“

میں نے کہا۔ ”بتانا کیا ہے صاف صاف بتا دوں گا۔“ اور دوسرے دن جب میں نے یاسمین کو بتایا کہ میں جا رہا ہوں تو وہ خاموشی سے میری طرف دیکھتی رہی۔ میں نے کہا۔ ”کچھ تو بولو۔“ وہ بولی۔ ”جب تم نے جانے کا فیصلہ کر لیا ہے تو میں

ذرخیز راکھ

عام طور پر آتش فشاں پہاڑ کے پھٹنے کو آس پاس کی ہر چیز کی موت اور تباہی سے وابستہ کیا جاتا ہے لیکن معلوم ہوا ہے کہ مچھلی کی افزائش کے لیے اس کی راکھ انتہائی مفید ہوتی ہے۔ آتش فشاں کی راکھ میں ایسی معدنیات ہوتی ہیں جو پانی کے ذخیروں کی بارآوری بڑھاتی ہیں اور چند سال میں مچھلیوں کی تعداد میں اضافہ کر دیتی ہیں۔ اس سے آبی گھاس میں کئی سو گنا اضافہ ہو جاتا ہے جو مچھلیوں کی غذا ہے۔

کیا کہہ سکتی ہوں۔ ہاں مجھے یقین ہے کہ تم اپنی امی سے متعلق بات ضرور کرو گے۔“

”ہاں کیوں نہیں۔“ میں نے جلدی سے کہا۔

گھر آ کر میرا دل بالکل بھی نہ لگا ہر وقت یاسمین کا

چہرہ آنکھوں کے سامنے رہتا۔ امی میرے آنے سے

بہت خوش تھیں۔ میں نے جیسے تیسے دس دن گزارے۔

ان دس دنوں میں میں پھر بھی امی کو یاسمین کے متعلق نہ

بتا سکا۔ کچھ تو ہمارے گھر کا ماحول ایسا تھا اور کچھ میری کم

ہمتی تھی یوں میں یاسمین کے لیے تحائف لے کر واپس

لاہور آ گیا۔ یاسمین اپنے لیے تحفے دیکھ کر بہت خوش

ہوئی اور میرا شکریہ ادا کیا پھر اس نے پوچھا کہ امی سے

بات کی؟ میں اس کا مطلب سمجھ گیا مجھے اسی بات کا ڈر

تھا۔

”دیکھو یاسمین گھر میں حالات کچھ ایسے تھے کہ میں

امی سے بات نہیں کر سکا لیکن تم فکر مت کرو میں جلد ہی

ان سے بات کروں گا۔“

میں نے اسے مطمئن کرنا چاہا اس نے مجھے ایسی

نظروں سے دیکھا جیسے وہ سب کچھ جانتی ہو لیکن اس نے

کہا کچھ نہیں۔ اب جب بھی میں اور یاسمین ملنے وہ یہ

بات ضرور پوچھتی کہ میں کب اپنے والدین سے بات

کروں گا اور میں اسے کسی نہ کسی بہانے ٹال دیتا۔ پتا

نہیں یہ میرے دل کا چور تھا یا کچھ اور مجھے لگتا تھا جیسے

یاسمین جانتی ہو کہ میں اسے ٹال رہا ہوں۔ مجھے گھر سے

آئے ہوئے بیسواں روز تھا جب والد نے مجھے پاس

بوسنے کی خوشخبری سنائی اور مجھے گلے لگایا۔ اس دن وہ

بہت خوش تھے۔ میں نے اجمل کو بتایا اس نے بھی خوشی کا

اظہار کیا اور مبارک باد دی۔ دوسرے دن ہم نے شازیہ

اور یاسمین کو بتایا۔ دونوں نے مبارک باد دی خصوصاً

یاسمین کی خوشی تو اس کی آنکھوں سے عیاں تھی۔ شازیہ

نے کہا۔ ”اس بار تو کچھ کھلاؤ ورنہ جان نہیں چھوٹے گی۔“

پہلے بھی ہم نے تمہاری زندگی بنائی اور تم چپ ہو رہے۔“

اس نے زندگی کہتے ہوئے یاسمین کی طرف اشارہ کیا جسے

اس نے دیکھ لیا اور نظریں جھکا لیں جس پر اسے ہنسی

آگئی۔ میں نے جیب سے رقم نکالی اور شازیہ کو دے دی

کہ وہ اپنی مرضی سے خود بھی کچھ لے لے اور یاسمین کے

لیے بھی۔ دوسرے دن یاسمین نے پاس ہونے پر مجھے تحفہ

دیا۔ میں نے مذاقاً کہا۔

”بدلتا رہا ہو۔“

وہ مسکرائی اور کہا۔ ”ایسا ہی سمجھ لو۔“ پھر بولی۔ ”اب

آگے کیا ارادہ ہے؟“

میں نے کہا۔ ”دیکھیں گے۔“

اس دن شام کو والد نے مجھے اپنے پاس بٹھایا اور

یوں گویا ہوئے۔ ”دیکھو عاقب تم میرے بڑے بیٹے ہو

اور مجھے تم سے بہت سی امیدیں ہیں۔ میں اس عمر میں

محنت اسی لیے کر رہا ہوں کہ تم پڑھ لکھ کر بڑے آدمی بنو۔

میں چاہتا ہوں کہ اب تم واپس جا کر آگے پڑھو اور ہاں

اپنی امی کو بالکل تنگ نہیں کرنا۔ ٹھیک ہے ناں؟“

والد کی بات سن کر میرے سامنے یاسمین کا چہرہ آ گیا

اور مجھے یوں لگا جیسے وہ مجھ پر ہنس رہی ہو۔ میں انکار کرنا

چاہتا تھا اور والد سے کہنا چاہتا تھا کہ میں یہاں ٹھیک ہوں

مگر یہ سب کچھ سوچ تو سکتا تھا والد سے کہنا میرے بس

کی بات نہیں تھی۔ دوسرے دن میں نے یاسمین کو والد

کے فیصلے سے آگاہ کیا۔ وہ دکھ اور حیرت کا تاثر لیے مجھے

دیکھتی رہی پھر اس نے کہا بھی تو صرف اتنا کہا کہ تم مت

جاؤ۔ میں نے کہا۔

”یاسمین یاد ہے تم نے کہا تھا کہ تمہارا مستقبل

کیا ہے تو اب مجھے اپنے پیروں پر کھڑا ہونے دوتا کہ میں

خبر سے تمہارا ہاتھ تھام سکوں۔“

”تمہاری بات اپنی جگہ ٹھیک ہے مگر پتا نہیں کیوں مجھے لگتا ہے کہ تم واپس نہیں آؤ گے؟“ یاسمین نے افسردہ لہجے میں کہا۔

”نہیں ایسا مت کہو میں ضرور آؤں گا اور اپنی زندگی کو لے کر جاؤں گا۔“ میں نے کہا۔

اس دن بھی ہم حسب معمول ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے چل رہے تھے۔ اس کے بعد ہمارے درمیان خاموشی چھا گئی۔ باتیں تو جیسے ختم ہو گئی تھیں۔ آخر وہ لمحہ آ گیا جب ہمیں جدا ہونا تھا میں وہ منظر کبھی فراموش نہیں کر سکتا۔ یاسمین کی آنکھوں میں آنسو تھے اس نے کہا۔

”جلدی آنا دیر نہ کر دینا ایسا نہ ہو کہ میں تمہاری راہ ہکتی رہوں۔“

میں نے کہا۔ ”خدا نہ کرے ایسا ہو میں ضرور آؤں گا اپنا خیال رکھنا۔“

”تم بھی جاتے ہی امی سے بات کرنا۔“ یاسمین نے کہا۔

”ضرور ضرور کیوں نہیں۔“ میں نے کہا اور اس کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا پھر میں نے اپنے ہونٹ اس کی ہتھیلی پر رکھ دیے۔ یاسمین سے الوداعی ملاقات کے بعد میں کافی اداس تھا۔ میں نے اجمل کو کہا کہ وہ یاسمین کا خیال رکھے اور اسے اپنے دوست کا نمبر بھی دیا پھر میں اس کے گلے لگ کر رو دیا۔ اس نے مجھے تسلی دی اور کہا۔

”ایویں بڑی بڑی باتیں کرتے ہو تو بچے ہی ناں۔“ اس کی بات سن کر میرے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔ اس نے کہا۔ ”یہ ہوئی نا بات۔“ میں نے پھر اسے گلے لگایا اور کہا کہ میں اسے ہمیشہ یاد رکھوں گا۔

گاؤں واپس آ کر میں نے فرسٹ ایئر میں داخلہ لے لیا۔ اجمل کا فون ہفتے میں ایک بار ضرور آتا یا پھر میں اسے فون کرتا اور اس سے یاسمین کے متعلق پوچھتا۔ ایک دن اجمل نے بتایا کہ میں نے یاسمین کو تمہارا نمبر دے دیا ہے۔ کل تمہیں فون کرے گی۔ اگلے دن یاسمین کا فون آیا وہ کافی دیر تک روتی رہی۔ میں نے بڑی مشکل سے اسے چپ کرایا۔ اس نے کہا کہ تم واپس آ جاؤ جب سے

تم گئے ہو میرا کچھ چین ختم ہو گیا ہے۔ میں نے کہا کہ مجھ کو ڈیڑھ جلد آؤں گا یہ جدائی عارضی ہے۔ اس نے کہا کہ امی سے بات کی یا نہیں؟

میں نے کہا۔ ”آج کل میں کرلوں گا۔“ یاسمین نے ایک گھنٹے تک بات کی جس کے دوران میں نے کئی بار اس سے کہا کہ وہ مجھے نمبر دے میں فون کرتا ہوں تم پر بل زیادہ آ جائے گا لیکن وہ راضی نہ ہوئی۔ اب اس کا فون ہفتے میں ایک بار ضرور آتا جس میں وہ زیادہ تر یہ بات ہی کرتی کہ اپنی امی کو میرے بارے میں بتاؤ جبکہ میں ابھی تک اپنی ماں سے بات نہیں کر سکا تھا۔ میں جب اجمل کو فون کرتا تو وہ مجھے یہی بتاتا کہ تم نے یاسمین پر کیا جادو کر دیا ہے وہ روز بہ روز کمزور ہوتی جا رہی ہے اور سوکھ کر کاٹا بن گئی ہے اور صرف تم سے بات کرنے کے لیے اور ٹائم کرنے لگی ہے۔ اجمل کی باتیں سن کر جہاں مجھے اپنی محبت پر فخر محسوس ہوتا وہاں اپنے آپ پر غصہ بھی آتا کہ میں اب تک امی سے بات نہیں کر سکا۔ اس طرح ایک سال بیت گیا۔ میں سیکنڈ ایئر میں آ گیا۔ یاسمین کا وہی معمول تھا۔ ایک دن جب اس کا فون آیا تو اس نے کہا کہ آخر تم کب گھر والوں سے بات کرو گے؟ اگر تم اتنے ہی بزدل تھے تو پھر میری زندگی کیوں برباد کی؟ میں خود تمہارے والد سے بات کرتی ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”ایسا مت کرنا میں جلد امی کو ملنا لوں گا۔“

لیکن وہ نہ مانی اور میرے والد سے کہہ دیا کہ میں اور عاقب شادی کرنا چاہتے ہیں جس پر میرے والد نے اسے کہا کہ عاقب اپنے آپ کو تو رکھ نہیں سکتا تمہیں کیا رکھے گا؟ یہ بات مجھے اجمل نے بتائی کیونکہ میرے والد نے اجمل سے بھی پوچھا تھا کہ یہ کیا معاملہ ہے؟ لیکن اجمل نے لاعلمی کا اظہار کر دیا پھر چند روز بعد امی نے بھی پوچھا کہ یاسمین کون ہے؟ کاش میں اس وقت امی کو بتا دیتا تو آج دل بریوں بوجھ تو نہ ہوتا لیکن میں نے امی کو کہا کہ میں تو کسی یاسمین کو نہیں جانتا جس پر امی نے والد کو بتا دیا کہ عاقب تو کسی یاسمین کو نہیں جانتا وہ لڑکی دیے ہی عاقب کا نام لے رہی ہوگی۔ یاسمین نے جب مجھے فون کیا تو میں نے اس کی خوب خبر لی کہ اس نے یہ بے وقوفی

کیوں کی؟ جس پر اس نے روتے ہوئے فون بند کر دیا پھر آدھا ماہ تک اس نے فون نہیں کیا۔ اجمل سے اس کے متعلق حال احوال ملتا رہتا۔ اس کی آواز سننے بغیر مجھے بھی چین کہاں تھا۔ میں نے اجمل کو کہا کہ یاسمین کو ویسے ہی بتادے کہ عاقب سخت بیمار ہے پھر وہ ضرور فون کرے گی۔ اس سے پہلے کہ اس کا فون آتا دوسرے روز رات کو فیکٹری سے فون آیا کہ میرے والد حادثے میں زخمی ہو گئے ہیں وہ چھٹی ہونے کی وجہ سے شہر جا رہے تھے کہ گاڑی کو حادثہ پیش آ گیا۔ میں اگلے دن صبح سویرے ہی لاہور کی طرف عازم سفر ہوا اور شام کو فیکٹری پہنچ گیا۔ وہاں جا کر پتا چلا کہ والد ہسپتال میں ہیں۔ میں والد کے ایک دوست کے ساتھ ہسپتال پہنچا۔ وہ مہنگا پرائیویٹ ہسپتال تھا۔ میں نے جب والد کو پیوں میں جکڑا دیکھا تو خود پر قابو نہ رکھ سکا اور رونے لگا جس پر والد نے مجھے کہا کہ میں بالکل ٹھیک ہوں بہادر بنو کیا عورتوں کی طرح رونے لگے ہو پیوں میں نے آنسو پونچھ لیے۔ ہسپتال میں ابو کا خیال رکھا جا رہا تھا۔ دوسرے دن اجمل بھی آ گیا اور فیکٹری کے منیجر بھی آ گئے۔ انہوں نے مجھے کہا کہ فکریست کرو سیٹھ صاحب نے کہا ہے کہ جتنا بھی خرچ آئے کمپنی برداشت کرے گی۔ ڈاکٹروں نے ٹیسٹ وغیرہ کر لیے ہیں کل تک رپورٹیں آ جائیں گی۔ میں نے ان کا شکریہ ادا کیا۔ انہوں نے کہا کہ شکریہ کی بات نہیں تمہارے والد نے ہمارے ساتھ بہت وقت گزارا ہے اور ہاں اس طرح کرو اپنی والدہ کو بلا لو کیونکہ ان کے ساتھ تمہاری والدہ کا رہنا ضروری ہے۔ میں فیکٹری میں تمہاری اور تمہاری والدہ کی رہائش کا انتظام کر دیتا ہوں۔ میں نے اسی وقت امی کو فون کر دیا۔ دوسرے دن شام کو میں اور اجمل امی اور چھوٹے بھائی کو لینے گئے۔ امی نے انیس برس کی میرے گلے لگ کر رونا شروع کر دیا۔ میں نے کہا کہ امی ابواب بالکل ٹھیک ہیں گھبرانے کی بات نہیں۔ میں انہیں فیکٹری لے جانا چاہتا تھا تا کہ وہ تھوڑی دیر آرام کر لیں مگر امی نے کہا کہ میں نے ہسپتال جانا ہے ہسپتال پہنچ کر امی والد کے پاؤں پکڑ کر رونا شروع ہو گئی۔ اس منظر نے مجھے اور اجمل کو بھی رلا دیا۔ میں نے بڑی مشکل سے انہیں چپ کرایا۔ دوسرے دن

ربا عیات

ہر اونچی پہاڑی پہ افق ہے گماں
ٹھہراؤ ہے یا وقت بنا ہے زنداں
تیلے گہرے کے بازوؤں میں میداں
چپ چاپ پُر اسرار سالیٹا ہے یہاں

لمبی ڈھلوان گلی اترتا ہے مجھے
کٹتے ہی صبح گزرتا ہے مجھے
ٹھنڈا پانی رگ رگ بھرتا ہے مجھے
جتنا چاہوں جی لوں مرنا ہے مجھے

سر میں تپاں طاقت جتنی ہے ابھی
پیچیدہ دھواں ہیں شان اتنی ہے ابھی
رہ رہ کے یہ پوچھتی ہے ثابت قدمی
پسپا ہونے میں دیر کتنی ہے ابھی

اک شعلہ نم درد جدائی تہ خاک
گل شاخ کا خم درد جدائی تہ خاک
اے ٹوٹی سانسوں میں بکھرتی ہوئی رات
ہستی نہ عدم درد جدائی تہ خاک

شمس الرحمن فاروقی

آپریشن کرنا پڑے گا ایک ٹانگ کا اسی ہفتے جبکہ دوسری کا بعد میں کیا جائے گا۔ میں مسلسل چار دن سے ہسپتال میں تھا۔ امی نے مجھے کہا کہ تم اور اجمل چلے جاؤ کچھ آرام کرو پھر شام کو آ جانا یوں میں اور اجمل فیکٹری چلے آئے۔ اجمل کی رہائش بھی فیکٹری میں تھی۔ ہم دونوں جا کر سو گئے اور تقریباً تین بجے ہماری آنکھ کھلی۔ فریش ہونے کے بعد اجمل نے مجھے کہا کہ آؤ باہر کینٹین میں چلتے ہیں ہو سکتا ہے باہر یا کمین سے بھی ملاقات ہو جائے۔ اس کی بات سچ تھی۔ ابھی ہمیں بیٹھے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی کہ یا کمین گیٹ سے باہر نکلی وہ اکیلی تھی۔ اجمل نے مجھے کہا کہ چلو شکر ہے میری بات سچ ہوئی۔ اب جاؤ مل آؤ۔ میں یہاں بیٹھ کر تمہارا انتظار کرتا ہوں۔ میں یا کمین کے پیچھے چل دیا وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتے ہوئے جا رہی تھی۔ اس کے قریب پہنچ کر میں نے زور سے السلام علیکم کہا۔ وہ رک گئی اور مجھے دیکھنے لگی جیسے اسے میرے آنے کا یقین نہ ہو۔ اس نے دھیرے سے سلام کا جواب دیا۔ وہ بہت کمزور لگ رہی تھی جبکہ اس کی ہمیشہ روشن روشن آنکھیں اس وقت ویران ویران سی تھیں۔ میں نے اس سے کہا کہ یا کمین! یہ کیا حالت بنائی ہوئی ہے؟ یا کمین نے کہا۔

”مجھے کیا ہونا ہے ٹھیک ہوں اور یہ بھی تو تمہارا ہی دیا ہوا تھوڑا سا ہے ناں۔“

میں نے کہا۔ ”فکرمت کرو میں آ گیا ہوں۔“

اس نے کہا۔ ”مجھے پتا ہے۔“

پھر اس نے والد کی صحت کے بارے میں پوچھا اور کہا کہ تمہاری امی بھی آئی ہیں؟ میں نے کہا۔

”ہاں آئی ہیں۔“

اس نے کہا کہ ہم نے پروگرام بنایا ہے جمعہ کے دن چھٹی ہونے پر ہم تمہارے والد کو دیکھنے جائیں گے اور میں تو تمہاری امی سے بھی ملوں گی۔ میں نے کہا۔

”ٹھیک ہے مل لینا۔“

پھر واقعی یا کمین چند دوسری لڑکیوں کے ساتھ والد کو دیکھنے ہسپتال آئی۔ یا کمین نے امی سے ملنے ہوئے کہا کہ میں یا کمین ہوں جس برامی نے پہلے والد کی طرف اور پھر میری طرف دیکھا لیکن میں نے نظریں نیچی کر لیں۔ یا کمین کافی دیر تک امی سے باتیں کرتی رہی۔ اس

نے پتا نہیں امی پر کیا جادو کیا کہ اس کے جانے کے بعد امی یا کمین ہی کی باتیں کرتی رہیں۔ دو دن بعد یا کمین اپنے والدین کے ساتھ دوبارہ آئی۔ یا کمین کی ماں نے امی اور چھوٹے بھائی کو گھر آنے کی دعوت دی جس پر والد نے امی سے کہا کہ کسی دن چلی جانا دل بھی بہل جائے گا۔ یا کمین نے کہا۔

”کسی دن کیوں آج ہی چلتے ہیں۔“

یوں امی اور چھوٹا بھائی یا کمین کے ساتھ چلے گئے۔ ان کی واپسی اگلے دن ہوئی۔ امی اٹھتے بیٹھتے یا کمین اور اس کے گھر والوں کی تعریف کرتی رہتیں۔ میں دل میں اس پر بہت خوش تھا۔ میں نے جب یا کمین کو بتایا تو اسے بھی خوشی ہوئی اور کہا کہ ابھی موقع ہے امی سے بات کر لو۔ میں نے کہا۔

”نہیں! ابھی نہیں ان حالات میں بات نہیں کر سکتا۔ امی کیا سوچیں گی؟“

اسی اثناء میں ابو کی ایک ٹانگ کا آپریشن ہو گیا اور دوسری ٹانگ کے آپریشن کے لیے ایک مہینہ بعد کا نام دیا۔ ایک دن یا کمین نے مجھے بتایا کہ برادری سے اس کے لیے دو تین رشتے آئے ہیں۔ پہلے تو میں نے گھر والوں کو بہانے سے ٹال دیا تھا لیکن اس بار میرے والدین میری شادی کر کے ہی رہیں گے اس لیے تم اپنی ماں سے بات کرو ورنہ پھر میں کرتی ہوں۔ میں نے کہا۔

”اچھا! میں کچھ سوچتا ہوں۔“

اس نے کہا کہ تم بس سوچتے رہنا اور میری شادی ہو جائے گی۔ یہ کہہ کر وہ چلی گئی۔ اس دن کے بعد یا کمین نے کام پر آنا بھی چھوڑ دیا جب دس دن گزر گئے تو میں بہت پریشان ہوا۔ اجمل نے مجھے کہا کہ ایسا کرو اپنی امی کو کسی طریقے سے ان کے گھر بھیج دو۔ میں نے اسی دن امی سے کہا کہ یا کمین ملی تھی وہ کہہ رہی تھی کہ آنٹی کو ہمارے گھر بھجوانا کافی دن ہو گئے ہیں انہیں آئے ہوئے۔ امی اور چھوٹا بھائی دوسرے روز صبح ہی یا کمین کے گھر چلے گئے لیکن ایک گھنٹے بعد ہی واپس آ گئے۔ امی کا چہرہ اترا ہوا تھا۔ میں سمجھ گیا کہ ضرور کچھ گڑبڑ ہے۔ والد نے امی سے جلد آنے کی وجہ پوچھی جس پر امی نے کہا کہ وہاں دل نہیں لگا اس لیے واپس آ گئے لیکن میں جانتا تھا کہ بات کچھ اور ہے پھر انہوں نے مجھ سے کہا کہ

مجھے فیکٹری چھوڑ آؤ۔ ان کی بات سن کر میں گھبرا گیا کیونکہ پہلے امی چھوٹے بھائی کے ساتھ اکیلی ہی جاتی تھیں۔ ہم جیسے ہی فیکٹری میں رہائش گاہ پر پہنچے امی مجھ پر برس پڑیں۔

”عاقب! مجھے تم سے یہ امید نہیں تھی۔“

”امی! کیا ہوا؟“ میں نے کہا۔

انہوں نے کہا۔ ”یہ کہ تم نے مجھے دھوکہ دیا۔ کاش میں ان کے گھر نہیں جاتی تو اتنی شرمندگی تو نہ اٹھانا پڑتی۔ تم نے ہمیں کہیں کا نہیں رکھا۔“

میرے بتانے پر انہوں نے کہا۔ ”یا کمین کے لیے رشتہ آیا تھا لیکن یا کمین نے انکار کر دیا۔ وجہ پوچھنے پر اس نے کہا کہ وہ عاقب سے شادی کرے گی۔ یا کمین نے بھی مجھے روتے ہوئے کہا کہ آپ میرے اور عاقب کے لیے کچھ کریں۔ یا کمین کی اس حرکت پر اس کے گھر والوں نے اس کا کام چھڑوا دیا ہے اور گھر میں پابند کر لیا ہے۔ امی نے مجھے کہا۔

”عاقب! اگر تمہارے والد کو پتا چل گیا تو سوچو ان پر کیا گزرے گی؟“

”میں نے یا کمین کے ماں باپ کو تو کہہ دیا ہے کہ عاقب ایسا نہیں لیکن یا کمین کے آنسوؤں نے مجھے بہت کچھ بتا دیا ہے۔ تم نے ہماری عزت کا بھی خیال نہیں کیا۔“

میں نے امی سے کہا کہ اس میں میرا کوئی قصور نہیں یا کمین نے جو کچھ کہا ہے وہ یا کمین کی اپنی خواہش ہو سکتی ہے۔ میں نے تو کچھ نہیں کہا۔“

اس وقت میں یہ فراموش کر بیٹھا کہ یا کمین کو اس راہ پر لانے والا میں ہی ہوں اور مجھ سے زیادہ بہادر تو وہ نکلی لیکن اس دن میں نے اپنے آپ کو بھالایا۔ دوسرے روز یا کمین کے ماں باپ ہسپتال آئے۔ یا کمین کے والد نے آتے ہی اپنے سر سے چادر اتار کر میرے والد کے پاؤں میں رکھ دی۔ والد حیران نظروں سے بھی ان کو اور بھی مجھے اور امی کی طرف دیکھتے پھر انہوں نے یا کمین کے والد سے کہا۔

”یہ آپ کیا کر رہے ہیں؟“

انہوں نے کہا۔ ”ہماری عزت آپ کے ہاتھ میں ہے آپ اپنے بیٹے کو سمجھائیں اس نے یا کمین کو ورغلا یا

حاضری موقوف کیجیے

ایک بار غازی الدین حیدر حیدری خاں سے گانا سن رہے تھے۔ انہوں نے حکم دیا کہ اگر حیدری خاں نے آج انہیں رلایا نہیں تو حیدری خاں کو دریائے گومتی میں پھنکوا دیں گے۔ خدا کی قدرت حیدری خاں نے ایسا گایا کہ غازی الدین حیدر رو پڑے۔ انہوں نے خوش ہو کر کہا۔

”بولو حیدری خاں! کیا مانگتے ہو؟“

حیدری خاں بولے۔ ”جناب! آپ مجھے کبھی نہ بلوایئے اور نہ گانا سنئے۔“

بادشاہ نے حیرت سے پوچھا۔ ”کیوں؟“

حیدری خاں نے جواب دیا۔ ”جناب! آپ کا کیا ہے مجھے مروا ڈالو گے پھر مجھ جیسا حیدری خاں دوبارہ پیدا نہ ہوگا اور آپ مرجائیں گے تو فوراً دوسرا بادشاہ تخت پر بٹھا دیا جائے گا۔“

”مشرقی تمدن کا آخری نمونہ“ سے اقتباس ہے۔

والد نے میری طرف تیز نظروں سے دیکھا پھر مجھے کہا کہ چادر اٹھا کر ان کے سر پر رکھو اور بتاؤ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟ میں نے کہا۔

میں نے کہا۔ ”میں نے کسی کو نہیں ورغلا یا۔“

”تو پھر وہ شادی سے انکاری کیوں ہے اور کہتی ہے کہ اگر شادی کروں گی تو عاقب سے؟“ یا کمین کے والد نے کہا جس پر میں نے انہیں جواب میں کہا۔

”یہ تو آپ اپنی بیٹی سے پوچھیں۔“

میرے والد نے یا کمین کے والد کی طرف دیکھا اور کہا کہ عاقب آپ کے سامنے ہے اب آپ کیا کہتے ہیں؟ انہوں نے کچھ نہیں کہا اور چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد ابو نے آنکھیں موند لیں پھر تھوڑی دیر بعد کہا کہ جیسے ہی میری دوسری ٹانگ کا آپریشن ہو جائے تم واپس چلے جاؤ۔ تمہارا یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔

میں نے کہا۔ ”کیوں؟“

ہوس نے دن یہ دکھائے

فرزانہ نگہت

حرس وہوس میں اندھا ہو کر انسان
انسانیت کی سطح سے بھی گر جاتا ہے
وہ بھی حرس وہوس کا شکار ہو کر اندھی ہو گئی تھی

اسلام آباد سے ایک سنگ دل عورت کی زوداد پہلی مختصر کہانی



ہو گیا؟“ وہ بولی پھر کچھ دیر بعد وہ اٹھتے ہوئے
بولی۔ ”میں آج فیصلہ کرنے آئی ہوں جہاں تم کو
گئے میں جانے کے لیے تیار ہوں۔ مجھے اپنے ساتھ
لے چلو میں تمہارے والد اور امی کے قدموں میں گر
کر انہیں منالوں گی۔“

مجھے یاسمین سے اتنے بڑے فیصلے کی توقع نہیں تھی
میں کچھ دیر تو حیران نظروں سے اسے دیکھتا رہا پھر کہا۔
”بے وقوفی کی باتیں مت کرو۔ اللہ خیر کرے گا۔“
اس نے کہا۔ ”نہیں“ صرف ہاں یا ناں میں جواب
دو۔“

میں نے کہا۔ ”یاسمین.....! جو کچھ تم کہہ رہی ہو وہ
کہنا آسان ہے؟“

اس نے کہا۔ ”مجھے جواب چاہیے۔“
میں نے کہا۔ ”ایسا نہیں ہو سکتا۔“

یاسمین بولی۔ ”مجھے پتا تھا تم یہی کہو گے لیکن پتا
نہیں کیوں اس پاگل دل کو خوش فہمی تھی کہ تم وہ نہیں ہو جو
میرے والدین نے کہا ہے لیکن نہیں کاش میں دل کے
ہاتھوں مجبور نہ ہوئی ہوتی۔“ یاسمین کی آنکھوں سے آنسو
رواں تھے اور ادھر میرے دل کو کچھ ہورہا تھا۔ تھوڑی دیر
بعد اس نے پھر کہا۔ ”عاقب! میں جا رہی ہوں لیکن میری
ایک بات سن لو میں نے صرف تمہیں چاہا ہے میں بے
وفا نہیں ہوں۔ یاد رکھنا ایک دن آئے گا جب تم میری
آواز کے لیے ترسو گے ساری زندگی بے چین رہو گے
اور یہی تمہاری سزا ہوگی اور میری سزا یہی ہے کہ جہاں
میرے ماں باپ کہتے ہیں میں وہاں شادی کر لوں۔“
یاسمین چلی گئی۔

آج برسوں بیت گئے میں نے دنوں کا حساب کرنا
چھوڑ دیا ہے۔ میں نے اس دن کے بعد یاسمین کو نہیں
دیکھا۔ مجھے اس کی بددعا لگ گئی ہے۔ میری سزا جاری
ہے۔ پتا نہیں کب تک جاری رہے گی؟ مجھے اس کے
حالات کا پتا چلتا رہتا ہے وہ اپنے بچوں میں مگن ہے۔
اس کے بڑے بیٹے کا نام بھی عاقب ہے۔ یاسمین سے
جدا ہوئے میں نے ایک دن بھی چین کا نہیں گزارا۔
آپ نے چلتی پھرتی لاش کے بارے میں سنا ہوگا میرا
حال بھی ایسا ہی ہے۔

☆☆☆

انہوں نے کہا۔ ”تم نے جو کچھ کیا ہے اس کے بعد
بھی کیوں کی گنجائش رہتی ہے؟“
گو یا وہ میرے دل میں چھپے چور کو جان گئے تھے۔
دوسری جانب جب یاسمین کو والدین نے میرے جواب
کے بارے میں بتایا تو اسے شاید یقین ہی نہیں آیا جیسی تو
دوسرے دن وہ پتا نہیں گھر سے کیسے نکل کر ہسپتال آئی۔
اس کے ساتھ ایک اور لڑکی بھی تھی۔ میں اسے لے کر
ہسپتال کے لان میں آ گیا اور ہم بیچ پر بیٹھ گئے۔ یاسمین
سر جھکائے خاموش بیٹھی تھی۔ میں نے پہل کرتے ہوئے
کہا۔

”یاسمین.....! یہ تم نے کیا بے وقوفی کی؟ ابھی یہ
سب کچھ کرنے کا وقت نہیں آیا تھا؟“

میری بات سن کر اس نے نظریں اٹھائیں اور میری
طرف دیکھا اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ وہ شاید
بھری بیٹھی تھی بولی۔

”وقت..... وقت..... وقت..... پتا نہیں تمہارا
وقت کب آتا ہے؟ آتا بھی یا.....؟“

وہ تھوڑی دیر کے لیے خاموش ہو گئی پھر بولی۔ ”تم
مجھے یہ بتاؤ تم نے میرے والدین کو کیا بتایا ہے یا وہ جو
کچھ کہہ رہے ہیں وہ سچ ہے؟“

”حالات کا تقاضہ یہی تھا میں اور کیا کرتا؟“
اسے شاید اس جواب کی توقع نہیں تھی۔ اس کے
چہرے پر دیرانی اور بڑھ گئی۔

”حالات تو کبھی ٹھیک نہیں ہوں گے میں نے
تمہیں کہا تھا کہ تم جو کچھ کہہ رہے ہو وہ پورا نہیں کر سکو
گے؟ کیاں گئی تمہاری بڑی بڑی باتیں؟ کیا یہی تمہاری
محبت تھی؟ میں نے تمہارے لیے کیا کیا اپنوں کو
ناراض کیا ان کی بددعا میں لی ہیں اور تم یہ صلہ دے
رہے ہو؟ تم بزدل ہو تم بے وفا ہو۔“ اس نے ایک ہی
سانس میں سب کچھ کہہ دیا اور رونے لگی۔ میں نے
کہا۔

”یاسمین.....! تم خود سوچو میرے والد کی کیا
حالت ہے اب اگر میں وہ سب کچھ مان لیتا تو بتاؤ ان پر
کیا گزرتی؟ اور مجھ پر کیا گزری ہے تمہیں اندازہ ہے
اس کا؟“

”نہیں تم جیسے سنگدل کو کیسے اندازہ

ماہرین امراض چشم آپریشن کے فوراً بعد کالا چشمہ
غالباً اس لیے چڑھا دیتے ہیں کہ کم از کم چھ ہفتے تک تو
ان کے ”کارنامے“ پر پردہ پڑا رہے۔

لیکن۔ انہوں نے اپنے چھوٹے بیٹوں یا سر اور یوسف
کی بھی شادیاں کر دیں۔

اب آخری اولاد سب سے لاڈلی پیاری سب سے
حسین و خوبصورت بیٹی عرفانہ عرف مولائز باقی رہ گئی تھی
جس کے لیے پھوپھی سلیمہ کو کوئی رشتہ پسند نہیں آ رہا تھا۔
خاندان کے لوگ پھوپھی سلیمہ کی عادتوں اور حرکتوں کے
سبب عرفانہ کا رشتہ لینے سے گریزاں تھے۔

یوں بہتر اور موزوں رشتے کا انتظار کرتے کرتے
عرفانہ کی عمر تیس سال ہو گئی۔ اس کے لیے اب بھولے
بھٹکے ہی کوئی رشتہ آنے لگا۔ پھوپھی سلیمہ اور سب گھر
والے اس پر بے حد پریشان اور فکر مند رہنے لگے تھے۔

آخر بڑی دوڑ دھوپ کے بعد اس کے لیے ایک
مناسب و موزوں رشتہ مل ہی گیا۔ یہ خاندان ہی کے لوگ
تھے نیم خواندہ اور پسماندہ سے۔ لڑکا البتہ انجینئر تھا اور
اعلیٰ عہدے پر فائز تھا۔ یہ شادی بڑی دھوم دھام سے
ہوئی۔ عرفانہ کو جہیز بھی بڑا بھاری دیا گیا۔ یوں پھوپھی
سلیمہ اور ان کے اہل خانہ کی عرصہ دراز کی فکر و پریشانی
دور ہوئی اور انہیں سکون وطمینان کا سانس نصیب ہوا۔

اب اللہ کی بے آواز لامٹی اپنی حرکت میں آ چکی
تھی۔ پھوپھی سلیمہ نے اپنے بیٹے احمد کی بیوی نفیسہ بھابی کو
بانجھ پن اور مرگی کی مریضہ ہونے کے گناہ یا جرم میں
احمر کی شادی ریحانہ سے کرنے کے لیے طلاق دلوا کر گھر
سے نکال دیا تھا۔ وہ غریب طلاق لے کر روتی دھوتی اپنے
ماں باپ کے گھر چلی گئی جہاں اس کی بھابیوں نے اس کی
دوبارہ شادی نہ ہونے دی اور اسے اپنی نوکرائی بتالیا۔
وہ ان کے ہاتھوں ذلیل و خوار ہوتی سختیاں اور ظلم
سمتی خون تھوک تھوک کر مر گئی۔

اس سے نجات پانے اور ریحانہ سے احمر کی شادی

سلیمہ نے یہ کیا کہ احمر بھائی کی بیوی بھابی نفیسہ کو یہ کہہ کر
طلاق دلوا دی کہ ایک تو بانجھ اوپر سے آئے دن اسے
مرگی کے دورے پڑتے رہتے ہیں۔ اس کے بعد انہوں
نے احمر کی شادی پھوپھی امینہ کی چھوٹی بیٹی ریحانہ سے اور
اپنی بیٹی عذرا کی شادی اپنے بھانجے فیصل سے کرنے کی
سرگود کو ششیں شروع کر دیں حالانکہ ان بہن بھائی کی
سختیاں امیر کبیر اور شریف گھرانوں میں ہو چکی تھیں۔

پھوپھی سلیمہ کا خیال تھا چونکہ انہوں نے اپنے بھانجے
بھانجیوں کی خوب خدمت گزاریاں کر کے ان سے بھرپور
مہر دیاں اور ان پر بے پناہ محبتوں و شفقتوں کی برسات
کر کے ان کے دلوں کو اپنی مٹھی میں لے لیا ہے اس لیے
وہ ضرور ان کی پسند اور مرضی کا احترام کریں گے لیکن یہ
کچھ خاندان کی بزرگ عورتوں کے سمجھانے بھانے کا اثر
تھا اور کچھ ان بہن بھائیوں کا اپنا احساس و ادراک انہوں
نے مختلف حیلے بہانوں سے انہیں ٹالنا شروع کر دیا۔

ادھر ریحانہ کے سسرال والوں نے جو اپنے ہی
قریبی رشتے دار تھے پھوپھی سلیمہ کی سرگرمیوں سے آگاہ
ہوئے ہی جلد شادی کا تقاضا شروع کر دیا۔

پھوپھی سلیمہ نے یہ شادی رکوانے اور رشتہ تڑوانے کی
بھرپور کوشش کی لیکن ان کی دال نہ گل سکی اور ریحانہ کی
شادی اس کے منگیتر سے ہو گئی۔

اس شادی کا پھوپھی سلیمہ کو ایسا رنج اور صدمہ پہنچا کہ
انہوں نے لاہور آنا بند کر دیا اور احمر کی شادی اپنے ملنے
والوں کی بیٹی سے کر دی۔

پھر انہوں نے اپنی بیٹی عذرا کی شادی بھی اپنے
ایک بھتیجے ڈاکٹر احمد سے کر دی۔ شادی کے بعد عذرا اپنے
شوہر کے ساتھ مراکش چلی گئی۔

کچھ عرصے بعد پھوپھی امینہ کے بیٹے فیصل کی شادی
بھی اس کی منگیتر سے ہو گئی۔

پھوپھی سلیمہ اس موقع پر اپنے تمام خاندانوں کے
ساتھ لاہور آ کر اس شادی میں شریک ہوئیں اور بڑی
خوش دکھائی دیتی رہیں اور اپنی بہن کو خوب خوب یاد کرنی
پڑی۔ ان کا یہ بدلا ہوا روپ دیکھ کر لوگ حیران ہوتے
رہے۔

پھوپھی سلیمہ اب پہلے کی طرح لاہور آنے اور اپنے
بھانجے بھانجیوں اور دیگر رشتے داروں سے ملنے جلنے

تھیں۔ ان دونوں بہنوں کا کئی سالوں سے ایک
دوسرے سے میل جول اور گھروں میں داخلہ بھی بند تھا۔
دونوں کے بچے بھی ایک دوسرے سے علیک سلیک کے
روا دار نہ تھے۔

پھوپھی امینہ اور ان کے شوہر سیٹھ ابراہیم طویل عرصے
سے شوگر کے مرض میں مبتلا تھے۔ ان کی شوگر اس حد تک
بڑھ چکی تھی کہ وہ زیادہ تر بستر پر ہی پڑے رہتے تھے۔
آئے دن اسپتال میں داخلہ گویا ان کا معمول بن چکا تھا
پھر ایک دن پھوپھی امینہ کا شوگر لیول بہت بڑھ جانے کے
سبب وہ کوما میں چلی گئیں۔

انہیں اسپتال لے جایا گیا لیکن وہاں پہنچتے پہنچتے ان
کا انتقال ہو گیا۔ ان کے انتقال پر پھوپھی سلیمہ اپنی تمام تر
نفرتیں حسد و جلاپا بھول بھال کر بھاک بھاگ لاہور
پہنچیں اور اپنے بھانجے بھانجیوں کو گلے لگا لگا کر ایسا
روئیں چلائیں کہ دیکھنے والے بھی آنسو بہائے بغیر نہ رہ
سکے۔ بہن کی اولاد کی محبت اور مہردی میں انہوں نے
کتنے ہی دنوں تک ان کے گھر ڈیرے ڈالے رکھے اور
ان کی ایسی ایسی خدمتیں کیں اور ایسی ایسی محبتیں اور
شفقتیں ان پر نچھاور کیں کہ وہ اپنے سب پرانے زخم بھی
بھول گئے۔ پھوپھی سلیمہ کو اپنی بچی مہر و اور غم گسار سمجھتے
ہوئے ہر دم ان کا کلمہ پڑھتے دکھائی دینے لگے۔

خاندان کے لوگ جو پھوپھی سلیمہ کی اس غیر متوقع اور
اچانک قلابازی کو مشکوک نظروں سے دیکھ رہے تھے
پھوپھی سلیمہ اور ان کی اولاد کو اشاروں میں ان کی طرف
سے محتاط رہنے کی تلقین کرتے لیکن ان سب کی آنکھوں پر
پٹی اور عقل پر پردے پڑ چکے تھے۔ وہ کسی کی نہ سنتے۔
پھوپھی سلیمہ نے گویا ان پر جادو کی چھڑی پھیر دی تھی۔

پھوپھی امینہ کے انتقال کو تین ماہ ہی گزرے تھے کہ
پھوپھی ابراہیم نے بھی سسر آخرت اختیار کیا۔ اس موقع پر
بھی پھوپھی سلیمہ نے ان کی اولاد کی بچی مہر و اور غم گسار
ہونے کا بھرپور کردار ادا کیا اور سب کے دلوں کو اپنی مٹھی
میں لے لیا۔

اس کے بعد انہوں نے جو کچھ کیا اس سے ان کے
پوشیدہ عزائم اور مقاصد مکمل کر سب کے سامنے آ گئے۔
ان کی ریاکارانہ محبت و منافقت کا پردہ چاک ہو گیا۔
پھوپھی امینہ کی اولاد کی بھی آنکھیں کھلیں۔ پھوپھی

پھوپھی سلیمہ ہمارے والد کی سوتیلی پھوپھی کی بیٹی
تھیں۔ اس ناتے سے وہ ہماری پھوپھی ہوتی تھیں۔ ہر
چند کہ ان کی جوانی ڈھل چکی تھی لیکن وہ اپنی سرخ و سفید
رنگت و گلش نقوش و نگار چمک دار براؤن بالوں و راز
قامت پر وقار انداز و اطوار کی وجہ سے خاندان بھر کی ہم عمر
خواتین میں سب سے نمایاں و ممتاز دکھائی دیتی تھیں۔

ان کے شوہر پھوپھی ناصر جو کشمیری تھے وہ بھی بے حد
وجہہ و حسین مرد تھے اسی لیے بچوں نے بھی ماں باپ کی
خوبصورتی ورثے میں پائی تھی۔ ان کے چاروں بیٹے اور
دونوں بیٹیاں بھی حسین و جمیل تھیں۔ بیٹوں میں احمر بھائی
اور بیٹوں میں عرفانہ کچھ زیادہ حسین تھی۔ احمر بھائی تو
بالکل انگریز معلوم ہوتے تھے اور عرفانہ اپنے حسن و جمال
کے ساتھ اپنی حسین و دلکش مسکراہٹ کی بدولت خاندان
بھر میں مولائز مشہور تھی۔

پھوپھی ناصر ایک کامیاب بزنس مین تھے اس لیے ان
کے گھر خاصی خوش حالی تھی۔ یہ لوگ گوجرانوالہ میں رہا
کرتے تھے جہاں ایک مضافاتی کالونی میں ان کی وسیع و
عریض کوٹھی تھی۔ پھوپھی سلیمہ کے بچوں میں دو بڑے بیٹے
عامم اور احمر شادی شدہ تھے باقی سب زیر تعلیم تھے۔
پھوپھی سلیمہ کی ایک بڑی بہن پھوپھی امینہ بھی تھیں جو
بے حد امیر کبیر خاندان میں بیابانی گئی تھیں۔ ان کے شوہر
سیٹھ ابراہیم بہت وسیع و عریض جائیداد اور مال و دولت
کے مالک تھے۔ ان کے دو بیٹے اور تین بیٹیاں تھیں جن
میں دو بیٹیاں اور ایک بیٹا شادی شدہ تھا۔

یہ لوگ لاہور کے پوش علاقے گلبرگ میں رہا
کرتے تھے۔ پھوپھی سلیمہ کے برعکس پھوپھی امینہ برائے
نام خوبصورت تھیں۔ اسی طرح ان کے شوہر سیٹھ ابراہیم
بھی سانولے رنگ کے معمولی شکل و صورت کے مالک
تھے۔ شاید یہ ہی وجہ تھی کہ ان کی اولاد میں بھی کوئی خاص
خوبصورت نہیں تھیں۔

پھوپھی امینہ اور پھوپھی سلیمہ دونوں بہنوں کے
تعلقات ہمیشہ سے سرد مہری کا شکار تھے۔ حقیقی بہنیں
ہونے کے باوجود ان کے درمیان محبت و اتفاق نام کی
کوئی چیز نہیں تھی اور اس کی سب سے بڑی وجہ پھوپھی
سلیمہ کا اپنی بہن سے شدید حسد اور رقابت تھی جس کا
مظاہرہ وہ بھری محفلوں میں کرنے سے بھی نہ ہچکچاتی

محرم کون؟

مریم شاہ بخاری

بہن کی آپریشن ہو جائے تو ماں چلتی
پھرتی لاش میں تبدیل ہو جاتی ہے
وہ بھی ایک ایسی ہی چلتی پھرتی لاش بن گئی تھی

سندھ سے دوسری مختصر کہانی



کوئی جلدی نہیں

ایک صاحب کو بے تحاشہ پیتے دیکھ کر ان
کے ایک دوست نے انہیں سمجھایا۔ ”یہ جو تم پی
رہے ہو سست اثر زہر ہے۔“
ان صاحب نے جواب دیا۔ ”ٹھیک ہے
مجھے بھی کوئی جلدی نہیں ہے۔“

ان کی اس حالت کو سال بھر بھی نہ گزرا تھا کہ ایک
اور ایسا ایسا رونما ہوا جس نے ان سے زندگی چھین لی اور
انہیں آغوشِ لحد میں جا اتارا۔

ان کی بڑی بیٹی عذرا جو شادی کے بعد اپنے شوہر
کے ساتھ مراکش چلی گئی تھی، کئی سال وہاں رہنے کے
بعد جب وطن لوٹی تو کراچی جا کر آباد ہوئی۔ اس کے تین
بیٹے تھے بڑا بیٹا کراچی یونیورسٹی میں داخل تھا جبکہ باقی دو
کانج میں پڑھ رہے تھے۔

اُس زمانے میں بھی کراچی میں آئے دن کے
فسادات اور ہنگامہ آرائیاں روزانہ کا معمول تھیں۔ ایک
دن یونیورسٹی میں طلباء کے دو گروہوں کے درمیان تصادم
ہوا تو عذرا کا بیٹا بھی اس کی زد میں آ گیا۔ مخالف گروہ
کے غنڈوں نے اسے گولیوں سے چھلنی کر دیا۔ نواسے کی
یہ المناک موت پھوپھی سلیمہ کی ہنگامہ خیز زندگی کے تابوت
کی آخری کیل ثابت ہوئی۔

پھوپھا نصیر اب تک حیات ہیں۔ انہیں آج تک اس
بات پر شدید حیرت ہوتی ہے کہ پھوپھی سلیمہ نے تو صرف
احمر کی شادی اپنی بہن کے گھر کرنے کے لیے اس کی بیوی
کو طلاق دلوائی تھی اس ایک گناہ کی انہیں اللہ تعالیٰ کی
طرف سے اتنی لمبی چوڑی سزا کیوں ملی؟

سننے والے کانوں کو ہاتھ لگانے اور استغفار پڑھنے
کے سوا کچھ نہیں کرتے۔ بے شک اللہ کی لامنی بے آواز
ہے۔ ان کی طلاق یافتہ بہو نفیسہ کی آہوں نے عرشِ الہی کو
بلا دیا ہوگا جس پر اللہ کے قہر و غضب کے کوڑے یوں
تسلل کے ساتھ پھوپھی سلیمہ پر برسے ہوں گے اسی لیے
کہتے ہیں کہ مظلوم کی آہ سے بچو کہ اُس کے لیے اللہ تک
بچنے میں کوئی رکاوٹ مانع نہیں ہوتی۔

☆☆☆

میں ناکام رہنے کے بعد پھوپھی سلیمہ نے احمر کی شادی
جس لڑکی سے کی تھی وہ بے حد چالاک اور مکار ثابت
ہوئی۔ اس نے احمر کو تھوڑے ہی عرصے میں اپنا غلام بنا
لیا۔ اس کے کہنے پر احمر نے اپنے ماں باپ کا گھر چھوڑ کر
ان سے الگ رہنا شروع کر دیا بلکہ ان سے ناتا ہی توڑ
لیا۔

پھر ایک دن وہ اور اس کی بیوی دونوں ہمیشہ کے
لیے ملک چھوڑ کر امریکا جا بے جس کے بعد ان کی کوئی خبر
گھر والوں کو نہ مل سکی۔

پھوپھی سلیمہ کی سب سے چھوٹی اور لاڈلی عرفانہ کو
شادی کے بعد اپنے سرال میں ایک دن بھی سکھ کا
سانس لینا نصیب نہ ہو سکا۔ اس کی ساس بے حد شکی
مزاج اور غصے والی عورت تھی۔ نندیں بھی ماں کا پر تو تھیں
جو عرفانہ کے حسن و جمال کے سبب اس سے بے حد جلتی
اور حسد کرتی تھیں۔

یہ سب عورتیں اس کے خاوند کو بھی ہر دم اس کے
خلاف بھڑکانے اُکسانے میں لگی رہتی تھیں جس کی وجہ
سے گھر میں ہر دم ہنگامے پر پارہے تھے۔

آئے دن عرفانہ کا روتے دھوتے میکے چلے آنا گویا
معمول کی بات بن چکی تھی۔ اس کے سرال والے اسے
تھے کہ مصالحت اور افہام و تفہیم کی کوئی کوشش ان پر کارگر
ثابت نہ ہوتی تھی۔

کچھ عرصے تو یہی معمول رہا پھر ایک دن عرفانہ
طلاق کا بد نما داغ ماتھے پر سجائے اپنے میکے آ گئی۔
ایسی خوب صورت، نیک سیرت، بے پناہ لاڈلی پیاری
بیٹی کے اس الیے نے پھوپھی سلیمہ پر قیامت ہی ڈھا
دی۔

مزید ستم یہ ہوا کہ ان کے سب سے چھوٹے صاحب
زادے یوسف ایک دن اچانک ہی دل کا دورہ پڑنے
سے انتقال کر گئے اور اپنے پیچھے بیوہ اور تین چھوٹے
چھوٹے بچے چھوڑ گئے۔ پھوپھی سلیمہ پے در پے یہ دوا لیے
نہ سہہ سکیں اور بستر سے جا لگیں۔ اسی حالت میں ان پر
فالج کا حملہ ہوا اور ان کا دایاں پہلو بالکل شل ہو گیا
چہرے کا آدھا حصہ بھی فالج سے متاثر ہو کر ان کی گویائی
بھی ختم ہو گئی لیکن شاید ابھی اللہ کی سزا پوری نہیں ہوئی
تھی۔

غزل

سوچتے ہیں تو کر گزرتے ہیں
ہم تو منجدھار میں اترتے ہیں

موت سے کھیتے ہیں ہم لیکن
غیر کی بندگی سے ڈرتے ہیں

جان اپنی تو ہے ہمیں بھی عزیز
پھر بھی شعلوں پہ رقص کرتے ہیں

دل فگاروں سے پوچھ کر دیکھو
کتنی صدیوں میں گھاؤ بھرتے ہیں

جن کو ہے اندمال زخم عزیز
آمد فصل گل سے ڈرتے ہیں

مُحِب کے روتے ہیں سب کی نظروں سے
جو گلہ ہے وہ خود سے کرتے ہیں

پروین فنا سید

میں کی تو میں ایک جھلکے سے ان سے الگ ہوئی۔
”ابا! یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟“ میں بہت خوفزدہ تھی۔
”کچھ نہیں میری جان! پیار کر رہا ہوں۔“ اُن کی
آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔

”ابا! میں آپ کی بیٹی ہوں ہوش کریں۔“ میرا لہجہ
خفت تھا۔ ابا کا یہ روپ میرے لیے بہت اٹوکھا اور عجیب
تھا۔ وہ کتنی ہی دیر میرے سامنے اپنی بے باک نظروں
سے میرے جسم کو ٹٹولتے رہے۔ پھر اٹھ کر باہر چلے گئے۔
ان کے جاتے ہی میں پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ میں
نے تو ابا کو بہت اونچا اور بلند مقام دے رکھا تھا۔ وہ یوں اس
مقام سے گر جائیں گے تو میں نے سوچا ہی نہ تھا۔ میں جس
اذیت اور تکلیف سے دوچار تھی کوئی نہیں جان سکتا تھا۔

اپنے باپ کو میں نے شیطان کے روپ میں دیکھا تھا
اُس باپ کو جس کی ناراضگی کو خدا نے اپنی ناراضگی کہا جسے
جنت کا دروازہ کہا گیا۔ میں نے وہ ساری رات روتے بلکتے
گزار دی جس کے نتیجے میں مجھے صبح تک شدید بخار نے آلیا۔
اماں پریشان ہو گئی۔ ابا کا رویہ بالکل نارمل تھا جسے
رات کچھ ہوا ہی نہ ہو جبکہ مجھے اس واقعے نے بالکل توڑ کر
رکھ دیا تھا۔ مجھے جب لگ گئی تھی۔ اماں کو بتانے کا مجھ میں
توسلہ ہی نہ تھا وہ تو اپنے شوہر کو فرشتہ سمجھتی تھیں پھر بھلا میں
کبے اُن کا مان اور اعتماد توڑ ڈالتی۔ کاش یہ سب ہونے
سے پہلے مجھے موت آ جاتی۔

☆.....☆.....☆
چند دن بالکل خیریت سے گزر گئے۔ ابا میرا خیال پہلے سے
لبادہ کئے لگے۔ میرا دل دم ہو گیا۔ شاید بلند ہر گئے ہیں۔
ایک روز اچانک اماں کو اپنے میکے جانا پڑا اماں کو
ایک میڈیٹ ہو گیا تھا۔ اماں بے چاری تو بوکھلا سی گئی تھیں۔
انہوں نے جلدی سے کپڑے شاہر میں ڈالے اور جانے
کے لیے تیار ہو گئیں اور ساتھ دونوں بھائیوں کو لے لیا۔
لیکن اب انہیں ابا کی فکر تھی وہ اکیلے رہ جائیں گے اس
لیجئے انہوں نے مجھے گھر رکھنے کا کہا۔

”تم گھر ہی رہو۔ تمہارے ابا کے کھانے کا مسئلہ بن
جائے گا۔ ایک رات ہی کی تو بات ہے صبح ہوتے ہی
لوٹ آؤں گی۔ تمہیں ڈر تو نہیں لگے گا۔“ انہوں نے
میرا ہاتھ دیکھا۔

”نہیں اماں! آپ جائیں۔ میری فکر مت کریں۔ ابا

یونہی دن پر لگا کر اڑتے چلے گئے میں نے بھی ان کی
حدیں پھلانگ کر نو جوانی میں قدم ہی کیا رکھا، اماں کی
جیسے جان پر بن آئی ایسے مت کر دویسے مت کر دویسے
ٹھک سے اڑھو سینے پر پھیلا کر رکھو۔ اماں کی روک ٹوک
بالکل بج گئی۔ میں جان بوجھ کر ابا سے بطور لڑا اماں کی
شکایتیں لگاتی جس پر ابا اماں کی خوب خبر لیتے۔
”کتنی بار کہا ہے نیک بخت میری بیٹی کو کچھ مت کہ
کرو۔“ اماں مجھے گھور کر خاموش ہو جاتی اور میں ہنسنے
ہوئے ابا سے لپٹ جاتی۔ ”میرے ابا مجھ سے بہت پیار
کرتے ہیں۔ کیوں اماں؟“ ابا کی گود میں سر رکھ کر
شرارت سے اماں کو پوچھتی۔

”مجھے نہیں پتا بھڑ میں جاؤ تم باپ بیٹی۔“ اماں
جلے ہوئے انداز میں کہتی اور روٹی پکانے اٹھ جاتی..... میں
اور ابا کتنی ہی دیر اماں کے انداز پر ہنسنے رہتے۔
کاش کہ سب ایسا ہی رہتا۔ پر جو مقدر میں سیاهی لکھی
ہو وہ تو ہو کر رہتی ہے۔

☆.....☆.....☆
وہ میرے بخت کی تاریک سیاہ رات تھی جب اُس رات
مجھے دیر تک جاگنا پڑا اور اصل اگلی صبح میرا اسکول کا ٹیٹ تھا
جس کی تیاری کرنی تھی۔ میں تو بتانا بھول ہی گئی کہ میں نویں
جماعت میں آ گئی تھی۔ اس رات اماں اور بھائی تو جلدی
سو گئے جبکہ میں کتابیں لے کر اپنے کمرے میں آ گئی۔ ابا
ابھی گھر نہیں آئے تھے رات تقریباً بارہ بجے کے قریب ابا گھر
آئے اور سیدھا میرے کمرے میں چلے آئے۔

”کیا ہو رہا ہے بھئی؟“
”ارے ابا! آپ۔“ میں جو سب بھول کر کتابوں
میں گم تھی چونک کر سیدھی ہو بیٹھی اور جلدی سے پاس پڑا
دوپٹا اٹھا کر سینے پر پھیلا دیا جبکہ ابا مسکراتے ہوئے
میرے قریب آ کر بیٹھ گئے۔

”پڑھائی ہو رہی ہے۔“ انہوں نے ایک کتاب اٹھا کر کھولی۔
”جی ابا!.....! صبح میرا اہم ٹیٹ ہے ناں۔“ میں
نے بھی مسکرا کر جواب دیا۔ پتا نہیں ابا کو کیا ہوا انہوں نے
کتابیں سامنے سے اٹھا لیں سائیڈ پر رکھ دیں..... اور
آگے ہو کر میری کمر کے گرد بازو حائل کر کے مجھے ساتھ لے
لیا۔ پہلے تو میری سمجھ میں ہی نہیں آیا مگر جب ان کے ہاتھ
کے لمس میں باپ کی شفقت کی جگہ ہوس کی پرچھائیں

ہمارے ارد گرد بے شمار ایسے انسانیت سوز واقعات
رو نما ہو رہے ہیں جنہیں جان کر اور سن کر سر شرم سے
تھک جاتے ہیں۔ کچھ ایسا ہی واقعہ جو میں آپ کی
بصارتوں کی نذر کرنے جا رہی ہوں اسے تحریر کرتے
ہوئے میرے ہاتھ اور دل دونوں لرز رہے ہیں۔
آنکھیں آنسو ضبط کرنے کی کوشش میں لہو رنگ ہیں.....
آنکھوں میں اُس معصوم کلی کا چہرہ ہے جو ظلم و زیادتی کا
شکار ہوئی اور انسانیت کے نام پر طمانچہ بن جانے والے
اُس شخص کا بھی خاکہ ہے جس نے اپنی جبلی و حیوانی نفس
کی خواہش کی تکمیل کی خاطر خود ہی اپنی عزت و غیرت کو
پامال کر ڈالا اور ساری عمر کی لعنت اپنے نام کر لی.....
ایسی کا لک اپنے اور انسانیت کے منہ پر ل ڈالی ہے جسے
سات سمندروں کا شفاف پانی بھی نہ دھو سکے گا۔

میرے کانوں میں اُس بے بس و مجبور ماں کی آہیں
اور سسکیاں بھی گونج رہی ہیں جو اپنی بیٹی کی آبرو باختہ
لاش پر بیٹھی ماتم کناں ہوئی۔ ہاں اگر بیٹی کی آبرو چلی
جائے تو وہ پھر لاش ہی بن جاتی ہے۔ زندہ لاش.....

آئیے اُس بیٹی کی کہانی خود اسی کی زبانی سنئے.....
تیرہ چودہ برس کی اس بیٹی کی کہانی جس کے گھر کو آگ لگی
اپنے ہی چراغ سے.....

میرا نام بخت حوا ہے دیگر لڑکیوں کی طرح مجھے بھی
اپنے ابا سے بہت محبت اور لگاؤ تھا۔ میرے ابا مجھے بہت
پیار کرتے تھے اماں ہم باپ بیٹی کی محبت دیکھ کر مسکراتی
رہتیں ابا میری ہر فرمائش پوری کرنے کو ہمہ وقت تیار
رہتے جبکہ اماں اکثر جھلا جائیں اور ابا سے لڑتی کہ اسے
زیادہ پیار مت کرو۔ بگڑ جائے گی پر ابا بڑے پیارا اور مان
کے ساتھ مجھے اپنے ساتھ لپٹا لیتے۔

”نہیں نیک بخت! یہ بالکل بھی نہیں بگڑے گی۔
میری بیٹی ہے..... کیوں بیٹی؟“ آخر میں وہ میرا ہاتھ چوم
کر تصدیق چاہتے تو میں فٹانٹ سر ہلا دیتی۔

ابا کی محبت اور توجہ یا کمر میں کل ہی تو اٹھتی تھی۔
میری ہم جولیاں مجھے رشتہ کی نظر سے دیکھتی تھیں۔

”دیکھو دیکھو اس کے ابا اس سے کتنا پیار کرتے ہیں۔“
میں اپنی ہم جولیوں کی بات سن کر اور بھی خوشی سے
پھول جاتی۔ میرے بعد میرے دو بھائی اور آگے لیکن
میری اہمیت پھر بھی وہی رہی۔

آجائیں گے۔“ میں نے اماں کو تسلی دی تو وہ سر ہلاتی چلی گئیں۔
ابا اُس روز ساتھ والے گاؤں گیا تھا۔ مجھے ڈر تو بہت
لگ رہا تھا پھر توڑی تسلی بھی تھی کہ ابا ٹھیک ہو گئے ہیں۔
شام کو ابا گھر آ گئے مجھے اکیلا دیکھ کر حیران ہوئے۔
”ماں کہاں ہے تمہاری؟“ ان کا عام سا لہجہ تھا۔
”وہ ابا.....! اماں تو خیر پور گئی ہے۔ ماموں کا
ایکسیڈنٹ ہو گیا ہے۔ کل تک آ جائے گی۔“ لمبے بھر کو ابا
کے چہرے پر فکر کے سائے ابھرے تھے۔
”اچھا ٹھیک ہے میں دکان پر جا رہا ہوں تو دروازہ
بند کر لے۔“

مجھے دیکھے بنا کہتے ہوئے وہ گھر سے نکل گئے تو میں
نے سکھ کا سانس لیا کہ واقعی ابا اب ویسے نہیں رہے ورنہ
میں نے ایک جھرجھری سی لی اور جلدی سے دروازہ بند کر
لیا۔ آدمی رات ہونے کو آئی تھی پر ابا کا کچھ پتا نہ تھا۔ اللہ
جائے ابا کہاں رہ گئے ہیں اتنا وقت ہو گیا ہے۔ میں نے
پریشانی سے پہلے دروازے پھر گھڑی کو دیکھا تھا، سبھی
دروازہ بجھا میں نے دروازہ کھولا تو سامنے ابا کھڑے تھے۔
ابا اندر داخل ہوئے تو میں نے ان سے کھانے کا پوچھا۔
”نہیں، بھوک نہیں..... تم نے کھا لیا؟“
”جی ہاں! کھا لیا۔“ میرا جواب سن کر وہ ستر پر نیم ہاڑ ہو گئے۔
”پانی پلاؤ۔“

”جی! ابھی لائی۔“ میں نے پانی کا گلاس بھر اور لا کر
ابا کو دے دیا جسے ابا نے ایک ہی سانس میں خالی کر دیا۔
”سو! ادھر میرا سر دباؤ۔“ ابا کے لہجے میں حکم تھا۔ میں
نے چپ چاپ سر جھکا دیا اور آگے بڑھ کر اُن کا سر
دبانے لگی، سبھی ابا نے میرا ہاتھ پکڑ لیا اور زور سے اپنی
طرف کھینچ لیا۔

”ادھر آ ذرا..... اتنا فاصلہ کیوں؟“ وہ ہوش میں
نہیں تھے۔ میں نے بہت کوشش کی کہ خود کو چھڑا سکوں مگر
ابا پر شیطان غالب آ چکا تھا۔ مجھے قابو کر لیا اور ساری
رات اپنی ہوس کی آگ بجھاتا رہا۔
میں نے بہت واسطے دیئے روئی، گڑ گڑائی لیکن اس
پر کچھ اثر نہ ہوا۔ میں موت موت پکارتی رہی لیکن جیسے
موت بھی مجھ سے روٹھ گئی تھی۔

صبح ہوتے ہی ابا باہر نکل گیا..... اور میں ساکت
بت بنی اپنی بربادی کا ماتم کر رہی تھی۔ آخر میری بربادی

کا ذمہ دار کون تھا؟ کسے ٹھہراتی ذمہ دار؟ میری آپس اور
چچیں اندر ہی دم توڑ گئیں۔ میرے لٹنے کا تماشا اس گھر کی
چار دیواری نے دیکھا تھا جسے ہمیشہ میں نے اپنے لیے
محفوظ پناہ گاہ سمجھا تھا۔ میرا جوڑ جوڑ دیکھ رہا تھا۔ میرے
دل و دماغ میں آگ لگی ہوئی تھی جانے کتنی ہی دیر مجھے
اس حالت میں پڑے گزر گئی تھی۔ کیا باپ ایسے ہوتے
ہیں؟ مکروہ اور گھناؤنے ذلت و پستی میں ڈوبے ہوئے؟
ہوس کے پجاری؟ میرے سارے وہ اندازے دھڑا دھڑ
قلم ثابت ہو رہے تھے جو میں نے باپ کے حوالے سے
تراشتے تھے باپ تو بیٹی کے لیے سائبان ہوتا ہے لیکن
میرے اپنے باپ نے میرے سر سے سائبان چھین لیا
مجھے ننگے سر دنیا والوں کے سامنے کر دیا۔ میرا تماشا بنادیا۔
ارے باپ تو عزتوں کے رکھوالے ہوتے ہیں میرا
باپ کیسا باپ تھا جس نے خود ہی اپنی عزت کو روند ڈالا تھا
جیتے جی ختم کر دیا۔ اسے کچھ خیال نہ آیا۔ انسان اشرف
المخلوقات بنایا گیا مگر آج وہ جانوروں سے بھی بدتر بن گیا۔
میری اس حالت نے میری ماں کا ذہنی توازن
خراب کر دیا..... وہ پاگل ہو گئی۔ میرے چھوٹے بھائی تا
سمجھتے تھے وہ ڈر گئے۔ یہ کیا ہوا؟

”سب ختم ہو گیا سب کچھ۔“ میں بھل بھل رو رہی تھی۔
میرا مجرم کہاں ہے؟ کچھ خبر نہیں وہ ایسا گیا کہ پلٹ
کر واپس نہیں آیا۔ ماں گلیوں میں ماری ماری پھرتی
ہے۔ میرے مجرم کو انصاف کے کٹہرے میں کھڑا کر کے
خود ہی سزا سنا دیتی ہے، کبھی ہنستی ہے، کبھی روتی ہے۔
اور میں بے حس بن گئی ہوں۔ لوگوں کے طعنے اور
باتیں روح تک گونجی کر دیتی ہیں لیکن میں نے چپ
سادھ لی ہے ہونٹوں پر خاموشی کا قفل لگا لیا ہے اور
آنکھوں میں چھپی ذلت کے وہ مناظر چھپانے کے لیے
انہیں جھکا لیا ہے، چہرے کو سپاٹ اور جامد کر لیا ہے، دل کو
مار ڈالا ہے، صرف اور صرف اپنے چھوٹے بھائیوں کے
مستقبل کے لیے اپنے ماں جانے کے لیے۔ آپ لوگ
میرے لیے دعا کریں کہ خدا مجھے اس آزمائش میں ثابت
قدم رکھے اور میری زحی روح کو قرار آ جائے۔ (آمین!)

آپ کی دعاؤں کی طلب گار
ایک نیت خوا (مظلوم)

حُرم کی کوکھ

شاء کنول اللہ دتہ

اُس نے اپنی عزت بچانے کے لیے ایک خون کرویا
تھا اس کے باوجود وہ عزت کی پامالی سے محفوظ نہ رہی

لودھراں سے تیسری مختصر کہانی



قارئین متوجہ ہوں

کیا آپ کو پرچہ نہیں ملتا؟

کچھ عرصے سے کئی شہروں سے یہ شکایات موصول ہو رہی ہیں کہ ذرا بھی تاخیر کی صورت میں قارئین کو پرچہ نہیں ملتا۔ ایجنٹ حضرات کی کارکردگی بہتر بنانے کے لیے قارئین سے ہماری التماس ہے کہ پرچہ نہ ملنے کی صورت میں ادارے کو خط لکھ کر یا فون کے ذریعے درج ذیل معلومات فراہم کریں۔

بکس اسٹال کا نام۔ جہاں پرچہ دستیاب نہیں۔ شہر اور علاقے کا نام۔ اگر ممکن ہو تو بک اسٹال کا سیل نمبر یا لینڈ لائن نمبر راجیڑے اور مزید معلومات کے لیے

محمد اقبال زمان

0300-2313256

پریس پبلی کیشنز "سچی کہانیاں" "دوشیزہ"

110- آدم آرکیڈ۔ شہید ملت روڈ/ بہادر شاہ ظفر روڈ کراچی۔

شادی کر بھی کیسے سکتی ہوں؟ ابھی مجھے بہت کچھ کرنا ہے۔ اس کی آواز سن کر ثمنینہ بیگم جو خواتین کو رخصت کر رہی تھیں، کمرے میں داخل ہوئیں اور کہنے لگیں۔ "ہم نے تمہاری مرضی نہیں پوچھی، تمہیں بتایا ہے۔ اس جمعے کو تمہارا نکاح ہے اگر تم سے۔" ثمنینہ بی بی غصے میں کچھ بڑبڑاتی ہوئی چلی گئیں۔

ثمنینہ نے ہر ممکن کوشش کی کہ یہ نکاح نہ ہو مگر کوئی نہیں مانا تو اس نے جمعرات کو گھر سے بھاگنے کی تیاری کر لی۔ اس نے امی کے دو نکلن جو انہوں نے اس کے اور عینی کے لیے بنا کر رکھے تھے، لیے کچھ پیسے بھیجی کی تجوری سے نکالے اور کرایہ گھری سی بنا کر رکھ لی۔

ثمنینہ بی بی نے سکھ کا سانس لیا کہ ثمنینہ مان گئی ہے ورنہ وہ اس کی ضد کی وجہ سے بہت پریشان تھیں مگر وہ نہیں جانتی تھیں کہ یہ خاموشی ایک طوفان کی آمد تھی جو ان کی عزت کو بل بھر میں ختم کر دے گی۔

وہ عزت جسے بنانے میں انسان ساری زندگی گزار دیتا ہے اور لڑکی کا ایک غلط قدم اسے ہمیشہ کے لیے ختم کر دیتا ہے بالکل اسی طرح اگر ہم کسی کی نظروں میں گر

سے خوب خوب نوازا تھا اور اسی لیے وہ خود کو کوئی وی کی اسکرین پر فلم میں چلتے پھرتے محسوس کرتی تھی۔ ثمنینہ کو ہیروئن بننے کا شوق ہی نہیں، جنون تھا۔ وہ فلموں میں کام کرنا چاہتی تھی۔ اس کے برعکس عینی گھرداری میں طاق تھی۔

جیسے ہی ثمنینہ کمرے میں داخل ہوئی، سامنے دو عورتیں بیٹھی تھیں۔ اس نے انہیں پہلے بھی گھر میں نہیں دیکھا تھا۔ وہ ان کے پاس بیٹھ گئی۔ وہ اس کی تعلیم کے بارے میں پوچھنے لگیں تو وہ انہیں گریجویشن کے بارے میں بتا کر اپنے کمرے میں چلی آئی جہاں عینی اس کے پیچھے دوڑی چلی آئی تھی۔

ثمنینہ نے پوچھا۔ "یہ کون ہیں اور یہاں کیا کر رہی ہیں؟" "تمہارا رشتہ طے ہو گیا ہے، یہ لڑکے کی امی اور بہن ہیں۔ یہ لو سنائی، منہ میٹھا کرو۔ اب میری بہن دہن بنے گی، گائے، شور مچائے، واؤ، کتنا مزہ آئے گا۔" عینی جوش میں بتاتی چلی گئی۔

ثمنینہ دھواں دھواں چہرے کے ساتھ پھٹ پڑی۔ "نہیں کروں گی میں یہ شادی، سمجھیں تم؟ تم جانتی ہو کہ میں

گلیوں میں گھومنے لگی تھی جہاں جگہ جگہ دروازے خوشیاں اور اپنوں کی جدائی کا درد تھا جس کے ایک ایک صفحے پر درد و جدائی رقم تھی۔

"ناگنی پتر، اٹھ جا، کب تک سوئے گی؟ چل دیکھ سورج سرائے چڑھ آیا ہے۔" ثمنینہ بی بی کوئی تیسری بار اسے اٹھانے آئی تو چارونا چاراسے اٹھنا پڑا۔ "کیا ہے اماں؟ تو سونے بھی نہیں دیتی۔" ثمنینہ جھنجھلا کر بولی۔

ثمنینہ بی بی حیرت سے شہادت کی انگلی تھوڑی پر رکھ کر بولی۔ "بس بی، تیرے لیے رات تھوڑی سی جو تو دن کو بھی سوتی ہے؟"

"اماں! اس کے لیے رات تھوڑی سی ہوگی۔ آخر کو ہیروئن بننے کے خواب جو دیکھتی ہے۔" ثمنینہ سے چھوٹی عنایا ہنستے ہوئے بولی۔

ثمنینہ بی بی، ثمنینہ سے بولی۔ "دیکھ پتر، جو چیز ہمارے نصیب میں نہیں ہوتی، ہمیں کبھی نہیں ملتی چاہے اسے پانے کے لیے ہم اپنی جان بھی دے دیں، پر جو چیز ہماری قسمت میں ہوتی ہے، ہمیں مل کر دیتی ہے۔"

"اماں! اب بس بھی کریں اور تو عینی میں منہ ہاتھ دھوتی ہوں، میرے لیے جلدی سے ناشتا لے آ۔" ثمنینہ ماں کو ٹوک کر بولی تو ثمنینہ بڑبڑاتی ہوئی باہر چلی گئی۔

ثمنینہ عینی سے بولی۔ "تم دیکھ لیتا، جب میں فلموں میں کام کروں گی، دنیا میں میرا نام ہوگا، مقام ہوگا، میرے فین میرے آگے پیچھے ہوں گے، تو کر چاکر گاڑی بینک بیلنس ہوگا، تب میں تمہیں بتاؤں گی کہ خواب بھی سچ ہوتے ہیں۔"

"ہاں، اگر ہم خواب اپنی اوقات میں رہ کر دیکھیں تو۔" عینی، ثمنینہ سے چھوٹی ضرور تھی مگر اس سے زیادہ سمجھدار تھی۔ عینی یہ کہہ کر چلی گئی اور تھوڑی دیر بعد ثمنینہ سر جھٹک کر ناشتا کرنے میں مصروف ہو گئی۔

ثمنینہ بیگم کے تین بچے تھے۔ بڑی ثمنینہ، چھوٹی عینی اور پھر نیل تھا۔ ثمنینہ بیگم کے شوہر اللہ بخش کا کچھ سال پہلے انتقال ہو گیا تھا۔ نیل ایک دکان پر سبز مین تھا اور شام کو بچوں کو ٹیوشن پڑھاتا تھا جبکہ ثمنینہ لوگوں کے کپڑے سیا کرتی تھی۔ ثمنینہ کو خدا نے غربت کے ساتھ ساتھ حسن کی دولت

"بولو، کیوں کیا تم نے ایسا، بدکردار عورت، جواب دو؟" انسپکٹر احسن اسے بالوں سے پکڑ کر جھٹکے دیتا ہوا بولا پھر اسے گرا کر اس پر لاتوں اور گھونسوں کی بارش کر دی۔ "خدا کے لیے مجھے مت مارو۔ تمہیں خدا کا واسطہ رسول کا واسطہ مجھے چھوڑ دو۔"

"چھوڑ دو، اتنی جلدی..... پہلے بتا، کیوں مارا تو نے ڈائریکٹر جاوید کو؟ بول بے شرم عورت، بولتی کیوں نہیں ہے؟" اس سے پہلے کہ وہ عورت کوئی جواب دیتی، وہ بے ہوش ہو گئی۔ انسپکٹر احسن اسے نفرت اور حقارت سے دیکھتا ہوا بولا۔ "لے جاؤ اس منحوس عورت کو....."

ایسے جیل میں ڈال دیا گیا۔ اس کی ہمت نہیں ہو رہی تھی کہ وہ اٹھ سکے۔ اسے ایسے محسوس ہو رہا تھا کہ کسی نے اسے گاڑی کے نیچے چل دیا ہو۔ پیاس سے اس کے گلے میں جیسے کانٹے چبھ رہے تھے، بھی وہ کراہتے ہوئے بولی تھی۔

"پا..... پا..... بی....."

وہ جو کب سے اسے رحم بھری نظروں سے دیکھ رہی تھی، جلدی سے اٹھ کر اسے پانی دینے لگی۔ "لو پانی پی لو۔" اس کے کہنے پر اس نے پانی پی لیا۔

پھر اسے اچانک جیسے کھوئے ہوئے اپنے یاد آنے لگے تو وہ اس عورت کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ وہ عورت ہمدردی سے اسے دیکھتے ہوئے بولی۔

"میرا نام صابرہ ہے اور تمہارا؟"

"نا..... نا....." ثمنینہ ہکلاتے ہوئے بولی۔

صابرہ نرمی سے بولی۔ "تم یہاں کیسے میرا مطلب ہے کہ....." صابرہ جھجک کر رک گئی۔

ثمنینہ بولی۔ "تم جان کر کیا کرو گی؟ میں عبرت کا نشان ہوں۔ میرے بچے عمر کے خوابوں نے مجھے یہاں تک پہنچا دیا ہے۔ اگر میں نے تمہیں بتا دیا تو تم بھی سب کی طرح مجھ سے نفرت کرو گی۔" یہ کہہ کر پھر سے اس کی آنکھوں سے آنسو برسنے لگے۔

"میں یہ نہیں کہتی کہ میں تم سے نفرت کروں گی مگر یہ ضرور کہوں گی کہ اپنا دکھ کسی سے شیئر کرنے سے دل کا بوجھ ہلکا ہو جاتا ہے۔ تم اپنی دوست سمجھ کر اپنا درد مجھے بتا سکتی ہو۔"

صابرہ کی بات سن کر ثمنینہ ایک دم سے اپنے ماضی کی

جائیں تو بھی اٹھ نہیں سکتے۔

اُس رات نامہ بھی اپنے گھر سے نکل آئی۔ وہاں سے وہ لاہور آگئی جہاں وہ ایک ہوٹل میں رہنے لگی۔ اس نے ایک پل کے لیے بھی اپنے امی ابو بہن، یعنی بھائی نبیل کے بارے میں نہیں سوچا۔ جب ہوٹل میں رہتے ہوئے دو سال ہو گئے اور کہیں بھی کوئی کام نہیں ملا تو وہ اپنے گھر واپس آگئی کیوں کہ ان دو سالوں نے اسے ایک پل کے لیے بھی چین سے نہ رہنے دیا تھا۔

جب وہ اپنے گھر پہنچی تو دروازہ کسی اور عورت نے کھولا۔ اس نے جھجک کر پوچھا۔ ”یہ گھر تو ثمنینہ بی بی کا تھا وہ کہاں ہیں؟“

”ارے وہی نا جس کی بیٹی بھاگ گئی تھی؟ بد بخت اگر پیدا ہوتے ہی مر جاتی تو اچھا تھا۔ تمہیں پتا ہے جب ثمنینہ کو پتا چلا کہ اس کی بیٹی گھر سے بھاگ گئی ہے تو اسے ہارٹ ایک ہوا اور وہ مر گئی۔ اس کے بیٹے نبیل نے خودکشی کر لی اور اس نے ساتھ میں بہن کو بھی مار دیا۔ ایک چھٹانک بھر کی لڑکی کی وجہ سے پورا خاندان اجڑ گیا اور تم کون ہو؟“

نامہ بہ مشکل بولی کہ میں ہی وہ بد بخت بیٹی ہوں۔ اس کے آنسو رکنے کا نام نہیں لے رہے تھے۔

اس عورت نے اس کے منہ پر تھوک دیا اور حقارت سے بولی۔ ”تو تم ہو نامہ نکل جاؤ یہاں سے۔ اپنے ماں بہن بھائی کو تو کھا گئی اب یہاں کیا کرنے آئی ہو؟ جاؤ اپنے اس یار کے پاس جس کے لیے تم نے گھر بار چھوڑا تھا۔ اس نے نفرت اور حقارت سے بولتے ہوئے دروازہ بند کر دیا۔

نامہ نے اس پل اپنے اس گھر کو دیکھا جہاں اس کا بچپن گزرا تھا جہاں اس نے ایک ایک قدم چلنا سیکھا تھا وہ پھر واپس لاہور آگئی۔

اماں سچ کہتی تھی کہ ایک لڑکی کی عزت ایک کانچ کے برتن کی طرح ہوتی ہے جو ایک بار ٹوٹ جائے تو کبھی نہیں جڑتی۔ پتا نہیں یہ لڑکیاں کیوں اپنے خوابوں کے لیے اپنے پیاروں کو چھوڑ دیتی ہیں؟

کیوں یہ لڑکیاں اپنے ماں باپ کا سر جھکا دیتی ہیں؟ کیا ان کے ماں باپ انہیں اس لیے پیدا کرتے ہیں کہ ہم بڑی ہو کر وہ اپنے خوابوں کے لیے ان کے خواب توڑ دیں؟ کیوں لڑکیاں اکثر اپنے ماں باپ کے

سر جھکانے کا سبب بنتی ہیں؟ کیوں؟ آخر کیوں؟

”تم یہاں کیسے آئی ہو؟“ صابرہ اس کے چہرے پر بولی تو نامہ کھوسی گئی۔ ”دو تین سال بعد مجھے بڑی مشکل سے ایک ڈائریکٹر کا پتا ملا۔ ڈائریکٹر جاوید۔ میں اس سے ملنے اس کے گھر گئی تو اس نے میری عزت سے کھیلنے کی کوشش کی اور اپنے آپ کو بچانے کی کوشش میں میرے ہاتھوں اس کا خون ہو گیا۔ کیوں؟ ہم لڑکیاں گھر سے بھاگ جاتی ہیں؟ ہمارے ایک قدم سے پورے کا پورا خاندان برباد ہو جاتا ہے۔ ماں نو ماہ تک اس لیے تو اذیت برداشت نہیں کرتیں کہ وہ جوان ہو کر ان کی عزت کو خاک میں ملا دیں؟“ نامہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی پھر یکدم بولی۔ ”میں نے ڈائریکٹر کو اس لیے مارا تھا کہ اس نے میری عزت لوٹنے کی کوشش کی تھی اور میں اسے مار کر بھی اپنی عزت نہ بچا سکی۔ ان پولیس والوں نے.....“ اس سے آگے اس سے کچھ بولا ہی نہیں گیا اور وہ صابرہ کی طرف دیکھتے ہوئے بولی۔

”تم نے کیا کیا تھا؟“

”میری بہن.....! ہم دونوں کی کہانی ایک جیسی ہے۔ میں نے اپنے شوہر کو قتل کیا ہے کیونکہ وہ شرابی اور جواری تھا۔ میں منع کرتی تھی تو مجھے مارتا تھا۔ ایک دن وہ آیا تو ساتھ میں ایک آدمی کو بھی لایا۔ میرے پوچھنے پر کہنے لگا کہ میں نے تمہیں جوئے میں ایک رات کے لیے ہار دیا ہے اب یہ ایک رات تمہارے ساتھ گزارنا چاہتا ہے ورنہ یہ مجھے نہیں چھوڑے گا۔ پلیز میری ہیلپ کرو۔“

اس کی اس بات پر میں نے غصے میں آ کر اسے بری طرح دھکا دیا تو وہ دیوار سے ٹکرا گیا وہ وہیں پر مر گیا جبکہ وہ آدمی بھاگ گیا اور میں..... اس دوزخ میں آگئی مگر میری بہن پھر بھی اپنی عزت نہ بچا سکی۔ جوئے سے بچی عزت اس بندگی میں لوٹ لی گئی۔“

اتنی دیر میں وارڈن کسی کی ملاقات کا کہنے آئی تھی اور نامہ اور صابرہ اپنی قسمت پر بیٹھی آنسو بہا رہی تھیں۔ یہ جیل کی چار دیواری بھی عجیب ہوتی ہے کہتے ہیں یہاں مجرم جرم کرنا بھول جاتے ہیں مگر جو جرم یہاں ہوتے ہیں ان جرائم کی سزا کس عدالت میں دی جاتی ہے؟

☆☆☆

رکھیل

نسیم سحر

جب محافظ ہیٹیروں کا روپ دھاریں تو گھر کی چار دیواری بھی غیر محفوظ ہو جاتی ہے حقوق نسواں کا پرچار کرنے والے نام نہاد لوگوں کو بے نقاب کرنے والی کہانی

کراچی سے چوتھی مختصر کہانی



عورتوں کے حقوق کا بہت شور مچایا جاتا ہے اور یہ شور وہ عورتیں مچاتی ہیں جن کو پہلے ہی سارے حقوق حاصل ہیں لیکن جن عورتوں کے نام پہ یہ سارا شور و غل اٹھایا جاتا ہے وہ تو بے چاری آج بھی پس رہی ہیں۔ چاہے وہ پڑھی لکھی ہوں یا ان پڑھ ان کا جرم پہلے بد نصیبی اور بعد میں غربت ہوتا ہے۔ کون یقین کر سکتا ہے کہ حوا کی بیٹی آج بھی ترقی یافتہ دور میں مردوں کے ہاتھ کا کھلونا بنی ہوئی ہے۔ پڑھ لکھ کے بھی وہ محض روٹی کپڑے کے نام پہ صرف جنس ہی تصور کی جاتی ہے۔

یہ کہانی ہے خالدہ کی جس کے گیارہ بہن بھائی ہیں۔ باپ کو کہ اچھی ملازمت کرتا ہے مگر بیوی بچوں کو گزارے لائق ہی خرچہ دیتا تھا اور باقی اپنی عیاشیوں پہ لٹا دیتا تھا۔ خالدہ سے بڑی چار بہنیں تھیں اور خالدہ کے بعد تین بہنیں اور آخر میں تین بھائی۔ بڑی بہنیں تو زیادہ نہ پڑھ سکیں۔ کسی نے میٹرک کیا اور کسی نے مڈل کر کے گھر سنبھال لیا اور سلائی وغیرہ کرنے لگیں۔

خالدہ نے جیسے تیسے کر کے انٹر کر لیا تھا پھر گھر کے حالات دیکھتے ہوئے اس نے گارمنٹ فیکٹری میں نوکری کر لی۔ تھوڑے دنوں میں ہی سیٹھ کی نیت خالدہ پہ خراب ہونے لگی اور اس نے خالدہ کو مراعات دینا شروع کر دیں۔ بھی اور ٹائم زیادہ دے دیتا، بھی خواجواہ ہی بولس پکڑا دیتا۔ خالدہ بے چاری سیدھی سادی تھی وہ اسے اپنی محنت کا معاوضہ بھی۔ جب سیٹھ کی دال نہیں گلی تو اس نے خالدہ کو دھمکانا شروع کر دیا۔ خالدہ بے چاری خوف زدہ ہو گئی اور بالآخر سیٹھ کے جھانے میں آ ہی گئی۔

اب سیٹھ اسے استعمال تو کر رہا تھا لیکن وہ خالدہ کو مالی فائدہ بھی پہنچا رہا تھا۔ خالدہ کو کہ لالچی نہیں تھی مگر اب اس کے بولس اور اور ٹائم سے گھر میں خوشحالی آنے لگی تھی اور اس کے بہن بھائیوں کے چہروں پہ آسودگی اور یوں وہ یہ کڑوا گھونٹ پینے لگی۔

اس کھیل کو پانچ سال گزر گئے۔ اس دوران خالدہ کی بڑی بہنوں کی شادی ہو گئی اور خالدہ نے خود پڑھائی کا سلسلہ شروع کر دیا کیونکہ اب اسے فیکٹری میں زیادہ کام نہیں کرنا پڑتا تھا۔ سیٹھ نے اسے سپروائزر بنا دیا تھا۔ خالدہ کو پڑھائی کا شوق تھا اب کیونکہ حالات اس کے

مطابق تھے لہذا اس نے دوبارہ پڑھائی کا سلسلہ شروع کر دیا۔ سیٹھ کو کوئی اعتراض نہیں تھا کیونکہ وہ اس کی خواہش پوری کر رہی تھی۔ خالدہ نے ایم اے کر لیا تھا۔ چپکے چپکے اس نے ایک دو جگہ نوکری کے لیے اپلائی بھی کر دیا۔

جب اسے ایک پرائیویٹ کالج سے آفر آئی تو اس نے فوراً قبول کر لی۔ اب خالدہ پر اعتماد ہو چکی تھی لہذا اس نے فیکٹری اور سیٹھ سے جان چھڑائی اور کالج میں پڑھانے لگی۔

دو سال کے اندر اس نے اپنی دو بہنیں اور بھائیوں سے اس سے چھوٹی تھیں اور رشتہ خالدہ کے لیے آیا تھا لیکن وہ اب شادی کرنا ہی نہیں چاہتی تھی اور اس کی ماں بھی شاید کماؤ بنی کو کھونا نہیں چاہتی تھی۔ خالدہ کو شادی میں کچھ محسوس تو ہوا تھا لیکن جب اس کی ماں نے رشتے سے انکار پر ذرا بھی اصرار نہیں کیا بلکہ فوراً اس کی چھوٹی بہن کے لیے ہاں کر دی۔ دوسری بہن کی بھی جلدی ہی شادی کر کے اب خالدہ کی ذمہ داریاں بہت کم ہو گئی تھیں کیونکہ اب صرف ایک چھوٹی بہن تھی جو اسکول میں پڑھانے لگی تھی اور بھائی بھی کافی سمجھ دار ہو گئے تھے۔ اس دوران خالدہ کا باپ نشے کی حالت میں ایک ایکسڈنٹ میں فوت ہو گیا۔ شوہر کے مرنے سے اس کی ماں کو کوئی خاص دکھ نہیں ہوا کیونکہ وہ زندہ تھا تو عذاب جاں ہی تھا۔ اب مرنے پر کم از کم جہنمی اذیت سے تو نجات ملی تھی۔ خالدہ کو اپنی ماں کے خیالات سے کافی دکھ ہوا مگر وہ چپ ہو گئی۔

کچھ دنوں سے وہ نوٹ کر رہی تھی کہ اس کے ساتھی پروفیسر انور اس میں دلچسپی لینے لگے ہیں۔ وہ اس سے کافی سینئر تھے بہت قابل سمجھے ہوئے اور کم گو۔ خالدہ ان کی قابلیت سے متاثر تھی مگر وہ چونکہ باپ اور سیٹھ کی صورت میں کئی مردوں کے بھیا یک روپ دیکھ چکی تھی اسی لیے وہ اب بے حد ریزرو رہتی تھی مگر اب پروفیسر انور اس سے فریج ہو کر بات کرنے لگے تھے۔ پہلے تو خالدہ بھی لیے دیے ہی رہتی تھی مگر جب کافی دنوں تک انہوں نے کوئی فضول بات نہ کی بلکہ بڑی سنجیدگی سے کرتے مہذبانہ انداز اس کے سبکیٹ کے حوالے سے

تاریخی اندازے

ابوالقاسم حماد اموی خلیفہ ولید کا ایک درباری تھا۔ وہ حبیب موصی خلیفہ ولید کو بہترین اشعار سنانے کی کوشش کرتا تھا مگر ولید کا شعری ذوق ناقص تھا اس لیے وہ حماد سے بہت درجے کے شعروں کی فرمائش کرتا تھا۔ حماد اس پر بہت کڑھتا تھا۔ اس سے حماد نے نتیجہ اخذ کیا کہ ولید کی حکومت رو بہ زوال ہے۔

جب خلیفہ مہدی کی خلافت کا دور آیا تو حماد نے محسوس کیا کہ مہدی کا شعری ذوق بہت اچھا ہے۔ خلیفہ مہدی اس سے ہمیشہ عمدہ اشعار کی فرمائش کرتا تھا۔ حماد نے اس سے اندازہ لگایا کہ مہدی کی حکومت رو بہ ترقی ہے اور اقبال مندی اس کی منتظر ہے۔ تاریخ شاہد ہے کہ اس کے دونوں اندازے درست ثابت ہوئے۔

اس کی مدد کرتے تو پھر خالدہ مطمئن ہو گئی۔ اب وہ ان کی کہنی انجوائے کرنے لگی تھی اور خود بھی ان سے کافی باتیں کرتی تھی۔

آہستہ آہستہ وہ ان سے متاثر ہوتی چلی گئی۔ پروفیسر صاحب کے بارے میں اس کو یہی پتا چلا تھا کہ ان کے دو بچے ہیں جو دادی کے پاس رہتے ہیں اور ان کی اپنی بیوی سے علیحدگی ہو چکی ہے۔ اب وہ انگیلے رہتے ہیں۔ اسٹاف کے لوگ بھی ان کی تعریف کرتے تھے۔ خیر جب خالدہ پوری طرح ان سے متاثر ہو گئی اور خود منتظر تھی کہ وہ کوئی بات کریں۔

پروفیسر صاحب کو بھی اندازہ ہو گیا تھا کہ لوہا گرم ہو چکا ہے لہذا انہوں نے خالدہ کو پروپوز کر دیا۔ خالدہ خود بھی یہی چاہتی تھی اس نے فوراً ہاں کر دی اور گھر میں بات کرنے کا وعدہ کر لیا۔ خالدہ کی ماں نے منع کر دیا کیونکہ وہ خالدہ کو جانے نہیں دینا چاہتی تھی اور بڑی بہنوں کا یہ اعتراض تھا کہ وہ عمر میں کافی بڑے اور شادی شدہ ہیں۔

خالدہ نے کسی کی نہ سنی اور پروفیسر صاحب سے نکاح کر کے گھر چھوڑ دیا۔ انہوں نے خالدہ کے لیے الگ فلیٹ لے لیا تھا۔ خالدہ کافی خوش تھی مگر اس کی یہ خوشی عارضی ثابت ہوئی کیونکہ پروفیسر صاحب بظاہر بہت مہذب تھے اندر سے اتنے ہی جنگلی ثابت ہوئے تھے۔ وہ ہمیشہ لحاظ سے خالدہ پہ بہت تشدد کرتے تھے۔ خالدہ روز و کر ہاتھ جوڑتی مگر ان پر کوئی اثر نہ ہوتا تھا۔ لگتا تھا رات کے وقت ان پر کوئی جنم آ جاتا ہے اور وہ پھر سے خوش اخلاق اور مہذب بن جاتے مگر وہ بھی باہر والوں کے لیے۔ اب خالدہ چونکہ بیوی بن

.....

خالدہ کے پاس اب کوئی راستہ نہ تھا۔ ماں نے اس سے قطع تعلقی کر لیا تھا لہذا اب وہ مجبور تھی اس لیے ان کا ہر ظلم خاموشی سے سہتی رہی۔ یہ کھیل تھوڑے عرصے چلا۔ اب پروفیسر صاحب رات کو غائب رہنے لگے۔ پوچھنے پر وہ آئیں بائیں شائیں کرنے لگے تھے مگر ایک دن انہوں نے انکشاف کر دیا کہ ان کی بیوی واپس آ گئی ہے اور وہ اسے بھی نہیں چھوڑ سکتے اس لیے اب وہ صرف دن میں آیا کریں گے۔ خالدہ بہت روٹی پٹی مگر بچی عمر کے آدمی کا رویہ اور مزاج بن چکا ہوتا ہے وہ خالدہ جیسی بھولی اور سادی لڑکیوں کو بے وقوف تو بنا سکتے ہیں مگر خود ان کے ہاتھوں بھی بے وقوف کم ہی بنتے ہیں۔

اب وہ اور بھی لا پرواہ ہو گئے تھے۔ فلیٹ وہ خالدہ کو دلا چکے تھے۔ خالدہ خود جاب کرتی تھی اس لیے انہوں نے خرچ سے بھی ہاتھ کھینچ لیا۔ پہلی بیوی سے ان کے دو بچے تھے۔ خالدہ کو انہوں نے اولاد بھی پیدا نہ کرنے دی تھی۔

اب صورت حال یہ ہے کہ خالدہ اکیلی رہتی ہے۔ پروفیسر صاحب اپنے بیوی بچوں میں مگن ہیں۔ بس بھی کبھار منہ کا ذائقہ بدلنے کو خالدہ کے پاس آ جاتے ہیں۔ بھلا ایسی عورت کو کیا کہتا ہے زمانہ رکھیل نا تو بس خالدہ بھی ایک رکھیل کی سی زندگی گزار رہی ہے۔ جانے کب تک.....

☆☆.....

بارشوں کے شہر میں

اختر شہاب

انڈونیشیا کی مہکتی شاموں اور چمکتی راتوں کا احوال
بارشوں میں چمکتی انڈونیشی حسیناؤں کا مآل

کراچی سے انڈونیشیا تک پھیلے ہوئے ایک رنگین و سنگین سفر کی رُوداد



ٹریفک جام کی وجہ سے گاڑی کو ایئر پورٹ کی حدود سے نکلنے میں آدھ گھنٹا لگا۔ جکار تہ کی حدود سے نکلنے میں ایک گھنٹا جبکہ باقی سفر میں ڈیڑھ گھنٹا لگا۔ یعنی سٹی کو پہنچنے میں ہمیں تین گھنٹے سے زائد لگے۔ جکار تہ سے 'سٹی گو' جاتے ہوئے بوگور دائیں طرف رہ جاتا ہے اور اگر ٹریفک جام نہ ہو تو جکار تہ سے بوگور کا سفر ایک گھنٹے کا ہے۔

بوگور قدرتی خوبصورتی کے حوالے سے مشہور ہے جہاں سے آپ پہاڑی سے نیچے دور تک سرسبز وادی کا نظارہ کر سکتے ہیں۔ یہاں دنیا کا سب سے قدیم اور سب سے بڑا بوٹا نیگل گارڈن بھی ہے۔ بوگور کو بارشوں کا شہر بھی کہا جاتا ہے۔ یہاں اکثر ہر دوسرے تیسرے دن بارش ہوتی ہے۔ 'سٹی گو' چونکہ ضلع بوگور کا ہی حصہ ہے اس لیے یہاں بھی بارش کا تناسب وہی ہے اسی لیے میزبانوں نے ہمیں چھتری یا رین کوٹ لانے کو کہا تھا بلکہ جب ہمیں یہاں تحفے میں ایک بیگ دیا گیا تو اس کے نیچے موجود ایک جیب میں یہی ایک رین کور موجود تھا جو بارش کی صورت میں بیگ پر چڑھایا جاسکتا تھا۔

ہمارے 'سٹی گو' کے میں قیام کے دوران 10 دنوں میں چار پانچ مرتبہ بارش ہوئی۔ ہمیں بارش سے عشق ہے۔ بارش میں نہاتے ہوئے آکس کریم کھانے کا الگ ہی مزہ ہے اور چاہے گھر میں ہوں یا باہر ہم اس رسم کو نبھانے کی کوشش ضرور کرتے ہیں مگر افسوس جب بھی بارش ہوئی دن کے وقت ہوئی اور اس وقت ہم کلاس میں ہوتے سو بہانے سے اٹھتے کچھ دیر بارش کا نظارہ کرتے صرف اپنا ہاتھ ہی گیلا کرتے اور مجبوراً واپس کلاس میں آجاتے۔ ویسے بارش کی وجہ سے تمام علاقہ طرح طرح کے پھولوں پھولوں اور سبزے سے مالا مال ہے۔

جکار تہ کی حدود سے نکلنے تک تعارف کا ابتدائی مرحلہ طے ہو گیا تھا۔ ایڈنا اور اگین اپنے اپنے کاموں کے بارے میں بتا چکے تھے اور ہم اپنا تعارف بھی کرا چکے تھے۔ 'اے' راستے میں آنے والے ہمیں جکار تہ کے مختلف علاقوں اور مشہور عمارات کے بارے میں بتا رہا تھا۔ آہستہ آہستہ سفر کی مکان غالب آرہی تھی اور غنودگی کی طاری ہونے لگی تھی مگر میں نیا ملک نیا شہر دیکھنے کے شوق میں آنکھیں کھلی رکھے ہوئے تھا۔

جکار تہ بھی بڑے شہروں کی طرح عمارتوں کا جنگل ہے اور ٹریفک کی زیادتی کی وجہ سے اس میں سفر میں کافی وقت لگا مگر جو بھی ہم اس کی حدود سے باہر نکلے اور اس کے مضافات میں آئے تو ہر طرف سبزے کی بہتات مختلف انواع و اقسام کے درختوں پودوں پھولوں اور پھولوں نے ہمارا استقبال کیا۔ ہم باہر کے نظارے میں گم تھے کہ اچانک ایڈنا کا سر ہمیں اپنے شانے سے ٹکراتا محسوس ہوا۔ میں نے مڑ کے اس کی طرف دیکھا تو وہ سو رہی تھی۔ میں نے آہستگی سے اس کا سر پر سے کیا تو اس نے آنکھیں کھول دیں۔

"سوری مسٹر کھان.....!" وہ ہماری طرف دیکھ کر مسکرائی اور شرمندہ سی بولی۔ "میں فلائٹ پکڑنے کی وجہ سے رات کو سو نہیں سکی۔"

"کوئی بات نہیں....." میں نے کہا اور اگین کی طرف دیکھا۔ وہ بھی باہر کے نظاروں میں محو تھا۔ میں بھی دوبارہ باہر کی طرف متوجہ ہو گیا۔

کچھ دیر بعد ایڈنا کا سر دوبارہ میرے شانے سے آگیا۔ اس دفعہ میں نے اسے سونے دیا۔ وہ میرے شانے سے سرٹکائے بے خبر سوئی رہی۔

"مسٹر کھان.....!" اے نے مڑ کر ہمیں کچھ بتانا چاہا اور ایڈنا کو ہمارے کندھے پر سر رکھے سوتے دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ اس صورت حال کو دیکھ کر اس نے فوراً گردن موڑ لی اور آگے دیکھنے لگا۔

"چند لمحوں میں اتنی بے تکلفی نہیں ہو سکتی یقیناً یہ لوگ پہلے سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں گے۔" ہمارے خیال میں اس نے یہی سوچا ہوگا۔

گاڑی کو ہلکا سا بیک لگا تو ایڈنا کے سر نے جھٹکایا اور شانے سے ہٹ گیا۔ ہم نے اسے آہستگی سے تمام لیا۔ ہمارے ہاتھوں کے کس سے وہ اور پرسکون ہو گئی اور جب تک ڈرائیور نے ایک مسجد کے قریب جا کے گاڑی نہ روکی وہ بے خبر سوئی رہی۔

یہ تو ہم نے سنا تھا کہ نیند کانٹوں پر بھی آ جاتی ہے مگر آج تو ایک نیا محاورہ ایجاد کرنے کو دل چاہ رہا تھا کہ نیند تو غیر کے شانوں پر بھی آ جاتی ہے۔

گاڑی رکی تو ایڈنا جاگی۔ اس نے شرمندہ شرمندہ نظروں سے ہمیں دیکھا پھر نہ جانے کیا سوچ کے شرمائی

"سوری اگین مسٹر کھان.....!" ہم نے اسے کہا۔

"تو چند لمحوں کا معاملہ ہے۔ اس میں سوری کیسی بات کہو تو ہم زندگی بھر اس سر کا بوجھ برداشت کرنے کو تیار ہیں۔" جی چاہا کہ یہ الفاظ کہہ بھی دیں پر ہم خاموش رہے۔

ڈرائیور نماز کے لیے گھر چلا گیا۔ ہم لوگ بھی منہ ہاتھ دھو کے تازہ دم ہو گئے۔

"Let's move." اے آ کر بولا تو ہم سب دوبارہ گاڑی میں بیٹھ گئے۔ ہم نے سوچا تھا کہ اس دفعہ شاید بیٹھنے میں ترتیب بدل جائے مگر ایڈنا نے ترتیب بدلنا دوبارہ نہ کیا۔ گاڑی دوبارہ چل پڑی۔ اس دفعہ ایڈنا احتیاط سے پیچھے تھی اور جاننے کی کوشش کر رہی تھی۔

"یہ رستہ بوگور کو جاتا ہے۔" اے نے دائیں طرف اشارہ کرتے ہوئے بتایا۔ "شاپنگ کے لیے ہم آپ لوگوں کو یہاں ہی لائیں گے۔"

"کیا 'سٹی گو' میں شاپنگ ایریا نہیں ہے؟" "نہیں، وہاں تو چھوٹی چھوٹی گروسری شاپس ہیں۔"

سڑک کے دونوں طرف ہوٹل، ریسٹورنٹس یا فارم ہاؤس ٹائپ کے ہٹ وغیرہ بنے ہوئے تھے۔ اس سے اندازہ ہو رہا تھا کہ جکار تہ کے امراء اپنا ایک اینڈ مٹانے اسی علاقے میں آتے ہوں گے کیونکہ اب نہ صرف پڑھائی شروع ہو گئی تھی بلکہ جکار تہ کے جس اور گری سے بھی نجات مل گئی تھی۔

مین سڑک پر چلتے چلتے گاڑی آہستہ ہوئی اور دائیں طرف مڑنے کے لیے رگ گئی کیونکہ آگے سے ٹریفک آ رہا تھا۔ اتنے میں میں نے دیکھا کہ سڑک کے کنارے جہاں بیٹھنے کی جگہ بنی ہوئی تھی وہاں بیٹھے نوجوانوں میں سے دو نوجوان اٹھ کر آئے اور ٹریفک کنٹرول کرنے کے لیے ان میں سے ایک نے مین سڑک کی ٹریفک روک دی اور ہماری گاڑی کو اندر جانے کا اشارہ کیا۔

یہاں کے لوگ تو بڑے اچھے ہیں۔ ہم نے سوچا۔ ایئر پورٹ تو پاکستان میں بھی ہونا چاہیے جہاں اس قسم کی سہولت کسی مدد سے ٹریفک کے کتنے مسائل حل ہو سکتے ہیں اور اسی طرح اگر ہم ایک دوسرے کا خیال رکھ سکیں تو

معاشرہ کتنا بھلا ہو جائے۔

گاڑی نے ٹرن لیا اور مڑتے ہوئے جب وہ ٹریفک کنٹرول کرنے والے نوجوان کے پاس سے گزری تو ڈرائیور نے خاموشی سے اس کے ہاتھ میں ایک نوٹ تھما دیا۔

"اوہ!....." ہم اپنے پہلے خیال پر تادم ہوئے۔ یہ بچائے باہمی نہیں ہے بلکہ امداد باہمی ہے۔ ہم نے سوچا۔ آپ نے سہولت اور جلدی سے سڑک پر مڑنا ہے تو اس کا ٹیکس تو دینا پڑے گا۔ خیر یہ بھی ایک اچھی سہولت ہے۔ اس سے مسافروں کو سہولت ہو جاتی ہے اور ان نوجوانوں کی کچھ کمائی ہو جاتی ہے اور کمائی کی وجہ سے نوجوان جرائم میں نہیں پڑتے۔ اپنے دس دن کے انڈونیشیا کے قیام کے دوران امداد باہمی کا یہ طریقہ ہم نے انڈونیشیا میں جگہ جگہ دیکھا اور اسے مفید بھی پایا ورنہ اگر یہ نوجوان ہماری مدد کو نہ آتے تو شاید ہم کھٹوں ٹریفک میں پھنسے رہتے۔ چند پیسے دے کر اگر آپ کو سہولت مل جاتی ہے تو میرے خیال میں اس میں کوئی حرج بھی نہیں ہے۔

گاڑی اندر مڑ کے پہاڑی چڑھائیاں چڑھنے لگی۔ اس میں بار بار موڑ آتے تھے۔ ایڈنا کا سر ایک بار پھر ہمارے شانے پر لگا مگر اس پر وہ خود ہی سنبھل گئی۔

"میں نیند کی ذرا جی ہوں....." وہ ہماری طرف دیکھ کر شرماتے ہوئی بولی۔

"ہمیں اندازہ ہو گیا ہے۔" ہم بولے۔ "دیے ہمیں منع کس نے کیا ہے؟ سفر کے اختتام تک ہمارے شانے سے سرٹکا کے سوئی رہو۔ اتنا حسین اور نازک بوجھ اٹھانے سے ہم تھک تھوڑی جائیں گے چاہے زندگی بھر اٹھوا لو۔" بالآخر ہم سے رہا نہ گیا اور ہم نے دل کی بات کہہ دی۔

"What!" ہماری بات سن کر اس نے حیرت سے ہماری طرف دیکھا اور بولی۔ "Aren't you moving very fast?"

ہم نے جواب میں کچھ کہنا چاہا تھا کہ اگین کھنکارہ۔ ایڈنا اور ہم ایک دوسرے کو دیکھ کر خاموش ہو گئے۔ موڑ مڑتی چڑھائیاں چڑھتی گاڑی آخر منزل مقصود پر پہنچ گئی۔ ڈرائیور نے گاڑی ایک احاطے میں لا کر ہمیں ایک بلڈنگ کے سامنے لا اتارا۔ معلوم ہوا کہ یہ جگہ ہاسٹل ہے

اور یہاں ہی ہماری رہائش کا انتظام ہے۔ نیچے لابی میں ریسپشن تھا جہاں ششے کے ایک فریم میں ہمارے ناموں کے اندراج کے ساتھ ساتھ ہمارے کمرانمبر بھی لکھے ہوئے تھے۔

ہمارے کمرے کا نمبر 312 تھا۔ قاعدے سے ہمارا کمراتیسری منزل پر ہونا چاہیے تھا مگر یہ پہلی منزل پر تھا۔ ہمیں اس ترتیب پر تعجب ہوا مگر جب عمارت کا جائزہ لیا تو پتا چلا کہ چونکہ پہاڑی علاقہ ہے اس لیے ایک منزل نیچے بھی بنی ہوئی ہے۔ ان کے لحاظ سے یہ پہلی منزل ہوئی جس میں مقامی انڈونیشی شرکاء کے ٹھہرنے کا انتظام تھا۔ جو ہمارے حساب سے گراؤنڈ بناؤن کے حساب سے دوسری منزل ہے لہذا اس کے نمبر 200 سے شروع ہوئے۔ اس میں ہمارے اساتذہ اور VIP ٹھہرے ہوئے ہیں اور پہلی منزل جو ان کے حساب سے تیسری ہے اس میں مختلف ممالک سے آئے ہوئے شرکاء جن میں ہم بھی شامل تھے ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ایڈناکو ہمارے برابر کا کمراتیسری 313 نمبر کمرادیا گیا جبکہ اگلیں 301 میں ٹھہرے گا۔

یہ اچھی بات جو ہمیں نئی لگی وہ یہ تھی کہ ہر کمرے کو نمبر کے ساتھ ساتھ نام بھی دیا گیا تھا جیسے ہمارے کمرے کا نام "Gravitasi" یعنی "Gravity" (کشش ثقل) تھا۔ بعد میں ہم نے جو کچھ نام نوٹ کیے وہ یوں تھے۔

Geophysics	Geophysics	جغرافیہ طبیعیات	کمرانمبر 301	جیولوجس
Seismic	Seismik	زلزلہ کا پیمانہ	کمرانمبر 302	زلزلہ کا پیمانہ
Eruption	Gempa	ظہار پہلے کدے	کمرانمبر 307	آتش فشاں کا پیمانہ
Tsunami	Tsunami	تسونامی کا پیمانہ	کمرانمبر 308	سونامی
Disaster	Bencana	لاؤس کی منتہالی	کمرانمبر 309	آفت
Land	Tannah	ٹاننا کا پیمانہ	کمرانمبر 310	زمین
Volcanic	Vulkanik	ٹاننا کا پیمانہ	کمرانمبر 311	آتش فشاں
Tectonic	Tektonik	ٹاننا کا پیمانہ	کمرانمبر 313	زمینی بیڑوں کی حرکت

اشاف نے ہمارا سامان ہمارے کمرے تک پہنچا دیا۔ کمرے کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ کمرے میں دو عدد سنگل بیڈز ہیں۔ دو سنگل بیڈز کی موجودگی کا مطلب ہے کہ ہمیں کمرے

کسی سے شیئر کرنا پڑے گا۔ ہم نے سوچا۔ اس فنل خرجی کی کیا ضرورت تھی؟ ایک ڈبل بیڈ پر ہی کسی کے ساتھ شیئر کرادیے۔ پر جب ہم وہاں رہے تو ہم نے دیکھا کہ ہر کمرے میں دو سنگل بیڈز ہیں بلکہ بعض کمروں میں تو تین بھی ہیں۔ ہمارا انتظار انتظار ہی رہا اور چونکہ کمرے خاصی تعداد میں تھے لہذا شیئر کرنے کی نوبت نہیں آئی اور ہم اپنے کمرے کے بے تاج بادشاہ رہے۔ کمرے میں ٹی وی اور الماریوں کے علاوہ ایک میز کرسی بھی موجود تھی جس پر ایک ٹرے میں بجلی کی کیتلی کے ساتھ ساتھ چائے اور کافی بنانے کا سامان بھی موجود تھا ساتھ میں منرل واٹر کی دو بوتلیں بھی تھیں۔

یہ تو عیاشی ہوگی۔ ہم نے سوچا۔ اس وقت چائے کی شدید طلب ہو رہی تھی لہذا تھکان دور کرنے کے لیے ایک کپ چائے بنانے کو پانی کیتلی میں ڈالا اور سامان سے کپڑے نکالنے لگے تاکہ کپڑے بدل کر آرام سے لیٹیں مگر پھر کپڑے بدلنے کا ارادہ تبدیل کر دیا کہ اب ڈز کرنے کے بعد ہی کپڑے بدلیں گے۔

اصل میں ہوا یوں تھا کہ جب ہم نے کیتلی اٹھائی تو دیکھا ٹرے کے نیچے ایک ہدایت نامہ برائے استعمال کمرے بھی موجود تھا۔ اس کے چیدہ چیدہ نکات کے مطابق کمرے میں۔

سگریٹ پینا منع ہے۔ (وہ ہم چھوڑ چکے ہیں۔) نشہ آور اشیاء کے استعمال کی ممانعت ہے۔ (ہمیں شوق نہیں ہے۔)

جنس مخالف کے کمرے میں داخل ہونا یا اسے اپنے کمرے میں بلانا منع ہے۔ (یہ زیادتی ہے۔)

پھول پودے اور گھاس کی پتیاں تک توڑنا منع ہے۔ (پاکستانی عادات کے حوالے سے یہ مشکل کام ہے۔)

ناشتا صبح 8 تا 6 بجے دوپہر 12 تا 2 اور ڈنر شام 6 تا 8 بجے تک کر سکتے ہیں۔

ہدایت نامہ پڑھنے کے بعد ہم نے گھڑی دیکھی تو چھ بجنے والے تھے سو کپڑے تبدیل کرنے کا ارادہ ترک کر کے سوچا کہ ڈز کرنے کے بعد ہی کپڑے بدلیں گے اور سوئیں گے۔

کمرے سے نکل کر سیڑھیاں اتر کر لابی کی طرف جا رہے تھے کہ دیکھا سیڑھیوں کے برابر ایک کاؤنٹر ہے

جس میں صابن ٹوتھ برش کپڑے شیمپو خوشبو وغیرہ بچے ہیں۔ معلوم ہوا کہ اگر ہمیں کسی چیز کی ضرورت ہو تو ہم باہر جانے کے بجائے ان سے خرید سکتے ہیں۔ ہمیں یہاں سے ایک گیس صابن خریدنا پڑا کہ ہمیں جو ہیڈ اینڈ ٹولڈر شیمپو ملا تھا اس سے ہمیں الرجی ہونے لگی تھی اور نہانے کے بعد ہماری آنکھیں کبوتر کی طرح سرخ ہو جاتیں۔

لابی میں پہنچ کر طعام گاہ کا دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ وہ تھوڑی دور دوسری عمارت میں ہے۔ ہم نے سوچا۔ ابھی وقت ہے کیوں نا اس جگہ کا جائزہ لے لیں۔ اس جگہ کے جائزے سے علم ہوا کہ بنانے والوں نے کوشش کی ہے کہ اس میں تمام VIP سہولیات دے دی جائیں یعنی اس جگہ ہاسٹل کے نیچے سوئمنگ پول تھا جبکہ طعام گاہ کے اوپر مینی سینما ہال تھا۔ اس کے بائیں طرف ایجوکیشن اور ٹریننگ سینٹر تھا جو درجہ دیکھ کی تمام سہولتوں سے آراستہ تھا۔ ٹریننگ سینٹر کے اوپر آڈیٹوریم اور اس کے نیچے جنازہ گیم اور ان ڈور گیمز کی جگہ تھی۔ دائیں جانب تھوڑی سی دور ایک چھوٹی سی عمارت میں ڈاکٹر بھی موجود تھا جبکہ پارکوں طرف سے باؤنڈری وال میں گھرا ہوا سرسبز علاقہ تھا۔

ہاسٹل کے سامنے مختلف پھولوں پودوں اور درختوں سے سجایا ایک جاذب ٹریک بھی بنا ہوا تھا۔ آنے والے دلوں میں یار لوگوں نے ہمیں اس پر بھگانے کی بہت کوشش کی مگر جب ہم ہر دفعہ یہ کہتے۔ "اتنی مشکلوں سے تو کوئی مشرول بڑھایا ہے۔ اب ہم اسے کم نہیں کرنا چاہتے۔" تو اس بات پر ایک قہقہہ پڑتا اور ہم جاذب سے بچ جاتے۔ اس سرسبز میدان کی بھی روز صفائی ہوتی تھی۔ اگرچہ اس میں درختوں سے گرنے والے چند پتے ہی ہوتے مگر وہ بھی روز صاف کیے جاتے۔

طعام گاہ میں درمیان میں بونے کا انتظام تھا جبکہ دونوں طرف بیٹھ کر کھانے کے لیے کرسیاں اور میزیں لگی ہوئی تھیں جبکہ طعام گاہ کے دوسرے سرے پر ویٹر حضرات اور لڑکیاں مختلف چیزوں کی سلائی کے لیے کھڑی رہتیں۔ ہم نے طعام گاہ میں داخل ہو کر جب اندھا جائزہ لیا تو چند افراد کو پہلے سے موجود پایا۔

ہم جب ٹشو چھپے اور پلیٹ اٹھا کر ڈشوں کی طرف

بڑھے تو پہلی ڈش پر نظر ڈالتے ہی ہمارا جی دھک سے رہ گیا۔ آپ بھی سمجھ گئے ہوں گے ہمارے دل کے دھڑکنے کی وجہ۔ جی ہاں! اس میں وہی ابلونا ہمارا منہ چڑا رہا تھا۔ ہم نے پلیٹ میں کوئی ایک چمچہ ابلونا ڈالا۔ اس سے اگلی ڈش میں بیف کا سالن تھا۔ وہ ہم نے تھوڑا سا لیا کہ پہلے چکھ لیں۔ اس سے آگے سبزی کی ڈش تھی۔ بعد میں کچھ پکڑے ٹکٹس وغیرہ جیسی چیزیں اور چٹنیاں تھیں۔ ایک مرتبان میں چاول کے چھوٹے پاڑے ٹائپ پڑے تھے۔

کھانے کی ترتیب اگلے دس دنوں میں یونہی رہی یعنی پہلی ڈش میں ابلونا براجمان ہوتا۔ سوپ ہر روز مختلف چیزوں کا ہوتا۔ گوشت میں بیف، مٹن یا چکن ہوتا۔ سبزی مختلف طریقوں سے پکی ہوئی۔ مچھلی اور جھینگے بھی کھانے کو ملے مگر ہر کھانے کا ذائقہ کچھ کھٹا بیٹھا ہوتا اس لیے ہم پہلے ہر کھانا تھوڑا سا چکھتے اور پھر بعد میں اور لیتے۔ ایک مرتبہ بانس کی تیلیوں پر لگی ہوئی مصالے دار بوٹیاں دیکھیں تو جی خوش ہوا مگر جب کھائیں تو ذائقہ وہی کھٹا بیٹھا۔

چائے کے ساتھ جو لوازمات ہوتے ان میں مختلف پھل، ٹیک، میٹریاں وغیرہ شامل ہوتیں مگر ذائقہ کے حساب سے جب ہم نے ایک دو بار دھوکا کھایا تو یا تو ہم خود کھتے یا پھر کھارے یا مہنازے سے پوچھ کر کھاتے کیونکہ چاہے پھل ہو یا دوسری چیز ہر جگہ ذائقہ ہماری توقع کے برعکس ہی ہوتا تھا۔

شروع میں تو کسی نے نوٹ نہ کیا مگر بعد میں جب ہم پلیٹ میں تھوڑے سے چاول لے کر باقی چیزوں سے پیٹ پوجا کرنے کی کوشش کرتے تو لوگ مسکراتے اور کہتے۔ "چاول اور لے لیں۔"

"اتنے بھی زیادہ ہیں۔" ہم کہتے۔ "ہمیں کہیں سے چپانی یا روٹی لا دو۔ ہم تو اسے دیکھنے کو ہی ترس گئے ہیں۔"

"صحیح کہتے ہیں۔" ایک صاحب نے کہا۔ "میں دنیا کے جس حصے سے آیا ہوں وہاں آلوہی سب کچھ ہے جبکہ یہاں چاول ہی سب کچھ ہے۔"

"ہاں!" ناشتے میں البتہ ہمیں ڈبل روٹی مل جاتی اور ہم دو سلاٹس اور ایک انڈے سے گزارہ کر لیتے۔

ڈنر پر مختلف لوگوں سے تعارف ہوا جیسے بنگلہ دیشی خاتون مہناز خان۔ وہ اصل میں آدمی پاکستانی تھیں یعنی ان کی پیدائش کوئٹہ کی تھی اور شوہر ان کے پنڈی کے رہائشی پاکستانی تھے۔ جتنے دن بھی وہ یہاں رہیں انہوں نے پاکستانی لباس شلوار قمیض ہی زیب تن کیا۔ ایک دن بھی ساڑھی نہیں پہنی۔

انڈیا کے ڈاکٹر پرکاش کھارے پونا سے آئے تھے۔ ہماری طرح استاد تھے بلکہ بڑے استاد تھے۔ بھونان کا اگین حقیقی ادارے سے منسلک تھا۔ کچھ کچھ ٹریننگ دینا بھی اس کی ذمہ داری تھی۔ مٹی کا بچہ استاد تھا۔ اسے کھارے سے زیادہ مذہبی معلومات تھیں بلکہ بعد میں دونوں مل کر ہنومان چالیس بھی پڑھتے ہوئے پائے گئے۔ ڈنر کے بعد اگلے دن اور بھی لوگوں سے ملاقات ہوئی مگر ہمارا خیال ہے کہ سب کا تعارف یہاں ہی کرا دیں تاکہ بار بار ملک کا نام لکھنے سے بچ جائیں۔

استادوں میں ڈاکٹر پیٹرک پیرش کا تعلق امریکا سے تھا۔ ان کا اسٹائل کسی فلمی ہیرو جیسا تھا۔ ان کی گرج دار آواز نے تپتے قدم اور بولنے کے اسٹائل دیکھ کر ہم نے بالآخر ان سے کہہ ہی دیا تھا۔

”آپ کو یہاں آنے کے بجائے فلم لائن میں جانا چاہیے تھا۔“

”آپ کا اندازہ درست ہے میں نے پڑھائی کے بعد فلم اکیڈمی جوائن کی تھی۔ میرا ارادہ فلم میں جانے کا تھا۔“ انہوں نے جواب دیا۔

”آپ اب بھی جاسکتے ہیں۔“ ہم نے کہا۔ ”بس آپ کو ایک اچھی فلم کی ضرورت ہے بلکہ میرا مشورہ تو یہ ہے کہ واپسی پر آپ جینیوا کے بجائے ہالی ووڈ کا رخ کریں۔“

دوسرے استاد ڈاکٹر ایان بیل تھے۔ ان کا تعلق آسٹریلیا سے تھا۔ باتوں میں طنزیہ اور مزاحیہ جملے کسانوں کی عادت تھی۔ کوئی سوال پوچھتا تو انہیں بڑی خوشی ہوتی۔ اس کی طرف دوڑتے ہوئے جاتے۔ اپنی بیوی کا جس کا تعلق رومانیہ سے تھا، کا بہت ذکر کرتے۔ وہ بھی بڑی لکھی خاتون تھیں کیونکہ ان کے کام کے حوالے انہوں نے ہمیں پڑھائی کے دوران دیے۔ اس کے علاوہ اچھے فوٹو گرافر تھے۔ اپنی روز کی چٹھی ہوئی تصویریں

دکھاتے۔ اپنی پرانی تصویروں کے کارڈ بنوار کھے تھے جو آخری دن تحفے کے طور پر ہر ایک کو دیے۔ تیسرے ٹرینر ترکی کے مصطفیٰ آری گزمل تھے۔ 6 فٹ سے زائد قد، سرخ سفید رنگت، ہر وقت مسکرانے والے ہر ایک سے مکمل مل جاتے۔ سیمینار کے شرکاء اور عالمی ادارے کے درمیان رابطہ کار بھی تھے۔

چوتھے ٹرینر ویسٹون سوارا تھے۔ تعلق تو ان کا فن لینڈ سے تھا مگر آئے کسی اور یورپی ادارے کی طرف سے تھے۔ ہر ایک سے خوش دلی سے ملتے اور یہ اور مصطفیٰ لابی میں ہمارے ساتھ بیٹھک بھی کر لیتے تھے۔

ساتھی شرکاء میں مہناز کھارے، اگین اور بچو کا ذکر تو ہو چکا اس کے علاوہ بروٹائی سے سعدیہ صوفیانہ اور کم لیان چونگ تھیں۔ دونوں ہی زندہ دل خواتین تھیں مگر صوفیانہ زیادہ چلبلی تھی۔

چھٹن سے یونگ وانگ اور چونگ روونگ سن تھیں۔ دونوں ہی ایکٹو تھیں مگر جب یونگ وانگ سے گانے کی فرمائش کی گئی تو انہوں نے سن کو آگے کر دیا کہ یہ اچھا گاتی ہیں اور واقعی اس نے اچھا گایا۔ کک آئی لینڈ سے مارپامیتو وایامینی آئے تھے۔ ان کے ساتھ وہی ٹریجڈی ہوئی جس سے سچے کوہم نے سامان کے دو حصے کیے تھے یعنی ان کا سامان انہیں ملنے کے بجائے دوسری فلائٹ پر چلا گیا اور انہیں 5 دن بعد ملا۔ ہم نے انہیں مینٹل ٹینشن بے عزتی پریشانی جیسے مختلف اسباب کی بنا پر ایئر لائن پر بیس ہزار ڈالر ہر جانے کا مقدمہ کرنے کا مشورہ دیا اور یہ بھی کہا کہ جب وہ مقدمہ جیت جائیں تو اس کا 10 فی صد بطور مشورہ فیس مجھے بھجوادیں۔

”یہ غلط بات ہے۔“ یہ سن کر وہاں کھڑا ہوا گووندا راجو بولا۔ ”10 فی صد فیس تو غریبوں میں بانٹ دی جاتی ہے اور.....“ پھر وہ کچھ وقفہ کے بعد بولا۔ ”آپ کو تو پچاس فی صد ملنا چاہیے۔“ اس پر وہاں موجود لوگوں نے خوب تالیاں بجاائیں۔

گووندا کا تعلق ملائیشیا سے تھا۔ باغ و بہار شخصیت کا مالک ہر ایک سے اسی مذاق کرتا۔ ٹیبل ٹینس ٹورنامنٹ کا انتہائی باپولر ریفری بھی تھا۔ کھارے اور بچو کی طرح گھومتا گشت سے پرہیز کرتا تھا۔

اس کے علاوہ ملائیشیا سے روزل ابوبکر تھا۔ میں نے

شروع میں اسے روزالی کہہ دیا تو بگڑ گیا۔ بعد میں میرا بہت اچھا دوست بنا۔ یہ واحد شخص تھا جو مجھے میرے پورے نام سے بلاتا تھا۔ فوٹو گرافی کا شوقین، سیمینار کی زیادہ تر تصویریں اسی کے کمرے کی مرہون منت ہیں۔ ملائیشیا سے تیسری شخصیت ستا شریہ حسن تھی۔ یہ زیادہ سوشل نہیں تھی۔

لاؤس کی سنسالی کسی سے کھلتی ملتی نہیں تھی مگر چونکہ آخری دن ہماری گروپ ٹیبل پر بیٹھی اور میں نے اس کی کافی باتیں کیں۔

للمین سے ایڈنا اور قطر سے جوزفین دونوں فلپائنی تھیں۔ سعودیہ سے ابوبکر بقازی اور محمد بانی دھان آئے تھے۔ یہ چونکہ اپنی فیملیاں بھی ساتھ لائے تھے اس لیے علیحدہ علیحدہ ہی رہے۔ سنگاپور سے بی ہونگ گانگ اور لیبری لم دونوں خواتین سوشل تھیں۔ سولوسن آئی لینڈ سے ٹول سائی ناڈا انتہائی سادہ اور خوش و خرم دوسروں کے دکھ بانٹنے والا۔ تھائی لینڈ کا سانی پڑھنے میں بھی تیز تھا اور گانے میں بھی اور اس کے علاوہ تاجکستان کی نالیہ اور ازبکستان کی ال اوروم شروع میں تو الگ تھلگ رہیں بعد میں فری ہو گئیں۔

میزبانوں میں قابل ذکر شخص من سرار سمین تھا۔ 5 فٹ قد کا یہ شخص صبح ہو یا شام رات ہو یا دن میں نے بھی تمکا ہوا یا بے زار نہیں دیکھا حالانکہ انتظامی امور کا سربراہ تھا مگر اپنے ہاتھ سے کام کر کے خوشی محسوس کرتا تھا۔ کام کی زیادتی کی وجہ سے اس کے پیٹ میں مسئلہ ہو گیا۔ ہمارے علاج کی وجہ سے صبح ہوا تو اس نے مجھے بھائی بنانے کا اعلان کر دیا۔

اور ”رورو بروتی“ کی تو بات ہی نہ پوچھو دلی پتلی سی نازک سی یہ لڑکی من کی نمبر 2 تھی مگر اس نے سارا انتظام خوش اسلوبی سے سنبھالا ہوا تھا۔ شروع میں جیسا کہ ہر شخص مجھے سمجھتا ہے کہ میں ایک ریزرو اور غصہ ور شخصیت ہوں یہ بھی یہی سمجھ کر مجھ سے دور رہی مگر جب بعد میں فری ہوئی تو اکثر دعائیں لینے آ جاتی۔

انڈونیشیا کے مقامی شرکاء میں ڈاکٹر انگک ابراہیم تھے۔ ادیب تھے جس نے میری بہت مدد کی۔ ایٹا سیٹوونی کی جو گانے کی بہت شوقین تھی اس کی وجہ سے لابی میں کافی رات بھر رہی اور ایسی تھی جس سے ہم اگین کا رشتہ جوڑ

رہے تھے۔ ڈنر سے واپس آئے کپڑے تبدیل کیے۔ پہلے تو حسب عادت کچھ پڑھنے کو تلاش کیا۔ اس ماہ کا ”دوئیزہ“ اتفاق سے ساتھ آ گیا تھا۔ اسے دو تین دن میں پہلے صفحے سے لے کر آخری صفحے تک پڑھ ڈالا بلکہ مجبوراً وہ بھی پڑھ ڈالا جو ہمارے شوق کی چیزیں نہ تھیں یعنی اشتہارات اور بیوی گائیڈ وغیرہ۔ دو تین دن بعد جب پڑھنے کو کچھ نہ رہا تو سوچا کہ اب کیا کریں؟ ایسے میں نا صر رضا بہت یاد آیا کہ اس نے کہا تھا کہ واپسی میں مجھے ”سفرنامہ“ چاہیے۔

”کوشش کریں گے وعدہ نہیں کرتے۔“ ہم نے اسے کہا تھا۔ اب جبکہ کرنے کو کچھ نہ رہا تو پھر ہم لکھنے ہی بیٹھ گئے اور اب یہ جو اچھا برا ”سفرنامہ“ آپ پڑھ رہے ہیں تو اس میں میرا کوئی قصور نہیں ہے۔ پسند آئے تو تعریف میری کریں اور اچھا نہ لگے تو برا بھلا نا صر رضا کو کہیں!

جب لکھنے سے تھک جاتے تو ٹی وی بھی لگاتے مگر ہر چینل براؤنڈ ویشیا ہی تھا۔ کوئی انگلش یا دوسرا چینل نہیں تھا سو کیا دیکھتے مگر چند ایک دن جو تھوڑا بہت ٹی وی دیکھا تو معلوم ہوا کہ یہاں میڈیا کافی آزاد ہے اور خاص طور پر شراب کے اشتہار میں عریانی دیکھ کر تو ”توبہ! توبہ!“ کرنے کا دل کرتا۔

اگلی صبح ناشتے کے بعد شرکاء کی رجسٹریشن کا آغاز ہوا اور اس کے بعد رسمی تعارف کے لیے استادوں نے ایک نیا طریقہ اختیار کیا۔ بجائے اس کے وہ ہم سے ہمارا تجربہ پوچھتے انہوں نے تجربے کے لحاظ سے ہمیں باہر لائن بنانے کو کہا اور جب یہ لائن بنی تو ہم استادوں کے برابر ہی کھڑے پائے گئے جبکہ بعض استادوں سے بھی ہمارا تجربہ زیادہ تھا۔

وہیں سے کلاس میں جانے کے بجائے گروپ فوٹو بنانے کا اہتمام کیا گیا جو ہمیشہ کی طرح ہڈیوں کا شکار ہوا۔ آسٹریلیا کے استاد ویاں بیل کو جن کی جگہ درمیان میں ہونی چاہیے تھی بالکل کنارے پر جگہ ملی لہذا وہ ناراضگی کے اظہار کے طور پر گروپ فوٹو میں سامنے کے بجائے دائیں طرف دیکھتے پائے گئے۔

وہیں ہمیں ٹریننگ سینٹر کے اوپر بنے ہوئے

آڈیو ریم میں جانے کو کہا گیا کہ سیمینار کی باقاعدہ افتتاحی تقریب ہو سکے۔ افتتاحی تقریب میں وہی رکی تقاریر ہوئیں اور اس میں حسب معمول زور اس بات پر تھا کہ آپ سیکھنے آئے ہیں تو کچھ سیکھ کر جائیں۔ اس کے بعد اعلان ہوا کہ آج رات کا ڈنر ”ویلم ڈنر“ ہوگا۔ اس کے بعد ٹائم ٹیبل کے حساب سے چائے کا وقت ہو گیا تھا لہذا سب لوگ طعام گاہ میں آ گئے۔ چائے وغیرہ کے بعد باقاعدہ پڑھائی شروع ہو گئی جو چائے اور کھانے کے وقفے کے ساتھ شام 5 بجے تک جاری رہی۔

ویلم ڈنر کے متعلق ہمارا خیال تھا کہ یہ کسی ریٹورنٹ یا ہوٹل میں دیا جائے اور اس بہانے چونکہ باہر جانے کا موقع ملے گا تو ہم گرد و نواح کا جائزہ لے کر خریداری کے مقامات کا تعین کر سکیں گے کیونکہ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ ہم باہر جائیں اور خالی ہاتھ آئیں اور ویسے بھی خالی ہاتھ آنے والے کی عزت نہیں ہوتی۔ پر ہمیں اُس وقت حیرانی ہوئی جب یہ ڈنر اسی آڈیو ریم میں دیا گیا جہاں افتتاحی تقریب ہوئی تھی۔ میزبانوں نے بڑی مستعدی سے کام لیتے ہوئے آڈیو ریم میں ہی بونے ڈنر کا انتظام کیا ہوا تھا۔

ہم اپنے حساب سے ڈنر کے لیے نکلے تو کھارے بھی اپنے کمرے سے نکل رہا تھا۔ ہم دونوں ساتھ ہو لیے۔ رستے میں اگین بھی مل گیا۔ ہم بیڑھیاں چڑھ کر اوپر پہنچے تو حیران رہ گئے میزبانوں نے آڈیو ریم کی ترتیب بدل کر اسے ایک خوبصورت ڈائننگ ہال بنا دیا تھا۔ صبح کی قطار میں موجود کرسیوں کی جگہ گول میزیں تھیں۔ اُن پر خوبصورت پھول سجے ہوئے تھے۔ بائیں طرف کھانے کی میز لگی ہوئی تھی۔ حسب عادت ہم جلدی پہنچنے والے مہمانوں میں سے تھے۔ بہر حال جب کافی مہمان آ گئے تو کھانا شروع ہو گیا۔ کھانے میں حسب معمول ”ابلوئے“ کے ساتھ تین چار ڈشیں موجود تھیں۔ ان میں ایک مٹن اسٹک بھی تھی۔ ہمارا دل خوش ہو گیا کہ آج ابلوئے کے بدلے میں اس سے پیٹ بھر جائے گا مگر جب اسے کھانا چاہا تو پتا چلا کہ مصالحوں میں شاید شہد بھی شامل ہے لہذا بڑی مشکل سے جو تین اسٹک ہم نے لی تھیں ختم کیں۔

کھانے کے بعد ناچ گانے کا بھی پروگرام تھا یعنی

میزبانوں نے نہ صرف ویسٹ جاوا کے مقامی رواج رقص دکھانے کا اہتمام کیا ہوا تھا بلکہ ایک مقامی بینڈ کو بھی مدعو کیا ہوا تھا تا کہ مشرق مغرب کا امتزاج بن سکے بلکہ آج کل تو ویسے ہی مغرب ہی ہر طرف چھاتا جا رہا ہے۔ ہر طرف مغربی کچر کی بھرمار ہے اور مشرقی تہذیب کو اپنی بقاء کی جدوجہد کرنا پڑ رہی ہے۔

پہلے ویسٹ جاوا کی لڑکیاں رقص کے مخصوص لباس میں آئیں اور انہوں نے ”تاری رمبک جین ڈنگ“ نامی ویسٹ جاوا کا روایتی ڈانس پیش کیا۔ ”تاری“ کا مطلب ہی ہے رقص اور ”جین ڈنگ“ کا مطلب ہے تھاپ دار آلہ۔ (جیسے پاکستان میں طبلہ ہوتا ہے اسی قسم کے تین طبلے دو چھوٹے ایک بڑا ہر دو لڑکیوں کے سامنے ہوتا ہے اور وہ باری باری اس پر لکڑیوں سے تھاپ دے کر اور خوشی کی آوازیں نکال کر رقص کرتی ہیں۔) لہذا تاری رمبک جین ڈانگ کا مطلب ہوا ”طبلے کی تھاپ سے ساتھ مطابقت اور ہم آہنگ ہو کر رقص۔“ یہ رقص انڈونیشیا کے سنڈیز لوگوں کا خاص رقص ہے۔ اس میں طبلے کی تھاپ پر مذہبی رسوم فنکارانہ احساسات کے ساتھ خوشی کا اظہار متحرک اور ولولہ انگیز حرکات کے ساتھ کیا جاتا ہے۔ ڈانس کرنے کے بعد لڑکیاں واپس چلی گئیں۔

اس کے بعد ایک دوسری ٹولی ویسٹ جاوا کا قدیمی رقص ”تاری جیا پونگ“ پیش کرنے آئی۔ اس رقص کی خصوصیت یہ ہے کہ یہ اکیلے بھی کر سکتے ہیں۔ گروپ کی شکل میں بھی اور مرد و عورت کس بھی کر سکتے ہیں۔ اس رقص کے دوران پر فیشنل ڈانسرز مردوں کو ڈانس کی دعوت دیتی ہیں اور اس کا طریقہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے گلے میں پڑی ہوئی پٹی مرد کے گلے میں ڈال کر اسے اٹھا لیتی ہیں۔ اس ٹولی کی فنکاراؤں نے رقص کے دوران ہاتھ کے پتھکوں کو کھولنے بند کرنے کا مظاہرہ بھی بڑی خوبصورتی سے کیا۔

اس کے بعد بینڈ والوں نے ایک دو گانہ سنایا اور پھر ایک گلوکارہ نے گانا گایا۔ اس کے بعد انہوں نے مہمانوں کو دعوت دی کہ اگر ان میں کوئی گلوکاری کا شوقین ہے تو وہ بھی نغمہ سرا ہو سکتا ہے۔ اس پر پہلے تو چین کی سن نے چینی گانا سنایا اور پھر ملائیشیا کے گووندا اور حنا شریہ حسن نے ڈونٹ گایا۔

ہمارا خیال تھا کہ ہم معزز مہمانوں کی طرح رقص و رقص کی اس تقریب سے محظوظ ہوتے رہیں گے اور تقریب کے اختتام پر اپنے کمرے میں جا کر سو جائیں گے تاہم پروگرام ختم ہونے کے بعد میزبانوں نے شرکاء میں سے کھارے اور استادوں میں سے مصطفیٰ کو دعوت دی کہ وہ اسٹیج پر آئیں اور وہاں رکھے طبلوں کو ڈانس لڑکیوں کی طرح نچانے کی کوشش کریں۔ اس میں جب انہیں ناکامی ہوئی تو پھر ان کی مدد کے لیے ایک ایک رقاصہ کو بلایا گیا۔ انہوں نے رقاصاؤں سے مل کر کوشش کی تو کچھ بہتر ہو گیا۔ وہ لوگ واپس آ گئے اور اسٹیج خالی ہو گیا۔

اب انہوں نے تمام مہمانوں کو دعوت دی کہ وہ اسٹیج پر آئیں ہمارے ساتھ گائیں اور رقص کریں۔ اس دعوت پر کچھ اٹھ گئے اور کچھ اپنی جگہ بیٹھے رہے۔ ان بیٹھے والوں میں ہم بھی شامل تھے کہ ہم نے کبھی ڈانس وغیرہ نہیں کیا تھا۔ اتنے میں وہ تمام رقاصائیں بھی پہلے گروپ اور دوسرے گروپ دونوں کی رقاصائیں دوبارہ اسٹیج پر آ گئیں اور شاید انہیں پہلے سے بتا دیا گیا تھا یا پھر بعد میں کسی نے اشارہ کیا تھا۔ وہ ہال میں پھیل گئیں اور اپنے گلے میں ڈالی ہوئی پٹیاں نکال کر انہیں مہمانوں کے گلے میں ڈال کر انہیں اٹھانا شروع کر دیا۔

ان میں سے ایک ہماری طرف بھی آئی اور اس سے پہلے کہ ہم سنہلتے ہم اس کے حملے کا ”خکار“ ہو چکے تھے۔ ہم نے اوپر اُدھر دیکھا جن جن کو یہ ”خصوصی احترام“ دیا گیا تھا وہ سب اٹھ گئے تھے اور اسٹیج کی طرف چارے تھے سو چارونا چار ہمیں بھی اٹھنا پڑا۔ جب ہم اسٹیج پر پہنچ گئے تو ہم سب سے تقاضا ہوا کہ آپ لوگوں کو اوندھا سیدھا جیسا بھی آتا ہے ناچنے کی کوشش کریں۔ ہم نے رقص سے ہتھیرا کہا کہ ہمیں ناچنا نہیں آتا اور ہم تو صرف ان کے اشاروں پر ناچتے ہیں مگر انہوں نے بھی ٹھانی ہوئی کہ کسی کو چھوڑیں گے نہیں۔ پہلے تو ایک رقاصہ نے ہمیں اسٹیج سکھائے پھر جب یہ دیکھا کہ اس کے اشاروں پر ہم ناچ رہے ہیں تو میزبانوں میں سے ”رورو“ نے اشارہ کر دیا کہ آئی اور ہم سے بولی۔ ”جیسے میں کروں آپ آئیے جائیں آہستہ آہستہ آپ کی جھجک ختم ہوگی اور آپ اس کرنے لگیں گے۔“

سو رورو کی ہدایت پر عمل کرتے ہوئے رفتہ رفتہ ہمارے ہاتھ پاؤں اٹھنے لگے اور کچھ دیر بعد ساز کے ساتھ روم میں بھی آنے لگے اور بالآخر جو ہم سے آتا تھا کچھ دیکھی کچھ انڈونیشی اور کچھ بھنگڑا کس ناچ ہی لیا لیکن اس کے باوجود اگر رقص اعضاء کی شاعری ہے تو ہم اُس وقت اعضاء کی بندربانٹ کر رہے تھے اور ہمارا دل رکھنے کو اس بندربانٹ پر بھی واہ واہ ہو رہی تھی کیونکہ ایک دو کے علاوہ سب ہی ہم جیسے تھے اور تو اور ہم نے اپنے استادوں کو بھی ناچتے پایا سو وہاں کبھی ہم جیسے تھے تو ہمیں کاہے کی شرم لیکن ایک بات ہے کہ اُس دن سے جو بے تکلفی اور رقص شروع ہوا تو وہی ماحول اگلے دن بھی برقرار رہا اور جہاں بھی موقع ملایا لوگوں نے رقص اور گانے کا ماحول اپنایا ٹینشن دور کی اور خوش رہے۔

ڈنر سے واپسی پر ہم ہاسٹل کی لابی میں بیٹھ گئے جہاں جیوا اگین اور گووندا پہلے ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ تعارف کے مزید مراحل طے ہوئے۔ ایک دوسرے کے کام سے آگاہی ہوئی۔ اتنے میں ایک خاتون الیکٹرانک سگریٹ کے کش لگاتی چلی آئیں۔ معلوم ہوا کہ یہ جوزفین ہیں اور ہیں تو فلیپائی مگر چونکہ قطر میں پڑھائی ہیں اس لیے قطر کی نمائندگی کر رہی ہیں۔

”اگر ہم نے پانچ چھ سال پہلے سگریٹ چھوڑ نہ دیے ہوتے تو ہم آپ کا ساتھ دیتے۔“ ہم نے کہا۔ ”آپ کیوں فکر کرتے ہیں؟“ گووندا بولا۔ ”میں ہوں ناں ان کا ساتھ دینے کو۔“ اس نے بھی سگریٹ سلگا لیا۔

ہم لوگ باتیں کرتے رہے چٹکے سناتے رہے کافی دیر گفتگو ہوتی رہی پھر اس احساس نے کہ صبح سب کو اٹھنا ہے۔ محفل برخواست کرنے پر مجبور کر دیا۔

اگلے دن چائے کے وقفے میں ایڈنا ہمارے پاس آئی اور بولی۔ ”مسٹر کھان! آپ کے پاس وقت ہے؟“ ”تمہارے لیے تو ہر وقت.....“ ہم مزاحیہ لہجے میں بولے۔

”وہ..... اصل میں میرے ہینڈ کیری کا لاک نہیں کھل رہا۔“ وہ پریشان تھی۔

”چلو ہم دیکھ لیتے ہیں۔“

ہم اس کے ساتھ ہاسٹل کی طرف چل دیے۔

آبادی کا بم

پاکستان میں بڑھتی ہوئی آبادی کا مسئلہ کئی برسوں سے نظر انداز ہو رہا ہے۔ آبادی پر نظر رکھنے والی پاکستان کی پاپولیشن سائنس آرگنائزیشن کی ویب سائٹ کے مطابق اس وقت پاکستان کی آبادی 17 کروڑ 98 لاکھ 50 ہزار 379 افراد پر مشتمل ہے اور گزشتہ سالوں کے مقابلے میں اضافہ ہوا ہے۔ اس کے تناظر میں اوسطاً 9,700 نفوس کا اضافہ ہو رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آبادی میں اس غیر معمولی اضافے کو پاکستان کے لیے نام بم قرار دیا جا رہا ہے۔ قومی ادارہ برائے مطالعہ آبادی کے اعداد و شمار کے مطابق پاکستان کی آبادی 1998ء میں 13 کروڑ 33 لاکھ افراد پر مشتمل تھی۔ 1998ء میں ہی پاکستان کی آخری مردم شماری کی گئی محض 13 سال میں یہ اضافہ 34.8 فی صد رہا ہے۔ گویا سالانہ 2.6 فی صد آبادی میں اضافہ ہوتا رہا۔ افسوس کی بات یہ ہے کہ اس غیر معمولی اضافے کے باوجود اس کو نظر انداز کیا جاتا رہا ہے۔ یہ بڑھتی آبادی پاکستان کے کامیاب وسائل پر تازیانہ ثابت ہو رہی ہے اور کسی نہ کسی حد تک لوگوں کے مصائب کی اتنی ہی ذمہ دار ہے جتنا حکومت کی پہلو تہی اور چشم پوشی کو قصور وار ٹھہرایا جاتا ہے۔

پاکستان کی بڑھتی ہوئی آبادی اقوام متحدہ کی جانب سے مرتب کردہ حالیہ اعداد و شمار کے مطابق 2050ء تک 30 سے 35 کروڑ کے درمیان ہوگی۔ واشنگٹن کے تھنک ٹینک وڈروولسن سینٹر کے مائیکل کوگل مین کا کہنا ہے کہ پاکستان کو اپنی تیزی سے بڑھتی آبادی اور اس سے منسلک مسائل کی سنگینی کا احساس کرنا ہوگا مگر جس ملک کی آبادی اگلے چالیس سال میں دوگنا ہونے کی پیش گوئیاں کی جا رہی ہیں۔ اس کی موجودہ آبادی کے حوالے سے کوئی حتمی اعداد و شمار کہیں موجود نہیں۔

”تو مجھے بھی اپنا کولیٹرول جلانے کا شوق نہیں ہے۔ اتنی مشکل سے تو بڑھایا ہے۔“
اس بات پر ایک قہقہہ پڑا۔
”جائیں سر! چلے جائیں۔“ آگین بولا۔
”تم بھی چلو۔۔۔۔۔“

”میں آرام کروں گا۔“ اس نے جواب دیا۔
”اور کھارے صاحب۔۔۔۔۔“ تم نے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
”یہ میرے ساتھ جائیں گے۔۔۔۔۔“ آگین نے کھارے کا ہاتھ دبا دیا۔
وہ لوگ ہاسٹل کی طرف بڑھ گئے جوی ان کے ساتھ ہولی جبکہ میں اور ایڈنا جو گنگ ٹریک پر اتر گئے۔
”آپ فلپائن میں کہاں رہتی ہیں۔۔۔۔۔“ چلتے چلتے ہم نے پوچھا۔

”میں اور اکٹھے ٹریننگ کر چکے تھے اس لیے ان میں پہلے سے دوستی تھی۔ یہ سن کر کچھ لوگوں کو تو بہت افسوس ہوا کیونکہ ان کی کی ہوئی تمام پیش گوئیاں دم توڑ گئیں۔ تصویر میں مصطفیٰ کو پہچاننے پر اس نے مہناز کو تحفتاً ایک تصویر بھی دی۔

☆.....☆.....☆
ہم ڈنر کے بعد کھارے اور آگین کے ہمراہ باہر نکلے جوی اور ایڈنا کھڑی تھیں۔
”مسٹر کھان! کیا آپ میرے ساتھ جو گنگ ٹریک پر پہل قدمی کرنا پسند کریں گے۔ ایڈنا بولی اس کی آواز سن کر عجیب سی کھرکھا ہٹ گئی۔
”تم جوی کے ساتھ کیوں نہیں چلی جاتیں۔“
”میں نے اس سے کہا تھا۔ اس کی طبیعت خراب ہے۔ وہ اک نہیں کرنا چاہتی۔

know, you will never smoke.”

”That’s Right.“ میں نے سنجیدگی سے کہا۔
”یہ تین دن کا سفر طے کر کے آج ہی آئی ہیں۔“
میں نے جملہ طریقہ بتایا اطلاع پر ہمیں ایان ہیل کی آواز سے کمپیوٹر سے سرائٹھانے پر مجبور کر دیا۔ مڑ کر دیکھا تو کمرے کے شروع والی ٹیبل کے پاس ایک خوبصورت گوری چٹ چھٹ سے زائد قد کی خاتون کھڑی تھیں۔ انہوں نے سب کو زور سے ”السلام علیکم!“ کہا۔ معلوم ہوا کہ خاتون ازبکستان سے آئی ہیں اور ان کا نام دل اور دم ہے۔ اگلے دن تاجکستان کی نکالیہ بھی آگئی۔ ان دونوں نے اکٹھے بیٹھنا شروع کیا بلکہ انہوں نے تو اس قانون کی بھی پاسداری نہیں کی کہ ہر شخص کو ہر روز ایک نئی ٹیبل پر نئے ساتھیوں کے ساتھ بیٹھنا ہے کیونکہ اگلے دن جب ان دونوں کے نام علیحدہ علیحدہ میزوں پر موجود تھے تب بھی وہ جا کر اکٹھی بیٹھ گئیں لہذا استادوں نے ان کو اکٹھا ہی رہنے دیا۔ اس کے علاوہ یہ دونوں خواتین عام لوگوں سے گھلنے ملنے کے بجائے دور دور ہی رہتی تھیں۔ ہاں مصطفیٰ ان سے خوب کھل مل گیا تھا۔ طعام گاہ میں اکثر ان کے ساتھ بیٹھنے کے علاوہ باہر بھی ان کے ساتھ چہل قدمی کیا کرتا۔ ان کے یوں الگ تھلگ رہنے پر لوگوں نے خوب باتیں بنائیں۔

”یہ ابھی تک سوشلسٹ دور کے تسلط کے خوف میں زندہ ہیں۔ اسی لیے کسی سے گھلنے ملنے سے ڈرتے ہیں۔۔۔۔۔ ایک بولا۔

”ان کی نئی نسل سے یہ خوف نکلے گا تب یہ لوگ صحیح ہوں گے۔“ دوسرے نے رائے زنی کی۔
صحیح بات کا علم ہمیں بعد میں ہوا کہ ان کے دوسروں سے کترانے کی وجہ کیا تھا۔ اصل میں نکالیہ کی انگلش بہت کمزور تھی۔ اسی لیے وہ کسی سے گفتگو کرنے سے ڈرتی تھی لہذا دل اور دم کو مجبوراً اس کا ساتھ دینا پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ دل اور دم سگریٹ نوش تھی لہذا اسے سگریٹ پینے کو باہر جانا پڑتا تھا تو نکالیہ اس کا ساتھ دیتی تھی۔

مصطفیٰ سے ان دونوں کی بے تکلفی پر بھی خوب اندازے لگائے گئے۔ یہ عقدہ تو آخری دن کھلا جب دل اور دم نے اپنی Presentation میں اپنی اور مصطفیٰ کی ایک تصویر دکھائی۔ یعنی وہ اس سے پہلے بھی آپس میں مل

ہینڈ کیری کا جائزہ لیا تو معلوم ہوا کہ اس کا لاک تو کھلا ہوا تھا اصل میں اس کا ہک پھنسا ہوا تھا۔ ہم نے ہینڈ کیری کو ایک جھٹکا دیا وہ ہک باہر نکل آیا تو ہینڈ کیری کھل گیا۔ ہم خوش ہوئے کہ عزت رہ گئی۔

”تھینک یو ویری مچ۔“ ایڈنا مسکرا کے بولی۔ ”میں رات سے پریشان تھی۔“

”تو۔۔۔۔۔ رات کو ہی بلا لیا ہوتا۔“ ہم ”تو“ کو لمبا کرتے ہوئے بولے پھر ہم نے اسے آئینہ کے لیے بھی ہک کھولنے کا طریقہ بتایا اور باہر نکل آئے۔

ہمارے استادوں نے ہمیں آپس میں اچھی طرح متعارف ہونے بلکہ بے تکلف ہونے کے لیے ایک اور اچھا طریقہ اختیار کیا تھا یعنی ہم چار پانچ لوگ ایک دن جس ٹیبل کے گرد بیٹھتے تھے دوسرے دن نہ صرف ان کی ٹیبل بدل جاتی بلکہ ساتھی بھی بدل جاتے۔ کل میرے ساتھ ڈاکٹر آنگنگ ابراہیم روزلی سن اور صوفیہ تھیں تو آج میرے ساتھ جوزفین، جیو، سنہالی اور ادینیہ تھے۔ آج ڈاکٹر ریان ہیل کو میں نے دیکھا وہ جوزفین کو جوی کہہ کر بلا رہا تھا۔ معلوم ہوا کہ یہ دونوں پہلے بھی ایک سیمینار میں مل چکے ہیں اور اسی وجہ سے بے تکلف ہیں۔ اس کی دیکھا دیکھی ہم نے بھی جوزفین کو جوی کہنا شروع کر دیا بلکہ اس سے ہمارا مذاق بھی شروع ہو گیا۔

”جوزی۔۔۔۔۔!“ ہم نے پاس بیٹھی جوزفین سے کہا۔ ”مجھے ایک کش تو لگوا دو۔“

”نو۔۔۔۔۔ وہ سنجیدہ ہوگئی۔ ”مسٹر کھان۔۔۔۔۔!“ آپ سگریٹ چھوڑ چکے ہیں۔ دوبارہ مت شروع کریں۔“

”میں مذاق کر رہا تھا۔“ ہم ہنسے۔
اس کے بعد جب بھی ہماری اس سے ملاقات ہوتی، ہم اس سے ایک کش کا سوال کرتے اور وہ ہنس دیتی۔

”جوزی۔۔۔۔۔! کاش۔۔۔۔۔ تم مجھے ایک کش لگوا دیتی تو میرے پاس سگریٹ دوبارہ شروع کرنے کا بہانہ ہوتا کہ مجھے ایک خوبصورت اور اسمارٹ خاتون نے سگریٹ دوبارہ شروع کرائے ہیں۔“ ہم نے آخری دن اس سے کہا تھا۔

”یو۔۔۔۔۔ جولی مین۔۔۔۔۔!“ وہ ہنسی اور بولی۔ ”ا“

”فیلا میں.....“

”وہاں کیا کرتی ہیں۔“

”ٹریننگ دیتی ہوں۔“

”اچھا ہماری طرح استاد ہیں۔“ ہم نے سوچا۔

”بچے کتنے ہیں آپ کے۔“

”میں نے شادی نہیں کی۔“

”سنجھل!“ ہم نے سوچا چانس بن گیا ہے۔

”تو ماں باپ کے ساتھ رہتی ہوں گی۔“

”نہیں! ان کا تو انتقال ہو گیا ہے۔ بہن بہنوئی کے

ساتھ رہتی ہوں۔“

”لو اور آسانی.....“ ہم نے سوچا وہاں تو ویسے ہی

تنگ ہوگی۔ لگتا ہے واپسی پر اکیلے نہیں ہوں گے۔“

”شادی کیوں نہیں کی۔“ ہم نے پوچھا۔ ”آئیڈیل

کی تلاش میں عمر گزار دی اور کوئی پسند نہیں آیا یا..... ہم

نے بات ادھوری چھوڑ دی۔“

”نہیں..... بس.....! وہ بولی۔“

”اوہ..... تو کوئی بے وفا نکلا اور آپ کے نازک دل

کو توڑ کر چلا گیا۔“ ہم بولے۔ ”خیرت ہے آپ جیسی

خوبصورت اور پیاری خاتون کو بھی کوئی چھوڑ کر جاسکتا

ہے۔“

”یوں ہی سمجھ لیں۔“

”کچھ اس بارے میں بتائیں گی۔“ ہمارے اندر کا

کہانی نویس بیدار ہو گیا۔

”کیوں نہیں.....“ وہ بولی ”اتنی مشکل سے

تو ڈھونڈا ہے۔“ اس کی آواز کی کھر کھراہٹ خوف زدہ

کیے جارہی تھی۔

”کے!“ ہم نے سوال کیا۔

”کچھ نہیں۔“ وہ بولی ”میں پھر بتاؤں گی تفصیل

سے۔“

”چلیں چھوڑیں.....“ ہم نے اس کی طرف دیکھا

اس کے چہرے کے نقوش جیسے بدل گئے تھے۔ وہ ایڈنا

نہیں کوئی اور ہی لگ رہی تھی اس لیے ہم نے بات بدل

دی اور بولے ”اتنی خوبصورت جگہ اتنے اچھے موسم میں

اک بے وفا کی یاد میں دل جلانے سے بہتر ہے کہ آدی

کوئی اور بات کرے۔“

وہ خاموش رہی۔

”جوزی سے تو آپ کی خوب دوستی ہوگئی۔“ ہم نے

موضوع بدل دیا۔

”ہاں! وہ بھی میری طرح تنہا ہے۔“

”کیا مطلب؟“ ہم چونکے۔

”اس نے بھی شادی نہیں کی۔“

”وجہ! وہی بے وفائی۔“

”نہیں! کچھ لوگوں کے نصیب اچھے نہیں ہوتے۔

جوزی شاید ان میں سے ایک ہے۔“

”افسوس ہوا یہ سن کر۔“ ہم بولے۔

کچھ دیر کے لیے خاموشی چھا گئی۔

”اب تمہارا کیا ارادہ ہے۔“ ہم نے پوچھا۔ ”اس

بے وفا کی یاد میں دل جلاتے رہتا ہے یا گھر بسانے کا

ارادہ ہے۔“

”تھا تو نہیں مگر شاید اب بن جائے۔“ ایڈنا نے

مسکرا کر ہماری طرف متنی خیر نظروں سے دیکھا ہمیں اس

وقت وہ پہلی والی ایڈنا لگی۔

”خیریت۔“ ہم نے اس کا مفہوم سمجھتے ہوئے بھی

سوال کیا۔

”معلوم نہیں مسٹر کھان! لیکن آپ میں اک عجیب

سی پراسرار کشش ہے جو قریب آنے پر اثر کرتی ہے۔“

”یہ تو تم انہی بات کر رہی ہو۔ لوگ تو پہلی نظر میں ہی

مجھے بڑا سخت گیر غصہ ور اور نہ فری ہونے والا شخص سمجھتے

ہیں۔“ ہم بولے ”میرے بارے میں ان کی رائے تو بعد

میں بدلتی ہے۔“

”وہ لوگ پہلی مرتبہ آپ کو دور سے دیکھتے ہیں مگر

میں تو.....“ وہ شرما گئی اور اس نے بات ادھوری چھوڑ

دی۔

”ہیلو.....“ اس سے پہلے کہ بات مزید آگے

بڑھتی۔ مصطفیٰ اور دل اور دم نے ہماری ارمان میں

کھنڈت ڈال دی۔

”ہائے..... ہم بولے۔ اس وقت ہمیں انداز ہوا

کہ باتوں باتوں میں ہم راؤنڈ پورا کر چکے ہیں اور مصطفیٰ

اور دل اور دل اور دم مخالف سمت سے نیچے اتر کر ہماری

طرف آئے ہیں۔

چڑھائی چڑھنے کے بعد لابی میں داخل ہوئے تو

دیکھا اک ہنگامہ برپا ہے۔ لابی میں اک بڑی سی ٹی وی

اسکرین روشن ہے اور سائنٹی اسکرین پر موجود گانے کے

پل پڑھتے ہوئے گانا گارہا ہے۔ جبکہ باقی افراد بیٹھے

ہوئے تال دے رہے ہیں۔ ہم بھی لابی میں موجود لوگوں

کی طرف بڑھ گئے۔ ہمارا خیال تھا کہ ایڈنا ہمارے پیچھے

ہوئی مگر پیچھے مڑ کر دیکھا تو وہ غائب تھی۔ ہم حیران ہوئے

کہ اتنی جلدی وہ کہاں چلی گئی۔

سائنٹی بہت اچھا گانا تھا یہ تو بعد میں معلوم ہوا کہ اس

کا پہلے ایک بینڈ بھی تھا اسی وجہ سے اسے گانا آتا بھی تھا۔

”یہ تمہارا نام سائنٹی کیا ہے۔“ ایک دن ہم نے اس

سے پوچھا۔ مجھے تو یہ ہندی کا سائنٹی لگتا ہے۔

”ایسا ہی ہے۔“ وہ بولا ”ہماری زبان میں سائنٹی اور

ہندی کے سائنٹی دونوں کا ایک ہی مطلب ہے۔“ وہ بولا۔

”مگر ہندی میں تو سائنٹی لڑکیوں کا نام ہوتا ہے۔“

”اچھا.....“ وہ تعجب سے بولا۔ ”میرا خیال تھا کہ

سائنٹی لڑکوں کا نام بھی ہوگا۔“

”ایسا ہرگز نہیں ہے۔“

”اب کچھ نہیں ہو سکتا۔“ وہ ہنسا۔ ”اب نام نہیں بدلا

جاسکتا۔“

سائنٹی کے علاوہ لابی میں ڈاکٹر آگنگ ابراہیم

السیہ رورو اور اینا کے علاوہ گوند بھی موجود تھا۔ تھوڑی

دیر میں سنگاپور کی لی بھی آگئی۔ گانے والا بدلا یعنی سائنٹی

کے بجائے اینا نے گانا شروع کیا تو مصطفیٰ اور دل اور دم

بھی آگئے۔ مصطفیٰ ہمارے ساتھ بیٹھ گیا مگر دل اور دم نہیں

رہے۔ نیارقص والا گانا شروع ہوا تو رورو اور اینا نے سب کو

اتھا کر رقص پر لگا دیا۔ ڈیسا وہاں سے گزر رہا تھا اسے بھی

پکڑ لیا گیا۔

☆.....☆.....☆

ہماری عادت ہے کہ جمعے کو خاص طور پر شلوار قمیص

پہنتے ہیں اور کبھی غلطی سے جمعہ کے علاوہ کسی دن شلوار

پہن کر دفتر چلے آئیں تو لوگ مذاقاً کہتے ہیں ”

صاحب نے شلوار قمیص پہنا ہے بہت سے لوگوں کو غلط

فہمی ہوگئی ہوگی کہ آج جمعہ ہے۔ سو ہم نے یہاں بھی کرتا

شلوار قمیص پہنا۔ ایک دو افراد نے ہمیں حیرت سے

دیکھا تو ایک دو افراد نے اس کی تعریف

کی۔

مارے نام نیل میں جمعہ کی نماز کا کوئی وقفہ نہیں دیا

ہوا تھا لہذا ہم نے میزبانوں سے بات کی اور خصوصی

اجازت سے بیشتر مسلمان حضرات نماز جمعہ کو چل دیے۔

ہمارا خیال تھا کہ ملائیشیا کی طرح یہاں بھی خواتین جمعے

میں شرکت کریں گی۔ مگر معلوم ہوا کہ پاکستان کی طرح

یہاں بھی خواتین نماز گھروں پر ادا کرتی ہیں مسجد نہیں

جاتیں۔ یہ پہلا موقع تھا جب ہم احاطے سے باہر نکلے

اور ہمارے ساتھ کوئی گارڈ بھی نہ تھا۔

بائیں طرف تھوڑی دور اترائی اتر کر بائیں جانب

ایک رستہ نظر آیا۔ اس پر چڑھ کر ہم اندر پتلی پتلی اور تنگ

گلیوں سے گزرتے ہوئے ہمیں اصل انڈونیشیا نظر آیا۔

کہیں باہر تنگ دھڑنگ بچے کھیل رہے تھے تو کہیں بچے

اسکول یونیفارم میں آتے ہوئے بھی نظر آئے۔ ایک

مکان کے باہر چھوٹے سے برآمدے میں ایک موٹر

سائیکل کھڑی تھی۔ ایک خاتون گھر کے سامنے بیٹھی برتن

دھورہی تھی۔ اس نے ہمیں تعجب سے دیکھا مگر اپنا کام

کرتی رہی۔ راستے میں ایک چھوٹی سی دکان بھی آئی

جس میں نہ صرف ہر طرح کے گھریلو استعمال کی چیزیں

تھیں بلکہ بھری اور پھل بھی موجود تھے۔ گلی کے کونوں پر

دو چار فارغ لڑکے بھی بیٹھے دکھائی دیے۔

جمعے کی نماز کی خاص بات یہ تھی کہ خطبے سے پہلے کی

تقریر کسی اور صاحب نے کی جبکہ خطبہ امام صاحب نے

پڑھا۔ اس کے علاوہ ہمارے یہاں جیسے چندہ کے لیے دو

افراد ایک بڑا سا رومال لے کر نمازیوں کے سامنے سے

گزرتے جاتے ہیں اور نمازی حضرات اس میں حسب

توفیق چندہ ڈالتے جاتے ہیں یہاں افراد کے بجائے

آپ کے سامنے چندے کی صندوقچی آجاتی ہے آپ

اس میں چندہ ڈالتے ہیں اور خود ہی صندوقچی کو آگے بڑھا

کر دوسرے صاحب کے سامنے رکھ دیتے ہیں کہ وہ

چاہے تو چندہ ڈالے ورنہ آگے بڑھا دے۔ مجھ سے پہلے

سعودی ابوبکر بقازی بیٹھا ہوا تھا اس نے بھی بھر نوٹ اس

صندوقچی میں ڈالے ہم نے بھی حسب توفیق چندہ ڈالا۔

نماز پڑھی اور واپس آگئے۔

شام چھ بجے ڈاکٹر پیٹرک نے اعلان کیا کہ کون کون

جائے کے باغات کی سیر کو جائے گا۔ جائے کے باغات

دیکھنا تو ہماری دیرینہ خواہش تھی جو اچانک یوں پوری

ہوگئی یہ ہمیں معلوم نہ تھا ہم بخوشی تیار ہو گئے۔ ہمارے

سچسپس کہانیاں 143

غزل

مُحُوك کی کڑواہٹ سے سر دکیلے ہونٹ
خون اُگلنے، سوکھے، چٹے، پیلے ہونٹ

ٹوٹی پھوٹی، ٹھنڈی لڑکی، باغی عمر
میز بدن، پتھرائی آنکھیں، نیلے ہونٹ

سونا آنگن، تنہا عورت، لمبی عمر
خالی آنکھیں، بیگا آنچل، کیلے ہونٹ

کچے کچے لفظوں کا یہ نیلا زہر
مُحُوجائے تو مُورکھ تو بھی چھیلے ہونٹ

زہر ہی مانگیں، امرت رس کو مُنہ نہ لگائیں
باغی، ضدی، وحشی اور ہٹیلے ہونٹ

ایسی خیر باتیں، ایسے کڑوے بول
ایسے سُدر، کوئل سرخ ریلے ہونٹ

اتنا بولو گی تو کیا سوچیں گے لوگ
رسم یہاں کی یہ ہے لڑکی سی لے ہونٹ

عشرت آفریں

تھیں اور ہمارے ہاتھ پر یوں باندھ دی گئیں جیسے آغا
ان اسپتال میں مریضوں کے ہاتھ پر شناخت کا ٹیگ
باندھا جاتا ہے۔ اندر جانے سے پہلے جو ہدایت نامہ
موصول ہوا وہ یوں تھا کہ سیاحوں کو ہدایت کی جاتی ہے کہ

گاڑی کے اندر رہیں اور گاڑی کے شیشے مکمل طور پر
بند رکھیں۔

سیاحوں کا اندر داخلہ مکمل طور پر ان کے اپنے رسک
پر ہوگا۔

جانوروں کو کچھ بھی کھانا پلانا اور تنگ کرنا منع ہے۔
کمرشل فوٹو گرافی اور ویڈیو بنانا منع ہے۔

ہم نے ان ہدایات پر عمل کرتے ہوئے شیشوں کو ہلا
جلا کر دیکھ لیا کہ کہیں وہ کھلے تو نہیں ہیں، بس جب سفاری
پارک کے اندر گئی تو اندر پیارے پیارے ہرن چوڑیاں
بھرتے نظر آئے یہ واحد جانور تھا جو بھاگ دوڑ کر رہا تھا یا
ان کے علاوہ بندروں میں ہمیں کچھ اچھل کود نظر آئی ورنہ
اس کے علاوہ تمام جاندار سستی مارے ہی دکھائی دیے۔

انسان بھی کیا عجیب چیز ہے پہلے جانوروں کو
آزادی سے محروم کرتا ہے انہیں جنگل سے نکالتا ہے پھر
انہی کے آرام کی خاطر جنگل کا مصنوعی ماحول پیدا کر کے
انہیں آزادی بھی دے دیتا ہے اور بند گاڑی میں انہیں
دیکھنے بھی جاتا ہے۔ مگر اصلی اور مصنوعی آزادی کا فرق تو
صاف نظر آتا ہے۔ کہاں خود شکار کے لیے بھاگ دوڑ
کرنے سے جاندار چست و توانا رہتے ہیں اور کہاں
انہیں بغیر ہاتھ پیر ہلائے صبح شام خود ہی کھانے کو مل
جائے تو پھر سستی ہی ہوگی ناں۔

بات ہو رہی تھی شمن سفاری کی اس میں ہرن، زبیرا،
گائے، بونو، موس، اونٹ، کیسوری، فلیمنگو، چیتا، ملایا کے ریچھ،
ہرن، کالے ہرن، زرافہ، نایالہ، ہرن، بابی روسا، افریقی
شیر، نکال، ٹائگر، شتر مرغ، باربری، بھیڑیں، سفید گینڈا اور
بلیک کائے کے علاوہ عام بڑے بڑے سینگوں والی گائیں
بھی موجود تھیں۔ خطرناک جانوروں یعنی چیتے، بنگال
ٹائگر، افریقی شیر کو دوسرے جانوروں سے علیحدہ رکھا گیا
تھا۔ اس علاقے میں گاڑی کے داخل ہونے پر ایک
دور سے کھنکھاتی گاڑی اندر یا باہر جاتی تو دروازہ بند ہو جاتا۔
اسے کے نزدیک ایک گاڑی بھی موجود تھا جو ان

گاڑیوں کے پاس آجائے جو ستر کار کو لے کر شمن سفاری
چڑیا گھر روانہ ہوں گی۔ رات کا کھانا باہر ہی ہوگا اور رات
7:30 تک واپسی ہوگی۔

اتوار کو یہاں سے 7:30 پر روانہ ہوں گے بوگور
جائیں گے وہاں دنیا کا سب سے قدیم اور سب سے بڑا
بوٹا نیکل گارڈن (نباتیاتی، حیاتیاتی باغ) دیکھیں گے اور
اس کے بعد شاپنگ کریں گے۔ شاپنگ 1:30 تک کرنا
ہوگی۔ 1:30 پر وہاں سے واپسی ہوگی اور تقریباً 3:30 پر
ہم یہاں واپس آجائیں گے۔ اس دوران چائے اور چائے
گاڑی میں ہی دیا جائے گا۔

”آپ لوگ احتجاج کیوں نہیں کرتیں؟“ یہ
پروگرام دیکھنے کے بعد میں نے خواتین کو اسکیا۔
”کس بات پر.....“ انہیں تعجب ہوا۔

”شاپنگ کے لیے اتنا کم وقت ملنے پر۔“ ہم نے
کہا۔ ”آپ لوگوں کو تو شاپنگ کے لیے پورا دن بھی کم
ہوگا۔ چائیکہ چند گھنٹے..... یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔“
خواتین میری بات سن کر خوش تو ہوئیں مگر احتجاج پر
کوئی آمادہ نہ ہوا۔ یہ الگ بات ہے کہ بوگور سے شاپنگ
کے بعد واپسی 5:30 بجے ہوئی اور ہمیں وہ تکلیف
برداشت کرنا پڑی جس کی وجہ سے میزبان واپسی میں
جلدی کر رہے تھے۔ اس کا ذکر آگے آئے گا۔

☆.....☆.....☆

شمن سفاری چڑیا گھر کو روانگی شیڈول کے مطابق نہ
ہو سکی کیونکہ اگین کو ڈھونڈنے میں دیر ہو گئی معلوم ہوا وہ
سو گیا تھا۔ ہم لوگوں کو لے جانے کے لیے دو کوچیں بلوائی
گئی تھیں۔ زیادہ تر افراد ایک کوچ میں تھے جبکہ دس بارہ
افراد دوسری کوچ میں جس میں ہم بھی شامل تھے۔ کوچ
جب شمن سفاری کو جانے والی سڑک پر مڑی تو رستے میں
جگہ جگہ گاجروں کے اسٹال دیکھے۔ پتا چلا کہ یہ گاجریاں
لوگ سفاری پارک میں جانوروں کو کھلانے کے لیے
خریدتے ہیں۔ پر نہ تو ہمیں کوئی خریدنا نظر آیا اور نہ ہی ہم
نے گاجریاں خریدیں۔

آدھے گھنٹے کے سفر کے بعد کوچ سفاری کے
علاقے میں داخل ہو کر ایک جگہ کھڑی ہو گئی معلوم ہوا
سفاری میں داخلے کے لیے ٹکٹس خریدی جا رہی ہیں۔
تھوڑی دیر میں ٹکٹیں آ گئیں۔ یہ ٹکٹوں کی صورت میں

علاوہ آٹھ دس افراد اور بھی جانے والے تھے جس میں
ایک گارڈ بھی تھا۔ اس دفعہ ہم احاطے سے باہر نکلے تو
دائیں طرف چڑھائی چڑھنا پڑی، کوئی ایک ڈیڑھ گلو میٹر
آگے جا کر پہاڑیوں پر پھیلے ہوئے چائے کے باغات
موجود تھے۔

”آپ کے ملک میں بھی چائے کے باغات
ہیں۔“ ادیتیہ نے پوچھا۔

”پہلے ہمارے ملک میں دنیا کی بہترین چائے کے
باغات تھے۔“ اب وہ کسی اور ملک میں ہیں۔

”کیا مطلب۔“ ادیتیہ حیران ہوا۔ ”باغات
دوسرے ملک کیسے چلے گئے؟“

”پہلے بنگلہ دیش ہمارا ملک مشرقی پاکستان ہی تو
تھا۔“ ہم نے افسردگی سے کہا۔ ”البتہ اب ہمارے یہاں
شمالی علاقوں میں چائے لگانے کے تجربات ہو رہے
ہیں۔“

چائے کے باغات میں اس وقت کوئی ذی نفس نہ
تھا۔ معلوم ہوا چائے کی چٹیاں صبح توڑی جاتی ہیں۔ ہم
نے چائے کی تازہ کوئیل کو توڑا، سوگھا کوئی خوشبو نہ تھی
اسے چبایا حلق میں کڑواہٹ گھل گئی یہ کڑواہٹ شاید
ہماری یادوں کی بھی تھی۔

چائے کے باغات سے واپسی پر سورج غروب
ہونے کا حسین منظر ہمیں مبہوت کر گیا۔ سب نے اس
منظر کو کیمروں میں مقید کر لیا۔ ہمارا خیال تھا کہ ہم جس
رستے سے گئے ہیں اسی رستے سے واپس آئیں گے مگر
پہاڑیوں سے گھومتے گھومتے جب نیچے اترتے گئے تو
معلوم ہوا کہ ہم اپنی باؤنڈری وال کے عقب میں آ گئے
ہیں اور پھر وہاں سے گلیوں گلیوں گھومتے ہوئے دوبارہ
چڑھائی چڑھ کر اپنے احاطے (Boundry) میں واپس
آ گئے۔

☆.....☆.....☆

ہفتہ و اتوار چونکہ آرام کے دن تھے لہذا میزبانوں
نے ہمیں سیر و تفریح کا ایک شیڈول تھما دیا۔ جس کے
مطابق ہفتہ کو صبح 8:30 بجے تک اگر کسی کو پڑھائی میں کوئی
مسئلہ درپیش ہو تو وہ ٹریننگ ہال میں آ کر اساتذہ سے
رہنمائی حاصل کر سکتا ہے ورنہ وہ اپنے کمرے میں آرام
کرے یا جو مرضی کرے مگر 1 بجے طعام گاہ کے باہر موجود

خطرناک جانوروں کے باہر آنے کی صورت میں انہیں روکنے کا ذمہ دار تھا۔

ہم سوچتے تھے کہ ہم ہی دنیا میں قانون شکن قوم ہیں اس لیے تو ساری دنیا ہم پر تھوکتی رہی ہے مگر جب ہماری کوچ اندر گئی تو ہم نے دیکھا کہ لوگ پاگ اپنی گاڑیاں روک کر شیشہ اتار کر راستے میں خریدی گئی گاڑیوں کے سرک پر آتی ہوئی گاڑیوں، زبیروں، ہرنوں اور بندروں کو کھلا رہے تھے بلکہ ان کی جانوروں سے اس محبت کی وجہ سے ہماری کوچ بھی رک جاتی کیونکہ جب تک آگے رستہ صاف نہ ہوتا، ہم آگے نہ جاسکتے۔ ان میں بعض مچھلے تو دور بیٹھے بندروں اور اورنگاؤں کو بھی گاڑیوں پھینک رہے تھے۔ سفاری پارک کی سیر بمشکل ایک گھنٹہ میں پوری ہو گئی۔ سفاری پارک سے باہر نکلے رستے میں ہمیں ہاتھی کی سواری بھی نظر آئی۔ چند بچے اور بڑے اس سواری سے لطف اندوز ہو رہے تھے۔ کوچ واپس آگے پارکنگ ایریا میں کھڑی ہو گئی اور ہم سب اتر کر آگے جا کے زین فاریسٹ ریسٹورنٹ کے سامنے میدان میں جمع ہو گئے۔ میزبانوں نے اعلان کیا کہ اگر آپ خود سیر کرنا چاہیں تو آپ کے پاس ڈھائی گھنٹے کا وقت موجود ہے۔ ساڑھے پانچ بجے اسی جگہ پر آپ کو واپس جمع ہونا ہے۔

ہم نے ادھر ادھر نظر دوڑائی تو بجوانکیش مہاراج کی سیوا کرتا یعنی ہاتھی کو ناریل کھلاتا نظر آیا۔ الین اس کی تصاویر بنا رہا تھا۔

”کیا خیال ہے..... ہم لوگ کیا کریں۔“ ہم نے کھارے سے پوچھا۔

”یہاں بہت سی چیزیں دیکھنے کے قابل ہیں۔ ہم لوگ خود ہی ایکسپلور کرتے ہیں۔“ وہ بولا۔ اتنے میں مہناز بھی آگئی۔ اس کا خیال تھا کہ جب خود ہی گھومنا ہے تو ایک گروپ کی صورت میں گھومنا بہتر ہوگا۔

”چلو جیسے بچوں کی مرضی۔“ ہم نے کہا۔

ہم تھوڑی سی کھلی جگہ پر بڑھے تو ہمیں چیز لفٹ جاتی ہوئی نظر آئی۔ ہمارا دل کیا اس کی سیر کریں مگر معلوم ہوا کہ اس کا ایکشن کافی دور ہے اور ہمارے پاس وقت کم ہے۔ ابھی ہم اور آگے جانے والے تھے کہ ایک غلغلا ہوا ”کس کس کو کاؤ بوائے شوڈ دیکھنا ہے۔“

”کاؤ بوائے شو..... یہ کس قسم کا شو ہے اور کہاں

ہوگا؟“

بڑا اسٹیشنل شو ہے۔ آپ کو اس سٹیشن ٹرین میں بڑے کاؤ بوائے شوڈ دیکھنے جانا ہوگا۔ ایسا بولی۔

”چلیں.....“ ہم نے کھارے سے پوچھا۔

”میرا دل نہیں چاہ رہا۔“ وہ بولا۔ ”ہم یہاں ہی گھومیں گے۔“

”آپ.....“ میں نے مہناز سے پوچھا۔

”جانتیں“ وہ بولی۔ وہ کوئی فیصلہ نہیں کر پار ہی تھی۔

”تو پھر میں کہہ رہا ہوں کہ چلیں۔“ ہم نے ضد کی۔

اتنی دیر میں ٹرین کی ٹکٹیں آگئیں اور پرانی ٹکٹوں کے ساتھ ہی نئی لال پٹی ہاتھ پر لپیٹ دی گئی۔ ہم نے ایک پٹی کھارے کے ہاتھ پر بھی لپیٹ دی اور وہ بھی ہمارے ساتھ ہولیا۔

تھوڑی دیر کے سفر نے ہمیں کاؤ بوائے شو کے اسٹیشن پر اتار دیا۔ وہاں اترنے سے پہلے ہی بارش شروع ہو گئی۔ ہم اس بارش میں بھیکتے تیزی سے اوپر بنے شیڈ میں جا کر کھڑے ہو گئے۔ معلوم ہوا کہ ابھی تھوڑا انتظار کرنا ہوگا کیونکہ ابھی ایک شو ختم ہوا ہے اور دوسرے شو کی تیاری جاری ہے۔ 10 مندرہ منٹ کے انتظار کے بعد جب ہم اندر داخل ہوئے تو ہمارے میزبانوں نے ہمیں اشارہ کیا کہ کچھلی سیٹوں پر بیٹھیں۔ ہم سخت متعجب ہوئے کہ جب اگلی سیٹیں خالی ہیں اور شو اگلی سیٹوں سے زیادہ واضح نظر آتا ہے تو کچھلی سیٹوں پر بیٹھنے کی کیا تک ہے۔

بہر حال ہم ان کے ساتھ کچھلی سیٹوں پر جا بیٹھے۔ روزی نے ویڈیو بنانا چاہی تو میزبانوں نے منع کر دیا کہ اس شو کی ویڈیو بنانا منع ہے۔

بیٹھنے کے بعد ہم نے اطمینان سے سامنے نظر ڈالی تو بالکل ویسٹرن کاؤ بوائے فلموں کا پورا سیٹ لگا ہوا تھا۔ وہی پرانے لکڑی کے بنے مکان، شراب خانہ، پھانسی گھاٹ، کنواں اور جیل بھی کچھ موجود تھا۔ میں نے سوچا کہ اس میں کچھ چیزیں فالتو ہیں اور محض سیٹ کی سجاوٹ کے لیے لگائی گئی ہیں۔

ہم نے کچھلی سیٹوں پر نظر ڈالی تو ہمیں گووندا نظر آیا جو دل اور دم اور خالیہ کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے مجھے دیکھا تو ہاتھ سے اشارہ کیا کہ نیچے آ جاؤ۔ میں جا کر اس کے برابر بیٹھ گیا۔

”گووندا“ ہم گووندا کی طرف مڑے۔ ”ظالم انسان! تم خوبصورت لڑکیوں کے پاس بیٹھنے کے چکر میں خود بھی بیٹھنے اور ہمیں بھی بھگوا دیا۔“

”یہ مجھ پر الزام ہے۔“ وہ کراہا۔ ”یہ خواتین خود ہی سب سے الگ ہو کر یہاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں نے تو ان کو بیٹھنے کے بعد دیکھا ہے۔“

”اب جو بھی کہو۔“ ہم بولے۔ ”جرم تم پر ثابت ہے۔“

☆.....☆.....☆

شو ختم ہونے پر باہر نکلے تو باہر موجود ایک دکان میں کھانسی گئے۔ تفریحی مقامات پر جانے والوں کے لیے لوٹ کا جو سلسلہ ہوتا ہے وہ وہاں بھی تھا۔ دام کافی زیادہ

تھے۔

کھارے کے چہرے پر اس وقت تک بے چینی اور بے اطمینانی رہی جب تک شو شروع نہ ہو گیا۔ شو شروع ہوا تو اس نے اپنے اختتام تک دم بخود کر دیا۔ میں جن چیزوں کو فالتو سمجھ رہا تھا۔ وہ سب کام کی ٹھیں، احمقوں نے یہٹ پر موجود ہر چیز کو اپنے شو میں استعمال کیا یہاں تک کہ سامنے تار سے لگا ہوا سینر جس پر میری نظر پڑی تھی اور میں نے اسے نظر انداز کر دیا تھا ایک جو کر کاؤ بوائے اس سے لٹک کر نیچے آیا اور ولن پر چھلانگ لگائی۔ شو میں ہر چیز اپنے پرفیکٹ ٹائمنگ کے حساب سے تھی یہاں تک کہ شو میں کام کرنے والے جانور اور برندے تک اس قدر سدھائے ہوئے تھے کہ کہیں بھی کوئی گڑبڑ نہ ہوئی۔ شو میں جو قصہ بنایا گیا تھا اس میں وہی ہیر و ہیر و ولن اس کا دوست اور جو کر کے کردار نمایاں تھے بلکہ ان میں سب سے زیادہ نمایاں کردار جو کر کا تھا۔ اس نے پہلے ولن سے مار کھا کے پانی کے ٹب میں چھلانگ لگائی اور ایسا کرتے ہوئے تماشاخیوں پر خوب پانی اچھال کے داد حاصل کی اور پھر شو کے اختتام سے کچھ پہلے وہ ہماری طرف آیا اور سامنے لگے ہوئے ایک موٹے سے پائپ پر چبھے ہی گرا پانی کی ایک تیز دھار نکل کر ہماری طرف آئی اور ہماری قطار کو بلکہ نیچے بیٹھے ہوئے تماشاخیوں کو بھی بھگو دیا۔ بھیگنے والوں میں ہم بھی شامل تھے۔ ہم نے مڑ کر اوپر دیکھا تو اوپر بیٹھے ہوئے سب لوگوں کے چہروں پر مسکراہٹ تھی۔

”گووندا“ ہم گووندا کی طرف مڑے۔ ”ظالم انسان! تم خوبصورت لڑکیوں کے پاس بیٹھنے کے چکر میں خود بھی بیٹھنے اور ہمیں بھی بھگو دیا۔“

”یہ مجھ پر الزام ہے۔“ وہ کراہا۔ ”یہ خواتین خود ہی سب سے الگ ہو کر یہاں بیٹھی ہوئی تھیں۔ میں نے تو ان کو بیٹھنے کے بعد دیکھا ہے۔“

”اب جو بھی کہو۔“ ہم بولے۔ ”جرم تم پر ثابت ہے۔“

☆.....☆.....☆

شو ختم ہونے پر باہر نکلے تو باہر موجود ایک دکان میں کھانسی گئے۔ تفریحی مقامات پر جانے والوں کے لیے لوٹ کا جو سلسلہ ہوتا ہے وہ وہاں بھی تھا۔ دام کافی زیادہ

تھے۔

”برونائی کی کم لیان ایک شرٹ کا ساڑز دیکھ رہی تھی۔“

”اپنے لیے لے رہی ہیں۔ اچھی ہے۔“ ہم بولے۔

”نہیں! اپنی بیٹی کے لیے مگر دام بہت زیادہ ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔

”یہ تو ہے۔“ ہم بولے۔ ”ایسا کریں آج دام کا اندازہ کر لیں شاپنگ کل کریں۔“

ہم آگے بڑھے تو ہمیں ایڈنا کی جھلک دکھائی دی۔

حیرت انگیز طور پر وہ کپڑوں وغیرہ کے بجائے ایک مجسمہ خرید کر اپنے بیگ میں رکھ رہی تھی۔ ہم اس کی طرف بڑھے تو اس نے ہمیں دیکھا اور پھر ہمارے عقب میں دیکھا اور بجائے ہماری طرف آنے کے دائیں طرف مڑی اور پھر ہمیں نظر نہ آئی۔ ہم واپس مڑے تو دیکھا ہمارے پیچھے مہناز آ رہی تھی۔ وہاں سے نکلے تو میزبانوں نے پوچھا۔ ”پیدل چلنا ہے یا ٹرین کا انتظار کرنا ہے؟“

پوچھا۔ ”اس کا سبب کیا ہے؟“

بولے۔ ”اگر ٹرین کا انتظار کیا تو دیر ہو جائے گی اور آپ ڈولفن کا شو نہ دیکھ سکیں گے۔“ سو پیدل ہی چل پڑے کہ اترائی یہ چلنا بہت آسان تھا۔ چلتے چلتے ڈولفن شو والے ایرینا میں پہنچے۔ وہ جیسے ہمارا ہی انتظار کر رہے تھے کیونکہ ہمارے اندر داخل ہونے اور بیٹھنے کے بعد شو اشارت ہو گیا۔

نیچے گول تالاب میں تین ڈولفن موجود تھیں جبکہ چوتھی کو جنگلہ لگا کر علیحدہ چھوٹے تالاب میں رکھا گیا تھا۔ شاید ٹریننگ کے لیے یا پھر سزا کے طور پر کیونکہ وہ بار بار پانی سے باہر آتی مگر ٹریننگ کی توجہ نہ پا کر پھر پانی کے اندر چلی جاتی۔

ادھر تالاب میں تینوں ڈولفون نے بہت سے کرتب دکھائے جس میں گول گھومنے پانی پر دم کی مدد سے چلنے۔ ایک لڑکی کو پکڑ کر لے جانے بلکہ اوپر لٹکے ہوئے رنگ میں سے چھلانگ لگانے جیسے بہت سے کرتب شامل تھے۔ جس پر انہوں نے تماشاخیوں سے خوب داد وصول کی۔ مگر سب سے زیادہ مزہ اس وقت آیا جب پانی میں تین گیندیں پھینک دی گئیں اور تینوں ڈولفون نے ایک ڈبکی لگائی اور پھر جب وہ پانی سے

نچے گول تالاب میں تین ڈولفن موجود تھیں جبکہ چوتھی کو جنگلہ لگا کر علیحدہ چھوٹے تالاب میں رکھا گیا تھا۔ شاید ٹریننگ کے لیے یا پھر سزا کے طور پر کیونکہ وہ بار بار پانی سے باہر آتی مگر ٹریننگ کی توجہ نہ پا کر پھر پانی کے اندر چلی جاتی۔

ادھر تالاب میں تینوں ڈولفون نے بہت سے کرتب دکھائے جس میں گول گھومنے پانی پر دم کی مدد سے چلنے۔ ایک لڑکی کو پکڑ کر لے جانے بلکہ اوپر لٹکے ہوئے رنگ میں سے چھلانگ لگانے جیسے بہت سے کرتب شامل تھے۔ جس پر انہوں نے تماشاخیوں سے خوب داد وصول کی۔ مگر سب سے زیادہ مزہ اس وقت آیا جب پانی میں تین گیندیں پھینک دی گئیں اور تینوں ڈولفون نے ایک ڈبکی لگائی اور پھر جب وہ پانی سے

نچے گول تالاب میں تین ڈولفن موجود تھیں جبکہ چوتھی کو جنگلہ لگا کر علیحدہ چھوٹے تالاب میں رکھا گیا تھا۔ شاید ٹریننگ کے لیے یا پھر سزا کے طور پر کیونکہ وہ بار بار پانی سے باہر آتی مگر ٹریننگ کی توجہ نہ پا کر پھر پانی کے اندر چلی جاتی۔

ادھر تالاب میں تینوں ڈولفون نے بہت سے کرتب دکھائے جس میں گول گھومنے پانی پر دم کی مدد سے چلنے۔ ایک لڑکی کو پکڑ کر لے جانے بلکہ اوپر لٹکے ہوئے رنگ میں سے چھلانگ لگانے جیسے بہت سے کرتب شامل تھے۔ جس پر انہوں نے تماشاخیوں سے خوب داد وصول کی۔ مگر سب سے زیادہ مزہ اس وقت آیا جب پانی میں تین گیندیں پھینک دی گئیں اور تینوں ڈولفون نے ایک ڈبکی لگائی اور پھر جب وہ پانی سے

نچے گول تالاب میں تین ڈولفن موجود تھیں جبکہ چوتھی کو جنگلہ لگا کر علیحدہ چھوٹے تالاب میں رکھا گیا تھا۔ شاید ٹریننگ کے لیے یا پھر سزا کے طور پر کیونکہ وہ بار بار پانی سے باہر آتی مگر ٹریننگ کی توجہ نہ پا کر پھر پانی کے اندر چلی جاتی۔

ادھر تالاب میں تینوں ڈولفون نے بہت سے کرتب دکھائے جس میں گول گھومنے پانی پر دم کی مدد سے چلنے۔ ایک لڑکی کو پکڑ کر لے جانے بلکہ اوپر لٹکے ہوئے رنگ میں سے چھلانگ لگانے جیسے بہت سے کرتب شامل تھے۔ جس پر انہوں نے تماشاخیوں سے خوب داد وصول کی۔ مگر سب سے زیادہ مزہ اس وقت آیا جب پانی میں تین گیندیں پھینک دی گئیں اور تینوں ڈولفون نے ایک ڈبکی لگائی اور پھر جب وہ پانی سے

نچے گول تالاب میں تین ڈولفن موجود تھیں جبکہ چوتھی کو جنگلہ لگا کر علیحدہ چھوٹے تالاب میں رکھا گیا تھا۔ شاید ٹریننگ کے لیے یا پھر سزا کے طور پر کیونکہ وہ بار بار پانی سے باہر آتی مگر ٹریننگ کی توجہ نہ پا کر پھر پانی کے اندر چلی جاتی۔

ابھریں تو انہوں نے اپنی دم کی ٹکر سے وہ گیندیں تماشائیوں کی طرف اچھال دیں۔ ان گیندوں کے ساتھ پانی تو آنا لازم تھا مگر ہم اس لیے بیچ گئے کہ ہم اس دفعہ کافی اوپر بیٹھے تھے۔

☆.....☆.....☆

ڈولفن شو ختم ہونے کے بعد ایک بار پھر ٹرین کا انتظار کرنے کے بجائے پیدل ہی نیچے اترنے کا فیصلہ کیا گیا۔ کاؤ بوائے شو ختم ہونے کے بعد شاپنگ کی غرض سے دکان میں گھسے اور بعد میں ڈولفن شو تک کھارے سے بات نہ ہو سکی تھی۔ اب پیدل چلتے ہوئے کھارے پر نظر پڑی تو اسے آواز دی۔

”کھارے صاحب!“ ہم بولے۔ ”شو کا مزہ آیا۔“

”بہت۔“

”آپ تو آنا ہی نہیں چاہ رہے تھے۔“

”آپ کی ضد پر آ گیا۔ نہ آتا تو افسوس ہوتا۔ بہت جبر دست شو تھا۔ یہ چیخ ایک دم پرفیکٹ۔ یوں لگ رہا تھا جیسے لائیو مووی دیکھ رہے ہیں۔“

”صحیح بولے۔“ ہم نے تائید کی اور اس کے بعد ڈولفن شو بھی لا جواب تھا۔

”یہ تو ہے۔“ کھارے بولا۔ ”پر ایک بات آپ کے علم میں نہیں ہے۔“

”وہ کیا.....؟“ ہم حیران ہوئے۔

”یہاں اور بھی بہت سی چیزیں دیکھنے لائق ہیں۔ میں اگر شونہ دیکھتا تو وہ دیکھ لیتا۔“

”مثلاً۔“

”یہاں سی لائن شو ٹائیگر اور لائن شو ہاتھی تماشا شکاری پرندوں کی پرفارمنس جیسے شو بھی دکھائے جاتے ہیں۔“

اس کے علاوہ مختلف جانوروں کے کرتب ایک چھوٹا سا چڑیا گھر مختلف قسم کے جھولے اور رائیڈز وغیرہ بھی موجود ہیں۔ اصل میں یہ ایک قسم کا ایمپوزمنٹ پارک ہے اور اسے دیکھنے کے لیے ایک سے زیادہ دن چاہئیں۔

”آپ کو یہ معلومات کہاں سے ہوئیں؟“

”رین فاریسٹ ریسٹورنٹ کے سامنے ایک جگہ بروشر موجود تھے۔ میں نے وہاں سے لے کر اس کا مطالعہ کیا تھا۔“

”اگر یہ بات ہے تو زندگی رہی تو ایک بار پھر آئیں گے اور اس دفعہ زیادہ دن کے لیے تاکہ آرام سے ہرچہ دیکھ سکیں۔ ویسے ان لوگوں نے ہر چیز کو بہترین بنانے میں بہت محنت کی ہے۔“

”یہ تو ظاہر ہے۔“

واپسی میں ڈنر کا پروگرام رین فاریسٹ ریسٹورنٹ میں تھا جہاں ایک مزے دار ڈنر ہمارا منتظر تھا سوڈن کے بعد واپسی ہوئی بس میں ہر ایک کے ہاتھ میں ٹکٹیں بندھی ہوئی نظر آ رہی تھیں۔ زیادہ تر نے انہیں پہنچ کر کھولنے کی کوشش کی تھی مگر یہ اتنی مضبوط تھیں کہ نہ تو تھیں نہ پھٹیں۔ اب لوگوں کا خیال تھا کہ انہیں فینچی سے کاٹیں گے۔ میں نے پونہی ایک گونے سے اس کی ایک گچی سی بھاڑی اور پھر دھچی گچی کر کے ٹکٹیں پھاڑ دیں۔ میری دیکھا دیکھی دوسرے بھی اس کام پر جت گئے اور انہوں نے بھی ٹکٹوں سے نجات حاصل کر لی۔

☆.....☆.....☆

اگلے دن بوٹا نیگل گارڈن یعنی نباتاتی باغ دیکھنے اور شاپنگ کرنے کا پروگرام تھا اس پروگرام میں معمولی سی تاخیر ہوئی یعنی ساڑھے سات کے بجائے ہم لوگ 8 بجے کے قریب نکلے اور کوئی پونے نو بجے تک بوگور پہنچ گئے۔ بوٹا نیگل گارڈن کو جاتے ہوئے صدارتی محل بھی نظر آتا ہے بلکہ اس کا ایک پچھلا دروازہ گارڈن کی طرف بھی کھلا ہے۔ ہم گارڈن کی سیر کرتے ہوئے اس دروازے تک بھی پہنچے مگر وہاں کوئی گارڈن نہ تھا ورنہ شاید ہم اس سے درخواست کرتے کہ ہمیں اپنے صدر سے ملادے۔

یہ بوٹا نیگل گارڈن دنیا کا قدیمی اور سب سے بڑا گارڈن ہے۔ اس میں دنیا جہاں کے پھول پودے اور درخت وغیرہ ہیں۔ سیر کرتے کرتے جیسے اپنے ملک کا درخت یا پودا نظر آتا وہ خوشی سے چلا اٹھتا۔

”مسٹر کھان! آپ کیا سوچ رہے ہیں؟“ زردی ہمیں خاموش دیکھ کر ہمارے پاس آ گیا میں سوچ رہا ہوں کہ اتنے خوبصورت پھول پودے اپنے ملک کیسے لے جاؤں۔ میرے گھر میں طرح طرح کے پھول پودے ہیں مگر یہاں کے پھولوں کی خوبصورتی تو اپنی مثال آپ ہے۔ اتنا تنوع تو آپ کے ملک ملائیشیا میں بھی ہے۔“

تالال

ایک صاحب کے ہاں ولادت ہونے والی تھی۔ وہ لیڈی ڈاکٹر کو اپنے گھر ہی بلا لائے۔ انہوں نے لیڈی ڈاکٹر کو اپنی بیوی کے کمرے میں چھوڑا اور خود باہر آ کر ٹھیلنے لگے۔ کچھ ہی دیر بعد لیڈی ڈاکٹر کمرے کا دروازہ کھول کر باہر نکلی۔ وہ صاحب لپک کر اس کے قریب پہنچے پھر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے لیڈی ڈاکٹر نے ان سے کہا۔ ”کوئی چاقو ہو تو دیجیے۔“

ان صاحب نے جلد ہی ایک بڑا اور تیز چاقو لیڈی ڈاکٹر کو فراہم کر دیا۔ لیڈی ڈاکٹر دوبارہ کمرے میں چلی گئی مگر چند منٹ بعد پھر دروازہ کھول کر باہر آ گئی۔

”جی جی کیا ہوا؟“ ان صاحب نے بے تابی سے پوچھا۔

”ابھی کچھ نہیں ہوا۔“ لیڈی ڈاکٹر نے جواب دیا پھر کہا۔ ”ایک ہتھوڑا چاہیے اور چھینی بھی۔“

”بہتر ہے۔“ وہ صاحب یہ کہہ کر ہتھوڑا اور چھینی لینے پڑوس کی طرف لپک گئے اور جلد ہی دونوں چیزیں لیڈی ڈاکٹر کے حوالے کر دیں۔ لیڈی ڈاکٹر ہتھوڑا اور چھینی لے کر دوبارہ کمرے میں چلی گئی۔ باپ بننے والے صاحب کے چہرے سے اب انتہائی فکر مندی کا اظہار ہو رہا تھا اور وہ بے چینی سے باہر والے کمرے میں ٹہل رہے تھے۔ ابھی کچھ ہی دیر گزری تھی کہ دروازہ پھر کھلا۔ لیڈی ڈاکٹر باہر آئی۔ وہ بھی چہرے سے فکر مند نظر آ رہی تھی۔ اس کے ماتھے پر پسینا نظر آ رہا تھا۔ ان صاحب کے کچھ پوچھنے سے پہلے ہی وہ بول اٹھی۔ ”مجھے آپ کو بار بار زحمت دینے پر افسوس ہے میں خود فکر مند ہوں مجھے ایک سنسی چاہیے۔“

”سنسی.....؟“

”مسٹر موصوف تقریباً چھ اٹھے۔“ خدا کے لیے ڈاکٹر اگر کس آپ کے قابو سے باہر ہو گیا ہے تو میں اپنی بیوی کو اسپتال لیے جاتا ہوں۔ آخر میری بیوی کو ہوا کیا ہے؟“

”میں نے کہا نا کہ ابھی میں کچھ نہیں کہہ سکتی ابھی تو میں اپنا بیگ کھولنے کی کوشش کر رہی ہوں۔“

”ٹھیک کہا۔“ وہ بولا۔ ”وہاں بھی بے شمار قسموں کے پھول پودے ہیں۔“

”کیا باتیں ہو رہی ہیں؟“ صوفیانہ نے پوچھا۔

”مسٹر کھان! اپنے ملک کو یاد کر رہے ہیں۔“

”کیوں؟“

”کوئی اپنے ملک کو کیوں یاد کرتا ہے؟“ روزی نے پوچھا۔

”اپنے لوگوں کی وجہ سے.....“ صوفیانہ بولی۔

”میرے پانچ بھائی اور سات بہنیں ہیں۔ وہ سب مجھے یاد آتے ہیں۔“

”اچھا تو ان کے بچے بھی ہوں گے۔“ قریب سے نکلنے پوچھا۔

”ہیں! ہر ایک کے دو تین تو ہیں۔“

”تو اس کا مطلب ہے تم لوگ چاہو تو اپنا ایک ٹاؤن

”ہرے..... سب نے نعرہ لگایا Long Live پرنس صوفیانہ آف صوفیانہ ٹاؤن۔“

پرنس کا خطاب ملنے پر صوفیانہ بہت خوش ہوئی اس نے خوشی میں اپنے شوہر کو فون کر کے بتایا کہ ہم لوگوں نے اسے پرنس کا خطاب دیا ہے۔

پھول پودے دیکھ کر صدارتی محل کے گیٹ کو ہاتھ لگا کر دوسری طرف نکلے تو پتا چلا کہ یہاں ایک میوزیم بھی ہے جس میں مختلف انواع جانوروں پرندوں اور کیڑے مکوڑوں کو حنوط کر کے رکھا گیا ہے۔ سوچا آئے ہیں تو

عید کا جوڑا

انور فرہاد

اس نے انہوں کے لیے اپنی جان کی بازی لگانا
چاہی لیکن عین وقت پر وہ حرام موت سے بچ گیا

ملک کے موجودہ حالات پر ایک پرائیڈر تحریر



اسے گھر واپس نہیں جانا، قطر جانا ہے اس لیے وہ شاپنگ
قطر سے کرے گی۔ اسے یہاں شاپنگ میں نہیں
نہیں ہے۔“

ایڈنا کی باتوں سے اندازہ ہوا کہ شاید دونوں کے
درمیان کچھ کھٹ پٹ ہو گئی ہے۔ ”آپ لوگ اپنے لیے
کچھ اور دیکھ لیں۔ میں تو یہاں سے کچھ چاکلیٹ وغیرہ کی
شاپنگ کروں گا۔“ کھارے یہاں شاپنگ سینٹر کے اندر
ایک ڈپارٹمنٹل اسٹور میں جا کے کھڑے ہو گئے اور
بولے۔ وہ شاید ہمارے ساتھ شاپنگ کرنے سے ہچکچا
رہے تھے۔ ان کے اپنے بجٹ کا حساب ہوگا۔ ہمارا تو
ہاتھ کھلا تھا۔

ہم نے ڈپارٹمنٹل اسٹور کا جائزہ لیا۔ کچھ زنانہ سوٹ
خریدے اور پھر فیصلہ کیا کہ اگر چاکلیٹ وغیرہ لینے ہیں تو
اسے ہم بعد میں وزٹ کریں گے۔ اب باقی شاپنگ مال
دیکھتے ہیں۔ مہناز ایڈنا اور اکیں ہم سب ساتھ تھے۔
مہناز نے بھی ایک سوٹ خریدا۔ ایڈنا نے اپنے لیے
جوتے پسند کیے۔ اکیں کچھ خریدتے ہوئے شرمارہا تھا۔
”ان خواتین سے پوچھ لو تمہاری گرل فرینڈ کو کیا
چیز پسند آئے گی؟“ ہم نے اسے حوصلہ دیا تو وہ اور شرما
گیا۔

”نونیو..... سر!“ وہ بولا۔
”نونیو کا مطلب ہے اس نے اپنی پسند تمہیں بتادی
ہے یا نہیں؟“ ہم نے اچانک سوال کیا۔
”لیس سر، نو سر.....!“ وہ گڑبڑا گیا۔

”اچھا، ہم لوگ ہٹ جاتے ہیں، تم اپنی پسند سے
خرید لیتا۔“
ہم ڈپارٹمنٹل اسٹور سے باہر نکلے اور پیچھے دیکھا تو
اکیں غائب تھا۔

”بھائی.....! ادھر آئیں۔ ذرا یہ کپڑا دیکھیں، ان
سے بھاؤ تاؤ کریں۔“
ہمیں مہناز کی آواز سنائی دی۔ میں اس کی طرف
بڑھا، وہ ایک دکان میں مگی ہوئی تھی۔
”مسٹر کھان!“ مجھے اپنے پیچھے ایڈنا کی آواز سنائی
دی۔

(باقی آئندہ ماہ ملاحظہ کریں۔)

لے ہاتھوں اسے بھی دیکھ لیں۔
کھارے صاحب تھک گئے تھے لہذا وہ جانے سے
کتر اگئے۔ اس دفعہ ہم نے بھی ان سے اصرار نہ کیا اور
دوسرے ساتھیوں کے ہمراہ خود ہی جا کر عجائب گھر دیکھا
جس کے کئی حصے تھے اور جس میں قدیم اور جدید دونوں
دور جانوروں کے پرندوں اور کیڑے مکوڑوں کے نہ
صرف ڈھانچے تھے بلکہ بہت سے تو حنوط شدہ بھی موجود
تھے۔ یونائٹڈ گارڈن کے باہر اصل انڈونیشیا موجود تھا۔
مختلف قسم کے سوئیٹر مقامی دستکاری کی چیزیں۔ ہمیں
ایسی ہی چیزوں کی تلاش تھی جو ہم اپنے دوستوں اور عزیزو
اقارب کو تحفے میں دے سکیں۔ باقی چیزیں تو ہمارے
ملک میں بھی سستی اور اچھی مل جاتی ہیں مگر ہمارے
میزبانوں نے ہمیں وہاں رکھنے نہ دیا شاید سیوری کے
خدشات کے پیش نظر اور وہ ہمیں وہاں سے نکال کر ایک
شاپنگ مال پر لے آئے۔ وہ شاپنگ مال صرف گھریلو
استعمال کی چیزوں بلکہ کپڑوں، جوتوں، بیگیوں سے بھرا ہوا
تھا۔ اس میں ہمارے مطلب کی کوئی چیز نہ تھی کوشش اور
خواہش کے باوجود ان میں سے کوئی چیز دل کو نہ لگی۔

ہم بابتک شرٹ خریدنا چاہتے تھے وہ وہاں نہ تھیں۔
ہم لنگی کا کپڑا خریدنا چاہتے تھے وہ موجود نہ تھا ہم انڈونیشیا
کے سوئیٹر لینا چاہتے تھے وہ بھی نہ ملے۔ ہاں ایک
کوٹے میں آکوپریش کی چند چیزیں نظر آئیں تو وہ ہم
نے خرید لیں کہ یہ پاکستان میں نہیں ملتیں۔

کچھ دیر بعد تقریباً سب ہی مایوسی کے عالم میں
اسٹور کے باہر جمع ہو گئے۔ ہم میں سے کسی نے شاید ہی
ایک آدھ چیز خریدی ہو ورنہ زیادہ تر خالی ہاتھ تھے لہذا
ہمارے میزبان ہمیں دوسرے ڈپارٹمنٹل اسٹور لے گئے
جو پہلے سے بڑا اور زیادہ مہنگا تھا۔ اندر داخل ہونے کے
بعد ہمیں کہا گیا کہ اس شاپنگ مال کے بیرونی دروازے
کے پاس جو کافی شاپ ہے زیادہ سے زیادہ ساڑھے
پانچ تک یہاں واپس آ جائیں۔ ہم لوگ گروپ کی شکل
میں نکلنے لگے۔ ہمارے ساتھ کھارے اکیں، مہناز اور
ایڈنا تھیں۔ جوزی نہ کل آ سکی اور نہ آج آئی تھی۔
”جوزی کیوں نہیں آئی؟“

”وہ اکل کھری بڑھیا.....“ ایڈنا غصے سے بولی۔
”وہ ویسے بھی مردم بے زار ہے اور اس کے علاوہ چونکہ

عید کی بھی کیا بات ہے کہ رمضان المبارک کی پہلی تاریخ سے لوگ اس کا انتظار کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ ابھی تقریباً پورا مہینہ باقی ہوتا ہے لیکن عید کی تیاریاں ابھی سے شروع کر دی جاتی ہیں۔ لیکن روزے جیسے جیسے کم ہوتے جا رہے تھے کہ عید کا دن قریب آتا جا رہا تھا ذیشان کی پریشانیاں بڑھتی جا رہی تھیں۔ اس کی فکر و تردد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔

”ہمارے لیے تو یہ دن.....“ ذیشان کے چہرے پر اداسیوں کی پرچھائیاں گہری ہوتی چلی گئیں۔ جیسے جیسے وہ بڑا ہوتا جا رہا تھا اس کے سوچنے سمجھنے کی صلاحیت بھی بڑھتی جا رہی تھی۔ اب وہ سولہ سترہ سال کا ہو گیا تھا اور اپنے اپنے گھر والوں اور اپنے ارد گرد کے ماحول کے بارے میں بہت سی باتیں سوچنے لگا تھا۔ سوچ سوچ کر وہ اکثر پریشان ہو جاتا تھا کیونکہ جو باتیں وہ سوچتا تھا ان سے اُسے پریشانوں کے علاوہ اور کچھ حاصل نہیں ہوتا تھا مثلاً وہ سوچتا عید آنے والی ہے تو آئے میرے لیے تو نہیں آئے گی؟ میں کیوں اس کا انتظار کروں؟ مجھے اس کے آنے سے کیا مل جائے گا؟ وہ میرے لیے کوئی خوشی لے کر تو نہیں آئے گی۔ جس طرح رمضان کے روزے پھلے اور بے مزہ گزر رہے ہیں اسی طرح عید بھی.....

”بیٹا! اذان ہو چکی ہے۔ جاؤ عصر کی نماز پڑھ آؤ اور ہاں نماز کے بعد تھوڑی تلاوت بھی کر لینا..... یہ مہینہ تو عبادت و ریاضت کا مہینہ ہے۔ اس نے امی کی طرف دیکھا منہ سے کچھ بولا نہیں اٹھ کھڑا ہوا مگر دل ہی دل میں بولا۔ ”امی! آپ بھی اللہ میاں کی خوشنودی کے لیے..... جبکہ اللہ میاں کو تو ہماری کوئی فکر ہی نہیں۔“

کبھی کبھی وہ امی سے بھی ایسی باتیں کہہ جاتا تھا۔ ”امی! روزے رکھ کر کچھ مزہ نہیں آتا۔“ ”یہ کیا بات کہہ دی تم نے؟ کیوں مزہ نہیں آتا؟“ ”روزوں کا مزہ تو افطار کے وقت آتا ہے۔ ٹھنڈا ٹھار شربت فروٹ چاٹ کئی قسم کے پکڑے سمو سے رول چھوٹے دی بڑے اور..... اور.....“ ”مگر ہمارے دسترخوان پر تو ایسی کوئی ایک چیز بھی نہیں ہوتی۔“ جمیلہ اس کی بات کاٹ کر بول پڑی۔ جمیلہ

ذیشان کی چھوٹی بہن تھی..... اور اب وہ بھی روزے رکھنے لگی تھی۔ ”بیٹا! یہ مہینہ.....“ ”صبر و شکر کا ہے۔“ بیٹا گویا ماں کا جملہ مکمل کر کے ہوئے کہتا۔ ”اور ہمارے دسترخوان میں بس اسی کی بہار ہے۔“

صابرہ بیگم دل مسوس کر رہ جاتی تھیں۔ بچے جیسے جیسے بڑے ہوتے جا رہے ہیں ان کے جذبات و احساسات ان کے لبوں تک آتے جا رہے ہیں مگر میں کروں بھی تو کیا کروں..... جن حالات سے ہم گزر رہے ہیں ان کا ان بچوں کو ابھی اندازہ نہیں ہے۔ چینی کی قیمت پچاس روپے سے اوپر ہو گئی ہے۔ مین اسی روپے کلو ہو گیا ہے کھی میل بھی تقریباً سونے کے بھاؤ بک رہے ہیں۔ بیگم ثروت جیسی خوش حال خاتون جب پھلوں اور اشیائے ضروریہ کی منگائی کا رونا روتی ہیں تو میں بے چاری جوان جیسوں کے گھروں میں جھونے برتن دھو کر گزارا کرتی ہوں اس گرانی کا کیا مقابلہ کر سکتی ہوں؟ میرے دسترخوان پہ تو بس سادہ پانی ہی ہو سکتا ہے یا روٹی کے سوکے ٹکڑے! بچوں کا اعتراض بھی غلط نہیں ہے مگر انہیں علم نہیں کہ اب یہ روٹی بھی کتنی مہنگی ہو گئی ہے۔ آٹے کی قیمت بڑھ کر تیس چونتیس روپے کلو ہو گئی ہے۔

ذیشان مسجد سے عصر کی نماز پڑھ کے اور تلاوت کر کے گھر واپس آیا تو مغرب کا وقت قریب آ گیا تھا۔ جمیلہ اور نبیلہ نے دسترخوان بچھایا تو ذیشان نے دل ہی دل میں کہا۔ ”آخر اس اہتمام کی کیا ضرورت ہے۔ ایک گھونٹ پانی پی کر ہی تو روزہ افطار کرنا ہے اور پھر وہی روٹی جو روز بروز چھوٹی ہوتی جا رہی ہے اور امی کے صبر و شکر کی تلقین بڑھتی ہی جا رہی ہے۔“

ذرا دیر بعد جب وہ دسترخوان پر آ کر بیٹھا تو چوہے کے بغیر نہیں رہا۔ آج تو دسترخوان پر افطار کے کچھ لوازمات نظر آ رہے تھے۔ کچھ پکڑے سمو سے اور چھوٹوں کے علاوہ فروٹ چاٹ کی بھی صورت نظر آ رہی تھی مگر اس کی طرح ان چیزوں کے چہروں پر بھی تازگی کی چمک نہیں تھی۔ اس کی سمجھ میں بات آ گئی۔ یہ ساری باسی چیزیں ہیں کل کی بچی کچھی ہیں یقیناً صبح امی بیگم ثروت یا کسی اور بیگم صاحبہ کے گھر سے لائی ہوں گی۔ اس نے سوچا ایسے

اسی گھر ہیں جہاں کھاپی کراتی چیزیں بچ بھی جاتی ہیں جنہیں بعد میں پھینک دیا جاتا ہے یا ماسیوں کو دے دیا جاتا ہے۔ اذان کے بعد اس نے دیکھا کہ جمیلہ اور نبیلہ بڑی رغبت سے افطار کر رہی ہیں۔ آج ان کے چہروں پر ایک رونق سی نظر آ رہی تھی۔ اُس نے پانی کا گلاس اٹھا کر جب معمول پانی کے گھونٹ سے روزہ کھولا پھر امی کی پانی ہوئی چپانی پر آ لوکی بھجیا ڈال کر اس کے لقمے بنا کر منہ میں ڈالنے لگا۔

”بھائی! پکڑے کھاؤ نا!“ چھوٹی بہن نبیلہ نے اس سے کہا۔ ”ان باسی پکڑوں سے میرے لیے تازہ روٹی زیادہ بہتر ہے۔“

صابرہ بیگم نے چونک کر بیٹے کی طرف دیکھا۔ کچھ بولنے کی کوشش کی لیکن بولیں نہیں۔ یہ لڑکا بہت حساس ہے۔ انہوں نے سوچا اس سے پہلے بھی مجھے ٹوک چکا ہے کہ دوسروں کے گھروں سے بچا کچھا اور جھوٹا کھانا نہ لایا کریں۔ اُن سے پیٹ تو بھر جاتا ہے لیکن..... لیکن کے بعد شاید اس نے دانستہ کچھ نہیں کہا تھا لیکن مجھے اندازہ ہے وہ یہی کہنا چاہتا ہوگا کہ لیکن صبر مردہ ہو جاتا ہے۔ یہ تو میں بھی جانتی ہوں..... لیکن یہ لڑکا شاید ابھی یہ نہیں جانتا کہ جب جسم کو روزہ رکھنے کا مسئلہ درپیش ہوتا ہے تو جسم اور ضمیر میں سے کسی ایک کے حق میں فیصلہ کرنا پڑتا ہے۔

انہوں نے بیٹے کو مجبور نہیں کیا کہ وہ باسی پکڑے کھائے۔ البتہ دل ہی دل میں یہ سوچنے لگیں جب اتنا کچھ ان لوگوں کے گھروں میں بچ جاتا ہے تو وہ افطار سے پہلے ہمیں کیوں نہیں دیتے۔ بیگمات یہ بھی تو کہہ سکتی ہیں۔ ”اذان سے پہلے آ کر افطار لے جایا کرو۔“

ذیشان واقعی بہت حساس ہے۔ اکثر اپنے اور اپنے گھر والوں کے بارے میں سوچتا رہتا ہے۔ سوچ سوچ کر پریشان ہوتا رہتا ہے۔

ایک بار اس کے ایک کلاس فیلو نے اس کو پریشان دیکھ کر کہا تھا۔ ”اگر تو اپنے حالات بدلنا چاہتا ہے اور گھر والوں کے لیے کچھ کرنا چاہتا ہے تو کوئی انقلابی فیصلہ کیوں نہیں کرتا؟“

”میں کچھ سمجھا نہیں یا! یہ انقلابی فیصلہ کیا ہوتا ہے

اور کیسے کیا جاتا ہے؟“ ”قربانی۔“ ”کیسی قربانی؟ کس کی قربانی؟“ ”اپنی جان کی قربانی۔“ ”یار! تو مجھے پہیلیاں کیوں بھجوا رہا ہے۔ کل کر صاف بات بتا۔“

صاف صاف بات یہ ہے میرے دوست کہ تجھے اپنی جان کی بازی لگانا ہوگی اور اپنے خاندان اور گھر کے لوگوں کی بہتری کے لیے ان لوگوں سے ملنا پڑے گا جو یہ نیک کام کرتے ہیں۔ دنیا کا دستور ہے۔ اس ہاتھ دے اس ہاتھ لے۔ تم ان کے لیے کام کرو گے وہ تمہارے ساتھ تعاون کریں گے۔“

”یہ کون لوگ ہیں؟ کیسا نیک کام ہے؟ مجھے ان کے لیے کیا کرنا پڑے گا؟ وہ میرے لیے کیا کریں گے؟ یہ باتیں اب تک صاف نہیں ہوئی ہیں۔ سوائے اس کے کہ مجھے جان کی بازی لگانا پڑے گی۔“

”میرا خیال ہے ذیشان تو بچ بچ پریشان ہے اور میری طرح پریشان ہے۔ جیسی تیری سمجھ تیرا ساتھ نہیں دے رہی ہے۔“ یہ کہتے ہوئے اس لڑکے نے ایک اخباری تراشا اس کے ہاتھ میں تھما دیا۔

ذیشان نے اس پر نظر ڈالی۔ لکھا تھا۔ ”خود کش بم دھماکا۔ بمبار نے بھرے بازار میں خود کو اڑا دیا۔ متعدد افراد جاں بحق اور زخمی۔“

ذیشان نے گھبرا کر تراشے سے نظریں ہٹالیں۔ ”تمہارا مطلب ہے..... میں بھی.....؟“ پھر کلاس فیلو کے جواب دینے سے پہلے خود ہی بول پڑا..... ”یہ تو بڑا مشکل کام ہے..... میں نہیں کر سکوں گا۔“ اس کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا اور وہ دھیرے دھیرے کانپ رہا تھا۔

اس کا ساتھی ہنس پڑا اور بڑے استہزائیہ انداز میں بولا۔

”بس غبارے کی ہوائ نکل گئی؟ اے یار! تو تو کہتا تھا میں اپنے گھر والوں کی بہتری کے لیے سب کچھ کر گزروں گا..... مگر تو تو اس چھوٹی سی آزمائش پر بھی پورا نہیں اتر سکتا۔ لعنت ہے تجھ پر۔“

کوئی اور موقع ہوتا تو وہ لعنت ملامت کرنے والے کا منہ توڑ دیتا مگر اس وقت وہ بالکل خاموش رہا۔ کچھ دیر

تک گم صم بیٹھا سوچتا رہا۔ پھر تھوڑے وقفے کے بعد دھیمے لہجے میں بولا۔ ”پرویز! میں سچ سچ پریشان ہوں“ بہت پریشان میرے گھر کی حالت بہت خراب ہے۔۔۔۔۔ گھر والے بہت دکھ مصیبت جھیل رہے ہیں۔ میں ان کے لیے کچھ کرنا چاہتا ہوں۔“

”مگر۔۔۔۔۔“ پرویز نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھ میں ہمت نہیں ہے۔ میں جان کی بازی لگانے کی بات تو کرتا ہوں لیکن جان دینے کا حوصلہ نہیں مجھ میں۔“

”نہیں پرویز! یہ بات نہیں۔“ ”دیکھ یار! آج کے دور میں جب کوئی کسی کو سو پچاس روپے قرض دینے کا بھی روادار نہیں اگر وہ لوگ اس کام کے لیے تجھے پانچ دس لاکھ روپے دے دیں تو یہ کون سا برا سودا ہے؟ ارے یار جان تو ایک ہی ہے اور وہ ایک نہ ایک دن تو جانی ہی ہے۔ اگر وہ اپنے خاندان کی بہتری اور خوش حالی کے لیے چلی جائے تو تیرے لیے اس سے اچھی بات کیا ہوگی؟“

”ٹھیک ہے میں سوچ کر جواب دوں گا۔“ پرویز گنگناٹے لگا۔ ”اپنے لیے تو سب ہی جیتے ہیں اس جہاں میں۔۔۔۔۔ ہے زندگی کا مقصد اوروں کے کام آنا!“

”مگر یار پرویز! وہ کون لوگ ہیں جو۔۔۔۔۔؟“ ”جب تو ہاں میں جواب دے گا تو بتا دوں گا۔“

وہ سوچنے لگا۔ اگر میری زندگی میری ماں اور بہنوں کے کام آ جائے تو اس سے اچھی بات کیا ہوگی۔ گھر گیا تو اس کے چہرے پر ایک چمک تھی۔۔۔۔۔ ماں پھر ماں ہوتی ہے۔ ماں کی نگاہیں بیٹے پر پڑیں تو اسے یہ سمجھنے میں دیر نہیں لگی کہ بیٹے کے چہرے کی یہ چمک کسی اندرونی جذبے کے تحت ہے۔ شاید کسی بات پر وہ خوش ہے۔ وہ چہرہ جس پر وہ اکثر اداسی کی پرچھائیاں دیکھتی تھیں۔ اس پر خوشی کا عکس نظر آیا تو وہ یہ کہے بغیر نہیں رہیں۔

”آج میرا بیٹا بہت خوش نظر آ رہا ہے؟“

”جی امی! میں خوش ہوں۔۔۔۔۔ بہت خوش۔۔۔۔۔“

”اچھا! کہیں سے کوئی خزانہ مل گیا ہے؟ یا ملنے والا ہے؟“

جی۔۔۔۔۔ جی ہاں۔۔۔۔۔ جی ہاں۔۔۔۔۔ کچھ ایسی ہی بات ہے۔“

صابرہ بیگم ایک دم محتاط ہو گئیں۔ وہ ہر وقت اس سوچ اور فکر میں رہتی تھیں کہ ان کا ذیشان خدا نخواستہ کبھی بہک نہ جائے۔ یہ عمر بڑی خطرناک ہوتی ہے۔ کسی غلط ساٹھی غلط دوست کی صحبت میں پڑ کر منفی راستہ اختیار نہ کر لے۔ آج کل تو بڑے اور خوش حال گھرانوں کے لڑکے بھی ایڈونچر کے نام پر انتہائی خطرناک راستے پر چل پڑتے ہیں۔

”کیسی بات ہے بھئی! کچھ مجھے بھی تو بتاؤ؟“ انہوں نے ذرارک کر خوشگوار موڈ میں پوچھا۔

وہ ایک دم گھبرا گیا۔ یہ امی نے کیا پوچھ لیا؟ کیا میں ان کو بتا دوں؟ نہیں مجھے بتانا نہیں چاہیے یہ تو نیکی کر کے جتانے والی بات ہو جائے گی۔

”کیا ہوا تم نے میری بات کا جواب نہیں دیا؟“ انہوں نے بیٹے کو سوچتا ہوا دیکھ کر ٹوکا۔

”وہ۔۔۔۔۔ وہ امی! بات دراصل یہ ہے کہ کچھ باتیں وقت سے پہلے بتانے کی نہیں ہوتیں۔ جب وقت آئے گا تو آپ کو معلوم ہو جائے گا۔“

”مگر میں تو یہ سمجھتی ہوں کہ ماں باپ اور چاہنے والے لوگوں سے کوئی بات بھی پوشیدہ رکھنے کا مطلب ہے بددیانتی یعنی وہ انہیں قابل بھروسہ نہیں سمجھتے قابل اعتبار نہیں گردانتے جیسی ان سے اپنی باتیں چھپاتے ہیں۔“

ذیشان عجیب مخمضے میں پڑ گیا تھا۔ وہ امی کو اپنی بات بتانا بھی نہیں چاہتا تھا اور امی کی بات سن کر چھپانا بھی اب اس کے لیے ممکن نہیں رہا تھا۔ انہیں نہ بتانے کا مطلب یہی ہوگا کہ میں ان سے سچی محبت نہیں کرتا ہوں لہذا اس نے یہی فیصلہ کیا کہ اُسے بتانا چاہیے۔ پہلے اس نے وہی شعر پڑھا جو اس نے پرویز سے سنا تھا۔ اپنے لیے تو سب ہی جیتے ہیں اس جہاں میں۔۔۔۔۔ ہے زندگی کا مقصد اوروں کے کام آنا!

پھر آہستہ آہستہ ساری باتیں بتا دیں۔ صابرہ بیگم کا جی چاہا کہ اس کے منہ پر ایسا زناٹے دار پھڑپھڑ مارے کہ اس کے منہ سے۔۔۔۔۔ مگر انہوں نے ایسا نہیں کیا۔ پہلے ان کے ماتھے کی شکنیں دور ہوئیں پھر ان کے تپنے ہوئے اعصاب ڈھیلے ہوئے پھر ان کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ذیشان نے ایک اطمینان بھرا سانس لیا کہ امی

پر امن نہیں ہوئیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اتنی بڑی رقم کی بات سن کر ان کی طبیعت میں ترنگ آگئی ہے۔۔۔۔۔

”بس لاکھ ڈیڑھ لاکھ ہی؟“ صابرہ بیگم نے تڑپے مایوس ہو کر کہا۔ ”یہ تو بہت کم ہیں ذیشان! میں نے تو تم سے اس سے کہیں زیادہ بلکہ بہت زیادہ کی امید لے رکھی ہے۔ یہ لاکھ ڈیڑھ لاکھ میرے کتنے دن کام آئیں گے؟ میں نے تو تم سے یہ آس لگا رکھی ہے کہ تم بڑھ کر بڑے آدی بن جاؤ گے تو مجھے زندگی بھر آرام سے رکھو گے عیش کراؤ گے۔ بہنوں کی شادی بیاہ کراؤ گے۔ میں تمہاری چاندی دہن لاؤں گی اور تمہارے بچوں کے ساتھ ہنس بول کر اپنے ماضی کا سارا دکھ درد بھول جاؤں گی۔“ وہ ذرارکیں۔ انہوں نے بیٹے کے چہرے کے تاثرات کا اندازہ لگایا پھر اپنی بات آگے بڑھائی۔ ”جو لوگ تمہیں لاکھ ڈیڑھ لاکھ دیں گے وہ تو تم سے بڑے کھانے کا سودا کر رہے ہیں۔ وہ اس حقیر سی رقم کے عوض نہ صرف میرا بیٹا مجھ سے چھین لیں گے بلکہ اور بہت سے لوگوں کے بیٹے بھائی اور باپ بھی چھین لیں گے جس طرح بھی تمہارے باپ کو کسی نے تم سے چھین لیا تھا۔ تم شاید یہ بات بھول گئے ہو کہ آج اگر تم اس حال میں ہو تو اس کا ذمہ دار بھی ہم دھما کا ہی تھا۔ تمہارے ابو تو دفتر سے گھر آ رہے تھے کہ دھماکے کی زد میں آ گئے اور اسپتال جا کر دم توڑ دیا۔ ان کا کیا قصور تھا؟ اور ان جیسے دوسرے بے گناہوں نے کیا خطا کی تھی؟ دھماکا کرنے اور کرانے والوں سے ان کی کیا دشمنی تھی؟ تمہیں تو شاید خود کش دھماکا کرنے پر آمادہ کرنے والے نے یہ بھی بتایا ہوگا کہ اس طرح تم سیدھے جنت میں چلے جاؤ گے یعنی آم کے آم گٹھلیوں کے دام۔ تمہارے لواحقین کو پیسا ملے گا اور تمہیں جنت کا ٹکٹ۔۔۔۔۔“

ذیشان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پرویز نے اس سے جنت کی بات تو نہیں کی تھی مگر اسے یہ بات معلوم تھی کہ خود کش بمباروں کو اس بات کی نوید بھی دی جاتی ہے کہ اس طرح تم سیدھے جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔ امی اپنی دھن میں کہے جا رہی تھیں۔ ”جنت میں تو ہمیں یہ لوگ انہیں سیدھے جہنم رسید کرتے ہیں۔ اللہ اور اس کے رسولؐ نے تو کسی چیونٹی کو بھی بے قصور مارنے کا

ذیشان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ پرویز نے اس سے جنت کی بات تو نہیں کی تھی مگر اسے یہ بات معلوم تھی کہ خود کش بمباروں کو اس بات کی نوید بھی دی جاتی ہے کہ اس طرح تم سیدھے جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔

امی اپنی دھن میں کہے جا رہی تھیں۔ ”جنت میں تو ہمیں یہ لوگ انہیں سیدھے جہنم رسید کرتے ہیں۔ اللہ اور اس کے رسولؐ نے تو کسی چیونٹی کو بھی بے قصور مارنے کا

حکم نہیں دیا ہے۔ پھر یہ کیسے گمراہ لوگ ہیں جو بے گناہوں کو مار کر جنت میں جانے کی خوش خبری سناتے ہیں؟“

”امی! یہ لوگ کون ہیں؟ اور ایسا کیوں کرتے ہیں؟“

”بیٹے! یہ سب کے سب بکے ہوئے لوگ ہیں جو ہمارے ملک میں انتشار پھیلانے کے لیے ہمارے بیرونی دشمنوں کے آلہ کار بنے ہوئے ہیں۔۔۔۔۔ ان سے بڑی بڑی رقمیں لے کر غریب اور مجبور لوگوں سے تخریبی کارروائی کرواتے ہیں ہمارے ملک میں بد نظمی پھیلاتے ہیں اس کی جڑیں کمزور کرتے ہیں۔“

”امی! ایسے لوگوں کے خلاف ہمیں کیا کرنا چاہیے؟“

”ان کے خلاف عام لوگوں میں یہ شعور پیدا کرنا چاہیے کہ جو بات اللہ اور اس کے رسولؐ کے حکم کے خلاف ہے اس پر ہرگز عمل نہیں کرنا چاہیے۔ اس کا حکم دینے والا یا عمل کرنے والا کوئی بھی ہوا اپنے آپ کو کتنا ہی معتبر بڑا اور بزرگ کیوں نہ بتاتا ہو۔۔۔۔۔ اس کی بات پر ہرگز بھروسہ نہیں کرنا چاہیے۔“ صابرہ بیگم زکریاں۔ انہوں نے بیٹے کی طرف دیکھا پھر بولی۔ ”ایک بار جہاد کے لیے جانثاروں کا انتخاب کیا جا رہا تھا۔ تمہاری عمر کے دولڑکے بھی آئے تھے اور بچوں کے بل کھڑے ہو کر اپنے آپ کو بڑا ثابت کرنے کی کوشش کر رہے تھے۔ رسول اللہ ﷺ نے اُن سے فرمایا۔

”تمہارے ماں باپ میں سے کوئی زندہ ہے؟“

”جی ہاں ہماری والدہ حیات ہیں۔“ ان میں سے ایک لڑکا بولا۔

”جاؤ۔۔۔۔۔ ان کی خدمت کرو۔ تمہارے لیے فی الحال وہی جہاد ہے۔ اگر تمہیں جنت کی جستجو ہے تو تمہارے لیے تمہاری ماں کے قدموں کے نیچے تمہاری جنت ہے۔“

شوہر کے انتقال کے بعد صابرہ بیگم نے عرفان کے بچوں کی پرورش و پرداخت کی ذمہ داری سنبھال لی تھی۔ عزیز رشتے داروں نے تو چند دنوں تک ہمدردی کا اظہار کیا تھا پھر آہستہ آہستہ سب دور ہوتے چلے گئے تھے۔ انہیں اس بات کا زیادہ دکھ نہیں ہوا تھا۔ اس دور میں سب

ہی لوگ پریشان ہیں! اپنے ہی بال بچے بھاری ہیں پھر دوسروں کی فکر کوئی کیسے کر سکتا ہے۔ لہذا مجھے خود ہی اپنی ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانا پڑے گا۔

انہوں نے ایک اسکول میں ملازمت کر لی کہ ماں باپ نے انہیں جو گریجویشن کرایا تھا شاید ان کا یہی مقصد تھا کہ کسی نئے وقت میں کام آئے۔ یہ عزت کی نوکری تھی اور وہ یہی کام کر سکتی تھیں۔ لیکن انہیں اسکول سے جو پیسے ملتے تھے وہ بہت تھوڑے تھے۔ ان سے ان کی آدمی ضرورت بھی پوری نہیں ہوتی تھی۔ وہ پریشان رہنے لگیں اور دبے لفظوں میں تنخواہ میں اضافے کی باتیں کرنے لگیں۔

”اے بی بی!“ میڈم نے ایک دن ان سے کہہ ہی دیا۔ ”اس سے زیادہ پیسے ہم نہیں دے سکتے۔ زیادہ پیسوں کی نوکری کرنی ہے تو گھروں کے جھوٹے برتن اور کپڑے دھونے کی نوکری کر لو۔ ہماری اس عزت کی نوکری سے بہت زیادہ پیسے مل جائیں گے نہیں۔“ اور صابرہ بیگم نے بھی ایک بار جھلا کر یہ فیصلہ کر لیا۔ ”بھاڑ میں جائے یہ عزت کی نوکری جس سے نہ پیٹ بھرے نہ میرے بچوں کی تعلیم جاری رہ سکے اور انہوں نے سچ مچ گھروں میں جھاڑو برتن کا کام شروع کر دیا۔

بچوں کو جب معلوم ہوا کہ ان کی ماں نے اسکول کی ملازمت چھوڑ کر گھروں کے گندے برتن دھونا شروع کر دیے ہیں تو انہوں نے اپنے طور پر بہت احتجاج کیا بہت روئے دھوئے۔

سب سے زیادہ دکھ ذیشان کو ہوا۔ ”امی! یہ آپ کیا کر رہی ہیں؟ کیوں اتنا برا اور گندہ کام کر رہی ہیں؟“ وہ کام جو ہم اپنے گھر میں کرتے ہیں تو برا نہیں سمجھا جاتا۔ وہی دوسرے گھروں میں جا کر کریں تو وہ برا کیوں سمجھا جائے؟ دوسرے گھروں کا کام کرنے میں کوئی برائی نہیں میرے لعل۔“

”امی! ہمارے جاننے والے سنیں گے تو کیا کہیں گے؟“

”سمجھ دار لوگ ہوں گے تو تعریف کریں گے۔ نا سمجھ ہوں گے تو ہنسیں گے لیکن کسی کے کہنے سننے سے ہمیں کیا لینا دینا۔“

”امی! آپ دوبارہ اسکول کی نوکری کر لیں۔“ آدمی روئی کھا کر..... ایک وقت بھوکے رہ کر گرا کر لیں گے۔“

”بیٹے! مسئلہ صرف روٹی کا نہیں۔ تم لوگوں کی تعلیم کا بھی ہے۔ روٹی کھلائے بغیر میں تم لوگوں کو سلا تو سکتی ہوں۔ لیکن تعلیم سے محروم رکھ کر میں کوئی عزت کی نوکری نہیں کر سکتی۔“

بڑی مشکلوں سے بچوں کی سمجھ میں ماں کی بات آئی تھی۔ ذیشان نے تنہائی میں اس مسئلے پر غور و فکر کیا تو اس نتیجے پر پہنچا کہ میری ماں بہت عظیم ہے۔ بی بی اے پاس ہونے کے باوجود ایسی چھوٹی اور گھٹیا ملازمت محض اس لیے کر رہی ہے کہ اپنی کی کا بھی ہمیں احساس نہ ہو۔ ابو کے نہ ہونے پر ہم تعلیم سے محروم نہ رہ جائیں۔ وہ ماں سے محبت تو پہلے سے کرتا تھا مگر اب اس محبت میں بہت زیادہ اضافہ ہو گیا تھا۔ ماں سے اس نے اس محبت کے نتیجے میں ان کے لیے اپنی جان قربان کرنے کا فیصلہ کیا تھا مگر جب ماں نے اسے سمجھایا کہ اس کا فیصلہ غلط ہے۔ اس کی ماں کو تو اس سے کہیں زیادہ توقعات وابستہ ہیں تو اس نے ایک نئے عزم و ارادے کے ساتھ ان کی توقعات پر پورا اترنے کے لیے اپنے آپ کو تیار کر لیا۔ پرویز سے اس کی ملاقات ہوئی تو اس نے پوچھا۔

”تم نے کیا فیصلہ کیا؟“

”ٹھیک ہے میں رضا مند ہوں لیکن اس بات کا اطمینان کرنا چاہتا ہوں کہ وہ کون لوگ ہیں جنہوں نے اس نیک کام کا بیڑہ اٹھایا ہے؟ کیا تم ان کے بارے میں بتاؤ گے؟“

”بھئی ذیشان! سچی بات تو یہ ہے کہ میں ان کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ بس ایک صاحب کی زبانی ان کی باتیں سنی ہیں۔“

”یہ کون صاحب ہیں؟“

”جس گراؤنڈ میں میں کرکٹ کھیلنے جاتا ہوں وہاں ایک بارلش نوجوان بھی کبھی کرکٹ کھیلنے آتے ہیں۔ وہی اکثر دنیا داری سے ہٹ کر دین کی باتیں بھی شروع کر دیتے ہیں اور جنت اور اس کی آسائشوں کا ذکر بھی چھیڑ دیتے ہیں اور کہتے ہیں ”جو لوگ زندگی بھر دین کی پیروی کریں گے نیکی اور سچائی کے راستے پر چلیں گے“

وہی جنت کے حقدار ہوں گے لیکن جنت میں جانے کا ایک شارٹ کٹ بھی ہے اور وہ ہے دسین مبین کے ہتھوں کا صفایا اور اس کے لیے اپنی جان کی بازی لگانا۔“

”تو تم ان کی باتوں سے متاثر ہو؟“

”ہاں بھی اور نہیں بھی۔“

”یہ کیا بات ہوئی؟“

”جنتی! جنت کی تمنا تو مجھے بھی ہے مگر ابھی میں مرنا ہی نہیں چاہتا..... اگرچہ انہوں نے مجھے پیسوں کا لالچ بھی دیا کہ لاکھ ڈیڑھ لاکھ روپے ہم تمہارے لواحقین کو بھی دیں گے تاکہ ان کے کام آئے۔“

”اس کے باوجود بھی تم ان کے کہنے پر نہیں چلے؟“

”شاید وہ یہ سمجھتے ہیں کہ میں کسی غریب گھرانے سے تعلق رکھتا ہوں۔ مگر تم جانتے ہو کہ مجھے ایسی کوئی مجبوری نہیں کہ میں لاکھ ڈیڑھ لاکھ کے عوض اپنی زندگی کا سودا کروں اس لیے میں ہوں ہاں کہہ کر انہیں ٹالتا رہتا ہوں۔ تم نے اپنی اور اپنے گھر والوں کی پریشانی کا ذکر کیا اور ان کے لیے کچھ کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تو میں نے تمہیں ان تک پہنچانے اور ان سے فیض اٹھانے کا مشورہ دیا۔“

ذیشان چند لمحے سوچتا رہا پھر بولا۔ ”مجھے کسی وقت ان سے ملا دو۔“

”ٹھیک ہے تم آج میرے ساتھ کرکٹ گراؤنڈ چلو۔“

ذیشان اُن سے محض اس لیے ملنا چاہتا تھا کہ انہیں گرفتار کروا کر دہشت گردوں تک پولیس کی رسائی ممکن بنائے مگر اُن سے اس کی ملاقات نہ ہو سکی۔ کئی دن تک وہ مسلسل جاتا رہا مگر اس داڑھی والے نوجوان سے شرف باریابی حاصل نہیں ہوئی۔

پرویز نے کرکٹ کھیلنے والے اپنے ساتھیوں سے بھی ان کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے یہی بتایا۔

”اسے وہ مولوی! وہ تو کافی دنوں سے ادھر نہیں آیا۔“

”ارے یار! وہ کرکٹ کھیلنے کب آتا تھا۔ تبلیغ کرنے آتا تھا۔“ ایک لڑکے نے کہا۔ ”یہاں کسی نے اسے لفت نہیں کرائی شاید اسی لیے یہاں آنا اس نے ترک کر دیا۔“

”یا پھر.....“ ذیشان نے دل ہی دل میں کہا۔ ”جنت کا ٹکٹ دینے والا خود ہی شارٹ کٹ کے راستے

جنت پہنچ گیا۔“

بہر حال صابرہ بیگم کو ذیشان کی یہ بات اچھی لگی تھی کہ باسی پکوڑوں سے میرے لیے گھر کی تازہ روٹی بہتر ہے۔ اگلے روز دسترخوان پر کچھ گرم پکوڑے بھی تھے۔ ذیشان نے انہیں گھور کر دیکھا۔ ”کہاں سے آئے ہیں یہ پکوڑے؟“

”کہیں سے بھی نہیں۔“ جیلہ بولی۔ ”امی نے بنائے ہیں۔“

”خاص طور پر آپ کے لیے۔“ جیلہ نے بہن کی بات آگے بڑھائی۔ اس وقت صابرہ بیگم دسترخوان پر نہیں آئی تھیں۔ ذرا دیر بعد وہ آنچل سے وضو کا پانی خشک کرتے ہوئے آئیں تو ذیشان نے انہیں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ”امی آپ نے یہ فضول خرچی کیوں کی؟“

”کیسی فضول خرچی بیٹا؟“

”اسی روپے کلو کا بیسن، ایک سو ستر روپے کلو کا تیل..... اور میری پیاری امی کی محنت کیا یہ فضول خرچی نہیں؟“

صابرہ بیگم مسکراتے ہوئے بولیں۔ ”کیا کریں میرا بیٹا باسی پکوڑے نہیں کھاتا اس لیے سوچا آج تھوڑی فضول خرچی کر لی جائے مگر کبھی کبھار کی ایسی فضول خرچی کو فضول خرچی نہیں کہتے۔“

ذیشان کچھ کہنے جا رہا تھا کہ اسی وقت اذان کی آواز آئی اور اس نے ماں بہنوں کے ساتھ افطار کی دعا پڑھنا شروع کر دی۔

روزے کم ہوتے جا رہے تھے اور عید کا دن قریب آتا جا رہا تھا جبکہ ذیشان کی اداسی آہستہ آہستہ بڑھتی جا رہی تھی۔ کیا روزوں کی طرح عید بھی پھسکی اور بے مزہ گزر جائے گی؟ وہ سوچتا رہتا۔

ایک دن وہ عشاء اور تراویح پڑھ کر گھر آیا تو صابرہ بیگم نے اسے اپنے پاس بلایا اور بولیں۔ ”یہ بتاؤ یہ کیسے ہیں؟“

”یہ کیا ہیں امی؟“

”تم دیکھ کر خود بتاؤ یہ کیا ہیں؟“ اس نے الٹ پلٹ کر دیکھا۔ ”یہ تو..... یہ تو لگتا ہے..... جیلہ جیلہ کے سوٹ ہیں۔“ پھر اگلے ہی لمحے وہ پوچھ رہا تھا۔ ”کون لایا یہ سوٹ؟ آپ کی کسی بیگم صاحبہ نے تو صدقہ نہیں کیا ہے؟“

سچی کہانیاں 157

”نہیں بھائی جان۔“ نبیلہ پٹ سے بول پڑی۔
 ”یہ امی نے خود کیا ہے۔“
 ”ہاں بھائی جان!“ جیلہ نے تائید کرتے ہوئے
 کہا۔ ”امی نے اپنے اچھے دنوں کے کپڑوں سے ہمارے
 لیے یہ سوٹ تیار کیے ہیں۔“
 ذیشان نے ماں کو عجیب نگاہوں سے دیکھا جیسے کہہ
 رہا ہو آپ نے یہ کیا کیا؟ صابرہ بیگم دھیرے سے
 بولیں۔ ”ارے بیٹا! اب یہ کپڑے میں استعمال تو نہیں کر
 سکتی اس لیے ان سے ان دونوں کے عید کے جوڑے بنا
 دیے۔“ یہ کہتے ہوئے انہوں نے ایک اور جوڑا اس کے
 پاس رکھ دیا۔

”یہ کیا ہے امی؟“

”تمہارا عید کا جوڑا۔ تمہارے ابو کے کپڑوں میں
 سے ایک کو لے کر تمہارے ٹاپ کا بنا دیا ہے۔“ ابو کے نام
 پر اس کی آنکھیں بھیگ گئیں۔ ابو ہوتے تو امی کو یہ سب
 کچھ کرنا نہیں پڑتا۔ اس نے سوچا وہ امی سے پوچھنا چاہتا
 تھا کہ آپ نے اپنے لیے کیا کیا؟ مگر اس کی ہمت نہیں
 ہوئی۔ کاش میں ہی اس قابل ہوتا کہ اپنی ماں کو عید کا جوڑا
 لا کر دے سکتا۔ امی کہہ رہی تھیں۔ ”تم لوگوں کو میں نیا
 جوڑا پہننے دیکھوں گی تو میری عید ہو جائے گی۔“
 ماں بھی کیسی عجیب مخلوق ہوتی ہے جس کی ساری
 خوشیاں بچوں سے مشروط ہوتی ہیں۔ چاند رات کی
 خوشیوں میں صابرہ بیگم کے بچے بھی خوش تھے اور وہ جیلہ
 اور نبیلہ کے کھلے کھلے چہرے دیکھ کر خود بھی خوشیوں سے
 سرشار ہوئی جا رہی تھیں۔

اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ نبیلہ دوڑ کر
 دروازے پر گئی پھر واپس آ کر بولی۔ ”امی! بھائی جان
 کے کوئی دوست ہیں۔ ان کو پوچھ رہے ہیں۔ میں نے کہا
 وہ تو باہر گئے ہوئے ہیں تو انہوں نے کہا پھر مجھے ان کی
 امی سے ملو ادیس۔“

”جاؤ انہیں اندر لے آؤ۔“

نبیلہ بھاگ کر گئی۔ واپس آئی تو اس کے ساتھ
 ذیشان ہی کی عمر کا ایک لڑکا تھا۔ اس نے صابرہ بیگم کو سلام
 کیا پھر بولا۔ ”آئی! میرا نام پرویز ہے۔ میں ذیشان کا
 کلاس فیلو ہوں۔“

”بولو بیٹا! کوئی کام ہے اس سے؟ وہ تو ابھی باہر گیا

ہے۔“
 ”میں اسے یہ خوش خبری سنانے آیا ہوں اور اس کا
 شکریہ ادا کرنے آیا ہوں کہ میری امی کو ہوش آ گیا ہے
 اور اب انہیں کوئی خطرہ نہیں۔“
 ”کیا ہو گیا تھا بیٹا! تمہاری امی کو؟“
 ”دو روز پہلے کی بات وہ شاپنگ کر کے آرہی تھی
 کہ دو ڈاکوؤں نے ان سے پرس اور سامان چھیننے کی
 کوشش کی، امی نے زرا مزاحمت کی تو انہوں نے ان پر
 گولی چلا دی۔“

”اوہ!“ صابرہ بیگم کے منہ سے تاسفی کلمہ نکلا۔
 ”اُن کی جان بچانے کے لیے خون کی ضرورت تھی
 مگر ان کے گروپ کا خون نہیں مل رہا تھا بس اسے اتفاق
 ہی کہیے کہ ذیشان کا وہی گروپ تھا۔ اس نے کہا جتنے خون
 کی ضرورت ہو مجھ سے لے لیجیے۔ ابو نے بہت کہا کہ خون
 کی قیمت لے لو۔ وہ ناراض ہو گیا۔ وہ بھی تو میری ماں کی
 طرح ہیں۔ کوئی بیٹا ماں کی جان بچا کر اس کی قیمت لیتا
 ہے؟ آئی! آپ کا بیٹا بہت گریٹ ہے۔“ یہ کہتا ہوا پرویز
 دروازے کی طرف پلٹا پھر واپس آ کر بولا۔

”ارے! یہ تو میں بھول ہی گیا۔“ اس نے اپنے
 ہاتھ میں پکڑے ہوئے شاپر کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔
 ”یہ ابو نے بھیجا ہے۔“

اس نے وہ شاپر رکھا اور بھاگ کر دروازے سے
 باہر چلا گیا۔ صابرہ بیگم اور ان کی دونوں بچیاں چند لمحوں
 تک اس شاپر کو گھورتی رہیں پھر صابرہ بیگم نے ہاتھ بڑھا
 کر اسے اٹھالیا۔ اس کے اندر سے ایک زنانہ سادہ سوٹ
 نکلا اور ایک لفافہ لفافے میں ہزار ہزار کے تین نوٹ تھے
 اور ایک پرچہ بھی تھا۔ پرچے پر لکھا تھا۔

بیٹا ذیشان! تم جس عظیم ماں کی اولاد ہو، میں خود
 آ کر ان کا شکریہ ادا کرنا چاہتا تھا مگر ایک ضروری کام کی
 وجہ سے خود نہ آ سکا۔ پرویز کو بھیج رہا ہوں۔ اس میں
 تمہاری امی کے لیے عید کا جوڑا ہے اور تمہارے اور
 تمہاری بہنوں کی عیدی ہے انکار نہ کرنا ورنہ ہمارا دل
 ٹوٹ جائے گا۔

دعا گو
 تمہارا اکل

☆☆.....☆☆

موت کا عمل

بشری سعید

محبت، نفرت اور احترام کے جذباتوں
 سے گندھی ایک خوبصورت تحریر



خصوصی صورتی اور نفاست سے سجے کمرے میں بیچ پر بیٹھی دہن نے غرور سے گردن اٹھا کر اپنے ارد گرد کا جائزہ لیتے ہوئے اطمینان کا سانس لیا۔ آخر یہ سب حاصل کرنے کے لیے اُس نے سات سال کا بن باس کاٹا تھا اور کڑی تپسیا کی تھی۔ پھر جا کر یہ دن دیکھنا نصیب ہوا تھا۔ دروازے پہ آہٹ ہوئی تو دہن کی بے تاب اور منتظر نظریں دروازے کی جانب اٹھیں۔

☆.....☆.....☆

”بس کرو زریاب اور کتنا مارو گی اس غریب کو۔“
آسیہ بیگم جو زریاب کی ماں تھیں نے گیارہ سالہ زریاب کے عتاب سے چھ سالہ کمزور بی ملازمہ کو بچاتے ہوئے کہا۔

”اس کی جرات کیسے ہوئی ہماری گڑیا کو ہاتھ لگانے کی ہم اس کے ہاتھ جلادیں گے۔“
گیارہ سالہ غرور اور تکبر کے پیکر زریاب نے گرم گرم استری اُس غریب کے ہاتھوں پر لگانے کی کوشش کی۔ جسے بروقت آسیہ بیگم نے ناکام بنا دیا اور اُس کے ہاتھ سے استری پکڑ کر ایک طرف رکھتے ہوئے کہا ”بری بات ہے زریاب کیا ہوا جو اس غریب نے تمہاری گڑیا کو ہاتھ لگا دیا۔ یہ کوئی گناہ تو نہیں اگر تمہاری نظر میں ہے بھی تو معاف کرنا سیکھو۔“

انہوں نے غصے سے کہا تو زریاب بولی۔ ”معاف اوں! ہم کسی کو معاف نہیں کرتے، ہم بدلہ لیتے ہیں، ہم چوہدری ہدایت اللہ کی اکلوتی بیٹی ہیں۔ کوئی معمولی لڑکی نہیں ہیں ہم، کوئی ہماری برابری نہیں کر سکتا۔“ زریاب نے غصے سے فح کر جاتی ہوئی ملازمہ کو دیکھ کر کہا۔ ”توبہ کرو توبہ زریاب اللہ تعالیٰ کو غرور پسند نہیں ہے اور اُس کی نظر میں سب انسان برابر ہیں۔ آج ہم معاف کریں گے تو کل وہ ہمیں معاف کرے گا۔“

آسیہ بیگم نے دکھ افسوس اور خوف سے اپنی لاڈلی بیٹی کو دیکھ کر کہا جو کب کی اندر جا چکی تھی۔

☆.....☆.....☆

چوہدری ہدایت اللہ اور چوہدری حیات اللہ دو ہی بھائی تھے۔ اُن کی کوئی بہن نہ تھی بلکہ پچھلی چار نسلوں سے اُن کے خاندان میں کوئی بیٹی نہ تھی۔ چوہدری ہدایت اللہ بڑے تھے اور اُن کے دو بیٹے فواد اور جواد تھے جبکہ

چوہدری حیات اللہ جو چھوٹے تھے اُن کا ایک ہی بیٹا شاہنواز تھا۔ یہ خاندان لاہور کے قریب شاہدرہ کے علاقے میں بسا ہوا تھا جہاں دونوں بھائیوں نے ساتھ ساتھ گھر بنوائے تھے۔ مل اور خاندان تھا دولت کی ریل پیل تھی۔ کسی غم کا دور دور تک وجود نہ تھا۔

پھر ایک دن اس خاندان کی خوشیوں اور بھی بڑھ گئیں۔ جب چوہدری ہدایت اللہ کو خدا نے دو بیٹوں کے بعد ایک بیٹی سے نوازا۔ جس کا نام انہوں نے زریاب رکھا۔ سارے خاندان کی آنکھوں کا تارا زریاب سب کی لاڈلی اور پیاری بیٹی تھی۔ ہر بات زبان پر آنے سے پہلے پوری کر دی جاتی۔ ہر خواب دیکھنے سے پہلے سچ ہو جاتا تھا۔

زریاب حسن کا جیتا جاگتا جسم تھی۔ سفید دودھیا رنگ سیاہ کالے لمبے بال اور بڑی بڑی غزالی آنکھیں ایک بار دیکھ لینے والے کو ناگل کر دیتی تھیں۔ وہ اندر سے کس قدر بد صورت ہے یہ کوئی نہیں جانتا تھا۔ ہر جگہ اپنا نام سن کر ہر وقت اپنی بات منوا کر اُسے اپنے علاوہ کوئی دیکھائی نہیں دیتا تھا اور اپنی خوشی اپنی ضد اور اپنی خواہش پوری کرنے کے لیے وہ کسی بھی حد تک جاسکتی تھی اور کسی بھی حد تک گر سکتی تھی۔ اپنی ہر خوشی پوری کرواتے کرواتے زریاب نے جوانی کی دہلیز پر قدم رکھ دیا تھا۔

جوانی نے جہاں زریاب کے حسن میں اضافہ کیا تھا وہاں وقت نے بھی اُس کی ظالمانہ فطرت میں اور بھی اضافہ کر دیا تھا۔ اب اُس کی خواہش چھوٹی موٹی نہیں بلکہ چوہدری حیات اللہ کا اکلوتا بیٹا شاہنواز تھا جو لاہور میں انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ اتنے بڑے مل اور کا بیٹا ہونے کے باوجود اُسے تعلیم حاصل کرنے کا بچپن سے شوق تھا۔

یہی شوق آخر کار شاہنواز کو لاہور کی سب سے بڑی انجینئرنگ یونیورسٹی تک لے آیا۔

شاہنواز مردانہ وجاہت کا پیکر، خوب صورت، ذہین، حساس اور من مو جی سانو جوان تھا۔ اکیسویں صدی کی فلو پطرحہ اُس کے گھر میں موجود تھی لیکن اُس نے دل دیا بھی تو اپنے دوست کی کزن حمنہ کو۔

حمنہ شیراز کے دوست ابرار کے چچا کی بیٹی تھی جو نارنگ منڈی کے بہت بڑے زمیندار تھے اور آج کل سیاست میں بھی تھے۔ اتنے بڑے زمیندار کی بیٹی ہونے

کے باوجود حمنہ اخلاق اور کردار کا بہترین نمونہ تھی اور حسن و حسن چہرہ کر بولتا تھا۔

☆.....☆.....☆

”زریاب! ہزار بار کہہ چکی ہوں کہ بی اے کی امتحان میں منگوا کر تیاری شروع کرو مگر تم ہر وقت آنے کے سامنے بیٹھی اپنا وقت ضائع کرتی رہتی ہو۔“ آسیہ بیگم نے زریاب کو آئینے کے سامنے بیٹھی بال سنوارتے دیکھ کر کہا۔ ”بس اماں ہم نے نہیں پڑھنا مزید آپ اب چچی سے ہماری اور شاہنواز کی شادی کی بات کریں۔“

زریاب نے ہنسنے پرش ایک طرف رخ کر کہا۔ ”اسی لیے تو کہہ رہی ہوں کہ مزید پڑھو شاہنواز کو دیکھا ہے۔ ماشاء اللہ پورے خاندان میں سب سے زیادہ تعلیم یافتہ ہے اور تم..... ویسے بھی تعلیم آگئی اور شعور دیتی ہے۔“ آسیہ بیگم نے زریاب کو سمجھاتے ہوئے کہا۔ ”آگئی اور شعور بہت ہے ہم میں۔“ زریاب نے غرور سے گردن اٹھا کر کہا۔

”ہاں ہاں دیکھا میں نے بہت ہے..... آج پھر تم نے زریابہ کو پیٹا۔ ملازموں پر ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں ہے ہمیں۔ اللہ تعالیٰ ناراض ہوتے ہیں۔“

آسیہ بیگم نے کہا۔ ”اور ملازم بے شک کچھ بھی کریں زریابہ نے میرا سوٹ جلا دیا تھا استری کرتے ہوئے جانتی ہیں نا ہمارا سوٹ کتنا قیمتی تھا۔ اُس کی پارے سال کی تنخواہ سے بھی زیادہ۔“ زریاب نے غصے سے کہا۔

”بیٹا! درگزر کرنا سیکھو۔“ آسیہ بیگم نے دکھ اور افسوس سے اپنی بیٹی کو دیکھتے ہوئے کہا۔

”درگزر ہوں حساب برابر کرتے ہیں ہم درگزر نہیں کرتے۔“ زریاب نے بڑے فخر سے بتایا۔

”ڈرو اُس دن سے زریاب جب اللہ تعالیٰ حساب برابر کریں گے۔ اُس دن اگر انہوں نے اپنا فضل نہ کیا ہے بددول پر تو ایک چوٹی بھی جو انجانے میں ہمارے پاؤں کے نیچے آئی ہے اُس کا بھی حساب برابر ہوگا۔“ آسیہ بیگم نے غصے سے کہا تو زریاب سر جھٹک کر چلی گئی۔

☆.....☆.....☆

”اچھا کیا تم نے جو گھر کا چکر لگا لیا تمہاری صورت ایسی کوثر کی گئی تھی میں۔“ رفعت بیگم نے محبت سے

شاہنواز کا ماتھا چوم کر کہا۔

”اب کیا ارادہ ہے بیٹے تمہارا؟“ چوہدری حیات اللہ نے بیٹے کو گلے لگا کر کہا۔

”اب اسلام آباد کا ارادہ ہے بابا جان وہاں سے جاب کا لیٹر آیا ہے۔“ شاہنواز نے مسکرا کر کہا۔

”جاب! میرا تو خیال تھا تم تعلیم مکمل کر کے بزنس سنبھالو گے۔ یہ جاب کا کب سوچ لیا تم نے؟“ حیات اللہ نے پوچھا۔

”بابا جان! یہ تو پہلے ہی طے تھا کہ میں جاب کروں گا۔ آپ ہیں نا بزنس سنبھالنے کے لیے پھر میں بھی کبھی کبھی آفس آیا کروں گا۔“ شاہنواز نے کہا۔

”بیٹا! میں کب تک ہوں میرے بعد تم نے ہی یہ سب دیکھنا ہے۔“ حیات اللہ نے کہا۔

”اللہ نہ کرے بابا جان جو آپ کو کچھ ہو آپ ہیں تو میں ہوں۔“ شاہنواز نے تڑپ کر باپ کے سینے سے لگتے ہوئے کہا۔

”ارے ارے آپ باپ بیٹا جذباتی ہو گئے۔“ رفعت بیگم نے ہنستے ہوئے کہا اور شاہنواز سے بولیں ”چلو اب آہی گئے ہو تو تمہاری شادی کی بات بھی کر لیں مجھے تو بس تمہارا ہی انتظار تھا۔ اب کل ہی بھابھی کی طرف جا کر شادی کی بات کرتی ہوں۔“ رفعت بیگم نے خوش ہو کر کہا۔

شاہنواز نے فوراً پوچھا۔ ”تایا ابو کی طرف کیوں؟“ ”ارے بھئی زریاب سے تمہارے رشتے کی بات کرنے اور کیوں۔“ انہوں نے ہنس کر کہا۔

و شاہنواز بولا۔ ”معاف کیجیے امی! میں زریاب سے شادی نہیں کرنا چاہتا۔“ شاہنواز نے ہمت کر کے دل کی بات کر ہی دی۔

”زریاب سے شادی نہیں کرنا چاہتے یہ کیا بات ہوئی؟ میں تو کب سے زریاب کو بہنو بنانے کے خواب سجا کر بیٹھی ہوں اور زریاب کی بھی یہی خواہش ہے۔“ رفعت بیگم نے پریشان ہو کر کہا۔

”زریاب کی خواہش ہے تو ہوتی رہے لیکن میں تو شادی حمنہ سے ہی کروں گا۔“ شاہنواز نے تیز لہجے میں کہا تو حیات اللہ بولے ”بیگم! مجھ سے بھائی صاحب نے ایسی کسی خواہش کا اظہار نہیں کیا۔ ہاں اگر شاہنواز کی کوئی

اور پسند نہ ہوتی تو زریاب کو بہو بنانا میرے لیے بھی خوشی کی بات ہوتی لیکن اب سب سے پہلے میرے بیٹے کی خواہش ہے۔“

حیات اللہ نے کہا تو بیگم رفعت بولیں۔ ”مگر زریاب تو خاندان کی بچی ہے دیکھی بھالی ہے۔ یہ لڑکی پتا نہیں کون ہے کس خاندان سے تعلق ہے اور عادت کیسی کیا معلوم۔“ انہوں نے فکر مند ہو کر کہا تو شاہنواز بولا۔ ”امی آپ فکر نہ کریں حمنہ بہت اچھی ہے۔ میرے دوست کی کزن ہے اُس کے والد نارنگ منڈی کے زمیندار ہیں اور آج کل سیاست میں ہیں ملک عالمگیر!“ شاہنواز نے حمنہ کا غائبانہ تعارف کر دیا۔

”ملک عالمگیر! ارے انہیں تو میں بہت اچھی طرح جانتا ہوں ارے واہ خاندان تو بہت اعلیٰ ہے۔ اللہ کرے لڑکی بھی اچھی ہو۔“ حیات اللہ نے خوش ہو کر کہا۔

☆.....☆.....☆

”نہیں یہ نہیں ہو سکتا شاہنواز میرا ہے صرف میرا۔“ زریاب نے بیش قیمت گلدان ڈرینگ ٹیبل کے شیشے میں مار کر کہا جو ایک زوردار آواز سے ٹوٹ کر بکھر گیا۔ سارا کمرہ تہہ وبالا ہو چکا تھا ہر طرف ٹوٹے کاغذ کے ٹکڑے بکھرے تھے۔ پیدائش سے لے کر آج تک صرف اپنا نام سننے والی زریاب کے کانوں میں آج اچانک ایک دوسرا نام گونج رہا تھا۔ یہ وہ کیسے سہہ سکتی تھی۔ کیسے سہہ سکتی تھی کہ کوئی اچانک اُس کی زندگی کی سب سے بڑی خوشی سب سے بڑی خواہش چھین کر لے جائے اور وہ دیکھتی رہ جائے۔ وہ تو اپنی معمولی سے معمولی خواہش اور چھوٹی سے چھوٹی خوشی کو پورا کرنے کے لیے کسی بھی حد تک جاسکتی تھی کسی بھی حد تک گر سکتی تھی اور یہ تو شاہنواز تھا۔ شاہنواز اُس کی زندگی.....

چوہدری حیات اللہ کی کوٹھی دہن کی طرح بچی تھی اُس کے اکلوتے لاڈلے بیٹے شاہنواز کی آج شادی تھی۔ آج دودل ہی نہیں دو بڑے خاندان بھی مل رہے تھے۔

حمنہ اپنے ساتھ اپنے ماں باپ کی دعاؤں کے ساتھ بیش قیمتی چیزیں تو لاتی ہی تھی ایک حویلی بھی اُسے جہیز میں ملی تھی۔ اُس کے والد ملک عالمگیر اور بھائی ملک جہانگیر نے اپنی پرانی حویلی جو نارنگ منڈی میں واقع تھی حمنہ کے نام کر دی تھی۔ یہ حویلی آٹھ کنال پر پھیلی ایک

وسیع اور خوبصورت حویلی تھی۔ جو حمنہ کے پردادا نے تعمیر کروائی تھی اور اب حمنہ کے حصے میں آئی تھی۔ ملک جہانگیر نے اپنی بہن کی طرح حویلی کو بھی دہن کی طرح سجا کر شاہنواز کے حوالے کیا تھا۔

اُس رات جہاں دودل پھولوں کی سچ پر ہمیشہ ساتھ نبھانے کی قسمیں کھا رہے تھے وہاں کوئی اور تھا جو کانٹوں پر لوٹ رہا تھا۔ ”زریاب“ جس کے سینے میں آگ لگی تھی اور وہ حمنہ کے حق میں شاہنواز سے دستبردار ہونے پر کسی طرح راضی نہ تھی۔

”کسی طرح بھی کچھ بھی کر کے مجھے حمنہ کو شاہنواز کی زندگی سے نکالنا ہوگا اور یوں نکالنا ہوگا کہ اس جرم کی سزا حمنہ کا روم روم بھگتے گا۔ وہ تڑپ تڑپ کے جھپٹے گی اور تڑپ تڑپ کے ہی مرے گی۔ ایسی بھیانک اور تکلیف دہ موت دوں گی میں اُسے کے موت بھی ڈر جائے گی۔ اُسے ہر گزرتے بل میں یہ احساس ہوگا کہ اُس نے اپنی زندگی کی کتنی بڑی غلطی کر لی ہے۔ ایسی غلطی جس کی سزا موت ہے صرف موت۔“ زریاب نے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بند کر کے اپنے آپ سے کہا یوں جیسے وہ تصور میں حمنہ کو مسل رہی ہو۔

اپنے آپ کو حمنہ کی تقدیر کا کاتب سمجھنے والی یہ نہ جان سکی کہ کہیں کوئی اُس کی بھی تقدیر لکھ رہا ہے۔ ”قسم کھاتی ہوں میں چھوٹی بی بی اپنی ماں کی قسم کھاتی ہوں میں میں نے آپ کی انگوٹھی نہیں چرائی۔ خدا کی قسم میں نے نہیں چرائی.....“ رانی نے سسک کر کہا مگر زریاب کہاں ماننے والی تھی بڑی بے دردی سے وہ رانی کو چابک سے پیٹ رہی تھی۔

”پانی پانی“ درد سے تڑپ کر رانی نے پانی مانگا۔ ”دے شرفو اسے پانی دے۔“ زریاب نے کہا تو شرفو نے حیران ہو کر زریاب کو دیکھا کہ اچانک اس ظالم جلاد کے دل میں رحم کیسے آ گیا۔ بھاگ کر وہ گلاس میں پانی لایا اور رانی کے ہونٹوں سے لگانے لگا۔ ”رکو!“ زریاب نے رو کر رانی نے حسرت سے ہونٹوں تک آتے پانی سے بھرے گلاس کو دیکھا۔

”ایسے نہیں اسے میرے جوتے میں ڈال کر پانی دو۔“ زریاب نے پاؤں سے اپنی بند پیمپی اتار کر کہا شرفو نے حیرت اور ڈکھ سے زریاب کو دیکھا اور پیمپی میں ڈال

کر رانی کے قریب کیا رانی نے تڑپ دو اور آنسو بھری آنکھوں سے زریاب کو دیکھا اور جوتے میں ڈالا ہوا پانی پی لیا۔

آج رانی زریاب کی ملازمہ زریاب کے عتاب کا شکار تھی کیونکہ زریاب کی ہیرے کی انگوٹھی نہیں مل رہی تھی اور رانی جو زریاب کے کمرے کی صفائی کرتی تھی۔ زریاب کو پورا یقین تھا کہ یہ کام رانی کا ہی ہے۔ اُسی نے ہی زریاب کی انگوٹھی اٹھائی ہے۔ ایک انگوٹھی کی خاطر جو چندوں بعد زریاب کے ڈرینگ ٹیبل کے دراز سے مل گئی تھی اُس پر تشدد کی انتہا کر دی۔ چابک سے بار بار کراس کی کھال اتار دی اور سفاکی کی انتہا یہ کہ پانی بھی اپنے جوتے میں ڈال کر پلایا۔

اپنے بندوں کے جو حقوق اللہ تعالیٰ نے بندوں پر مقرر کیے ہیں وہ اللہ تعالیٰ بھی معاف نہیں کرے گا۔ ایک ایک غلم کا حساب برابر ضرور ہوتا ہے۔

”بی بی جی آج میں آپ کو ایک سنیا سی بابا کے پاس لے کر جاؤں گی بہت پیچھے ہوئے ہیں۔“ ثریا زریاب کی پرانی اور بھیدی ملازمہ نے سر کوٹھی کرتے ہوئے کہا۔ ”پیچھے ہوئے کی بچی! اب کی بار اگر تمہارے اس بابے نے میرا کام نہ کیا تو میں تمہیں ایسی جگہ پہنچا دوں گی کہ تمہارا نام و نشان تک نہ ملے گا۔“ زریاب نے غصے سے کہا۔

”اتنے عرصے سے تو رنگ پرنگے بابے اور عالموں کے پاس مجھے لے کر جاتی رہی مگر کسی نے بھی میرا کام نہیں کیا اور میرے الگ کھاتے رہے اگر اب کی بار میرا کام نہ ہوا تو میں تمہارا کام تمام کر دوں گی۔“ زریاب نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”نہیں چھوٹی بی بی اب کی بار ایسا نہ ہوگا۔ آپ یقین کریں یہ بہت بڑا معاملہ ہے۔ کالے علم کا ماہر ہے۔ بڑے مشکل کام دنوں میں کر دیے ہیں۔ اس نے پورا یقین دلایا ہے کہ مجھے اب کی بار آپ کا کام ضرور ہوگا آپ آج شام کو میرے ساتھ چلیں آپ خود مل کر تسلی کریں۔“ ثریا نے زریاب کو یقین دلایا۔

اپنی پوری نفرت، جلن اور حسد کے باوجود ہزاروں بار کے بعد بھی وہ حمنہ کا ابھی تک کچھ نہ بگاڑ سکی۔ خدا کی قسم کہ شادی کے فوراً بعد ہی شاہنواز اپنی کمپنی کی

طرف سے سات سال کے لیے انگلینڈ چلا گیا اس لیے چاہ کر بھی ابھی تک زریاب کچھ نہ کر سکی مگر ایسا ایک بھی دن نہ تھا جب زریاب سکون سے سوئی ہو۔ ہر رات اُس نے کانٹوں پر ہی گزاری۔ اس دوری بے بسی اور نفرت نے مل کر زریاب کے اندر اتنی نفرت پیدا کر دی کہ وہ خود اندر سے سراپانا گن بن گئی تھی۔ اُس کی سانس میں سانپ کی پھنکار صاف سنائی دیتی تھی۔

بند تار یک اور جس زندہ کمرہ چربی خون اور جلے ہوئے گوشت کی عجیب اور ناقابل برداشت بدبو سے بھرا تھا۔ کمرے میں ایک طرف چھوٹی سی چبوتری پر ایک کالا سیاہ نیم برہنہ پیلے پیلے دانٹوں سرخ آنکھوں اور مکرو چہرے والا شیاسی بابا بیٹھا تھا۔

زریاب نے ڈر خوف اور نفرت سے چہرے پر دوپٹا لیتے ہوئے کمرے کا جائزہ لیا۔

”لے آئی محبوب سے ملن کی طلب آخر تمہیں یہاں۔“ مکروہ چہرے والے بابا نے زریاب کا اندر کھٹکاتے ہوئے کہا۔

”جی باباجی۔“ زریاب بمشکل کہہ پائی۔ ”سچ جگہ پر آئی ہے تو تجھے تیری مراد ضرور ملے گی۔ مشکل کام ہے بول کر پائے گی؟“ بابا نے زریاب سے پوچھا۔

”جی باباجی۔“ اب کی بار زریاب نے جوش سے کہا۔

”بول کیا کر سکتی ہے تو اُسے پانے کے لیے؟“ بابا نے زریاب کو ٹٹولتے ہوئے کہا۔

”میں پوری دنیا کو جلا سکتی ہوں۔“ زریاب نے سینے میں آگ بھر کر کہا تو بابا نے پوچھا ”خود جل سکتی ہے؟“ میں تو پہلے ہی جل رہی ہوں باباجی یہ جو آپ کے سامنے ہے یہ تو راکھ کا ڈھیر ہے۔“ زریاب نے سسک کر کہا اور بابا اُس کے اندر کی طلب اور تڑپ دونوں جان گیا۔

”تیری لگن سچی ہے بچہ مگر قیسا کڑی کرنی ہوگی اس راکھ کو بھی آگ کی بھٹی میں ڈالنا ہوگا اگر اپنا مقصد پانا ہے تو۔“ بابا نے کہا۔

”کروں گی بابا جو آپ کہیں وہ کروں گی بس آپ میرے من کی مراد پوری کر دیں۔“ زریاب نے روتے ہوئے کہا۔

”تو جا جو تیری راہ کی رکاوٹ ہے اُس کے تن کا کوئی کپڑا جو اُس نے کچھ دیر پہلے ہی تن سے اتارا ہو یا بال لے آئے میں چلے کاٹ کر تجھے مل بتاؤں گا۔ تم دیکھنا چند دن میں سب کھویا تیرے ہاتھ میں ہوگا۔“ بابا نے کہا۔

زریاب بولی۔ ”مگر بابا! وہ تو سات سال سے ملک سے باہر ہے۔ تن کا کپڑا یا بال لانا تو مشکل ہے۔“

چند لمحوں تک عامل بابا نے کچھ سوچا پھر بولا۔

”ٹھیک ہے تو مجھے دونوں کی تصویر لادے۔ میں ایسا عمل کروں گا کہ چند دنوں میں دونوں تیری نظروں کے سامنے ہوں گے پھر تم بال یا کپڑا لے آنا۔“ موت کا عمل؟

”یہ کھن ہوتی ہے زندگی کی جو لکڑی کی طرح دھیرے دھیرے انسان کی زندگی کو کھا جاتی ہے۔ اور اتنی خاموشی سے انسان مر جاتا ہے کہ موت کو بھی اپنے قدموں کی آواز نہیں آتی۔“ سنیا سی بابا نے مکروہ قہقہہ لگایا اور بولا

”خرچہ! خرچہ! بہت ہے اس عمل میں اور خطرہ بھی اور یہ دونوں تم نے ہی سہنے ہیں۔ اب جا جا کر تصویر لا پھر آگے دیکھ یہ عامل کیا کرتا ہے۔“

سنیا سی بابا کے پاس سے آنے کے بعد نہ جانے کیوں اب کی بار زریاب بڑی پُر امید ہو گئی تھی۔ یوں لگنے لگا تھا جیسے شاہنواز اور اُس کے درمیان کی دوری چند دنوں کی مہمان ہے۔ شاہنواز اور حمزہ کو اچانک پاکستان آنا پڑا کیونکہ حمزہ کے بابا جان ملک عالمگیر کی طبیعت بہت خراب ہو گئی۔

اگرچہ ان سات سالوں میں حمزہ اور شاہنواز کے والدین کئی بار دونوں کو ملنے گئے۔ مگر وہ دونوں چاہ کر بھی نہ آ سکے۔ پہلے حمزہ کی پریلینسی کی وجہ سے ڈاکٹر نے سفر سے منع کیا پھر شاہنواز نے کسی کورس میں داخلہ لے لیا اور اب پانچ سالہ ابراہیم کے اسکول کی وجہ سے..... یا شاید قدرت خود انہیں پاکستان سے دور رکھنا چاہتی تھی۔

اپنی خوبصورتی سے جہاں حمزہ نے شاہنواز کا دل موہ لیا تھا وہاں اپنی خوب سیرنی سے اُس نے سارے خاندان کا دل جیت لیا۔ شاہنواز کے ماں باپ تو حمزہ کے دیوانے ہو گئے اُس نے بھی بہو نہیں بیٹی بن کر اُن کی خدمت کی اور انہیں محبت دی۔

بے شک وہ پردیس میں رہ رہی تھی۔ مگر اتنی دور بیٹھ

کر بھی وہ سب کا دل و جان سے خیال رکھتی۔ ہر تین چار ماہ بعد چوہدری حیات اللہ اور رفعت بیگم اُن سے ملنے جاتے۔ تب حمزہ اُن کی خدمت میں دن رات ایک کر دیتی۔ اُن کے آرام کا پورا خیال رکھتی۔ صرف حیات اللہ ہی نہیں بلکہ ہدایت اللہ اور اُن کا پورا گھرانہ بھی حمزہ کی محبت اور حسن سلوک کا گردیدہ ہو چکا تھا۔

حمزہ کی محبت اگر کسی کا دل نہ جیت سکی تو وہ زریاب تھی جس نے اپنے دل میں اتنی نفرت آگ اور حسد بھر رکھا تھا جس کے دھواں کی وجہ سے اُسے اپنے علاوہ کوئی اور دکھائی ہی نہ دیتا تھا۔

وہ آج بھی روزِ اول کی طرح حمزہ سے نفرت کرتی تھی، شدید نفرت اور شاہنواز سے محبت بے پناہ محبت۔ اسی محبت کی وجہ سے ان سات سالوں میں اُس نے کئی اچھے اور بہترین رشتے ٹھکرا دیے۔

آسہ بیگم اُس کی دلی کیفیت سے آگاہ تھیں اور وہ سمجھ رہی تھیں کہ شاید زریاب شاہنواز کی محبت کو دل سے نکالنے کے لیے وقت چاہتی ہے۔ مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ زریاب وقت تو چاہتی تھی مگر کسی کی ہنسی بستی دنیا اُجڑنے کے لیے۔

پاکستان آنے کے بعد جب حمزہ کے بابا جان کی طبیعت کچھ سنبھل گئی تو سب خاندان والوں نے دونوں کی دعوتیں کرنی شروع کر دیں۔ ایسی ہی ایک دعوت میں حمزہ سے گلے ملنے کے بہانے زریاب نے اُس کے بالوں میں چیونگم چپکا دی۔

”ارے حمزہ یہ تمہارے بالوں میں کیا لگا ہے۔“

زریاب نے کمال کی اداکاری کی۔ ”کیا لگا ہے؟“ حمزہ نے بالوں پر دائیں بائیں ہاتھ پھیر کر کہا۔ شاید چیونگم لگی ہے۔“ زریاب نے کہا۔

”چیونگم کیسے لگ گئی؟ اب میں کیا کروں؟“ حمزہ نے گھبرا کر کہا۔ ”لاؤ میں کوشش کرتی ہوں۔ آؤ میرے کمرے میں۔“ زریاب نے حمزہ کا ہاتھ پکڑ کر کہا اور حمزہ زندگی میں پہلی بار محبت سے پیش آنے پر زریاب کی باتوں میں آ گئی۔

”یہ تو کاٹنے پڑیں گے۔“ زریاب نے کمال ہوشیاری سے کہا۔

”کاٹنے! نہیں! بال خراب ہو جائیں گے۔“ حمزہ

جان ہو کر بولی۔ ”نہیں خراب ہوتے۔ میں تھوڑے سے بال کاٹ دیتی ہوں کسی کو پتا بھی نہیں چلے گا۔“ زریاب نے کہا اور بال اُس نے بڑی چالاکی سے حمزہ کے بال کاٹ لیے

اللہ تعالیٰ ظالم کی رسی خود ہی دراز کرتا جاتا ہے تاکہ جب وہ ایک جھٹکے سے اُسے کھینچے تو وہ لمبی رسی اُس کے گرد لپٹ کر خلیج بن جائے۔

”نہیں بابا جی میں بال لے آئی ہوں۔“ زریاب نے بال سنیا سی بابا کو دیتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک اب تو جا بچہ میں ان پر موت کا عمل کرتا ہوں تم اگلے منٹ کو آنا۔“ بابا نے بال لے کر کہا اور پھر اگلے منٹ زریاب بابا کے سامنے بیٹھی تھی۔

”لے بچہ یہ پوٹی لے۔ اس کو کالے بکرے کی خون چسپی سری میں رکھ کر رات کو بارہ بجے کے بعد اور پو بیوٹے سے پہلے قبرستان میں کسی قبر میں رکھ دے۔ یاد رکھ تو صرف ایک دن پڑانی ہو۔“ بابا نے لال کپڑے میں لپی ایک چھوٹی سی پوٹی اُسے پکڑا کر کہا۔

”رات کو قبرستان میں؟“ زریاب نے ڈرتے ڈرتے پوٹی پکڑ کر کہا۔

”کیوں ڈر گئی؟ تو کہتی تھی کہ اپنا مقصد پانے کے لیے تو کچھ بھی کر سکتی ہے! اب منزل سامنے آ گئی ہے تو تیرے قدم لڑکھڑانے لگے ہیں۔“ سنیا سی بابا نے طنز سے کہہ کر مکروہ ہنسی ہنستے ہوئے زریاب کو دیکھا۔

”بابا کیا یہ سب کر کے شاہنواز میرا ہو جائے گا؟“

زریاب نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔ ”شک ہے بابا کے علم پر؟ شک ہے تو جا کہیں اور جان۔“ بابا نے ناراض ہو کر کہا۔

”نہیں شک نہیں ہے بابا! بس دل کو تسلی دینا چاہتی ہوں۔“ زریاب نے گھبرا کر کہا۔ ”تسلی نہیں دل کو یقین دلا جسے تو پانا چاہتی ہے وہ سو فیصد تمہارا ہوگا ہمیشہ کے لیے یہ بابا کا دعویٰ ہے۔“ بابا نے تکبر سے کہا اور زریاب سر سے پاؤں تک سراپا یقین بن گئی۔

مگر وہ یہ نہیں جانتی تھی کہ ایک ادنیٰ انسان کسی کے نصیب بدلنے کا دعویٰ کر رہا ہے۔ جو خود اپنا نصیب نہیں بدل سکتا وہ کسی کا کیا بدلے گا۔

جو کچھ اللہ تعالیٰ نے ہمارے نصیب میں نہیں لکھا وہ

ایک انسان کیسے لکھ سکتا ہے۔ انسان لالچ، طمع، حس، نفرت اور محبت میں اتنا اندھا ہو جاتا ہے کہ اُسے شے کی طرح صاف شفاف حقیقت بھی نظر نہیں آتی۔

پرانی قبر کے بارے میں ثریا نے ایک رات پہلے ہی پتا لگا لیا تھا۔ رات کے ڈیڑھ بجے دونوں قبرستان کی جانب روانہ ہوئیں۔ رات کا اندھیرا، نومبر کی ٹھنڈی سردی، ہوکا عالم تیز ٹھنڈی ہوا، تنہا دو عورتیں اور قبرستان.....

خوف کی ایک دبیر چادر ہر طرف پھیلی تھی۔ ثریا قدم قدم پر اُس کے ساتھ تھی۔ ملازموں پر رحم نہ کرنے والی آج پوری طرح ایک ملازمہ کے رحم و کرم پر تھی۔ محبت میں ایک رانی داسی بنی دین مذہب اپنے پرانے سچ اور غلط کی پہچان مٹائے اپنا مقصد پانے نکل پڑی۔ قبرستان تک تو ثریا ساتھ تھی مگر قبر کے اندر وہ لال پوٹی زریاب ہی کو رکھنی تھی۔

”ثریا مٹی کھودنے کے لیے کچھ لائی ہو۔“ زریاب کی سرگوشی رات پر چھائی خاموشی کی چادر میں چھید کرنی ہوئی ابھری۔

”جی بی بی جی! میں یہ گھر پالائی ہوں۔“ ثریا نے چادر سے گھر پال نکال کر زریاب کو دیا۔ زریاب نے ساری ہمت، نفرت اور محبت کو جمع کر کے قبر کے سرہانے سے مٹی کھودنا شروع کی۔

دور کسی چگاڑ کی آواز نے سارے ماحول کو اور بھی ڈراؤنا بنا دیا۔ ”ثریا پلیز! تم کروہم سے نہ ہوگا۔“ زریاب نے ڈر کر ثریا کا ہاتھ پکڑا۔ ”بی بی جی! میری جان بھی آپ پر قربان مگر یہ کام تو آپ ہی کو کرنا ہے۔ سات سال سے آپ جس انتظار میں ہیں اب وہ ختم ہونے والا ہے۔ آپ کی دلی تمنا پوری ہونے والی ہے۔ آپ بس تھوڑی سی ہمت کریں پھر سب آپ کی خوشی کے مطابق ہوگا۔“

ثریا نے زریاب کی محبت کو ہمت بنایا تو زریاب نے لرزتے ہاتھوں سے لال پوٹی قبر میں رکھ کر مٹی برابر کی اور پھر پیچھے مڑ کر دکھے بغیر وہاں سے نکل آئی۔

قبر میں پوٹی رکھتے ہی چیخوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا۔ وہاں سے بچ کر آنا یا تو زریاب کی ہمت تھی یا کوئی معجزہ یا پھر خدا ابھی اپنی رسی تھوڑی اور ڈھیلی کرنا چاہتا تھا۔

حسنہ کے سر میں اچانک سے درد اٹھا اور پھر ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتا ہی گیا۔ ہر طرح کا علاج کیا مگر درد بڑھتا گیا، جب جب دوا کی۔ آخر ملک کے قابل نیوروسرجن نے اُس کے دماغ میں ٹیومر کی تشخیص کی۔ اور آپریشن کا کہا۔ آپریشن سے پہلے جب حسنہ کا خون ایک بار ٹیسٹ کیا تو اچانک ہی اُس کے خون میں کینسر ظاہر ہوا۔

سب کے لیے یہ خبر ناقابل یقین تو تھی ہی ناقابل برداشت بھی تھی۔ دنوں میں ہستی کھیتی صرف پچیس چھبیس سالہ حسنہ بستر سے لگ گئی۔ چاند سا چہرہ سیاہ پڑ گیا۔ پورا جسم سوکھ کر کاٹا ہو گیا۔

ہر آنے والا دن کوئی نہ کوئی بُری خبر دیتا اور ایسے ہی منحوس دنوں میں ایک دن صبح صبح ہی حسنہ کو خون کی الٹی ہوئی اور وہ بے ہوش ہو گئی اور پھر یہی بے ہوشی کوئے میں بدل گئی۔ صرف چھ ماہ میں حسنہ زندہ لاش بن گئی۔ ہر آنکھ اُس کے لیے آبدیدہ تھی ہر زبان اُس کے لیے دُعا گو تھی۔

اگر کوئی خوش تھا تو وہ زریاب تھی۔ جو ہر روز حسنہ کی حالت دیکھ کر مسرور ہوتی اور اُس کی موت کی دعا کرتی۔ پھر اللہ کی مصلحت نے اپنا روپ دکھایا اور سب کی محبت آنسو اور دعائیں ہار گئیں۔ اور صرف ایک زریاب کی نفرت جیت گئی۔

کون جیتا اور کون ہارا یہ تو اللہ کی واحد ذات جانتی تھی۔ مگر بازی فی الحال زریاب کے ہاتھوں میں تھی اور شاہنواز کے ہاتھوں میں تھی اپنی محبوبہ بیوی اور پانچ سالہ کسن بیٹے کی ماں کی لاش جو اتنی نیکبخت اور درد سہ رہی تھی کہ آخر خدا کو اُس پر رحم آ ہی گیا۔

☆.....☆.....☆

سات سال بعد پورے سات سال بعد آخر زریاب نے اپنے دل کی تمنا پوری کر لی۔ لیکن اس بار اُس نے تمام حدیں پار کر لیں اور پستی کی اُن گہرائیوں میں جا گری جہاں سے اٹھنا اب ممکن نہیں تھا۔

سب کے مجبور کرنے پر اور اپنے پانچ سالہ معصوم بیٹے کے لیے آخر شاہنواز نے زریاب سے شادی کر لی۔ زریاب نے بھی حسنہ کی موت کے بعد اپنے اوپر محبت اور خدمت کا جولیا دہ چڑھایا تو ہر کوئی اُس کا گرویدہ ہو گیا۔

پانچ سالہ ابراہیم کا بھی وہ بہت خیال رکھتی اُس کے سونے جاگنے کھانے پینے کا پورا دھیان رکھتی۔ اور ہر ممکن کوشش کرتی کہ اُس گوماں کی کمی محسوس نہ ہو اسی بات نے شاہنواز کے دل میں زریاب کے لیے نرم گوشہ پیدا کر دیا۔

مگر وہ نادان یہ نہیں جانتا تھا کہ جو جڑوں کے دشمن ہوتے ہیں وہ شاخوں کے دوست کیسے ہو سکتے ہیں۔

آہٹ پر زریاب نے سر اٹھا کر دروازے کی طرف دیکھا۔ جہاں شاہنواز اپنے معصوم بیٹے کی انگلی تھام کر کھڑا تھا۔ زریاب کے لیے یہ منظر بہت تکلیف دہ اور اُمید سے برعکس تھا۔ اب یہ سنبولیا میری خوشیوں کو ڈسے گا۔

”زریاب تم جانتی ہو کہ میں نے یہ شادی صرف اور صرف ابراہیم کی وجہ سے کی ہے کیونکہ وہ تم سے بہت مانوس ہو گیا ہے۔ ورنہ میرے لیے تو حسنہ کی یادیں پوری زندگی کے لیے کافی ہیں۔ تم سے بس اتنی سی گزارش ہے کہ میرے بچے کو ماں کا پیار دینا۔ یہ خوش رہے گا تو میں بھی خوش رہوں گا۔“ شاہنواز نے کہا۔

زریاب نے دل میں کہا۔ ”تمہاری خوشی صرف میں ہوں۔ تمہارے پیار پر صرف میرا حق ہے۔ اور رہا یہ ننھا سا کاٹا؟ اسے تو مسلنے کے لیے میں خود ہی کافی ہوں کسی سنیا سی بابا کی ضرورت نہیں ہے۔“

☆.....☆.....☆

”شاہنواز! یہ کس عمارت کی تصویریں ہیں؟“ زریاب نے بڑی سی حویلی کی تصویر دیکھ کر پوچھا۔ ”یہ عمارت! یہ حسنہ کی حویلی ہے جو اُس کے والد نے جہیز میں دی تھی۔“ شاہنواز نے تصویر ہاتھوں میں لے کر دکھ سے کہا۔

”یہ تو بہت خوبصورت لگتی ہے۔“ زریاب نے تجسس سے کہا۔ ”ہاں بہت خوبصورت ہے کسی دن دکھاؤں گا تمہیں۔“ شاہنواز نے کہا۔ ”کسی دن کیوں کل ہی دکھائیں۔“ زریاب نے لاڈ اور محبت سے کہا۔

”اچھا ٹھیک ہے کل چلیں گے۔“ شاہنواز نے کہا۔

اور پھر اگلے دن زریاب اور شاہنواز دو ملازموں

کے ساتھ حویلی پہنچے۔

”واہ! زبردست“ یہ تو بہت خوبصورت ہے۔“ زریاب نے کہا۔ وہ حویلی کے بڑے بڑے دالان کمرے اور ان کی دیواریں جو خوبصورت نقش و نگار سے سجی ہیں میں گھومی گئی۔

پوری حویلی حسن کا شاہکار تھی۔ آٹھ کنال پر پھیلی یہ وسیع و عریض حویلی بے پناہ خوبصورتی اور جاہ و جلال کا پیکر تھی۔

”شاہنواز اب تو یہ حویلی آپ کی ہو گئی ہے نا؟“ زریاب نے پوچھا۔ ”ہاں حسنہ کی موت کے بعد اب یہ میری ہے مگر اس کا اصل وارث ابراہیم ہے کیونکہ یہ اُس کی ماں کی حویلی ہے اس لیے۔“ شاہنواز نے کہا تو زریاب نے جل کر سوچا ”یہاں بھی یہ ننھا سنبولیا میری خوشیوں کی راہ میں بیٹھا ہے۔ لیکن اگر ابراہیم نہ رہے تو یہ حویلی میری ہو سکتی ہے۔“

زریاب حویلی کو گھوم کر دیکھتے دیکھتے اس کے پچھلے حصے میں موجود دالان میں گئی جو تقریباً ویران اور حویلی کے خاص حصے سے دور اور سنسان تھا۔ وہاں اُس نے بوجے کا ایک بڑا سا گول ڈھکن دیکھا۔

”یہ کیا ہے شاہنواز؟“ اُس نے پوچھا۔ ”یہ پانی کی تنگی ہے پہلے وقتوں میں ایسی ہی زمین دوز مٹکیاں پانی کا ذخیرہ کرنے کے لیے بنائی جاتی تھیں تاکہ گھر والوں کو پانی کی کمی نہ ہو۔“ شاہنواز نے کہا تو زریاب کچھ سوچتی ہوئی بولی۔ ”یہ تو بہت بڑی لگتی ہے۔“

”ہاں لگ بھگ 8x8 کی ہوگی۔ چھت بھی کافی اونچی ہے آدی سیدھا ہو سکتا ہے۔“ شاہنواز بات کرتے کرتے واپس گیٹ کی طرف آیا۔

”شاہنواز کیوں نہ ہم سب گھر والے مل کر یہاں کچھ منانے آئیں۔ سب انجوائے کریں گے۔“ زریاب نے ایک اور شیطانی منصوبہ بناتے ہوئے کہا۔ ”دو تین دن بعد پروگرام بناتے ہیں ابھی مجھے کچھ کام ہے۔“ شاہنواز نے ہامی بھرتے ہوئے کہا تو زریاب نے کہا۔ ”ٹھیک ہے میں کل ملازموں کو لا کر اس کی صفائی دیکر رہ کر دیتی ہوں۔“

لاہور اور اُس کے ارد گرد کے علاقوں میں ایسی زمین

تم اور میں

تم کیوں کسی کو خاطر میں لاؤ

تم شاخ گل ہو

دست خزاں کے کیوں ناز اٹھاؤ

میں کیوں یہ سوچوں

میں ہوں انا کا زخمی پرندہ

زخموں کو لے کر اڑ کیوں نہ جاؤں

لیکن یہ دنیا

جس کے قفس میں

تم بھی ہمیشہ دست خزاں سے ڈرتی رہو گی

میں بھی ہمیشہ زخموں کی پوشاک پہنے رہوں گا

آؤ پھر آؤ

اک دوسرے کی تعظیم کر لیں

تسلیم کر لیں

ہم اپنی اپنی مجبوریاں ہیں

سحر انصاری

بنائی جاتی ہیں۔ یہ ٹنکیاں زمین کے اندر سات یا دس فٹ بلند ہوتی ہیں جبکہ زمین کے اوپر سے یہ تین یا چار فٹ بلند ایک چوبیس فٹ کی طرح دکھائی دیتی ہیں۔ یہ بھی ایسی ہی ایک ٹنکی تھی جو زمین کے اوپر تقریباً چار فٹ بلند تھی اور جس کے ایک کونے پر امرود کا ایک پرانا درخت تھا یہ درخت اتنا پھیل گیا تھا کہ اس نے آدھی ٹنکی ڈھانپ رکھی تھی۔

☆.....☆.....☆

زریاب دماغ میں اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے تانے بانے بننے لگی۔ اگلے دن زریاب دو تین ملازموں کے ساتھ صبح گیارہ بجے ہی حویلی کی صفائی کے لیے آگئی۔ سب کو کام پر لگا کر اور ابھی تھوڑی دیر میں آنے کا کہہ کر وہ حویلی کے پچھلے حصے میں آئی جہاں وہ پرانی زمین دوز ٹنکی تھی۔ زریاب کے شیطانی دماغ نے ایک بڑا سفاک منصوبہ بنایا تھا۔

اُس نے سوچا تھا کہ وہ پکنک والے دن کسی بہانے سے ننھے ابراہیم کو پچھلے حصے کی طرف لائے گی اور اس ٹنکی میں بند کر دے گی۔ کیونکہ ٹنکی حویلی کی مرکزی عمارت سے بہت دور ہے اور زمین دوز ہونے کی وجہ سے اُس کی آواز بھی کسی کو سنائی نہ دے گی اور پھر مردیوں میں لوگ اپنے کمروں سے کم ہی نکلتے ہیں۔ دو تین دن میں تڑپ تڑپ کر یہ کاٹنا بھی ختم ہو جائے گا اور کسی کو کان و کان خبر بھی نہ ہوگی۔ وہ لوگ ادھر ادھر تلاش کریں گے لیکن ٹنکی کی طرف کسی کا خیال ہی نہ جائے گا۔

اپنے منصوبے کو عملی جامہ پہنانے کے لیے وہ ٹنکی کا جائزہ لینا چاہتی تھی۔ لوہے کے مضبوط زنگ لگے ڈھکن کو پوری طاقت لگا کر بھی وہ کھول نہ پائی۔

”کیا مصیبت ہے یہ کھل کیوں نہیں رہا۔“ زریاب نے غصے سے مکار کر کہا تو کھٹ کی آواز کے ساتھ کھل گیا۔

پوری طاقت لگا کر اُس نے کھینچ کر ڈھکن کھولا جو قبضوں کے ساتھ جڑا تھا اور ایک طرف ہو کر کھڑا ہو گیا۔ قبضوں کو زنگ لگا تھا۔ ڈھکن بڑی مشکل اور زور لگانے پر کھلا۔ اندر نیچے کو جاتی لوہے کی سیڑھیاں تھیں۔ زریاب نے نیچے جھانک کر دیکھا چھوٹا سا ایک کمرہ

تھا۔ یوں ہی اچانک زریاب کے دل میں اندھیرے دیکھنے کی خواہش پیدا ہوئی تاکہ اپنی تسلی کر لے کہ ٹنکی کوئی روزن تو نہیں ہے۔ سیڑھی پر پاؤں رکھ کر وہ نیچے اتر رہی تھی کہ اُس کی پیپی پستلی اور وہ اندر پکے فرش پر گر گئی اور بے ہوش ہو گئی۔ اُس کے گرتے ہی زوردار آواز کے ساتھ وہ آہنی زنگ آلودہ مضبوط اور بھاری ڈھکن ”ٹھا“ کی آواز کے ساتھ بند ہو گیا۔

ہر طرف کھرام مچ گیا۔ سب زریاب کو ڈھونڈ رہے تھے۔ ملازموں نے بتایا کہ بی بی تھوڑی دیر میں آنے کا کہہ کر ہمیں کام کرنا چھوڑ کر چلی گئی تھیں۔ اور پھر واپس نہیں آئیں۔ انہوں نے کافی دیر تک انتظار کیا اور پھر شاہنواز کو فون کر دیا۔ پولیس کو بلایا گیا جس نے حویلی ہی کا نہیں نارنگ منڈی کا چپہ چپہ چھان مارا مگر زریاب کا کچھ پتا نہ چلا۔ نا جانے اسے زمین نگل گئی یا آسمان کھا گیا۔

حتمہ کی موت کے صرف ایک سال بعد ہی یہ دوسرا سانحہ سارے خاندان کو ہلا گیا۔ ابراہیم جو اس ایک سال میں زریاب سے بے حد مانوس ہو گیا تھا۔ ایک بار پھر اپنی ماں کے کھوجانے پر رورو کے بے حال ہو گیا۔

شاہنواز کا الگ بڑا حال تھا۔ زریاب نے اُس کے تکلیف دہ دنوں میں اُس کا ساتھ دیا تھا۔ اُس کے یوں اچانک غائب ہو جانے پر وہ بھی بہت پریشان تھا۔ زریاب کے بابا ماں اور بھائی غرض سارا خاندان غم میں ڈوب گیا۔

پولیس نے اپنا پورا زور لگایا اپنی پوری کوشش کی مگر زریاب کا کچھ پتا نہ چلا۔ ہر روز اس امید پر سارا خاندان جاگتا کہ شاید آج زریاب مل جائے مگر ڈوبتا سورج اُن کو پھر مایوسی کے اندھیروں میں ڈبو جاتا۔ مرجانے والوں کا تو وقت کے ساتھ ساتھ صبر آ جاتا ہے۔ مگر لپٹا کا صبر کبھی نہیں آتا ہر دن نئی آس دلاتا ہے اور ہر رات نیا درد دیتی ہے۔

☆.....☆.....☆

نا جانے وقت کا کون سا پہر تھا۔ جب زریاب کو ہوش آیا۔ ہر طرف گھپ اندھیرا تھا۔ ہاتھ کو ہاتھ بھائی نہیں دیتا تھا۔ زریاب کو لگا شاید وہ مر چکی ہے اور قبر میں ہے یا پھر جہنم میں..... کچھ دیر بعد دیوار کے ایک چمید

ہے لکی سی روشنی کی کرن آئی۔ اُس کرن نے آہستہ آہستہ اندھیرے کو کم کرنا شروع کر دیا۔ اُس کرن کی وجہ سے آہستہ آہستہ زریاب اندھیرے میں دیکھنے کے قابل ہو گئی۔ یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جس کی ایک دیوار کے سوراخ سے کسی درخت کی ایک شاخ اندر آ رہی تھی۔ شاید یہ امرود کے درخت کی شاخ تھی جو ٹنکی سے باہر زمین میں لگا تھا۔

”یہ دروازہ کیسے بند ہو گیا؟ یہ تو زنگ آلودہ اور بہت بھاری تھا۔ ہوا سے تو نہیں گر سکتا اور کوئی آس پاس بھی نہ تھا تو پھر کیسے بند ہوا؟“ زریاب نے اُس ٹنکی کو سلجھانے کی کوشش کی جواب سلجھنے والی نہیں تھی۔

”کوئی ہے کوئی ہے؟ مجھے باہر نکالو۔ خدا کے لیے مجھے باہر نکالو میں مرجاؤں گی مجھے باہر نکالو۔“ چیخ کر زریاب کا گلا بیٹھ گیا۔ یہ جانتے ہوئے بھی کہ یہ ٹنکی حویلی سے دور ہے اور حویلی تک آواز نہیں جائے گی۔ مگر پھر بھی وہ مسلسل چیختی رہی اور آخر بے دم ہو کر گر گئی۔

”پانی پانی“ اُس نے ٹھٹی ٹھٹی آواز سے پانی مانگا اور پانی کی تلاش میں ادھر ادھر نظر دوڑائی۔ ٹنکی میں پانی کی فراہمی کے لیے ایک پُرانا سا پائپ موجود تھا۔ مگر بالکل خشک.....

زریاب نے بے بسی اور لا چاری سے چاروں طرف دیکھا چھوٹا سا قبر نما کمرہ جہاں سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں کسی تک آواز پہنچنے کا کوئی ذریعہ نہیں۔

☆.....☆.....☆

اللہ اکبر اللہ اکبر اللہ اکبر پاس ہی سے اذان کی آواز آئی بالکل واضح اور صاف ”پتا نہیں کیا وقت ہوا ہے؟ اور یہ کون سی اذان ہے؟“ زریاب نے اپنے آپ سے کہا ”اس طرح تو میں دو چار دن میں ہی مرجاؤں گی بھوک پیاس یقیناً میں مرجاؤں گی اور اچھا ہی ہے کہ میں مرجاؤں یہاں تڑپ تڑپ کر جینے سے تو مر جانا اچھا ہے۔“ اُس نے روتے روتے سرد دیوار سے ٹکراتا شروع کر دیا۔

”یا اللہ! مجھے موت دے دے مجھے موت دے“ سر ٹکراتا کر وہ بے دم ہو کر گر گئی۔ پتا نہیں کتنی دیر تک بے دم ہی پڑی رہی۔ پھر اللہ اکبر کی صدائیں

”یہ دوسری اذان ہے۔“ اُس نے اپنے آپ سے کہا اور ادھر ادھر دیکھ کر ایک چھوٹا سا پتھر اٹھا کر دیوار پر دو لکیریں بنائیں ”میں ہر اذان کے ساتھ ایک لکیر لگاتی جاؤں گی۔ اس طرح مجھے پتا چل جائے گا کہ کتنے دن ہو گئے ہیں۔ دو چار دن سے زیادہ نہیں ہوں گے۔ میں دو چار دن ہی میں مرجاؤں گی لگتا ہے میری موت کا عمل شروع ہو گیا ہے۔“ زریاب نے خود کلامی کی۔

موت کا عمل! ہاں موت کا عمل! وہی موت کا عمل جو میں نے حتمہ پر کر دیا تھا اور وہ تو چھ ماہ میں مر گئی تھی۔ لیکن میں جلد مرجاؤں گی۔ دو تین دن میں ہی۔ ہاں دیکھ لیتا دو تین دن میں ہی.....

نا جانے کتنے گھنٹوں بعد یا شاید اگلے دن زریاب کی آنکھ کھلی اور وہ بھی اللہ اکبر کی صدا پر اُس نے بھاگ کر دیوار پر ایک اور لکیر لگائی۔ ”بھوک لگی ہے مجھے بہت بھوک لگی ہے کیا کروں؟“ اُس نے بے تابی اور بے بسی سے ادھر ادھر دیکھا۔

ٹنکی کے اُس ننھے سے روزن سے اندر آنے والی امرود کی شاخیں پھل سے لدی تھیں۔ تین چار امرود توڑ کر اُس نے بے تابی اور بے صبری سے کھائے۔ اسی اثنا میں اُس پرانے سے پانی کے پائپ سے ہلکا ہلکا اور زرار سا پانی آنے لگا۔ زریاب پیاس سے بے چین ہو کر پائپ سے پانی پینے کی کوشش کرنے لگی۔ مگر پانی اُس کے منہ سے بہت دور تھا۔ ہاتھوں کا بار بار پیالہ بناتی مگر پانی بہہ جاتا۔ کافی دیر تک وہ بے تابی سے پانی کی ایک بوند پینے کی کوشش کرتی رہی مگر کامیاب نہ ہو سکی اور پھر پانی آنا بند ہو گیا۔ اپنی بے بسی پر وہ چیخ چیخ کر رونے لگی۔

”یا اللہ مجھے موت دے دے میں جینا نہیں چاہتی۔“ اپنی حالت پر وہ بے بس ہو گئی اور موت کی دعا کرنے لگی۔ اچانک دور سے اذان کی آواز بلند ہوئی۔ اللہ اکبر اللہ اکبر اللہ اکبر زریاب نے فوراً دیوار پر ایک لکیر لگائی۔ ”چودہ لکیریں! میں چودہ بار اذان کی آواز سن چکی ہوں یعنی دو دن سے زیادہ ہو گئے۔“ اُس نے حیرت اور لا چاری سے کہا اور اذان کے الفاظ پر غور کرنے لگی۔

الصلوة خیر من النوم (نماز نیند سے بہتر ہے) کم سمی زریاب اذان کے الفاظ میں کھوئی تھی

اچانک بولی۔ ”یہ تو صبح کی اذان ہے۔ یہ الفاظ تو صبح کی اذان میں ہوتے ہیں۔ جس دن میں منگی میں گری تھی تب دوپہر کے بارہ بجے تھے۔ کچھ دیر میں ظہر کی اذان ہونے والی تھی۔“

پندرہ اذانوں کا مطلب ہے مجھے یہاں چوتھا دن شروع ہو گیا ہے۔ چوتھا دن! اس اندھیرے کمرے میں دو چار امرود اور پانی کی چند بوتلیں..... میں زندہ ہوں! ابھی تک کیوں؟ کیوں میرے مولا کیوں؟“ زریاب نے تڑپ تڑپ کر روتے ہوئے کہا۔

پانی کے گرنے کی آواز نے زریاب کو پھر بے قابو کر دیا۔ پیاس ادھوری ہو تو انسان دیوانہ ہو جاتا ہے۔ اسی ادھوری پیاس نے پہلے بھی زریاب کو دیوانہ کیا تھا اور آج بھی.....

ادھر ادھر دیکھ کر وہ پانی اکٹھا کرنے کے لیے کچھ تلاش کرنے لگی۔ اچانک اُس کی نظر اپنی بند پچی پر پڑی اُس نے فوراً اُسے پانی کے پائپ کے آگے کر دیا۔ پچی جیسے جیسے بھرتی جاتی زریاب میں زندگی کی رمت بھی بڑھتی جاتی اور پھر زریاب چوہدری ہدایت اللہ کی اکلوتی بیٹی فواد اور جواد کی لاڈلی بہن لاکھوں کروڑوں کی جائیداد کی مالک منہ میں سونے کا چھچھے لے کر پیدا ہونے والی زریاب نے پچی کو منہ لگا کر سارا پانی ایک ہی سانس میں پی لیا۔

پیاس ابھی تو حواس بحال ہوئے اور حواس بحال ہوئے تو زریاب نے اپنے ہاتھوں میں پکڑی پچی کو دیکھا اور دور کہیں سے اماں کی آواز آئی۔ ”ڈرو اُس دن سے جب اللہ تعالیٰ حساب برابر کریں گے۔ اُس دن اگر انہوں نے اپنا فضل نہ کیا تو ایک چوٹی بھی جو انجانے میں ہمارے پاؤں کے نیچے آئی ہے اُس کا حساب بھی برابر ہوگا۔“

”چوٹی! میں نے تو اللہ کے بندوں کو مسلا ہے۔ مجھے معاف کر دو رانی۔ مجھے معاف کر دو پروین۔ حمزہ! حمزہ تم سن رہی ہو۔ مجھے معاف کر دو۔ اللہ تعالیٰ آپ تو سن رہے ہیں نا مجھے معاف کر دیں۔ میں نے آپ کے معصوم بے بس لاچار اور بے گناہ بندوں کو ستایا ہے۔ ستایا! نہیں نہیں میں نے تو جان لی ہے۔ آپ مجھے معاف کر دیں یا پھر مجھے مار دیں۔ ہاں مجھے مار دیں۔“ زریاب نے ہاتھ میں پکڑی جوتی اپنے سر پر مارتے ہوئے کہا۔

رسی جتنی لمبی ہوتی ہے۔ شکجہ اتنا ہی مضبوط ہوتا ہے۔ چھوٹے سے 8x8 کے کمرے میں ایک کونے میں فضلہ اور گندگی پڑی تھی۔ جس کا تعفن سارے کمرے میں پھیلا ہوا تھا۔ ننھا سا روزن جو امرود کی چند شاخوں روٹی اور آکسیجن اندر لانے کی ذمہ داری تو بڑی خوبی سے پوری کر رہا تھا۔ وہ اس تعفن کو باہر لے جانے کا کام بہت جلدی سے کر رہا تھا۔

چوہدری ہدایت اللہ کی اکلوتی بیٹی جو عام لڑکی نہ تھی۔ وہ خاص لڑکی ایک کونے میں بے بسی سے پڑی تھی۔ اُس کے کپڑے گندے پرائے اور بوسیدہ ہو چکے تھے۔ دیوار پر لکیریں بڑھتی جا رہی تھیں۔

ہر روز وہ امرود کی شاخیں پھل سے دوبارہ بھر جاتیں۔ پانی بھی وقفے وقفے سے آ جاتا۔ بھوک پیاس سے مجبور ہو کر زریاب امرود بھی کھا لیتی اور پانی بھی پیتی۔ ہر روز وہ اس امید پر سوتی کہ اگلا دن نہیں دیکھ پائے گی۔ لیکن اللہ اکبر کی صدا اُسے پھر جھنجھوڑ کر جگا دیتی۔ موت کا ٹل تو جاری تھا۔ مگر موت نہیں آرہی تھی۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ وہ ایک بار بھی بیمار نہ پڑی۔ وہ زندہ تھی۔ صحت مند تھی اور قید میں تھی۔ کیا تھا یہ؟ جادو؟ کرشمہ؟ کسی سنیا سی بابا کا کوئی عمل؟ معجزہ یا پھر القہار کا قہر.....

حسی علی الفلاح حسی علی الفلاح حسی علی الفلاح (آؤ نجات پانے کے لیے آؤ نجات پانے کے لیے) موذن نے پھر زریاب کو جھنجھوڑا۔

نا جانے کتنے دنوں سے وہ ایک ہی آواز مسلسل سن رہی تھی۔ اذان کی آواز صرف اذان کی آواز اور کچھ نہیں۔ آہستہ آہستہ وہ اذان کے الفاظ سے مانوس ہونے لگی۔ ”ہاں میں فلاح کی طرف آؤں گی۔ ہاں میں نجات کی طرف آؤں گی۔“ اپنے وجود کو گھسیٹ کر زریاب نے پائپ کے قریب کیا۔

آج خلاف توقع پانی بھی تیز آیا نا جانے کتنے عرصے بعد اُس نے وضو کیا اور 8x8 کے اُس چھوٹے سے تعفن زدہ نیم تاریک کمرے میں اپنے گندے لباس اور گندے وجود کے ساتھ وہ اپنے رب کے حضور سجدہ رہنے ہو گئی۔

دیوار پر لکیریں بڑھتی گئیں کتنی سے زیادہ اُن گت ابراہیم نے اپنی ماں کی حویلی کسی درس گاہ کے لیے

تسکری تھی۔ درس گاہ کے منتظم اعلیٰ نے حویلی کی صفائی کے لیے مزدور بلوائے۔ ”اچھی طرح سے سارا صاف کرو۔ یہاں کل سے درس کی کلاس ہوتی ہے۔ منگی بھی کھول کر اچھی طرح صاف کرو۔ اسے شال میں لانے کے لیے مرمت وغیرہ کرواتے ہیں۔ بہت مضبوط رنگ آلودہ بھاری ڈھکن مزدوروں نے زور لگا کر کھولا۔

”اندرو کوئی ہے اندرو کوئی ہے۔“ ایک مزدور نے چیخ کر کہا۔ جیسے وہ آہنی ڈھکن اچانک خود بخود بند ہو گیا تھا۔ ایسے ہی اچانک کھل گیا۔ سورج کی تیز روشنی نا جانے کتنے عرصے بعد زریاب کے چہرے پر پڑی۔ وہ جو اس ہم پانی کی عادی نہ تھی۔ اس کرم کا بوجھ نہ اٹھا سکی اور ہوش اس سے بے گانہ ہو گئی۔

جب زریاب کو ہوش آیا تو اپنے سامنے رفعت بیگم کو اکرے تابی سے بولی ”چچی جان میں کہاں ہوں؟“ رفعت بیگم نے دھیرے سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیر کر کہا۔ ”بیٹا ہسپتال میں۔“ ”اماں اور بابا جان کہاں ہیں؟“ زریاب کی بے تابی کسی طرح کم نہ ہو رہی تھی۔

”بیٹا! وہ دونوں اب اس دنیا میں نہیں ہیں۔“ رفعت بیگم نے روتے ہوئے کہا۔ ”نہیں چچی وہ مجھے چھوڑ کر نہیں جاسکتے۔“ زریاب نے بھی روتے ہوئے کہا۔ ”رفعت بیگم بولیں۔“

تمہاری گم شدگی کے بعد وہ بالکل گم صم ہو گئے تھے۔ اپنوں کی دوری مار ڈالتی ہے۔ اسی لیے تو شاہنواز بھی چلا گیا۔ حمزہ کا غم تو تمہارے سہارے سہہ گیا تھا تمہارا غم کس کے سہارے سہتا۔“ رفعت بیگم نے روتے ہوئے کہا۔

بڑے دعویٰ کے ساتھ اُس سنیا سی بابا نے جسے سو برس اُس کا بنایا تھا۔ وہ بھی اُس کا نہ رہا۔ اپنے نصیب سے زیادہ ایک زرہ بھی ہم حاصل نہیں کر سکتے۔ شاہنواز تو ہر ایک جیتا جاگتا انسان تھا۔

”چچی جان میں کتنے دنوں بعد ملی ہوں؟“ زریاب نے روتے ہوئے کہا۔ ”دنوں بعد! بیٹے تو! تو سالوں بعد ملی۔“ سالوں بعد..... ”رفعت بیگم نے زریاب کا ماتھا چوم کر کہا۔ ”کتنے سالوں بعد؟“ زریاب نے سک کر

پوچھا ”چودہ سال بعد“ رفعت بیگم کی آواز دور بہت دور سے آئی۔

”اماں آپ یہ سوپ پی لیں بہت کمزور ہو گئی ہیں آپ۔“ انیس سالہ ابراہیم نے محبت سے زریاب کے منہ میں چمچ ڈال کر کہا۔ ایک سال کی وہ محبت جو زریاب نے محض دکھاوے کے لیے کی تھی۔ ابراہیم کا کل اثاثہ تھی۔

”ابراہیم ایک دن میں پانچ بار اذان ہوتی ہے۔ چودہ سال میں کتنی بار اذان ہوتی ہے؟“ زریاب نے عجیب سے انداز میں عجیب سا سوال پوچھا۔ ابراہیم نے حیران ہو کر ماں کو دیکھا اور پھر اپنے موبائل سے حساب لگانے لگا۔ ”25550 بار“ ابراہیم نے کہا۔

”ابراہیم تم مجھے اپنی حویلی لے جاؤ۔“ زریاب نے بے تابی سے کہا۔ ”کیوں اماں؟“ ابراہیم نے پریشان ہو کر پوچھا۔ ”بس تھوڑی دیر کے لیے مجھے وہاں لے جاؤ پلیز!“ زریاب نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

زریاب کے کہنے پر ابراہیم اُسے حویلی لے آیا۔ زریاب اُسی منگی کے پاس آئی اور ایک ملازم سے کہا۔ ”نیچے اتر کر دیوار پر لگی لکیریں گن کر بتاؤ کتنی ہیں؟ ٹھیک سے گننا۔“ ملازم نے عجیب سی نظروں سے اُسے دیکھا جیسے اُس کی دماغی حالت پر شک ہو اور پھر نیچے اتر گیا۔

”25550!“ کچھ دیر بعد ملازم کی آواز آئی۔ اور ملازم کی آواز سننے ہی زریاب روتے روتے زمین پر بیٹھ گئی۔

پورے چودہ سال یعنی عمر قید عمر قید کی سزا کاٹی تھی اُس نے۔ وہ بھی اُس گناہ کی جس کا کوئی گواہ نہ تھا۔ اُس قتل کی جس کا کوئی ثبوت نہ تھا۔ مگر وہ یہ بھول گئی تھی کہ وہ اعلیٰ ذات خود ہی گواہ ہے اور خود ہی ثبوت..... اُس سے کچھ پوشیدہ نہیں ہے اور پھر جب وہ حساب برابر کرنے پر آتا ہے تو.....

اللہ اکبر اللہ اکبر کی صدا بلند ہوئی اور زریاب نماز کے لیے حویلی کی طرف بڑھ گئی کیوں کہ یہ بھی اُسی اعلیٰ ذات کا وعدہ ہے کہ وہ آخری سانس تک توبہ قبول کرے گا۔

وہو علی کل شئی قدیر (اور وہ ہر شے پر قادر ہے)۔

☆☆.....☆☆

ایک لمحے کی بھول

رضوان قیوم

اُس کی ایک لمحے کی بھول نے دو زندگیاں اُجاڑ دیں
ہوس کے مارے ہوئے لوگ یہ کہانی ضرور پڑھیں



1954ء کی بات ہے، میں پاکستان کے ایک شہر کی ایک یونیورسٹی میں پڑھا کرتی تھی۔ یہ تو آپ نے ہی جانتے ہیں کہ ہمارے ملک کی یونیورسٹیوں میں آج بھی کوانٹیکیشن سسٹم ہوتا ہے۔ اس یونیورسٹی میں بھی کوانٹیکیشن سسٹم تھا اسی لیے یونیورسٹی کا ماحول بہت آزادانہ تھا۔

لڑکے لڑکیاں آپس میں آزادانہ طور پر ملا کرتے تھے اسی لیے لڑکیاں لڑکے اپنی تعلیمی سرگرمیوں پر کم اور خوشحالی پر زیادہ توجہ دیتے تھے۔

میں ایک متوسط خاندان سے تعلق رکھتی تھی۔ میرے والد سعید الدین محنت مزدوری کے سلسلے میں ایک عرصے سے لیبا گئے ہوئے تھے۔ میرے علاوہ میری ایک اور بہن شمیم بھی لیکن ہمارا کوئی بھائی نہیں تھا۔

جب ابو کی شادی ہوئی تو اُس وقت وہ ایک ٹھیکے دار تھے اس مزدوری کیا کرتے تھے۔ شادی کے ابتدائی دنوں میں تو ہم تنخواہ کے باوجود گھر کا گزارہ ہو جاتا تھا لیکن جب میں اور میری بہن پیدا ہوئیں تو اخراجات میں اضافہ ہو گیا اور گھر میں معاشی تنگی بڑھنے لگی۔ ان حالات میں ابو نے بہتر معاشی مستقبل کی خاطر ملک سے باہر جانے کا فیصلہ کیا۔ رخصت ہوتے وقت ایئر پورٹ پر ابو نے والدہ کو خاص طور پر ہدایت کی کہ میری دونوں بیٹیوں کی تربیت دینی دنیاوی ہر لحاظ سے عمدہ طریقے سے کرنا۔

ابو نے ایک چھوٹا سا مکان ہمیں لے کر دے دیا تھا۔ انہوں نے باہر جا کر امی کو اُس وقت کے لحاظ سے اچھی خاصی رقم خرچے کے لیے بھیجنا شروع کر دی جس سے گھر کا گزارہ اچھے طریقے سے ہونے لگا۔

اماں میرے ابو کی ہدایت کے مطابق ہماری تربیت اچھے طریقے سے کر رہی تھیں۔ انہوں نے ہمیں روایتی طور پر قرآن کی تعلیم دلوائی اور ہمیں شہر کے اچھے اور مہنگے سکولوں میں پڑھائی کے لیے ڈالا تھا۔

وقت اسی طرح اپنی مخصوص رفتار سے گزرنے لگا اور بہت سے سال بیت گئے۔ میں اور میری بہن شمیم جوان ہو گئی تھیں۔ اس دوران والدہ نے والد کی طرف سے بھیجے جانے والی رقم سے بچت کر کے ایک اچھا مکان خرید لیا تھا۔ والد کی کمائی سے گھر میں خوش حالی آ گئی تھی جیسا آنا شروع ہوا تو اس معاشی خوشحالی میں ہماری

امی ہم دونوں بہنوں کی حرکات و سکنات پر زیادہ توجہ نہ دے پا رہی تھیں۔ میں جب یونیورسٹی میں داخل ہوئی تو وہاں کا ماحول اسکول کی زندگی سے یکسر بدلا ہوا پایا تھا۔ یونیورسٹی کی دنیا ہی علیحدہ تھی۔ جیسا میں نے پہلے بتایا کہ یہاں کوانٹیکیشن سسٹم تھا، پڑھائی سے بے زار عاشق پسند لڑکیاں اور لڑکے عشق و محبت کے چکر میں گم ہو کر جوڑوں کی شکل میں یونیورسٹی کے لان، کونے کھدروں میں سر جوڑے بیٹھا کرتے تھے۔

اپنی سہیلیوں کو دیکھ کر مجھے بھی شوق پیدا ہوا کہ میں بھی کوئی اچھا سا بوائے فرینڈ چنوں لیکن مجھے میری سوچوں کے معیار والا کوئی لڑکا نظر نہیں آ رہا تھا۔ اچھے خوبصورت لڑکے میری سہیلیوں نے چھانٹ لیے تھے۔

ایک دن یونیورسٹی میں واجبی شکل و صورت کا لڑکا وارد ہوا، اسے دیکھ کر نہ جانے کیوں میرے اندر ہلچل سی ہونے لگی اور میرے دل میں یہ خواہش شدت سے جاگنے لگی کہ اسے بوائے فرینڈ بنایا جائے پھر میں نے اس پر ڈورے ڈالنا شروع کر دیئے۔ اسے قابو کرنے میں مجھے زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی تھی۔ وہ میری محبت کے جال میں بڑی آسانی سے آ گیا تھا۔ اس کا نام سمیر تھا۔

اس نے مجھے صاف صاف بتایا تھا کہ وہ ایک غریب خاندان سے تعلق رکھتا ہے اور اس کی غریب بیوہ ماں بنگلوں، کوٹھیوں میں صفائی ستھرائی کا کام کرتی ہے۔ نیز اس نے یہ بھی بتایا کہ وہ پڑھ لکھ کر اپنی ماں کے دکھوں کا مداوا کر کے معاشرے میں اعلیٰ مقام حاصل کرنا چاہتا ہے۔ رفتہ رفتہ ہم دونوں کا عشق اس حد تک بڑھ گیا تھا کہ ایک روز وہ مجھے گھر تک لے گیا۔ وہاں ان کا چھوٹا سا مکان ایک پس ماندہ کچی آبادی میں ضرور تھا لیکن اس کی ماں اور بھائی بہت خوش مزاج اور زندہ دل تھے بالخصوص سمیر کی ماں نے بڑے والہانہ انداز میں میرا استقبال کیا۔ اس کی ماں نے میرے خاندان کے متعلق پوچھا اور پھر اپنے بارے میں سرسری طور پر بتاتے ہوئے کہا۔ ”بیٹی! سمیر نے مجھے تمہارے بارے میں بتایا ہے اور مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ وہ تم سے محبت کرتا ہے۔ بیٹی! تم ایک کھاتے بیٹے خاندان سے تعلق رکھتی ہو۔ بیٹی! تم خود ہی فیصلہ کرو کہ کیا یہ گھر تمہارے شایان شان ہے؟“

میں نے انہیں کہا کہ مجھے امید ہے کہ سمیر جب پڑھ

لکھ جائے گا تو وہ اپنا اچھا مستقبل بنالے گا اور ویسے بھی مجھے اس کی ذات سے محبت ہے۔ میں آپ کے ساتھ بہت دور تک جاؤں گی۔

انہوں نے مجھ سے کہا۔ ”بیٹی! یہ تمہارا جذباتی فیصلہ ہے لیکن جہاں تک میری شادی کا تعلق ہے اس میں ابھی کئی رکاوٹیں حائل ہیں۔“

”میں آپ کی بات نہیں سمجھی آئی؟“

انہوں نے کہا کہ ”دیکھو شہناز بیٹا! اول تو میرے اپنی تعلیم مکمل کر کے چاب کرنا ہے اور پھر یہ نوکری کر بھی لے گا تو کیا تمہارے گھر والے بھی اسے تمہارے لیے پسند کر لیں گے؟“

”اس کی آپ فکر نہ کریں۔ میں ہر قیمت پر اپنے گھر والوں کو سمجھا لوں گی۔“

وقت گزرتا رہا میری اور میری محبت اب جنون میں تبدیل ہو چکی تھی۔

ہم دونوں بے باکانہ طریقے سے ہر شام کو لازماً ملا کرتے تھے۔ اس دوران یہ ہوا کہ میں نے اور اس نے امتحانات دے دیے تھے۔

وہ تو اچھے نمبرز سے پاس ہو گیا لیکن میں انگلش کے پیپر میں فیل ہو گئی۔ میرے اس کے بعد سی ایس ایس کا امتحان دیا اور میں انگلش کا پیپر دینے میں مصروف ہو گئی۔ میرے تو سی ایس ایس کا امتحان پاس کر کے ریلوے میں اعلیٰ پوسٹ پر فائز ہو گیا لیکن بد قسمتی سے میں دوبارہ انگلش کے پرچے میں فیل ہو گئی۔

پھر تیسرے اور آخری چانس میں بھی میں بی اے کا امتحان پاس نہ کر سکی۔

میرے مجھے بہت زور دیا کہ میں دوبارہ سے بی اے کی تیاری کروں لیکن پڑھائی سے میرا دل اب اچاٹ ہو گیا تھا۔

میں نے اپنی کتابوں کا پیوں کو کباڑیے کے ہاتھ فروخت کر دیا۔ میرا اب ایک اعلیٰ سرکاری افسر تھا۔ اس کا تبادلہ خانیوال جنکشن میں ہو گیا۔ وہاں اسے سرکاری طور پر بنگلا بھی ملا۔

اس نے خانیوال جانے سے پہلے مجھے اپنے گھر بلا کر اپنی امی سے ملوایا۔ ان کی امی نے مجھ سے کہا کہ اب چونکہ میرا عزت ذریعہ معاش سے لگ گیا ہے لہذا اب

میں اس پوزیشن میں ہوں کہ میں تیرا ہاتھ مانگنے تیری ماں کے پاس آ سکتی ہوں۔

میں نے اپنی امی سے جب میرے بارے میں ذکر کیا تو انہوں نے کہا کہ میں جب تک لیپیا میں موجود تمہارے ابو سے نہ پوچھوں گی اُن لوگوں کو رشتے کے لیے اپنے گھر نہیں بلاؤں گی۔

امی نے میری محبت اور میرے بارے میں ابو کو جب خط لکھا تو انہوں نے جواب میں ایک طویل لعن طعن والا خط مجھے لکھا۔

انہوں نے امی کو بھی لکھا کہ تمہاری غفلت کی وجہ سے شہناز بی اے نہیں کر سکی اور وہ عشق کے چکر میں پڑ گئی۔ انہوں نے سختی سے انکار کرتے ہوئے کہا کہ میں جلد پاکستان آ کر اپنے بچپن کے دوست اسلم کے بیٹے تصدق سے شہناز کے رشتے کی بات کروں گا۔

تصدق ایک پرائیویٹ کمپنی میں کلرک تھا۔ اس کی ٹانگ میں معمولی سا لنگ بھی تھا۔ میں نے امی کو میرا اور تصدق کے بارے میں بتایا کہ دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے اور یہ بات آپ بھی اچھی طرح جانتی ہیں۔

امی نے کہا۔ ”میری نظر میں بے شک میرے تصدق سے ہزار درجے بہتر ہے لیکن میں تمہارے ابو کی وجہ سے مجبور ہوں۔ میں اس سلسلے میں کچھ نہیں کر سکتی۔“

میرے ٹیلی فون اور خطوط کے ذریعے میرا رابطہ رہتا تھا۔ وہ مجھے ہر بار لکھتا تھا کہ میری اماں شادی کے بارے میں سنجیدگی سے سوچ رہی ہیں۔ ہر ماں کی طرح ان کی بھی خواہش ہے کہ جلد از جلد بیٹے کے سر پر سہرا دیکھیں یوں بھی اب اللہ کے فضل سے ہم خاصے خوش حال اور باعزت ہیں۔ تم کسی طرح اپنے ابو کو منانے کی کوشش کرو۔

میں بڑی شش و پنج میں تھی۔ بالآخر بڑی سوچ بچار کے بعد میں نے اپنے ابو کو ڈرتے ڈرتی تفصیلی خط لکھا۔

میں نے انہیں میرے اپنی بے پناہ محبت اور تصدق سے شادی کے انکار کے بارے میں لکھا۔ جواباً میرے ابو نے مجھے انتہائی غضب ناک خط لکھا اور لکھا کہ وہ اگلے نئے پاکستان آ کر یہ قصہ ہی نہ شادیں گے۔ میں نے امی سے کہا کہ میں زہر کھالوں گی لیکن کسی صورت بھی تصدق سے شادی نہیں کر سکتی۔

میری امی نے بہت خوشامد انداز میں کہا۔ ”خدا

میرے لیے میری شادی کی ضد چھوڑ دو اور باپ کی بات مان لو۔“

میرے خود بھی خانیوال سے میرے پاس ملنے آیا اور ”شہناز! تم تصدق سے شادی کر لو۔ مجھے تم سے کوئی شکایت یا گلہ نہیں ہے لیکن میرا تم سے یہ وعدہ ہے کہ میری زندگی شادی نہیں کروں گا۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے؟ جب تم میری خاطر ساری زندگی شادی نہیں کر سکتے تو میں کیسے تمہارے بغیر کسی دوسرے مرد کی بیوی بن جاؤں؟ میرا تمہاری خاطر میں اپنی جان دے سکتی ہوں۔“ میں نے ڈبڈبائی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

”جذباتی نہ بنو اپنے ابو کا فیصلہ مان لو۔“ میرے نے کہا۔ ”نہیں میرا! میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔“ میں نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ وہ مجھے سمجھا بجا کر بوجھل قدموں سے لوٹ گیا۔

ایک دن ہمارے گھر ابو کے دوست اسلم اپنی فیملی کے ساتھ مجھے دیکھنے کے لیے آ گئے۔ سچی بات ہے وہ بچپن میں اتنے برے نہ تھے۔ مجھے انکل اسلم کی بیگم نے تصدق کی تصویر بھی دکھائی تھی۔

وہ ہر لحاظ سے بہتر تھا لیکن میں تو میرے عشق کی آگ میں سلگ رہی تھی۔ میں نے رورور تصدق سے شادی سے انکار کر دیا تھا۔

میرا رونا اور واویل اس کر تصدق کی فیملی والے ناراض ہو کر چلے گئے۔

ان کے جانے کے بعد امی نے مجھے بہت بیدردی سے مارا چٹا لیکن میں بھی شس سے مس نہ ہوئی۔ میں سارا بار ان اپنے کمرے میں بند رہتی اور میرے بارے میں سوچتی رہتی تھی۔

ایک دن میں نے چوہ مار گولیاں کھا کر اپنی زندگی بھر کا چاہا لیکن میری جان بچ گئی۔

امی نے میری اس جنونی کیفیت کے بارے میں ابو کو لکھا کہ وہ پاکستان آ کر اس معاملے کو سلجھا میں شہناز اب میرے قابو میں نہیں ہے۔

حیرت مجھے اُس وقت ہوئی جب امی کا لکھا ہوا خط آیا۔ اس خط کے لفظوں پر لکھا تھا کہ مذکورہ شخص شہناز نہیں ہے۔

”جیل میں! یہ کیا ہو گیا؟ ابو جیل میں کیسے چلے گئے؟“ میں نے روتے ہوئے پوچھا۔

ابو کے جیل میں بند ہونے کی یہ اطلاع ہمارے خاندان میں بجلی کے مانند گری۔

ہمیں اس خبر پر یقین نہیں آ رہا تھا۔ ہمارے ابو تو بڑے شریف النفس شخص تھے اور دنیاوی فراڈ لڑائی جھگڑے سے دور رہنے والے انسان تھے۔ وہ کیسے جیل چلے گئے؟

ہمارے گھر میں پہلے ہی میری اور میری محبت کی وجہ سے تناؤ چل رہا تھا۔ اب ابو کا جیل جانا ایک نیا عذاب بن کر ہمارے خاندان کو ڈسنے لگا۔

امی نے روتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ”تیری اور میری محبت کی کہانی نے ہمارے گھر میں نحوست پیدا کر دی ہے۔“ انہوں نے مجھے برا بھلا کہنا شروع کر دیا۔

بعد میں ہم لوگوں نے لیپیا کی جیل میں موجود ابو کے بارے میں بڑی مشکل سے تحقیق کی کہ وہ جیل میں کیوں بند ہیں؟ معلوم ہوا کہ ابو پر وہاں کسی پاکستانی فراڈیے نے جھوٹا کیس ڈال دیا ہے اور اس نے انہیں اس کیس میں ایسا پھنسا دیا ہے کہ انہیں 10 سال کی سزا ہو گئی ہے۔

ایک تو میری اور میرے عشق کی خبر باہر نکل گئی اور دوسرا ابو کی لیپیا میں جیل میں نظر بندی کی وجہ سے ہمارے گھر کی بڑی بدنامی ہو رہی تھی۔ اُن دنوں میری بہن شیم کا ایک بہت اچھا رشتہ بھی آیا تھا لیکن وہاں سے ان ہی حالات کی وجہ سے انکار ہو گیا۔

جب سے ابو کو قید ہوئی تھی، کوئی ذریعہ آمدنی نہیں رہا تھا۔ گھر میں بہت معاشی بد حالی تھی۔

صورت حال یہ ہو گئی کہ امی نے گھر میں موجود قیمتی اشیاء فروخت کرنا شروع کر دی تھیں۔

ایک وقت ایسا بھی آیا کہ ہمارے گھر میں کھانے پینے کے لالے پڑ گئے اور دوسری جانب والد سے بھی لیپیا میں رابطہ نہ ہو رہا تھا۔

ایک دن امی نے مجھے اپنے پاس بلا کر خود ہی کہا۔ ”بیٹی! تو کسی نہ کسی طریقے سے میرے رابطہ کر اور اس سے کہہ کہ وہ ہماری مدد کرے۔“

میں نے میرے کو ایک تفصیلی خط لکھا۔ خط ملتے ہی وہ گویا گھڑی کی چوتھائی میں ہمارے شہر

آگیا۔ اسے امی نے رو رو کر اپنے مسائل سنائے۔ پہلا مسئلہ والد کی لیبیا سے رہائی کا تھا پھر میرے اور شیم کے رشتے کی بات تھی۔

میر نے امی سے کہا کہ وہ اگر چاہیں تو میں آج بھی شہناز سے شادی کرنے کے لیے تیار ہوں۔

امی نے اسے روتے ہوئے جواب دیا۔ ”بیٹا! یہ بات تو تمہیں بخوبی معلوم ہے کہ شہناز کے والد نے تم سے اس کی شادی کے بارے میں سختی سے انکار کیا تھا لیکن اب میں مجبور ہوں۔ بیٹا! میں اب تمہیں اجازت دیتی ہوں کہ تم شہناز سے شادی کر لو۔“

میر نے امی سے کہا۔ ”آپ اچھی طرح سوچ لیں۔ کل جب شہناز کے والد پاکستان آئیں گے تو آپ انہیں کیا جواب دیں گی؟“

امی نے کہا۔ ”بیٹا! اس وقت ہم ایسے عذاب کا شکار ہیں کہ کل تک تو ہم ان حالات کی چکی میں پس کر مر جائیں گے۔ وہ جب پاکستان آئیں گے تو میں سنبھال لوں گی۔“

میر نے اپنی امی کو ہمارے گھر بھیجا۔ وہاں اس کی امی نے فوری طور پر ہاں کر دی۔

میر کے ساتھ بڑی سادگی سے میرا نکاح ہو گیا۔ میں بغیر جہیز کے میری دلہن بن کر خانوال چلی گئی۔ میں اس بات پر خوش تھی کہ قدرت نے ایسے حالات پیدا کر دیے کہ تقدیر نے ہمیں ملا دیا تھا لیکن دوسری جانب مجھے اپنے ابو کے بے قصور قید ہونے کا بھی بہت غم تھا۔ اس کے ساتھ ساتھ مجھے اپنے گھر کی معاشی بد حالی اور شیم کے رشتے کی بھی بڑی فکر لاحق تھی۔

میر ایک بڑے اچھے انسان تھے۔ وہ بہت تعاون کرنے والے تھے۔ دوسری جانب ان کی ماں اور ان کا بھائی بہت اچھے تھے۔

میر والد کو لیبیا جیل سے چھڑوانے کے لیے دن رات کوششیں کر رہا تھا۔ اس نے وہاں کسی طریقے سے رابطہ کر کے ہمارا اُن سے رابطہ بھی کروا دیا تھا۔ وہاں ایک وکیل کے ذریعے اُن کا مقدمہ لڑوایا اور اُن کی سزا کو کسی حد تک کم بھی کروایا۔

میر کی کوششوں سے ایک آدھ دفعہ ان سے ہمارا ٹیلی فونک رابطہ بھی ہوا۔ اسی دوران میں میر نے شیم بہن

کی شادی بھی اپنے ایک دوست کے ساتھ کروادی تھی۔ یہی نہیں اس نے ہمارے گھر کے مالی حالات کو بھی بنانے کے لیے ہمارے گھر کے ایک حصے میں کچھ ضروری تبدیلیاں کر کے اسے کرائے پر چڑھا دیا تھا۔ اس سے ہمیں معقول آمدنی ہونے لگی۔

لگتا تھا ہماری زندگی اب خوش حالی طرف گامزن ہے۔ سب کچھ اچھا ہوتا ہوا نظر آ رہا تھا۔

میر کی شادی کو چار سال ہو چکے تھے۔ میری زندگی بھی بڑے اچھے طریقے سے معمول کے مطابق چل رہی تھی۔ اس دوران اللہ نے مجھے دو بیٹے دیے۔

ایک دن میری امی نے مجھے بتایا کہ ابو لیبیا کی جیل سے آزاد ہو کر پاکستان آ رہے ہیں۔ یہ خبر سن کر ہمارے پورے خاندان میں خوشی کی لہر دوڑ گئی تھی۔ ان کی بقیہ سزا لیبیا حکومت نے معاف کر دی تھی۔

ان کے آنے کی خوشی میں والدہ نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ ہم اپنے گھر میں ایک عالی شان جشن کریں گے اور اس میں پورے خاندان کو جمع کر کے دعوت طعام کی جائے گی۔ انہوں نے ہم دونوں بہنوں کو اس خوشی کے موقع پر گھر آنے کی دعوت دی تھی۔ میں اپنے ابو کا سامنا کرنے سے ڈر رہی تھی۔ میں نے ان کی مرضی کے خلاف میر سے شادی کی تھی۔ امی نے مجھ سے کہا کہ میں ان سے کہوں گی کہ میں نے میر سے شہناز کی شادی کا فیصلہ اپنے گھر کی معاشی بد حالی کی وجہ سے کیا ہے۔

انہوں نے مجھے یہ بھی تسلی دی کہ وہ جب مجھے میر کے ساتھ خوش دیکھیں گے تو تمہاری طرف سے ان کا دل صاف ہو جائے گا۔ امی نے مجھ سے کہا تھا کہ بیٹی! جب تمہارے ابو تمہارے سامنے آئیں تو تم ان کے پیر پکڑ کے ان سے ان کی مرضی کے خلاف میر سے شادی کرنے پر معافی مانگنا اور بعد میں اپنے بیٹے کو بھی ان کے قدموں میں ڈال دینا۔

میرے دونوں بچے ماشاء اللہ انتہائی حسین تھے۔ انہیں ویسے بھی گول مثول بچوں سے محبت تھی۔

ابو کو ایئر پورٹ لینے ہم سب گھر والے گئے تھے۔ امی، شیم، شیم کا شوہر اور میں!

ابو اپنی عمر سے بہت زیادہ بوڑھے اور لاغر لگ رہے تھے۔ انہوں نے شیم اور اس کے شوہر کے سر پر ہاتھ پھیرا

انہوں نے میری جانب سے کیے گئے سلام کا کوئی جواب نہ دیا اور منہ پھیر لیا۔

انہوں نے ایئر پورٹ پر ہی مجھے کہہ دیا کہ تو میری زندگی میں مجھے کبھی اپنی شکل نہ دکھانا۔ گھر آ کر بھی وہ مجھ سے ناراض ہی رہے۔ میں اُن کے قدموں میں بیٹھ گئی۔

میں نے اُن سے پہلے میر سے شادی کرنے کے بارے میں معافی مانگی اور انہیں وہ حالات بتائے جن کی بنا پر امی نے مجھے میر سے شادی کی اجازت دی تھی۔ انہوں نے میری ایک نہ سنی بلکہ انہوں نے نہ صرف میری بلکہ امی کی بھی بڑی تذلیل کی۔

میر نے ابو کا غصیلہ موڈ دیکھا تو انہوں نے کہا۔ ”شہناز! تم گھر چلو۔ تمہارے ابو بڑے عرصے بعد پاکستان آئے ہیں اور تمہاری شادی کے غم سے سلگ رہے ہیں۔“

اس موقع وقت کی مصلحت ہی یہی تھی کہ میں نے سب سمجھا کہ اس وقت مجھے اپنی سسرال چلے جانا چاہیے۔ ابو کو پاکستان آئے ہوئے تقریباً تین ماہ کا عرصہ دیا تھا۔ میرا دل امی اور ابو سے ملنے کو بے چین تھا۔ شیم سے میرا رابطہ رہتا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ پریشانیوں کی وجہ سے ابو کو شوگر ہو گئی ہے اور ان کی صحت بہت گر گئی ہے۔ میں نے شیم کی زبانی جب والد کی یہ حالت سنی تو مجھ سے رونا نہ گیا۔ میں نے میر سے کہا کہ میں ہر صورت میں ابو کو دیکھنے پنڈی جاؤں گی۔ انہوں نے مجھے اور بچوں کو ہماز کے ذریعے پنڈی بھیج دیا۔

میں جب اپنے میکے پہنچی تو امی نے مجھے فوری طور پر اپنے سینے سے لگا لیا۔ ابو چار پائی پر لیٹے ہوئے تھے۔ انہوں نے اپنا منہ دیوار کی جانب کر لیا۔ انہیں میری آمد کا احساس ہو چکا تھا۔ میں نے اُن کے پاؤں پکڑ کر اُن کی آنکھوں کے مطابق تصدیق سے شادی نہ کرنے اور میر کو ہاتھ دینے کی گستاخی کی معافی مانگی۔ اتنے میں امی ان کے پاس آئیں۔ انہوں نے بھی ابو سے کہا کہ اب جو ہونا تھا ہو گیا۔ اسے قسمت کا لکھا یا ہماری مجبوری کا سودا کھو اور شہناز کو اب معاف کر دو۔

میں نے امی کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ”مجھے میر اور اس کی ماں نے بالکل شہزادیوں کی طرح معاف کر دیا ہے۔ مجھے وہاں کوئی تکلیف نہیں ہے۔“ دوسری

جانب امی نے انہیں روتے ہوئے بتایا کہ آپ جب لیبیا کی جیل میں بند تھے تو اُس وقت میر ہی نے شہناز کو اپنی دلہن بنایا تھا۔ اگر یہ اُس وقت اس سے شادی نہ کرتا تو یقیناً آج بھی شہناز اور شیم ہماری چوکھٹ پر ہوتیں۔ آپ جب لیبیا کی جیل میں تھے تو میر ہی نے اپنی کوششوں سے آپ کا وہاں کیس لڑ کے سزا کم کروائی تھی اور یہی نہیں اس نے اُس وقت ہماری مالی معاونت کی تھی۔

ابو اپنے بستر سے اٹھے۔ انہوں نے مجھے اپنے سینے سے لگا کر کہا۔ ”بیٹی! تم نے میرے بچپن کے دوست اسلم کے بیٹے سے شادی نہ کر کے میرا دل دکھایا تھا۔ میں اسے اپنا منہ دکھانے کے قابل نہ رہا بلکہ میں اُس سے اپنی دوستی سے بھی محروم ہو چکا ہوں لیکن میں تجھے معاف کرتا ہوں۔“ انہوں نے میرے سر پر دست شفقت پھیرتے ہوئے مجھے معاف کر دیا۔ انہوں نے میرے بچوں کو بھی اپنے گلے سے لگا لیا۔ تھوڑی دیر بعد شیم بھی اپنے خاوند اور بچے کے ساتھ آ گئی۔ اُس وقت ایسا لگ رہا تھا جیسے ہمارے گھر میں طویل خزاں کے بعد بہار کا موسم آیا ہے۔ شیم نے ابو کو مشورہ دیا کہ ہمیں اپنے میکے میں میرے اور شہناز کے تمام سسرالیوں کی دعوت کرنی چاہیے۔ اس سے یہ ہوگا کہ ہم دونوں کے سسرال والے نہ صرف خوش ہوں گے بلکہ میر کا موڈ بھی اچھا ہو جائے گا۔

”ابو!.....! آپ نے اپنی آمد کے موقع پر میر کی بہت تذلیل کی تھی۔“ شیم نے کہا۔ ”مجھے یقین ہے ابو!.....! آپ میر کو دیکھیں گے تو یقیناً آپ اسے پسند کریں گے۔ اچھا انسان ہے بڑا فرائخ دل ہے۔“

میں نے شیم کی بات کاٹتے ہوئے کہا تھا۔ ”ہم نے میکے میں یہ باہمی فیصلہ کیا کہ ابو مجھے یہ ذات خود میرے سسرال خانوال چھوڑنے جائیں گے اور وہاں جا کر سب سے پہلے میر اور اس کی ٹیمکی سے اپنے رویے کی معافی مانگیں اور پھر وہ انہیں باقاعدہ اپنے گھر آنے کی دعوت دیں۔“

ابو نے میر اُس کی ماں اور میرے چھوٹے دیور کے لیے خصوصی تحفے اور مٹھائی لی۔

میں جب ابو کو لے کر اپنے سسرال پہنچی تو وہاں میر اور اُن کا بھائی انہیں دیکھ کر بہت حیران ہوئے۔ میری ساس اُس وقت گھر میں موجود نہ تھی۔ محلے میں کسی کا

انتقال ہو گیا تھا وہاں گئی ہوئی تھیں۔ ابو نے سمیر کے شانے پر ہاتھ رکھ کر اس سے اپنے گزشتہ رویے کی معافی مانگنے کے لیے پہلا لفظ ہی نکالا تھا کہ سمیر نے ابو سے کہا۔ ”میں آپ کے بیٹے کی طرح ہوں۔ آپ مجھ سے معافی مانگ کر مجھے شرمندہ نہ کریں۔ میرے دل میں ایسی کوئی بات نہیں۔“

تھوڑی دیر بعد جب ماحول نے خوشگوار اختیاری اور دنیا داری کی باتیں شروع ہوئیں تو سمیر نے مجھ سے کہا کہ میں ابو کے لیے ذرا بازار سے کھانے بیٹے کی اشیاء لے آؤں۔ ابو نے انہیں بتایا کہ بیٹا! میں صبح ہی واپس راولپنڈی چلا جاؤں گا اور میں سادہ غذا کھاتا ہوں۔ جو گھر میں موجود ہے وہی کھاؤں گا۔ تم بازار جا کر تکلف میں نہ پڑو۔

سمیر نہ مانے۔ وہ خوشی خوشی بازار چلے گئے۔ ابو میرے گھر کی آرائش کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کے دیکھنے لگے۔ وہ بہت خوش نظر آ رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد میری ساس محلے سے آ گئیں۔ میری ساس جب میرے کمرے میں آئیں اور انہوں نے جب میرے ابو کو دیکھا تو وہ فوراً چونک کر رہ گئیں۔

دوسری جانب میرے ابو بھی انہیں چونک کر دیکھنے لگے۔ ”اختری! تم؟“ ابو کے منہ سے یہ جملہ نکلا۔

”سعید الدین! تم؟“ دوسری جانب ساس کے منہ سے بھی یہ جملہ نکلا۔

”کیا آپ ایک دوسرے کو جانتے ہیں؟“ میں نے ابو سے پوچھا۔

ابو اپنا سر پکڑ کر صوفے پر بیٹھ گئے۔ ”بیٹی شہناز! تم ایک لمحے کے لیے باہر جاؤ۔“ ابو نے جھنجھلائے ہوئے انداز میں کہا۔

اس کے بعد میری ساس نے بھی بڑے افسردہ لہجے میں مجھ سے کہا کہ ”بیٹی شہناز! تم ذرا کچن میں جا کر میرے لیے اچھی سی چائے بناؤ۔“

میں اچانک بدلتی صورت حال کے پیش نظر بڑی پریشانی میں کچن میں پہنچ کر بے دلی سے اپنی ساس کے لیے چائے بنانے لگی۔ یہ ابو اور میری ساس کے درمیان بالآخر کون سا رشتہ ہے جس کی بنا پر انہوں نے ایک دوسرے کو بہت چونک کر دیکھا ہے اور انہوں نے مجھے

خصوصی طور پر اپنے کمرے سے نکال دیا ہے؟

اس قسم کے لاتعداد سوالات میرے ذہن پر ہتھوڑے بن کر برسنے لگے۔ میں نے فنافٹ چائے بنائی اور میں جب کمرے میں گئی تو میرے ابو انتہائی انہوش کے عالم میں اپنا دل پکڑے بیٹھے تھے۔

میں نے گھبرا کر اُن سے پوچھا۔ ”کیا بات ہے ابو! آپ اس طرح کیوں بیٹھے ہیں؟“

انہوں نے پر تاسف لہجے میں کہا۔ ”بیٹی! کاش میں تم سے ہمیشہ ناراض رہتا اور تمہاری سسرال نہ آتا۔“

”کیوں ابو!؟ آخر آپ مجھے بتاتے کیوں نہیں کہ بات کیا ہے؟“

وہ شدید صدمے کی حالت میں بولے۔ ”بیٹی شہناز! لگتا ہے آج میری ذرا سی بھول اور جوانی کے چند لحظات جذباتی نشے نے میری بقیہ زندگی کے لیے تمہاری سمیر سے شادی کی شکل میں سزا دے دی ہے۔“

”کیا مطلب؟“ میں نے چلاتے ہوئے بڑے تجسس کے ساتھ پوچھا۔

”بیٹی! بس یہ سمجھ لو کہ سمیر تمہارا بھائی ہے۔“

”نہیں! نہیں! آپ یہ کیا کہہ رہے ہیں؟“

”یہ سچ ہے بیٹی!۔“

ابو کے منہ سے یہ دل خراش جملہ سن کر مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے میرا دل پھٹ رہا ہو۔

چند لمحوں بعد میری ساس بھی بڑی پریشانی میں کمرے میں داخل ہوئیں۔ انہوں نے میرے ابو سے کہا۔ ”سعید الدین! تم شہناز سے کہو کہ وہ سمیر سے طلاق لے لے۔“

”تو تم کیا ایک بدکار زانی عورت تھیں؟“ میں نے روتے ہوئے اپنی ساس سے کہا۔

اس دوران میرے ابو نے میرے گالوں پر تران سے ایک پھٹ مارا اور کہا کہ یہ اختری ایک معصوم بے بھگ لڑکی تھی۔ میں ہی بدکار تھا یہ میری ہوس کا نشانہ بنی ہے لیکن مجھے نہ معلوم تھا کہ میری ایک لمحے کی تسکین مجھے

زندگی کے اس بھیا تک دوراے پر گھڑا کر دے گی۔

”تم میری زندگی کی خوشیوں کے قاتل اور میری عزت کے لٹیرے ہو۔“ سمیر کی ماں نے چلا چلا کر جنوبی انداز میں واویلا شروع کر دیا۔ ”میں اب چپ نہیں رہ

تی۔ تم کیا سمجھتے ہو ایک گناہ جو میری بے عقلی کی وجہ سے دوسرے ایک اور سنے گناہ کی زنجیر کی کڑی اس سے لڑی جائے؟ سمیر تمہارا ابو ہے اور شہناز بھی تمہاری بیٹی ہے اور رشتہ کے لحاظ سے سمیر اس کا بھائی ہے۔ بتاؤ! تم کس شریعت کے تحت اپنا ازدواجی رشتہ قائم رکھ سکتی ہو؟ میرا تو دل کرتا ہے سعید الدین! تمہارے

پر بھوک دوں اور سمیر سے دھکے دلوں کر باہر نکلوا۔ تم خدا کے واسطے یہاں سے فوری طور پر دفع ہو جاؤ۔“

”تم نے آج برسوں بعد میرے سامنے آ کر اور وہ بھی شہناز کے باپ کے روپ میں میرے

بچے پر پرچھی مار دی ہے۔“

اتنے میں سمیر بھی وہاں آ گیا۔ اسے دیکھ کر میری ماں روتے ہوئے دوسرے کمرے میں چلی گئی۔

سمیر نے ہونفوں کی طرح میری جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ”یہ امی کیوں چلا رہی تھیں؟ اور وہ کیوں روتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی گئی ہیں؟“

میرے بھی اعصاب قابو میں نہ تھے میں انہیں کیا جواب دیتی؟ ابو انتہائی تھکے پریشان کن چال چلتے ہوئے کمرے سے اٹھ کر گھر سے باہر نکل گئے۔ میں نے

اور سمیر نے ان سے پوچھا کہ آپ کہاں اور کیوں جا رہے ہیں؟ ہم دونوں نے انہیں روکنے کی بہت کوشش کی لیکن

وہ نہ روکے۔

”کیا ہوا؟“ سمیر نے شدید گھبراہٹ کے عالم میں مجھ سے پوچھا۔

میں سکتے کے عالم میں بت بنی ہوئی تھی۔ میں نے ان کے کسی سوال کا جواب نہ دیا تھا۔ اس نے مجھے بری طرح جھنجھوڑا۔

میں انہیں کیا بتاتی صرف اتنا کہا۔ ”جاؤ اپنی ماں سے پوچھو۔“ میں نے یہ جملہ بڑے افسردہ لہجے میں

کہا۔ سمیر اپنی ماں کے کمرے میں گئے تو وہ مجھے میرے باپوں سے تھک کر مجھے بھی وہاں لے گئے۔ میری

ساس اپنے کمرے میں ایک کرسی میں بڑی گہری سوچوں میں ڈوبی خموشی کی تصویر بنی بیٹھی تھی۔ ”ایسا کیا

ہوا؟ اب لوگوں کو چند لمحوں میں کیا ہو گیا ہے؟“ سمیر کی

ماں بالکل خموشی سے اسے گھورنے لگی تھی۔ ”ماں! آخر مجھے بتاؤ کہ تمہارا شہناز کے ابو سے کیا رشتہ نانا تھا

جس کی بنا پر ہمارا گھر لمحوں میں ماتم کدہ بن گیا؟“

میری ساس نے جھجکتے روتے ہوئے سمیر کو تمام بات بتادی۔

سمیر سکتے کے عالم میں بیٹھے رہ گئے پھر کچھ کہے بغیر اٹھ کر باہر چلے گئے۔

دوسرے دن مجھے اطلاع ملی کہ ابو نے چھت سے کود کر خودکشی کر لی۔۔۔۔۔ ان کی موت پر نہ میں گئی نہ سمیر گیا۔

سمیر تو نہ جانے کہاں گلیوں میں گھومتا پھرتا تھا۔

سمیر نے اس کے بعد مختلف مفتیوں اور مولویوں سے فتویٰ لیا۔ اس نے مجھ سے کہا۔ ”شہناز! اب تم

میرے نکاح میں نہیں رہیں۔ میں نے مسجدوں کے مولویوں، ماہرین اسلامی فقہ، قانونی فتوؤں کے نہ جانے

کہاں کہاں نہیں دھکے کھائے ہیں لیکن سچی بات ہے زیادہ تر نے مجھے یہی فتویٰ دیا ہے کہ اب تم اپنی بیوی سے

فوری طور پر اپنا نکاح ساقط کر کے اس سے جدا ہو جاؤ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تم دونوں کا باپ ایک ہی ہے۔“

میں نے اس سے کہا۔ ”دیکھو سمیر! میرے پاس بھی ایک ایسے مفتی صاحب کا فتویٰ موجود ہے جس کی رو

سے ہم اپنا نکاح برقرار رکھ سکتے ہیں۔“ اتنے میں میری ساس بھی وہاں آ گئیں۔ انہوں نے کہا۔ ”بیٹی! تم

اب اس حقیقت کو تسلیم کیوں نہیں کر لیتیں کہ تمہاری حیثیت ایک طرح سے سمیر کی بہن جیسی ہے؟ اور جو تم

جس مفتی کا فتویٰ اپنے ہاتھوں میں لے کر پھر رہی ہو وہ ہمارے مسلک کا نہیں ہے۔“ میں اپنی ساس اور سمیر کے

قدموں میں بیٹھ گئی اور ان سے میں نے رورود کر التجا میں کہیں۔ ”خدا کے واسطے! مجھے میرے باپ کے گناہ کی سزا ایک دم نہ دو۔“

سمیر نے کہا۔ ”شہناز! مجھے غلط نہ سمجھنا۔ جس طرح تم نے مجھ سے جنون کی حد تک محبت کی تو اس طرح مجھے

بھی بخدا تم سے اُس وقت تک جنون کی حد تک محبت ہے جب تک تم میری بیوی نہیں لیکن اب میں مفتیان اسلام

کے دیے گئے فتوؤں کے آگے مجبور ہوں اور دوسرے میرا اب ضمیر بھی نہیں مانتا کہ میں تمہیں اپنی بیوی کہوں لہذا

اب میں تمہیں طلاق طلاق دیتا ہوں۔“

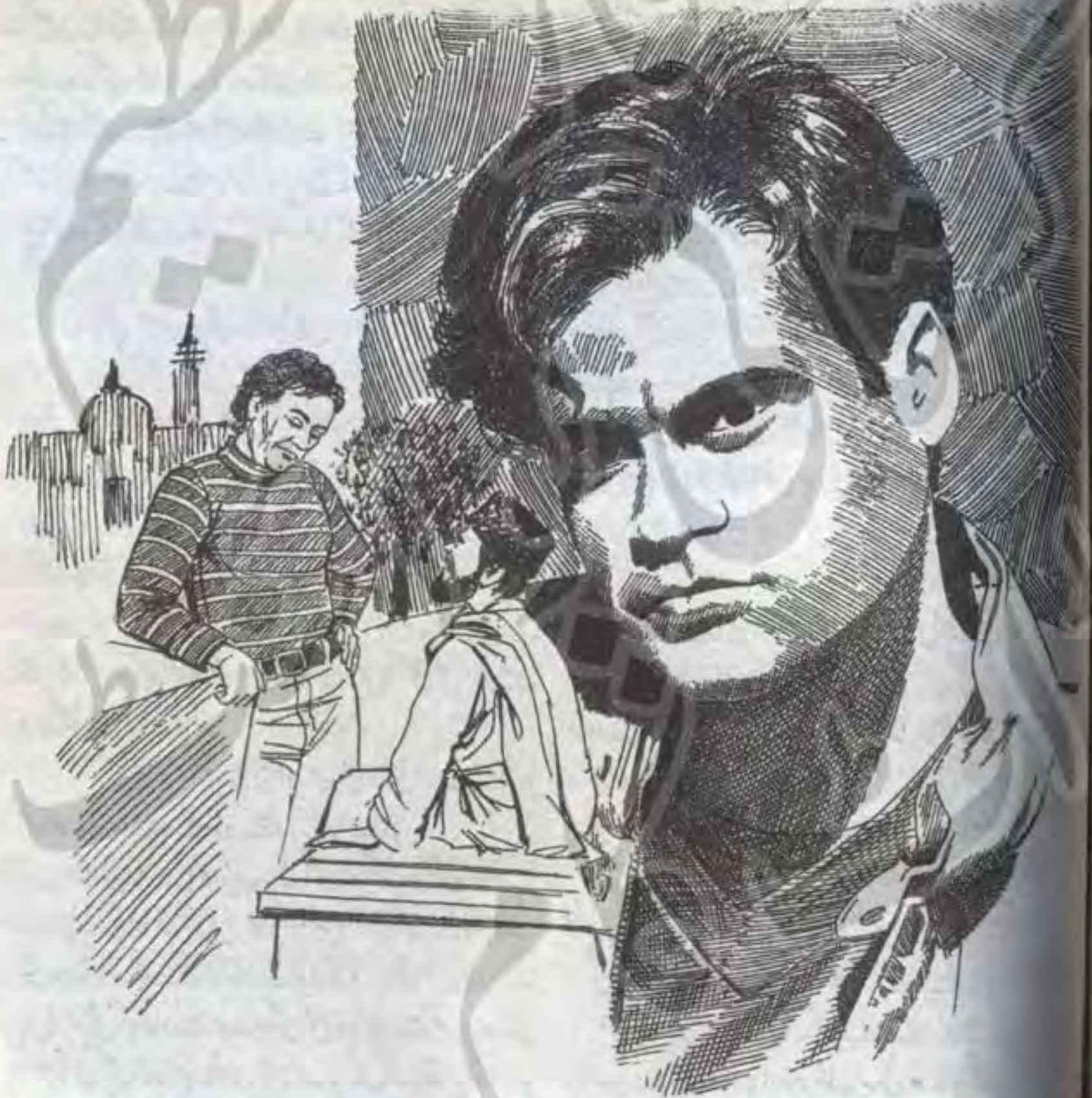
میرا سر بری طرح چکرایا اور میں دھم سے فرش پر گر گئی۔

تقدیر کے کھیل نیارے

محمد اسماعیل بروہی

وہ اپنی تقدیر کی طرف سے مایوس تھا
لیکن تقدیر اس پر مسکرا رہی تھی

انسانی جذبولں سے گندھی ایک بڑا اثر تحریر



میں نے اپنے ماں باپ کو نہیں دیکھا کیونکہ میری پیدائش کے کچھ دن بعد ہی میرے ماں باپ ایک کار ایکسیڈنٹ میں مجھے ہمیشہ کے لیے چھوڑ گئے تھے۔ مجھے میری نانی اماں نے پالا تھا۔ انہوں نے مجھے ہر رشتے کا پیار دیا یعنی ماں بھی، نانی، باپ بھی، نانی، بھائی اور بہن بھی، نانی اور میری دوست بھی نانی تھیں۔ گھر میں اور بھی لوگ تھے جن میں اقبال ماموں، ان کی بیوی نوشابہ ممانی، طلال ماموں، ان کی بیوی نرگس ممانی شامل تھے۔ نانی کے علاوہ گھر میں سب کا رویہ مجھ سے عجیب سا تھا۔

نوشابہ ممانی کو نہ جانے مجھ سے کیا پیر تھا، ان کی آنکھوں میں ہمیشہ میں نے اپنے لیے نفرت ہی دیکھی تھی۔ وہ بھی مجھ سے سیدھے منہ بات نہیں کرتی تھیں۔ اقبال ماموں اور طلال ماموں کا رویہ بھی مختلف نہ تھا۔ وہ بھی مجھ سے بات نہیں کرتے تھے اور وہ مجھ سے کھینچے کھینچے رہتے تھے جیسے مجھ سے بے زار ہوں البتہ نرگس ممانی بہت نرم دل اور خوش مزاج تھیں۔ وہ میرا ہر طرح خیال رکھتی تھیں۔ نانی کے بعد گھر میں مجھے وہی اچھی لگتی تھیں۔

اقبال ماموں کی دو بیٹیاں نازش اور سحرش تھیں، سحرش بہت سلیبی ہوئی، معصوم اور نرم دل تھی۔ میری اور نازش کی کبھی نہیں بنتی تھی۔ مجھے اس کے دوست بھی پسند نہیں تھے۔ وہ لوگ اچھے نہیں تھے خاص طور پر جنید عرف جونی تو مجھے زہر لگتا تھا۔ میں اس کے بارے میں بہت کچھ جانتا تھا۔ بہت بد معاش تھا، اس نے جانے کتنی لڑکیوں کو سہانے خواب دکھا کر انہیں تباہ و برباد کر دیا تھا۔ میں نازش کو سمجھاتا تھا وہ میری بات نہیں سمجھتی تھی اور غصے سے کہتی تھی۔

”سہیل.....! تم جونی اور میری دوستی سے جلتے ہو، تم ہوتے کون ہو مجھے روکنے کو کئے والے؟“

طلال ماموں کا ایک بیٹا بھی تھا مگر وہ بھی مطلب سے بات کرتا تھا یعنی پڑھائی وغیرہ میں مجھ سے ہیلپ لیتی ہوتی تو مجھ سے بولتا ورنہ بے گانوں کی طرح رہتا۔ ماں، سحرش کی عادت بہت اچھی تھی وہ میرے کمرے میں اکثر آتی تھی اور ہم دونوں دیر تک باتیں کرتے تھے مگر یہ نوشابہ ممانی کو ہضم نہیں ہوتا تھا اور وہ سحرش کو روکتی تھیں کہ

سہیل کے کمرے میں مت جایا کرو۔ گزرتے وقت کے ساتھ میں اور سحرش دل ہی دل میں ایک دوسرے کو پسند کرنے لگے تھے اور یہ بات نانی اماں نے بھی نوٹ کی تھی۔

میرے والدین کی کوئی نشانی نہیں تھی نہ ان کی کوئی تصویر تھی نہ ان کے کپڑے تھے۔ کبھی کبھی میرے دل میں یہ خواہش بہت شدت سے جاگتی تھی کہ کاش میرے امی ابو کی کوئی چیز ہوتی جسے میں ان کی نشانی کے طور پر اپنے پاس رکھتا۔ ایک دن نانی اماں سے میں نے پوچھ لیا۔

”نانی.....! یہ کیا؟“ میرے امی ابو کی کوئی ایک بھی نشانی نہیں ہے آپ کے پاس نہ ان کی تصویر نہ کوئی یادگار چیز نہ کوئی اور سامان، کچھ بھی نہیں ہے آپ کے پاس جس سے میری امی ابو کی خوشبو آئے یا جسے دیکھ کر میرے دل کی گفتگو کچھ کم ہو؟“

جواب میں نانی اماں کہیں۔ ”سہیل بیٹا! اُس وقت تصویر وغیرہ کا اتنا رواج نہیں تھا۔ کپڑے اور کچھ دوسرا سامان ہم نے غریبوں کو دے دیا۔ تمہاری امی کی کتابیں ادھر ادھر ہو گئیں۔“ ان باتوں سے میرے دل کو تسلی نہیں ہوتی تھی دل کہتا تھا ضرور کچھ ہے جو مجھ سے چھپایا جاتا ہے۔

نانی اماں نے ہمیشہ میرا ہر طرح خیال رکھا۔ میری ہر جائز خواہش پوری کی۔ مجھے اچھی تعلیم دلائی اور پھر ماموں کی ٹیکسٹائل مل میں اچھے عہدے پر رکھا دیا۔

نوشابہ ممانی اور طلال ماموں کی سخت مخالفت کے باوجود اقبال ماموں نے نانی اماں کے کہنے پر نہ چاہتے ہوئے بھی مجھے جاب پر رکھ لیا تھا، تاہم میں نے بڑی محنت سے تھوڑے ہی دنوں میں اپنی تقرری کو جائز ثابت کر دیا تھا۔ اقبال ماموں میرے کام سے مطمئن تھے۔

اُس روز میں آفس سے خوشی خوشی گھر پہنچا اور ہمیشہ کی طرح گھر آتے ہی سب سے پہلے نانی اماں کے کمرے میں جانے لگا۔ کمرے کے دروازے پر پہنچا تو اندر سے نانی اماں اور نوشابہ ممانی کے باتیں کرنے کی آواز سنائی دی۔ میں دروازے پر رک گیا۔

نوشابہ ممانی سخت لہجے میں کہہ رہی تھیں۔ ”نہیں امی! میں اسے اپنی بیٹی نہیں دے سکتی جس کے نہ خاندان کا پتا نہ ذات پات کا۔ ہم خاندانی لوگ ہیں اور خاندان دیکھ کر ہی بیٹی دیتے ہیں۔“

نانی نے جواباً کہا۔ ”دیکھو بھو.....! سہیل اچھا لڑکا ہے۔ تمہارے سامنے پلا بڑھا ہے۔ کبھی ایسی ویسی حرکت نہیں کی جو.....“

”نہیں امی جان.....! میں ہر گز سہیل کو اپنی بیٹی نہیں دوں گی۔“ ممانی بہت غصے میں تھیں۔

”مگر سہیل اور سحرش ایک دوسرے کو پسند کرتے ہیں۔“ نانی کا لہجہ نرم تھا۔

”خدا کے لیے امی جان.....! بس کریں۔“ ممانی چلائیں۔ ”میری دونوں بیٹیاں معصوم ہیں، میں سہیل کا سایہ بھی ان پر پڑنے نہیں دوں گی۔“ یہ گفتگو سننے ہی میرا سر چکرانے لگا اور میرا وجود جیسے کرچی کرچی ہو گیا۔

”یا اللہ! یہ کیا ماجرا ہے؟ میں کون ہوں؟ یہ لوگ مجھ سے نفرت کیوں کرتے ہیں؟“ میرے ذہن میں بہت سے سوالات کلبلائے گئے جن کے میرے پاس جواب نہیں تھے۔ میں اپنے کمرے میں آیا اور بیڈ پر ڈھسے سا گیا پھر میری آنکھوں سے آنسوؤں کی جھری سی لگ گئی۔ کافی دیر رونے کے بعد بھی دل کو سکون نہ ملا۔ نوشابہ ممانی کے الفاظ میرے دماغ پر تھوڑے کی طرح لگ رہے تھے۔ شام تک میں کمرے سے نہیں نکلا تو بالآخر کمرے کا دروازہ بجنے لگا۔

”سہیل بیٹا.....! دروازہ کھولو۔“ یہ پیاری آواز نانی اماں کی تھی۔ میں نے نہ چاہتے ہوئے بھی دروازہ کھولا، سامنے نانی کھڑی تھیں۔ ان کے جھریوں بھرے ہاتھ پر فکر کے آثار نمایاں تھے۔

”بیٹا! کیا بات ہے؟ کیوں خود کو کمرے میں بند کر رکھا ہے اور یہ تمہاری آنکھیں کیوں سوچی ہوئی ہیں؟“ بہت تو ٹھیک ہے تمہاری؟ کسی نے کچھ کہا؟“ نانی نے ایک سانس میں کئی سوال کر ڈالے۔ میں نانی سے نظریں نہ اٹا سکا ہوا لپٹ کر بیڈ پر بیٹھ گیا اور میری آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ نانی میرے سامنے کھڑی تھیں۔

”سہیل.....! کچھ تو بولو آخر ہوا کیا ہے؟“ انہوں نے

نے میرے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا تھا۔ ”میں نے آپ کی اور ممانی کی باتیں سن لی ہیں۔“ میں نے رندھی آواز میں کہا۔ نانی کا چہرہ زرد ہو گیا اور وہ میرے سامنے کرسی پر بیٹھ گئیں۔

”کیا سن لیا تو نے سہیل؟ ہم نے تو ایسی کوئی بات نہیں کی۔“

”پلیز نانی! مجھ سے مت چھپائیں، مجھے سچ بتائیں، میں کون ہوں؟ کیوں سب لوگ مجھ سے نفرت کرتے ہیں؟ کون تھا میرا باپ؟ کیا وہ کوئی خونی تھا، مجرم تھا یا سچ خاندان کا تھا؟ اور..... اور میری ماں تو آپ کی بیٹی تھی۔ کیا میں ناجائز اولاد ہوں جو یہ سب مجھ سے نفرت کرتے ہیں؟ مجھے بتاؤ نانی! ورنہ میرا سر پھٹ جائے گا، میں مر جاؤں گا۔“ میں پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا تھا۔

”کچھ نہیں چھپایا جا رہا ہے تجھ سے سہیل! بات صرف اتنی ہے کہ تمہاری ماں نے تمہارے باپ سے پسند کی شادی کی تھی اور یہ سب اس کے خلاف تھے۔ تمہارا باپ امریکہ سے آیا تھا، اسے میری بیٹی سے محبت ہوئی اور ان دونوں نے شادی کر لی۔ اقبال اور طلال نے بہت مخالفت کی۔ میری بیٹی نے شادی کر لی اور یہ گھر ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا۔ اس گھر میں تمہاری امی نہیں آئی تو تمہارے ابو کیسے آتے؟ کیسے پتا چلتا کہ وہ کون تھا، کس خاندان کا تھا؟ جب ان کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ ہوا تو صرف میں نے ان کے کفن و دفن کا انتظام کیا تھا۔ بھائیوں نے اپنی بہن کی نہ ڈولی اٹھائی نہ اس کے جنازے کو کاندھا دیا کیونکہ انہیں اپنی عزت عزیز تھی۔ میں تو ماں تھی، اپنی بیٹی کی آخری نشانی سمجھ کر تجھے پالا پوسا، جوان کیا اور اب تم اپنی نانی سے ذرا سی بات پر ناراض ہو گئے؟“ نانی نے مختصر اسب کچھ بتا دیا اور اس طرح انہوں نے میرا غصہ ٹھنڈا کر دیا۔

ایک فقیر عورت اکثر دروازے پر آتی تھی۔ وہ اپنا ہاتھ تھپی بے ساکھیوں کے سہارے آتی تھی اور گھر کے دروازے پر بیٹھ کر صدا لگاتی تھی۔ نہ جانے کیوں وہ عورت مجھے غور سے دیکھتی تھی۔ میں بھی اس کو پیسے دے کر دعائیں لیتا تھا۔ وہ دل کی گہرائی سے مجھے دعائیں دیتی تھی۔

بہر حال وقت گزرتا رہا، اس دوران نازش اور جونی

کی ملاقاتیں بھی بڑھنے لگیں۔ میں یہ دیکھ کر کڑھتا رہتا اور نانی کو بھی بتاتا۔ دوسری طرف سحرش کی چاہتیں بھی بڑھنے لگیں لیکن میں خود کو روکتا تھا کیونکہ ہمارا ملن ناممکن تھا۔ نوشاہہ ممانی کی نفرت کی آگ بھی بڑھتی رہی۔ نرگس ممانی کی محبتیں بھی جاری رہیں۔

اس دوران مجھے یہ ایک اور انکشاف ہوا کہ جونی دراصل بدنام زمانہ کینکسز جعفر خان کا بیٹا تھا۔ وہ کالے دھندوں کا بے تاج بادشاہ تھا۔ باپ کی دولت میں مست جونی کئی لڑکیوں کو شادی کا جھانسہ دے کر ان کی عزت سے کھیل چکا تھا اور ان دنوں نازش اس کے جال میں پھنسی ہوئی تھی۔ وہ بھی جونی سے شادی کے خواب دیکھ رہی تھی۔

ایک دن اچانک نانی اماں کی طبیعت بگڑنے لگی۔ انہیں ہسپتال لے جایا گیا۔ دراصل نانی کو دل کی تکلیف ہو گئی تھی۔ ڈاکٹر کہتے تھے کہ ان کے دل پہ کوئی بہت بڑا بوجھ ہے جس کی وجہ سے انہیں دل کی تکلیف ہوئی تھی۔ نانی کی حالت دن بہ دن بد سے بدتر ہوتی جا رہی تھی۔ ایک روز انہوں نے مجھے اپنے کمرے میں بلایا اور جو کچھ کہا، اسے سن کر میرے سر پر جیسے پہاڑ ٹوٹ پڑے۔

جب میں نانی کے کمرے میں گیا تو ان کی آنکھیں نقاہت کی وجہ سے بند تھیں، تاہم میری آمد کے احساس پر انہوں نے پکارا۔

”آگئے سہیل بیٹا.....!“

”ہاں نانی.....! کیا بات ہے؟“

”سہیل.....! جو بات تجھے آج میں بتانے لگی ہوں، کاش نہ بتاتی تو اچھا تھا مگر کیا کروں اگر میں نے نہ بتایا تو میرے مرنے کے بعد۔ یہ بات تمہیں کسی اور سے پتا چلے گی، تب تمہیں بہت دکھ ہوگا اور مجھ سے شکایت بھی۔ شاید یہ بات بتا کر میرے دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہو جائے۔ بیٹا! میں جو جھوٹ اب تک تم سے بولتی رہی ہوں، اس پر میرا دل مجھے ملامت کرتا رہا ہے مگر آج سچ بولوں گی تاکہ سکون سے مر سکوں۔“ نانی کا لہجہ غم سے بھرا ہوا تھا۔

”کون سا جھوٹ نانی؟“ میں نے الجھن سے پوچھا۔ میرا دل جیسے بیٹھنے لگا تھا۔

”سہیل.....! میری بات سکون سے سنو، نہ میں تمہاری نانی ہوں نہ تم میرے نواسے ہو، نہ یہ تمہارے ماموں اور ممانیاں ہیں نہ میری کوئی بیٹی تھی نہ تمہارے ماں باپ نے پسند کی شادی کی تھی نہ ان کا ایک سیڈنٹ ہوا تھا، یہ سب جھوٹ تھا..... جھوٹ..... اور سچ یہ ہے کہ تم مجھے گھر کے قریب کوڑے میں بڑے ملے تھے اور میں تمہیں اٹھالائی تھی تاکہ نوشاہہ تجھے پالے مگر نوشاہہ نے یہ کہہ کر انکار کر دیا، وہ ناجائز بچہ نہیں پالے گی پھر میں تجھے پالنے لگی اور سب رشتے داروں میں یہ بات پھیلا دی کہ تم میری مرحومہ بیٹی کی اولاد ہو۔“ نانی نے سب کچھ بتا کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کر لیا تھا مگر میری دنیا اندھیر ہو گئی تھی۔ یہ بات کتنی اذیت ناک تھی کہ میں کسی کی ناجائز اولاد تھا نہ میرے باپ کا پتا نہ میری ماں کی خبر..... کاش! یہ سب کچھ سننے سے پہلے مجھے موت آ جاتی، تاہم میں کچھ نہ کہہ سکا، خاموشی سے نانی کو تکتا رہا۔ نانی پھر گویا ہوئیں۔

”سہیل.....! تم میرے بعد یقیناً یہ گھر چھوڑ دو گے یا یہ لوگ تمہیں نکال دیں گے مگر یہاں سے نکلنے سے پہلے دو کام ضرور کرنا، ایک نازش کی جان اس جونی سے چھڑانا، کہیں یہ لڑکی ہمارے خاندان کی عزت خاک میں نہ ملا دے، دوسرے تم اپنی زندگی سے مایوس مت ہونا۔ زندگی اللہ کی دی ہوئی امانت ہے۔ اس کی حفاظت کرنا۔ تمہاری ماں کی ضرور کوئی مجبوری ہوگی جو تمہیں کوڑے میں رکھ کر چلی گئی ورنہ کوئی ماں اپنی اولاد کو یوں بے آسرا نہیں چھوڑتی۔“ نانی سب کچھ بتا کر خاموش ہو گئیں۔ میں ان کے بولنے کا منتظر رہا مگر وہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہو گئی تھیں۔ میں نانی، نانی پکارتا رہا، روتا رہا مگر نانی جا چکی تھیں۔

نانی کی میت میں بہت سے لوگ آئے تھے، ان میں وہ اپناج، بھکاری عورت بھی شامل تھی۔ اس کا آنا میری سمجھ میں نہ آیا تھا۔ نہ جانے کیوں وہ مجھے غور سے دیکھتی تھی اور میں اس کی نظروں کا مفہوم سمجھنے سے قاصر تھا۔

نانی کے گزر جانے کے پندرہ بیس دن بعد ایک روز میں نے نازش کو سمجھانے کی کوشش کی اور وہ کوشش مجھے مہنگی پڑ گئی۔ وہ میری بات پر تجھے سے اکڑ گئی اور میرا

سہانہ بکڑ کر بری طرح چلانے لگی۔ اس کی آواز سن کر میرے گھر والے اس کمرے میں آ گئے۔ نازش نے سانسے مجھ پر دست درازی کا الزام لگا دیا اور میں ہکا بکا کھڑا رہ گیا۔ طلال ماموں نے مجھے بری طرح پٹا شروع کر دیا۔

”حرام زادے..... گندہ خون..... اپنا رنگ دکھانے لگا؟“ نرگس ممانی نے طلال ماموں کے ہاتھ پکڑ کر انہیں روکا مگر نوشاہہ ممانی کی زبان نہ رکی۔ ان کے ایک ایک لفظ نے میرے وجود کو چھلنی کر دیا۔ اقبال ماموں نے غصہ سے چلاتے ہوئے کہا۔

”سہیل.....! یہاں سے چلے جاؤ، ہم تمہاری شکل بھی نہیں دیکھنا چاہتے۔“

”مگر ماموں.....! میری بات تو سنیں.....“ میں نے اپنی صفائی میں کچھ کہنا چاہا۔

”بس! میں نے کہہ دیا تھا، چلے جاؤ یہاں سے۔“ اور میں نے وہ گھر ہمیشہ کے لیے چھوڑ دیا۔ گھر کے ساتھ آٹھ سو بھی چھوڑ دیا اور اپنے دوست ابراہیم کے ایک حالی لٹ میں رہنے لگا۔ ابراہیم کی کئی ٹیکسیاں چلتی تھیں، اس نے مجھے بھی ایک ٹیکسی دے دی جسے چلا کر میں گزراوقات کرنے لگا۔ ٹیکسی سے مجھے بہت اچھی آمدنی ہونے لگی تھی۔ اپنا خرچہ بھی نکل جاتا تھا اور کچھ بچت بھی آ جاتی تھی۔

ایک روز فٹ پاتھ پر مجھے وہی بھکاری عورت ملی۔ میں جوتے پالش کرنے والے کے پاس کھڑا تھا کہ مجھے وہ سامنے فٹ پاتھ پر بیٹھی نظر آ گئی۔

میں نے پالش والے سے پوچھا۔ ”بھائی، یہ عورت کس سے بھکارن نہیں لگتی، یہ کون ہے؟“

”صاحب! میں بھی نہیں جانتا، پتا نہیں یہ کون ہے، یہاں سے آئی ہے؟ یہ عورت اکثر یہیں بیٹھی رہتی ہے۔“

میں سیدھا اس کے پاس گیا۔ پہلے سلام کیا اور 100 کا نوٹ اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس کا چہرہ ہل گیا۔ یوں لگتا تھا جیسے مجھے دیکھتے ہی اس کا غم دور ہو گیا۔ سبب میں ہفتے میں دو تین بار اس کے پاس جاتا، اسے کھانا کھاتا، بدلے میں وہ مجھے ڈھیروں

دعائیں دیتی۔ نہ جانے کیوں مجھے اس سے ایک خاص قسم کی انسیت ہو گئی تھی۔

اُس روز ایک سواری کو لے کر شہر سے باہر جانا پڑا۔ سواری اتار کر میں سڑک کنارے درخت کے نیچے گاڑی کھڑی کر کے گاڑی پر کپڑا مارنے لگا۔ یہ کم آبادی والا علاقہ تھا۔ دور دور گھر بنے ہوئے تھے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ ٹریفک بھی کم تھا۔ سڑک کے دونوں طرف کھیت تھے۔ میں درخت کے نیچے گاڑی کھڑی کر کے ٹھنڈی ہوا کا مزہ لینے لگا۔ یکا یک میری نظر ایک لڑکی پر پڑی جو دوڑتی ہوئی میری طرف ہی آرہی تھی۔ وہ میرے قریب پہنچتے ہی ہانپتے ہوئے کہنے لگی۔

”بھائی صاحب! مجھے بچاؤ، یہ لوگ مجھے مار دیں گے۔“ وہ رو رہی تھی۔ ”بھائی! خدا کے لیے ٹیکسی اشارت کرو مجھے یہاں سے لے جاؤ۔“ میں نے دیکھا، واقعی تین آدمی ڈنڈے اٹھائے ہماری طرف ہی آرہے تھے۔

”دیکھو بی بی! مجھے سچ بتاؤ، یہ کون ہیں اور تمہیں کیوں مارنا چاہتے ہیں؟ اگر مجھے سچ بتاؤ گی تو میں تمہاری مدد کروں گا۔“

”ان میں سے ایک میرا ابو ہے اور دو بھائی ہیں۔ دراصل میں کسی کے ناجائز بچے کی ماں بننے والی ہوں۔“ لڑکی نے سچ بول دیا حالانکہ اس کی مجھے توقع نہ تھی۔ ”میں نے جونی نامی لڑکے کی جھوٹی محبت کے جال میں پھنس کر اپنی عزت گنوا دی۔ اب اس کا گناہ میرے پیٹ میں پل رہا ہے مگر اس نے مجھ سے منہ پھیر لیا۔ میرے ماں باپ بھائیوں کو پتا چل گیا ہے۔ اب یہ مجھے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“ لڑکی یہ بتا کر رونے لگی۔ وہ تینوں ہمارے قریب پہنچ گئے تھے۔

اُسی وقت مجھے نانی کی بات یاد آ گئی کہ نازش کو جونی سے بچانا۔ میں نازش کو تو نہ بچا سکا مگر اس لڑکی کو بچانے کا فیصلہ کر لیا پھر میں ایک چٹان کی طرح اس لڑکی کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

ان تینوں میں سے بڑی عمر کا آدمی دھاڑا۔ ”اے ٹیکسی والے.....! سامنے سے ہٹ جا، ہم اسے زندہ نہیں چھوڑیں گے۔“ اس کی آنکھوں میں خون اترتا ہوا تھا۔ لڑکی میرے پیچھے کھڑی سسک رہی تھی۔

”آپ اسے نہیں مار سکتے.....“ میں نے مضبوط لہجے میں کہا۔

”اے.....! کون ہو تم؟ ہٹو ورنہ مفت میں مارے جاؤ گے۔“ ایک نوجوان نے چلا کر کہا۔ وہ لڑکی کا بھائی تھا۔

”میں اس کا شوہر ہوں یہ میری بیوی ہے۔ ہم نے نکاح کیا ہے۔“ میں نے بہت سکون اطمینان سے یہ بات کہی تھی۔

”اچھا اب تم بھی زندہ نہیں رہو گے۔“ دوسرا نوجوان ہماری طرف بڑھنے لگا۔

”رک جاؤ رک جاؤ طاہر.....!“ ان کے باپ نے چلاتے ہوئے کہا۔ لڑکا اپنی جگہ ٹھک گیا۔

”اگر میری بیٹی تجھے پسند تھی تو اپنے والدین کو بھیجتے؟“ اس نے نرمی سے کہا تھا۔

”انکل! اگر میرے ماں باپ زندہ ہوتے تو ہم یہ قدم کیوں اٹھاتے؟ ہم یہ بات آپ لوگوں کو بتانے والے تھے مگر آپ کی بیٹی ڈرتی تھی۔“ میرا لہجہ مودبانہ تھا۔

”جو ہوا سو ہوا اب تم دونوں چلو گھر۔ اب ہم عزت سے اپنی بیٹی کی رخصتی کریں گے پھر تم اپنی بیوی کو لے جانا۔“

اسی وقت میں نے فون کر کے ابراہیم کو بلوایا اسے سب کچھ بتایا اور انہوں نے اپنی بیٹی میرے ساتھ رخصت کر دی۔ رخصتی بڑی سادگی سے ہوئی تھی۔ ان کے کچھ رشتے دار اور کچھ محلے والے شامل تھے۔ میرے ساتھ صرف ابراہیم تھا اور پھر میں اس لڑکی یعنی سائرہ کو اپنے فلیٹ میں لے آیا۔ ابراہیم نے ایک مولوی کو بلوایا۔ اسے ساری حقیقت بتائی۔ مولوی صاحب بڑے نیک آدمی تھے انہوں نے ہمارا نکاح پڑھا دیا۔ اس طرح سائرہ میری بیوی بن کر میرے فلیٹ میں رہنے لگی۔ سائرہ بہت خوش تھی وہ ہر وقت میری خدمت میں لگی رہتی تھی۔ وہ اپنے بچے کو ضائع کروانا چاہتی تھی مگر میں اس کے لیے تیار نہیں تھا کیونکہ اس کے حمل کو ساتواں مہینہ تھا اور پھر یہ بہت بڑا گناہ تھا۔ میں نے سائرہ کو کہہ دیا تھا کہ میں اسے اپنی شناخت دوں گا۔

سائرہ کے قدم میرے گھر میں بہت مبارک ثابت

ہوئے تھے۔ مجھے ایک نچی فرم میں بہت اچھی جاب مل گئی تھی۔

ایک روز میں آفس میں مصروف تھا کہ سائرہ کا فون آیا۔

”سہیل.....! دو دو تیس آپ سے ملنے آئی ہیں۔“

”کون ہیں سائرہ؟ پوچھوان سے؟“ میں نے کہا۔

”کچھ بتانی نہیں ہیں بس کہہ رہی ہیں کہ آپ سے ملنا ہے۔“

”چلو ٹھیک ہے میں آتا ہوں۔“ آفس کا کام سمیٹ کر جب میں گھر پہنچا تو سائرہ نے دروازہ کھولا اور بتایا دونوں فی دی لاؤنچ میں بیٹھی ہوئی ہیں۔ جب میں اس کمرے میں داخل ہوا تو اپنی جگہ ٹھک کر رہ گیا۔ میرے سامنے وہی مکار و مغرور نوشاہہ ممائی اور نازش کھڑی تھیں دونوں کے چہروں پر مایوسی اور دنیا بھر کا غم پھیلا ہوا تھا۔ نوشاہہ ممائی دوڑ کر میرے گلے سے لگ گئیں اور رونے لگیں۔

”سہیل بیٹا.....! اپنے ماموں کو بچالو۔ وہ مر جائیں گے۔ نازش کھڑکی نے ہماری عزت خاک میں ملا دی۔ یہ جونی کے ناجائز بچے کی ماں بننے والی ہے۔“ وہ نازش کو بری طرح مارنے لگیں اور نازش ہلک ہلک کر رونے لگی۔ ”سہیل بیٹا! اسے اپنا لواپنے ماموں کی خاطر چاہے پھر اسے چھوڑ دینا۔“

”لیکن ممائی! یہ خاندانی اور معصوم اور میں..... میں گندہ خون..... نہ میرے خاندان کا پتا نہ میرے ماں باپ کی خبر۔ یہ ملاپ ممکن نہیں ہے۔ میں نے نازش کو جونی سے ملنے سے روکا مجھے معلوم تھا ایک دن یہ گل کھلے گا۔ نازش نے مجھ پر الزام لگایا اور آپ سب نے مجھے ذلیل کر کے گھر سے نکال دیا اور آج میں جونی کے گناہ کو اپنا لوں اور نازش سے شادی کر لوں نہیں ہرگز نہیں۔“ میں نے غصے سے کہا۔

”سہیل بیٹا! مجھے بعد میں پتا چلا کہ تم بے گناہ ہو نازش نے تم پر الزام لگایا۔ بیٹا! جب سے تمہارے ماموں کو پتا چلا ہے کہ نازش ماں بننے والی ہے وہ بستر پر لگ گئے ہیں اور ہم نے جونی کے بجائے تمہارا نام لیا ہے کہ تم نے نازش سے.....“ ممائی نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ ”اور پھر انہوں نے کہا کہ اگر مجھے زندہ دیکھنا چاہتے

ہو سہیل سے کہو وہ نازش کو اپنا لے۔“

”میں ایسا نہیں کر سکتا۔ میں شادی شدہ ہوں یہ میری بیوی ہے۔“ میں نے سائرہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

”بیٹا! کچھ دنوں کے لیے اسے اپنا لو بعد میں اس پر نسیب کو طلاق دے دینا.....“

”اچھا..... میں اسے اپنے گھر میں رکھوں تاکہ یہ میرا ہنسنا بستا گھر تباہ کر دے۔“ اسی لمحے نازش سائرہ کے پاؤں پڑنے لگی اور ہاتھ جوڑ کر گڑ گڑا کر رونے لگی۔ ”پلیز سائرہ میں اس گھر میں تمہاری نوکرانی بن کر رہوں گی۔“

نوشاہہ ممائی بھی مجھے تانی کے واسطے دینے لگیں تب سائرہ نے مجھ سے کہا کہ میں نازش کو اپنا لوں اور میں نے ہتھیار ڈال دیے۔

میرا اور نازش کا نکاح سادگی سے ہوا اور سائرہ نے بھی خوشی خوشی ہمارے نکاح میں حصہ لیا۔ اس طرح نازش بھی سائرہ کی طرح میرے گھر بیوی کی حیثیت سے رہنے لگی۔

وقت کا پہلہ گھومتا رہا سائرہ نے ایک چاند سے بیٹے کو جنم دیا۔ بیٹے کا نام ہم نے عامر رکھا تھا۔ سائرہ اور نازش اکثر کہتے تھے کہ عامر بالکل مجھ سے ہے۔ میں نے بھی غور کیا تو واقعی عامر کے نین نقش بالکل میرے جیسے تھے۔ نازش کا بھی آخری مہینہ تھا۔ وہ ان دنوں ہر وقت بھیجی بھیجی رہتی تھی۔ میں اسے تسلی دیتا۔

”نازش! فکر مت کرو تمہارے بچے کو میں باپ بن کر پالوں گا۔ عامر کی طرح یہ بھی میرا بچہ ہے۔ اسے ہم بھی ناجائز نہیں کہیں گے بلکہ میں اسے اپنی پہچان دوں گا۔“

”ایک بات بتانا چلوں کہ نازش کو یہ پتا نہیں تھا کہ سائرہ بھی جونی کی ڈھی ہوئی ہے اور عامر کا باپ میں نہیں ہوں۔ یہ بات ہم نے نازش سے چھپائی تھی۔“

ایک روز فی وی پہ خبر آئی کہ جعفر خان کا بیلی کا پٹر پہاڑی سے ٹکرا کر تباہ ہو گیا ہے جس میں جعفر خان کے ساتھ چار افراد اور بھی قلمہ اجل بن گئے تھے۔ اگلے روز خبر آئی کہ جونی اپنے کمرے میں مردہ پایا گیا کسی نے اس کے گلے میں پھندہ ڈال کر اسے ہمیشہ کے لیے سلا

دیا تھا۔ اس نے بہت سی لڑکیوں کو برباد کیا تھا۔ پتا نہیں کسی نے اپنا انتقام اس طرح لیا تھا۔ نہ جانے کیوں مجھے ان باپ بیٹے کی موت کا سن کر بہت دکھ ہوا تھا۔ میں سوچنے لگا کہ انسان کچھ بھی کر لے آخر موت ہے۔ دوسروں کی زندگیوں سے کھیلنے والوں کو کیسی موت ملی تھی۔ لاوارثوں کی طرح ان کے کفن و دفن کا انتظام ایدھی والوں نے کیا تھا۔

اس روز میں آفس سے گھر آ رہا تھا کہ دل میں خیال آیا اس اپنا جج فقیرنی سے ملا جائے۔ اس فقیرنی کو اب میں اماں جی کہنے لگا تھا۔ جب میں وہاں پہنچا تو مجھے پتا چلا کہ اماں جی یعنی وہ فقیرنی فوت ہو چکی ہے۔ یہ بات مجھے وہاں ایک ریزہ والے نے بتائی تھی۔ وہ ریزہ والی مجھے اکثر اماں جی سے ملتے یا بات کرتے دیکھتا تھا۔ ریزہ والے نے مزید بتایا کہ اماں نے کوئی چیز آپ کے نام دی ہے وہ چیز موچی کے پاس ہے اور موچی پتا نہیں کل سے کہاں غائب ہے؟ میرے کہنے پر وہ ریزہ والی مجھے قبرستان لے گیا جہاں دوہی اور تازہ قبریں بھی تھیں ان پر نام والی تختیاں لگی تھیں۔ ایک قبر پر لکھا تھا جعفر خان اور ساتھ والی قبر پہ جنید خان لکھا تھا۔ ان دونوں قبروں کے پاؤں کی طرف اماں جی کی قبر بھی جو بے نام تھی۔ کسی کو کیا معلوم تھا اماں جی کون تھیں اس کا نام کیا تھا حالانکہ مجھے بھی معلوم نہیں تھا۔ یہ قبریں ایدھی والوں نے بنائی تھیں کیونکہ قبرستان کا یہ حصہ ایدھی والوں کے لیے مخصوص تھا۔

یہ تینوں اموات ایک ہی ہفتے میں ہوئی تھیں اس لیے ایدھی والوں نے تینوں کو قریب قریب دفن دیا تھا۔ ان تینوں قبروں کا ساتھ ساتھ ہونا ایک راز تھا جو بعد میں مجھے پتا چلا جب موچی نے اماں جی کا خط مجھے دیا۔ اس خط نے مجھے ہلا کر رکھ دیا۔ خط کے الفاظ کچھ یوں تھے۔

”پیارے بیٹے سہیل.....! میرا نام آمنہ ہے۔ میں ایک پڑھی لکھی باشعور عورت تھی۔ میری شادی پسند سے جعفر خان سے ہوئی تھی۔ میں اپنے ماں باپ کے ساتھ دینی میں رہتی تھی۔ جعفر خان مجھے بیاہ کر پاکستان لے آیا۔ ایک سال ہم خوشی خوشی رہے پھر ہمارا پہلا بیٹا ہوا جس کا نام ہم نے

ایک سر بستہ راز

کاشی چوہان

اسرار کائنات بھی کھل جائیں گے کبھی
انسان کو ابھی سر خود آگئی نہیں

مایا چکر کے گرد گھومتی عجب تحریر

آپ کو اس کہانی پر یقین کرنا ہوگا

ایک ایسی کہانی جس کو عقل انسانی تسلیم نہیں کرتی

لیکن ایسی کہانیاں جنم لیتی رہتی ہیں



اس کھیل پر حیران ہوتا رہا۔ وہ مجرم اسمگلر جعفر خان میرا
باپ تھا جوئی جس سے میں نفرت کرتا تھا وہ میرا بھائی
تھا وہ اپنا ج عورت میری ماں تھی۔ اس کی کوکھ سے میں
نے جنم لیا تھا۔ میں اپنی ماں کی خدمت بھی نہ کر سکا۔
میری ماں یہ جانتی تھی کہ میں اس کا بیٹا ہوں پھر بھی وہ
میری بہتری کی خاطر میرے قریب نہ آئی۔ میں ان ہی
خیالوں میں کم تھا کہ میرا سیل فون بج اٹھا۔ دوسری طرف
اقبال ماموں تھے۔

”سہیل بیٹا.....! مبارک ہو بیٹا ہوا ہے۔“ انہوں
نے خوشی سے بھرپور لہجے میں بتایا۔ انہوں نے ہسپتال
سے فون کیا تھا۔

نازش دو دن پہلے اپنے ماں باپ کے گھر گئی تھی اور
وہیں اسے درد اٹھا تھا اور وہ لوگ اسے ہسپتال لے گئے
تھے اور نازش نے ایک بیٹے کو جنم دیا تھا۔

میں فوراً ہسپتال پہنچا۔ نازش بیڈ پر لیٹی ہوئی تھی اس
کے پہلو میں ایک پیارا سا بچہ آنکھیں موندے لیٹا تھا۔ وہ
بالکل میرے جیسا تھا میرا پوتو تھا۔

وہی چہرہ وہی آنکھیں اس بچے میں بھی میں اپنا
عکس دیکھ رہا تھا۔ بچے کا نام میں نے عام رکھا۔
سب کہتے ہیں میرے دونوں بیٹے مجھ پہ گئے ہیں۔

میں دل ہی دل میں خوش ہوتا ہوں کہ مجھ پہ کیوں نہ
جاتے آخر میرے بھائی جنید کے بچے ہیں۔ ناجائز ہی
کبھی ہیں تو میرا خون۔

آج میرے گھر میں خوشیاں ہی خوشیاں رقصاں
ہیں۔ عامر کے بعد سارہ سے ایک پیاری سی بیٹی ساشا
ہوئی۔ اسی طرح نازش کے ایک اور بیٹا جواد ہوا۔ نازش
اور سارہ دونوں بہنوں کی طرح مل جل کر رہتی ہیں۔ میرا
اور بچوں کا بے حد خیال رکھتی ہیں۔ میرے رب نے مجھے
ہر نعمت سے نوازا ہے۔ میں اپنے رب کا جتنا شکر کروں
کم ہے۔

عامر عامر ساشا اور جواد سے میں بے حد پیار کرتا
ہوں یہ چاروں میرے اپنے ہیں اور ہاں..... میں ان
تینوں قبروں پر بھی جاتا ہوں ان کی صفائی اور دیکھ بھال
کرتا ہوں ان کو ایصالِ ثواب کرتا ہوں کیونکہ وہ بھی
میرے اپنے ہیں۔

☆ ☆ ☆

جنید رکھا۔ جنید ہماری آنکھوں کا تارہ تھا پھر مجھے رفتہ رفتہ
پتا چلا کہ جعفر خان اچھا آدمی نہیں ہے بلکہ بہت بڑا اسمگلر
ہے۔ میں نے اسے یہ دھندہ چھوڑنے کا کہا جس پر روز
ہمارا جھگڑا ہونے لگا اور یوں ہمارے تعلق میں دراڑ پڑ گئی
یہ دراڑ بڑھتے بڑھتے ہمارے درمیان خلیج بن گئی۔ جب
جنید ایک سال کا اور دوسرا بچہ 3 ماہ کا میرے پیٹ میں تھا
کہ اس نے ایک روز مجھے مار مار کر بے ہوش کر دیا۔ جب
مجھے ہوش آیا تو میں نے خود کو بھکاریوں کی جھگی میں پایا۔
بعد میں مجھے پتا چلا کہ ان بھکاریوں کو میں بے ہوشی کی
حالت میں پڑی ملی تھی۔ وہ مجھے جھگی میں اٹھالائے پھر
مجھے ایک خیراتی اسپتال لے گئے اور میرا علاج کروایا مگر
میری کمر ٹھیک نہ ہو سکی۔ دراصل میری رپڑھ کی ہڈی
ٹوٹ گئی تھی اور میں ہمیشہ کے لیے اپنا ج ہو گئی تھی۔ میرا
کوئی نہیں تھا سوائے ان بھکاریوں کے..... اب میں
بے سہکیوں کے سہارے چلتی تھی اور ساتھ بھگے مانگنے
لگی تھی۔ چھ ماہ بعد میرے دوسرا بیٹا ہوا۔ میں یہ سوچ کر
رونے لگی کہ ان بچوں کا کیا ہوگا؟ بڑا بیٹا باپ کی طرح
ڈاکو بنے گا چھوٹا بیٹا ماں کی طرح بھکاری بنے گا سو میں
نے فیصلہ کیا کہ اپنے چھوٹے بیٹے کا مستقبل خراب ہونے
نہیں دوں گی۔ چنانچہ اس کے پیدا ہوتے ہی میں نے
اسے ایک گھر کے سامنے کچرے کے ڈھیر پر رکھوا دیا اور
نگرائی کے لیے اپنے سامنے لڑکے کو بٹھایا کہ دیکھو کون
میرے بیٹے کو اٹھا کر لے جاتا ہے؟ پھر اسی گھر کی ایک
عورت نے میرے بچے کو اٹھایا اور میرا گلہ وہاں پہننے
لگا۔ جس بچے کو میں نے کچرے کے ڈھیر پر ڈالا تھا وہ
بچہ تم ہو۔ میں تمہاری ماں ہوں۔ جعفر خان تمہارا باپ ہے
اور جنید تمہارا بھائی ہے۔ مجھے تمہاری زندگی کے ایک ایک
مل کی خبر ہے۔ تمہاری نانی اماں کی موت کے بعد وہ لوگ
تمہیں اس گھر سے نکال چکے تھے۔ جب میں وہاں گئی تھی
تو سحرش نامی لڑکی نے مجھے سب کچھ بتایا تھا۔ اس خط کا
مقصد بس یہی ہے کہ تمہیں بتاؤں تم ناجائز نہیں بلکہ
اپنے ماں باپ کی جائز اولاد ہو۔ بیٹے سہیل.....! یہ سب
میں نے تمہاری بہتری کے لیے کیا تھا۔ امید ہے تم میری
مجبوری سمجھ سکو گے۔

صرف اور صرف تمہاری ماں!“
خط پڑھ کر میں بہت دیر تک روتا رہا اور تقدیر کے

ہم سب بھاگ رہے تھے

ریفریو جی تھے

ماں نے جتنے زیور تھے سب پہن لیے تھے

باندھ لیے تھے

چھوٹی مجھ سے

دودھ پلا کے خوب کھلا کے ساتھ لیا تھا

میں نے اپنی ایک ”بھمیری“ اور اک ”لاٹو“

پاجامے میں اڑس لیا تھا

رات کی رات ہم گاؤں چھوڑ کر بھاگ رہے تھے

ریفریو جی تھے۔

زندگی اسی کا تو نام ہے۔ بھاگتے رہو بھاگتے

رہو..... اور زندگی بھاگتی چلی جاتی ہے۔ ہم تو اس زندگی

کے ہاتھوں میں بے دام غلام اور کٹھ پتلیوں کی طرح

ہوتے ہیں۔ بھاگتے چلے جاتے ہیں۔ زندگی اگر ہمیں

”بہار“ سے بھرت کے نام پر نہ بھاگانی تو ہم تو اسی کٹھ

کی کٹی ”محلہ رگو تاتھ“ میں پڑے جی رہے ہوتے یا مر

رہے ہوتے۔ مجھے اب بھی یاد ہے اپنی جنم بھوی ہم اس

سے پہلے ”بہار“ میں رہتے تھے۔

زیادہ ذہن پر زور ڈالوں تو ہمارے اس شہر کے تین

اطراف پہاڑیاں اور چوٹی طرف ندی تھی۔ ہر سال اس

پر سکون شہر میں گوتم بدھ کا میلہ لگتا اور مسلسل ایک ماہ تک

جاری رہتا تھا۔ لوگ تو ہمارے شہر کو ”گوتم کا شہر“ کے نام

سے پکارا کرتے تھے۔ یہاں کی دنیا قطعی الگ الگ سی

تھی۔ علاقے بھر میں گوتم بدھ کے چھوٹے بڑے مندر

اور پکوڑے بنے ہوئے تھے جن میں گيروے رنگ کے

مخصوص کپڑے پہنے بدھ یا تری ہر وقت موجود رہتے

تھے۔

وہیں ایک قدیم ترین پتیل کے درخت کے پاس

موجود مندر کی بہت زیادہ دھوم تھی اور زیادہ تریا تری وہیں

چڑھاوے چڑھاتے اور پڑاؤ ڈال رکھتے۔ جانے

میرے قدم بچپن سے اس پتیل کے گرد کیوں گھوما

کرتے۔ یا یوں لگتا میں ایک ٹرانس میں چلتا اس پیڑ کے

پاس پہنچتا اور کوئی گول چیز یوں میرے پاؤں چھوٹی

کہ پاؤں پیسے بن جاتے اور میں گول گول گھومنا شروع

ہو جاتا۔

”چھمن..... چھمن..... چھمن..... چھمن..... چھمن..... چھمن.....“

چھمن..... جیسی آواز لگتا میرے پیروں کے گھومنے سے

زمین سے نکلتی چلی جاتی ہے یہ چھمن چھمن آواز جیسے کسی

نے پیتل کی دپٹی میں ڈھیر سارے سکے ڈال کر بھانا

شروع کر دیے ہوں۔ اور یہی آواز میرے خوابوں میں

آ کر مجھے سلاتی تھی۔ پتا نہیں کیسی انیسیت سی تھی مجھے

وہاں سے بالک عمر میں بھلا اتنا میں کہاں سوچ سکتا تھا۔

ملک بھر میں یکتخت ہی ہا ہا کار پچی اور آن کی آن

میں سارا ہندوستان جل اٹھا۔ جتانے یوں نکل رہے

ہوتے جیسے کسی نے زندہ اندھی چتا کو آگ دکھا دی ہو اور

چتا زندگی اور موت سے ہارجیت کی معرکہ آرائی کر رہی

ہو۔ بھا بھڑ جل اٹھے تھے۔ گنگا میں چھوٹے چھوٹے

دیے جو پوجا کے وقت چھوڑے جاتے تھے۔ یوں لگتا تھا

جیسے چھوٹی بڑی لاشیں تیرتی چلی جا رہی ہوں۔ کسی گناہ

کنارے کی اور..... ایسے میں ان جلی لاشوں کے زندہ

ہو جانے کے واقعات بھی ہونے لگے تھے۔

آہ! وہ سنائے بھری راتیں۔ جب کالی دیوی لال

زبان باہر نکالے ہر طرف موت بانٹتی پھر رہی تھی اور کوئی

شکار بچ نہ پار ہاتھا۔ کالی دیوی کے پیروکار اور بھگت خون

پلا پلا کر اسے طاقت بخش رہے تھے۔ جانے کہاں کہاں

سے میراج آ لگتا تھا۔ ایسے میں ہم پر بھرت فرض ہو گئی

اور ہم بھی اپنے دیس جانے کو بے چین ہوا تھے۔ ریفریو

جی بن کر سفر کا آغاز ہو چکا تھا۔ زمین تنگ ہونے کا عمل

شروع ہوا تو ہمارے قدم خود بخود شملہ کی طرف اٹھ گئے۔

☆.....☆.....☆

شملہ پہنچتے ہی ہمیں محسوس ہوا کہ یہاں ابھی نقارہ

نہیں بجاتا تھا، قبل جنگ کا شور ابھی نہ اٹھا تھا مگر میں بے

سروسامان ہو چکا تھا۔ ماں جی کی حالت یکدم خراب

ہو گئی۔ انہیں خون کی الٹی آئی اور پھر وہ نہ سنبھل سکیں۔

میری ننھی بہن ساتھ گئی اور اجنبی شہر۔

یا خدا! میں کہاں جاؤں۔ میری سوچ کی پرواز تھی

ہی کتنی..... میں تو نو دس برس کا ہوں گا اس سے اور دو

سال کی ننھی بہن..... شملہ اسٹیشن میرے لیے زندگی بھر کی

یاد بن گیا۔ ماں کا لاشہ پڑا تھا۔ ماں کے سارے زیور

اتارے گئے اور جب پتا چلا کہ ہم مسلمان ہیں تو اسٹیشن

ماسٹر کی بیوی منترانے فوری طور پر کفن کا انتظام کیا اور

یوں ماں جی کو زمین کی گود میں سلا دیا گیا۔ منتر بہت دن

تھے ہمیں ساتھ نہ رکھ سکتی تھی کیونکہ اس کی بیٹی کو دن

بچے ہوئے تھے اور کسی بھی سے وہ نئی زندگی کو جنم دے

سکتی تھی۔ ہندوستان کی مہوت چھات نے جلد ہی ہمیں

وہاں سے دیس نکالا دے دیا۔ ہاں اس نے ایک مہربانی

کی بھی کہ ماں کے سارے زیور ایک چھوٹے سے ڈبے

میں بند کر کے ہمارے حوالے کر دیے اور ساتھ ہی اپنے

ایک جاننے والے کے ساتھ اپنی دور پار کی بہن یثومتی

کے پاس بھجوا دیا۔

☆.....☆.....☆

یثومتی ایک غریب اور دھرماتما عورت تھی۔ اس کا

جی گھر سے بدقوت ہوئی کمانے کی غرض سے نکلا تو واپس

نہیں آیا تھا۔ میں اور ننھی وہاں آ کر بس گئے ننھی اور مجھے

دیکھ کر اس غریب عورت کا کلیجہ باہر آ گیا اور اس کی بانجھ

کونکھ سیراب ہو گئی۔ اس کے من سے جو محبت کے

دھارے نکلے تو اس نے ہم دونوں کو سیراب کر دیا۔ محبت

بھی کیسی عجیب شے ہے۔ دین دھرم کچھ نہیں مانتی بس

بجور کر دیتی ہے۔ جینے پر اکساتی ہے اور زندگی کی ڈور

کھینچا دیتی ہے۔

یثومتی کا مکان بڑا بوسیدہ سا تھا۔ مگر اس کے گھر

میں آنے والے بڑے کے عقیدے سے آیا کرتے۔

اکثر معذور لوگ لنگڑے لوگوں کا ننھا اس کے گھر میں لگا

رہتا۔ یثومتی پر بھگوان کی خاص کر پاتھی کہ اس کے دعا

کرنے سے من کی مراد بر آتی تھی۔ خاص کر معذوروں

کی شفا اس کی پوجا میں نہاں تھی۔ اکیلی عورت تھی۔ سارا

دن چرخہ چلاتی رات کو جو میسر آتا وہ غرباء میں صرف

کر دیتی۔ یثومتی کے گھر میں ایک پتیل کا بڑا سارا بہت

قدیم پیڑ تھا اور اس پیڑ اور گوتم بدھ والے پتیل میں مجھے

کوئی فرق نہ لگتا تھا۔ بس یہ تھا کہ وہ پیڑ مندروں کے بیچ

میں تھا اور یہ پیڑ گھر کی چار دیواری میں۔

جب میرے پیر یہاں بندھ گئے تو ننھی تو یثومتی کی

گود میں ہوئی اور میں دن کے کسی پہر میں گول گول

گھماری لینا شروع ہو جاتا۔ ”چھمن..... چھمن.....“

چھمن..... ”میرے پیر اس لیے گھومنا شروع ہو جاتے۔

ہمیں یہاں مہینہ بھر ہوا ہوگا کہ یثومتی نے ایک دن

سنائے بھری دو پہر میں مجھے پاس بلایا اور بولی۔

”بالک..... میری آنکھوں میں غور سے دیکھ ”بتا

مجھے کیا دکھائی دیتا ہے۔“

میں نے غور سے اس کی آنکھوں میں دیکھا۔ مجھے

کچھ نظر نہ آیا۔ ”دیدی..... مجھے تو کچھ نہ دکھے۔“ ان

کے کہنے کے مطابق ہم انہیں ”دیدی“ کہتے تھے۔

”تو بھگوان کا روپ ہے۔ تو شام کا پتر ہے۔ مجھے

تیرے ماتھے پر شگون کا ٹپکا چمکتا نظر آتا ہے۔ میرے

پتر۔ تو ہی مجھ ابھگن کو شہ خبر سنا سکتا ہے۔“ وہ مجھے ماتھے

پر بوسہ دیتے ہوئے بولی۔ ”بھگوان کی کرپا سے میں تجھ

جیسے مہاشالی پتر کے ہاتھوں ہی وجیتا پاؤں گی۔“ دیدی

نے مجھے متا سے لپٹاتے ہوئے کہا تھا۔

”آج سے تو میرے ساتھ ایک پہر گیان پر دھیان

دے گا۔ جو میرے پاس نکلتی ہے میں تجھے ارپن کرنا

چاہتی ہوں۔ تجھ میں مجھے کوئی بہت خاص چسکار چھپا دکھتا

ہے۔“ اور پھر اسی اثناء میں ننھی کے رونے کی آواز نے

جیسے دھم سے کوئی طلسم بھسم کیا تھا۔

یثومتی کی آنکھوں سے غصہ عیاں تھا۔ مگر وہ غصے کا

اظہار کر کے میرے دل میں گرہ باندھنا نا چاہتی تھی

شاید۔ گرم گرم غصہ اس کی آنکھوں سے بہنے لگا۔

”جا بالک..... جا کے ننھی کو لے آ..... اس کے

کھانے کا سہ ہو گیا ہے۔“

میں ننھی کو لے آیا اور یثومتی کی گود میں دے دیا۔ وہ

اسے دودھ کی کھیر کھلانے لگی تھی۔

☆.....☆.....☆

دو بجے دن گیان شروع ہو گیا۔

جیسے ہی میں نے آنکھیں بند کیں میرے ارد گرد

”چھمن..... چھمن..... چھمن..... چھمن.....“ کی آوازیں تیز

تر ہونے لگیں۔

میرے کان ان آوازوں کا بوجھ نہیں سہار سکتے تھے

اس لیے میں نے دونوں ہاتھ کانوں پر رکھ لیے۔

”اللہ!“ میری آواز پوری طاقت سے حلق سے

برآمد ہوئی تھی۔

یثومتی نے بند آنکھیں کھولیں اور غور سے مجھے

دیکھا۔

”میرے پتر..... اگر تو گیانی بنا چاہتا ہے تو سچے

من سے گیان پر دھیان جٹا..... گیانی کا کوئی مذہب نہیں

ہوتا۔ اللہ بھگوان بدھ رام یسوع..... سب کے دھرم

میں آشتی ہے۔ سجاؤ ہے۔ راستی ہے۔“
 ”میں کیسے دھیان جٹاؤں دیدی..... آنکھیں بند کرتے ہی.....“ میں بولتے بولتے رک گیا۔
 یثوتی کے دروازے کھلے ہی رہتے تھے کیونکہ اُس کے در پر ناٹ کا پردہ اٹھا کر کوئی بھی اندر آ سکتا تھا۔
 ”تو ایسا کرنا کہ.....“ ابھی وہ اتنا ہی بول پائی تھی کہ ایک لولا فقیر اندر داخل ہوا۔

”کر پا کرو دیوی بڑی تکلیف میں ہوں۔“ گھٹنے کا درد اس کے جھریوں بھرے شریر سے جھلک رہا تھا۔ یثوتی نے مجھ سے بات تیاگ کر اُس فقیر کو بیٹھنے کو جگہ دی اور پیل کے گرد مٹی سے بنے چوتھرے پر اُس کو بٹھایا اور مجھے سامنے سے ایک بھگو نے میں رکھی مٹی لانے کو کہا اور خود اشلوک پڑھنا شروع کر دیے۔
 اشلوک پڑھتے سے یثوتی کے چہرے پر اترتا سکون، کوئل کوئل محسوس ہوتا تھا جیسے اس سے اُس کی روح تک شاد ہو رہی ہو۔

☆.....☆.....☆

مجھے اچھی طرح یاد ہے گیان کے گیارہویں دن جب پورن ماسی کی رات اتری تو یثوتی نے مجھے اپنی آنکھوں میں جھانکنے کو کہا۔

”میرے بالک..... میرے پتر..... دیکھ آج تجھے ضرور ان آنکھوں میں کچھ دکھے گا۔“

ایک طرف دیے کی مدھم لوتھی۔ اُس کے برابر والی چار پائی کے ساتھ جھولے میں بھی خواب خرگوش میں گم تھی۔ میں نے دیدی کی آنکھوں میں جھانکا اور جھانکا..... دیکھتے ہی دیکھتے آنکھیں کسی منظر کی تصویر بنانے لگیں۔ میرے سامنے فلم سی چلنے لگی تھی۔
 میرے لب ہلے۔

”دیدی“ اُس نے زرد سورج کا سا اچکن پہنا ہے جس پر گھٹکر وڈو لٹے ہیں۔ سفید گھیر دار شلوار مٹی سے آئی ہے۔ بال بڑھ کر ٹیٹیں بن چکے ہیں۔ وہ رستہ بھول گیا ہے۔ پریشان ہے۔ ایک رتھ ساتھ چلتا ہے مگر تھکان اُس کے پورے شریر سے ظاہر ہے۔ بڑا گرم دن ہے۔ دیدی وہ بہت پیاسا ہے۔ دیدی..... وہ..... دیدی وہ مر جائے گا۔ دیدی..... دیدی وہ پکار رہا ہے۔ دیدی وہ..... یثوتی یثوتی کہہ رہا ہے۔ دیدی وہ تمہارا..... را..... دیدی وہ تمہارا ہی

پتی ہے۔ دیدی تمہارا پتی ہے۔ دیدی اسے بچالو۔“
 ”بالک..... بالک! ہوش کر.....“ اسی اثناء میں میں نے آنکھیں کھول دیں۔ یکدم سے پورن ماسی کا چاند ایک کالی بدلی کے پیچھے چھپ گیا تھا۔
 یثوتی کی آنکھوں میں آنسوؤں کی جھری لگی ہوئی تھی۔

”میرے پتر! میری آنکھوں میں دیکھو۔ میں نے تمہارے ماتھے پر اپنی ہر پریشانی کا انت دیکھا ہے۔ تم ہی کوئی چٹکار دکھاؤ۔“

اور پھر جیسے میں دوبارہ سے دیدی کی آنکھوں میں اتر گیا۔

”دیدی! تمہیں قربانی دینی ہے۔ دیدی تمہارے شوہر کے بیچ ایک سیاہ سایہ ہے جو کئی نازک روح کی بکی مانگ رہا ہے۔ دیدی بکی دینا ہوگی تمہیں.....“ یہ کہہ کر میں نے آنکھیں کھول دیں۔

یثوتی غائب تھی۔ میری منہ می گڑیا جھولے میں بڑی۔ نیند میں مسکرا رہی تھی۔ یکدم میں نے سر جھٹکا..... کچھ دیر پہلے کے مناظر دیدی کی آنکھوں میں وہ ایک عجیب یدھ دیکھنا..... یہ سب سوچ کر مجھے چکر سا آنے لگا۔

”دیدی..... دیدی“ مگر اُس سے دیدی شاید وہاں تھی ہی نہیں۔ اور میں نے بھی پیل کے پیڑ کے نیچے لیٹ کر آنکھیں موند لیں۔

”چمن..... چمن..... چمن..... چمن.....“ آواز میرے کانوں میں پڑی اور مجھے لوری سنانے لگی۔

☆.....☆.....☆

صبح تڑکے میری آنکھ کھل گئی دیدی اب بھی وہاں نہ تھی اور..... میری منہ می غائب تھی۔

”یا اللہ.....! یہ دونوں کہاں ہیں؟ دیدی منہ می کو لے کر کہاں چلی گئی تھی؟“

میں وہیں تک کر بیٹھ گیا۔ اُس زمانے میں کوئی بھی دوسری بات ذہن و دل میں روشن نہ ہو سکتی تھی۔ کچھ عرصے کچھ زمانہ سیدھا۔

یکدم سے غلغلہ اٹھا تھا کہ پار گاؤں میں بلوا اٹھ گیا ہے۔ ایک طرف منہ می دوسری طرف یہ پریشانی..... یکدم میری دنیا ہی بدل گئی تھی۔ اکیلا میں پیل کا پیڑ اور.....

چمن..... چمن..... چمن..... چمن..... چمن.....

☆.....☆.....☆

جانے کب چھوٹی کا مجھ سے پھوٹا ہاتھ وہیں اُس دن پھینک آیا تھا اپنا بچپن لیکن میں نے سرحد کے سانوں کے صحراؤں میں کٹر دیکھا ہے۔

ایک بھیری اب بھی ناچا کرتی ہے۔ اور اک ”لاٹو“ اب بھی گھوما کرتا ہے

آخر کار رات میں ایک لولے لنگڑے فقیر کے ساتھ میں پناہ حاصل کرنے کی خاطر اسٹیشن کی آواز آ کھڑا ہوا۔

ساری رات انتظار میں گزری۔ بھلا جانے والے لوٹ کے آتے ہیں؟ میں یثوتی دیدی کا نام لے لے کر سکتا رہا مگر رات گزر گئی۔ غم کی رات کس قدر طویل ہوتی ہے اس کا اندازہ مجھے اُس سے خوب خوب ہوا تھا۔

مچ پلیٹ فارم پر آ گیا خالی خالی پلیٹ فارم مردہ خانے جیسا سرد خزاں کے جیسا خشک ابھی میں جائزہ بھی نہ لے پایا تھا کہ ہری جی روشن ہوئی اور سیٹی کی آواز سنائی

دی۔ ایک دم سے جیسے یوں لگا کہ پلیٹ فارم کو کسی نے چنلی لی اور کون کون سے کونے سے قلی دھم دھم کرتے آسوجود ہوئے۔ میں جس فقیر کے ساتھ آیا تھا۔ بھینٹ میں

جانے وہ کہاں نکل گیا اور جب مجھے کچھ ناسوجھا تو میں نے آؤ دیکھنا تاؤ..... اور ریل میں سوار ہو گیا۔

آہ! میری منہ می! آہ! میری اماں..... اس اسٹیشن نے تو میرا سب کچھ چھین لیا تھا۔ میں تہی دست ہو کر شملہ سے واپس جا رہا تھا۔

”چمن..... چمن..... چمن..... چمن.....“ میرے کانوں میں یہ سرسراہٹ پوری طاقت سے چیخنے لگی تھی۔

ریل نے ایک بار پھر سیٹی دی اور میں نے نامعلوم منزل کی سمت جانی گاڑی میں آنکھیں موند لیں۔ ریل کی چمک چمک میرا کلیجہ مسکتی تھی۔ یوں لگتا تھا اسی ریل کے پہیوں تلے میری ماں اور منہ می چلی جا رہی ہوں مگر میں کچھ نہ کر سکتا تھا۔

گاڑی نے رفتار پکڑ لی اور ٹھنڈی ہوا کے جھونکے اندر آئے تو کبھی جیسے اونگھنے لگے تھے۔ میں کپار ٹمٹ کی

ایار سے لگا کھڑا تھا۔ کب سے کچھ پتا نہ تھا۔

اچانک ایک باریش بزرگ کی آنکھ کھلی تو انہوں نے

مجھے الٹیاں لگ چکی تھیں۔ تھوڑے تھوڑے وقفے بعد میں اسی خون میں تے کرتا اور گندگی، تھوڑے جسم کو

نے مجھے دیکھا اور بولے۔

”بیٹھ جاؤ بیٹے کھڑے کیوں ہو۔ آرام کر لو.....“

کب سے یوں کھڑے ہو۔

”نہیں، نہیں، میں ٹھیک ہوں۔“ میرے حلق میں آنسوؤں کے گولے اب تک پھنسے تھے۔

”آ جاؤ بیٹا..... وہاں تکلیف سے بیٹھو گے۔ میرے پاس آ جاؤ۔“ اُن کی آواز میں جانے کیا سحر تھا کہ میں اس فسون میں ڈوب گیا۔ میں نے مختصر اُنہیں اپنی بربادی کی داستان سنا ڈالی تھی۔

”بیٹے! اب کسی سے کچھ نہ کہنا۔ تم بہت خاص انسان ہو۔ اللہ نے تمہیں بہت نوازا ہے اور..... اسی لیے اتنے کٹھن حالات تمہارے راستے میں آئے۔ بس بچے اب دعا کرو کہ تم بحفاظت تمام منزل تک پہنچ جاؤ۔ اب تم اکیلے نہیں..... میں تمہارے ساتھ ہوں۔“ یہ کہہ کر انہوں نے دست شفقت میرے سر پر پھیرا..... اور اپنے گلے سے ایک مالانکال کر مجھے دی۔

”بچے! تم یہ پہن لو..... انشاء اللہ..... تم کامیاب رہو گے۔“ مالا اسی سے میں نے پہن لی تھی۔ اسے پہنتے ہی ایک دم سے سکون سا میرے رگ و پے میں در آ یا تھا جسے میں بتانے سے قاصر ہوں۔

☆.....☆.....☆

شہر میں آدمی کوئی بھی نہیں مل ہوا

نام تھے لوگوں کے جو مل ہوئے

سر نہیں کاٹا کسی نے بھی کہیں پر کوئی

لوگوں نے ٹوپیاں کالی تھیں کہ جن میں سر تھے

اور یہ بہتا ہوا سرخ لہو ہے جو سڑک پر

صرف آوازیں ذبح کرتے ہوئے خون گرا تھا

ٹرین جو پوری لٹ چکی تھی۔ بابا اور میں سرخ لہو کے بہتے دھارے میں گاڑی میں چپ چپ میں لاشوں کے ڈھیر تلے اسی خون سے آکسیجن حاصل کرتے زندہ تھے۔ گھور اندھیرا جیون کی ہر امید کی کرن کو اپنی پلیٹ میں لے چکا تھا۔ کتنی دیر تک ہم اسی رات کے اندھیرے میں ایک ساتھ لیئے زندگی کی مہین سانسوں کو تازہ کرتے رہے۔

مجھے الٹیاں لگ چکی تھیں۔ تھوڑے تھوڑے وقفے بعد میں اسی خون میں تے کرتا اور گندگی، تھوڑے جسم کو

نے مجھے دیکھا اور بولے۔

”بیٹھ جاؤ بیٹے کھڑے کیوں ہو۔ آرام کر لو.....“

کب سے یوں کھڑے ہو۔

”نہیں، نہیں، میں ٹھیک ہوں۔“ میرے حلق میں آنسوؤں کے گولے اب تک پھنسے تھے۔

”آ جاؤ بیٹا..... وہاں تکلیف سے بیٹھو گے۔ میرے پاس آ جاؤ۔“ اُن کی آواز میں جانے کیا سحر تھا کہ میں نے مختصر اُنہیں اپنی بربادی کی داستان سنا ڈالی تھی۔

”بیٹے! اب کسی سے کچھ نہ کہنا۔ تم بہت خاص انسان ہو۔ اللہ نے تمہیں بہت نوازا ہے اور..... اسی لیے اتنے کٹھن حالات تمہارے راستے میں آئے۔ بس بچے اب دعا کرو کہ تم بحفاظت تمام منزل تک پہنچ جاؤ۔ اب تم اکیلے نہیں..... میں تمہارے ساتھ ہوں۔“ یہ کہہ کر انہوں نے دست شفقت میرے سر پر پھیرا..... اور اپنے گلے سے ایک مالانکال کر مجھے دی۔

”بچے! تم یہ پہن لو..... انشاء اللہ..... تم کامیاب رہو گے۔“ مالا اسی سے میں نے پہن لی تھی۔ اسے پہنتے ہی ایک دم سے سکون سا میرے رگ و پے میں در آ یا تھا جسے میں بتانے سے قاصر ہوں۔

☆.....☆.....☆

شہر میں آدمی کوئی بھی نہیں مل ہوا

نام تھے لوگوں کے جو مل ہوئے

سر نہیں کاٹا کسی نے بھی کہیں پر کوئی

لوگوں نے ٹوپیاں کالی تھیں کہ جن میں سر تھے

اور یہ بہتا ہوا سرخ لہو ہے جو سڑک پر

صرف آوازیں ذبح کرتے ہوئے خون گرا تھا

ٹرین جو پوری لٹ چکی تھی۔ بابا اور میں سرخ لہو کے بہتے دھارے میں گاڑی میں چپ چپ میں لاشوں کے ڈھیر تلے اسی خون سے آکسیجن حاصل کرتے زندہ تھے۔ گھور اندھیرا جیون کی ہر امید کی کرن کو اپنی پلیٹ میں لے چکا تھا۔ کتنی دیر تک ہم اسی رات کے اندھیرے میں ایک ساتھ لیئے زندگی کی مہین سانسوں کو تازہ کرتے رہے۔

مجھے الٹیاں لگ چکی تھیں۔ تھوڑے تھوڑے وقفے بعد میں اسی خون میں تے کرتا اور گندگی، تھوڑے جسم کو

نے مجھے دیکھا اور بولے۔

”بیٹھ جاؤ بیٹے کھڑے کیوں ہو۔ آرام کر لو.....“

کب سے یوں کھڑے ہو۔

”نہیں، نہیں، میں ٹھیک ہوں۔“ میرے حلق میں آنسوؤں کے گولے اب تک پھنسے تھے۔

”آ جاؤ بیٹا..... وہاں تکلیف سے بیٹھو گے۔ میرے پاس آ جاؤ۔“ اُن کی آواز میں جانے کیا سحر تھا کہ میں نے مختصر اُنہیں اپنی بربادی کی داستان سنا ڈالی تھی۔

”بیٹے! اب کسی سے کچھ نہ کہنا۔ تم بہت خاص انسان ہو۔ اللہ نے تمہیں بہت نوازا ہے اور..... اسی لیے اتنے کٹھن حالات تمہارے راستے میں آئے۔ بس بچے اب دعا کرو کہ تم بحفاظت تمام منزل تک پہنچ جاؤ۔ اب تم اکیلے نہیں..... میں تمہارے ساتھ ہوں۔“ یہ کہہ کر انہوں نے دست شفقت میرے سر پر پھیرا..... اور اپنے گلے سے ایک مالانکال کر مجھے دی۔

”بچے! تم یہ پہن لو..... انشاء اللہ..... تم کامیاب رہو گے۔“ مالا اسی سے میں نے پہن لی تھی۔ اسے پہنتے ہی ایک دم سے سکون سا میرے رگ و پے میں در آ یا تھا جسے میں بتانے سے قاصر ہوں۔

☆.....☆.....☆

شہر میں آدمی کوئی بھی نہیں مل ہوا

نام تھے لوگوں کے جو مل ہوئے

سر نہیں کاٹا کسی نے بھی کہیں پر کوئی

لوگوں نے ٹوپیاں کالی تھیں کہ جن میں سر تھے

اور یہ بہتا ہوا سرخ لہو ہے جو سڑک پر

صرف آوازیں ذبح کرتے ہوئے خون گرا تھا

ٹرین جو پوری لٹ چکی تھی۔ بابا اور میں سرخ لہو کے بہتے دھارے میں گاڑی میں چپ چپ میں لاشوں کے ڈھیر تلے اسی خون سے آکسیجن حاصل کرتے زندہ تھے۔ گھور اندھیرا جیون کی ہر امید کی کرن کو اپنی پلیٹ میں لے چکا تھا۔ کتنی دیر تک ہم اسی رات کے اندھیرے میں ایک ساتھ لیئے زندگی کی مہین سانسوں کو تازہ کرتے رہے۔

مجھے الٹیاں لگ چکی تھیں۔ تھوڑے تھوڑے وقفے بعد میں اسی خون میں تے کرتا اور گندگی، تھوڑے جسم کو

نے مجھے دیکھا اور بولے۔

”بیٹھ جاؤ بیٹے کھڑے کیوں ہو۔ آرام کر لو.....“

کب سے یوں کھڑے ہو۔

”نہیں، نہیں، میں ٹھیک ہوں۔“ میرے حلق میں آنسوؤں کے گولے اب تک پھنسے تھے۔

”آ جاؤ بیٹا..... وہاں تکلیف سے بیٹھو گے۔ میرے پاس آ جاؤ۔“ اُن کی آواز میں جانے کیا سحر تھا کہ میں نے مختصر اُنہیں اپنی بربادی کی داستان سنا ڈالی تھی۔

”بیٹے! اب کسی سے کچھ نہ کہنا۔ تم بہت خاص انسان ہو۔ اللہ نے تمہیں بہت نوازا ہے اور..... اسی لیے اتنے کٹھن حالات تمہارے راستے میں آئے۔ بس بچے اب دعا کرو کہ تم بحفاظت تمام منزل تک پہنچ جاؤ۔ اب تم اکیلے نہیں..... میں تمہارے ساتھ ہوں۔“ یہ کہہ کر انہوں نے دست شفقت میرے سر پر پھیرا..... اور اپنے گلے سے ایک مالانکال کر مجھے دی۔

”بچے! تم یہ پہن لو..... انشاء اللہ..... تم کامیاب رہو گے۔“ مالا اسی سے میں نے پہن لی تھی۔ اسے پہنتے ہی ایک دم سے سکون سا میرے رگ و پے میں در آ یا تھا جسے میں بتانے سے قاصر ہوں۔

☆.....☆.....☆

شہر میں آدمی کوئی بھی نہیں مل ہوا

نام تھے لوگوں کے جو مل ہوئے

سر نہیں کاٹا کسی نے بھی کہیں پر کوئی

لوگوں نے ٹوپیاں کالی تھیں کہ جن میں سر تھے

اور یہ بہتا ہوا سرخ لہو ہے جو سڑک پر

صرف آوازیں ذبح کرتے ہوئے خون گرا تھا

ٹرین جو پوری لٹ چکی تھی۔ بابا اور میں سرخ لہو کے بہتے دھارے میں گاڑی میں چپ چپ میں لاشوں کے ڈھیر تلے اسی خون سے آکسیجن حاصل کرتے زندہ تھے۔ گھور اندھیرا جیون کی ہر امید کی کرن کو اپنی پلیٹ میں لے چکا تھا۔ کتنی دیر تک ہم اسی رات کے اندھیرے میں ایک ساتھ لیئے زندگی کی مہین سانسوں کو تازہ کرتے رہے۔

مجھے الٹیاں لگ چکی تھیں۔ تھوڑے تھوڑے وقفے بعد میں اسی خون میں تے کرتا اور گندگی، تھوڑے جسم کو

نے مجھے دیکھا اور بولے۔

”بیٹھ جاؤ بیٹے کھڑے کیوں ہو۔ آرام کر لو.....“

کب سے یوں کھڑے ہو۔

”نہیں، نہیں، میں ٹھیک ہوں۔“ میرے حلق میں آنسوؤں کے گولے اب تک پھنسے تھے۔

”آ جاؤ بیٹا..... وہاں تکلیف سے بیٹھو گے۔ میرے پاس آ جاؤ۔“ اُن کی آواز میں جانے کیا سحر تھا کہ میں نے مختصر اُنہیں اپنی بربادی کی داستان سنا ڈالی تھی۔

”بیٹے! اب کسی سے کچھ نہ کہنا۔ تم بہت خاص انسان ہو۔ اللہ نے تمہیں بہت نوازا ہے اور..... اسی لیے اتنے کٹھن حالات تمہارے راستے میں آئے۔ بس بچے اب دعا کرو کہ تم بحفاظت تمام منزل تک پہنچ جاؤ۔ اب تم اکیلے نہیں..... میں تمہارے ساتھ ہوں۔“ یہ کہہ کر انہوں نے دست شفقت میرے سر پر پھیرا..... اور اپنے گلے سے ایک مالانکال کر مجھے دی۔

”بچے! تم یہ پہن لو..... انشاء اللہ..... تم کامیاب رہو گے۔“ مالا اسی سے میں نے پہن لی تھی۔ اسے پہنتے ہی ایک دم سے سکون سا میرے رگ و پے میں در آ یا تھا جسے میں بتانے سے قاصر ہوں۔

☆.....☆.....☆

شہر میں آدمی کوئی بھی نہیں مل ہوا

نام تھے لوگوں کے جو مل ہوئے

سر نہیں کاٹا کسی نے بھی کہیں پر کوئی

لوگوں نے ٹوپیاں کالی تھیں کہ جن میں سر تھے

اور یہ بہتا ہوا سرخ لہو ہے جو سڑک پر

صرف آوازیں ذبح کرتے ہوئے خون گرا تھا

ٹرین جو پوری لٹ چکی تھی۔ بابا اور میں سرخ لہو کے بہتے دھارے میں گاڑی میں چپ چپ میں لاشوں کے ڈھیر تلے اسی خون سے آکسیجن حاصل کرتے زندہ تھے۔ گھور اندھیرا جیون کی ہر امید کی کرن کو اپنی پلیٹ میں لے چکا تھا۔ کتنی دیر تک ہم اسی رات کے اندھیرے میں ایک ساتھ لیئے زندگی کی مہین سانسوں کو تازہ کرتے رہے۔

مجھے الٹیاں لگ چکی تھیں۔ تھوڑے تھوڑے وقفے بعد میں اسی خون میں تے کرتا اور گندگی، تھوڑے جسم کو

نے مجھے دیکھا اور بولے۔

”بیٹھ جاؤ بیٹے کھڑے کیوں ہو۔ آرام کر لو.....“

کب سے یوں کھڑے ہو۔

”نہیں، نہیں، میں ٹھیک ہوں۔“ میرے حلق میں آنسوؤں کے گولے اب تک پھنسے تھے۔

”آ جاؤ بیٹا..... وہاں تکلیف سے بیٹھو گے۔ میرے پاس آ جاؤ۔“ اُن کی آواز میں جانے کیا سحر تھا کہ میں نے مختصر اُنہیں اپنی بربادی کی داستان سنا ڈالی تھی۔

”بیٹے! اب کسی سے کچھ نہ کہنا۔ تم بہت خاص انسان ہو۔ اللہ نے تمہیں بہت نوازا ہے اور..... اسی لیے اتنے کٹھن حالات تمہارے راستے میں آئے۔ بس بچے اب دعا کرو کہ تم بحفاظت تمام منزل تک پہنچ جاؤ۔ اب تم اکیلے نہیں..... میں تمہارے ساتھ ہوں۔“ یہ کہہ کر انہوں نے دست شفقت میرے سر پر پھیرا..... اور اپنے گلے سے ایک مالانکال کر مجھے دی۔

”بچے! تم یہ پہن لو..... انشاء اللہ..... تم کامیاب رہو گے۔“ مالا اسی سے میں نے پہن لی تھی۔ اسے پہنتے ہی ایک دم سے سکون سا میرے رگ و پے میں در آ یا تھا جسے میں بتانے سے قاصر ہوں۔

☆.....☆.....☆

شہر میں آدمی کوئی بھی نہیں مل ہوا

نام تھے لوگوں کے جو مل ہوئے

سر نہیں کاٹا کسی نے بھی کہیں پر کوئی

لوگوں نے ٹوپیاں کالی تھیں کہ جن میں سر تھے

اور یہ بہتا ہوا سرخ لہو ہے جو سڑک پر

صرف آوازیں ذبح کرتے ہوئے خون گرا تھا

ٹرین جو پوری لٹ چکی تھی۔ بابا اور میں سرخ لہو کے بہتے دھارے میں گاڑی میں چپ چپ میں لاشوں کے ڈھیر تلے اسی خون سے آکسیجن حاصل کرتے زندہ تھے۔ گھور اندھیرا جیون کی ہر امید کی کرن کو اپنی پلیٹ میں لے چکا تھا۔ کتنی دیر تک ہم اسی رات کے اندھیرے میں ایک ساتھ لیئے زندگی کی مہین سانسوں کو تازہ کرتے رہے۔

مجھے الٹیاں لگ چکی تھیں۔ تھوڑے تھوڑے وقفے بعد میں اسی خون میں تے کرتا اور گندگی، تھوڑے جسم کو

نے مجھے دیکھا اور بولے۔

”بیٹھ جاؤ بیٹے کھڑے کیوں ہو۔ آرام کر لو.....“

کب سے یوں کھڑے ہو۔

”نہیں، نہیں، میں ٹھیک ہوں۔“ میرے حلق میں آنسوؤں کے گولے اب تک پھنسے تھے۔

”آ جاؤ بیٹا..... وہاں تکلیف سے بیٹھو گے۔ میرے پاس آ جاؤ۔“ اُن کی آواز میں جانے کیا سحر تھا کہ میں نے مختصر اُنہیں اپنی بربادی کی داستان سنا ڈالی تھی۔

”بیٹے! اب کسی سے کچھ نہ کہنا۔ تم بہت خاص انسان ہو۔ اللہ نے تمہیں بہت نوازا ہے اور..... اسی لیے اتنے کٹھن حالات تمہارے راستے میں آئے۔ بس بچے اب دعا کرو کہ تم بحفاظت تمام منزل تک پہنچ جاؤ۔ اب تم اکیلے نہیں..... میں تمہارے ساتھ ہوں۔“ یہ کہہ کر انہوں نے دست شفقت میرے سر پر پھیرا..... اور اپنے گلے سے ایک مالانکال کر مجھے دی۔

”بچے! تم یہ پہن لو..... انشاء اللہ..... تم کامیاب رہو گے۔“ مالا اسی سے میں نے پہن لی تھی۔ اسے پہنتے ہی ایک دم سے سکون سا میرے رگ و پے میں در آ یا تھا جسے میں بتانے سے قاصر ہوں۔

☆.....☆.....☆

شہر میں آدمی کوئی بھی نہیں مل ہوا

نام تھے لوگوں کے جو مل ہوئے

سر نہیں کاٹا کسی نے بھی کہیں پر کوئی

لوگوں نے ٹوپیاں کالی تھیں کہ جن میں سر تھے

اور یہ بہتا ہوا سرخ لہو ہے جو سڑک پر

صرف آوازیں ذبح کرتے ہوئے خون گرا تھا

ٹرین جو پوری لٹ چکی تھی۔ بابا اور میں سرخ لہو کے بہتے دھارے میں گاڑی میں چپ چپ میں لاشوں کے ڈھیر تلے اسی خون سے آکسیجن حاصل کرتے زندہ تھے۔ گھور اندھیرا جیون کی ہر امید کی کرن کو اپنی پلیٹ میں لے چکا تھا۔ کتنی دیر تک ہم اسی رات کے اندھیرے میں ایک ساتھ لیئے زندگی کی مہین سانسوں کو تازہ کرتے رہے۔

مجھے الٹیاں لگ چکی تھیں۔ تھوڑے تھوڑے وقفے بعد میں اسی خون میں تے کرتا اور گندگی، تھوڑے جسم کو

نے مجھے دیکھا اور بولے۔

”بیٹھ جاؤ بیٹے کھڑے کیوں ہو۔ آرام کر لو.....“

کب سے یوں کھڑے ہو۔

”نہیں، نہیں، میں ٹھیک ہوں۔“ میرے حلق میں آنسوؤں کے گولے اب تک پھنسے تھے۔

”آ جاؤ بیٹا..... وہاں تکلیف سے بیٹھو گے۔ میرے پاس آ جاؤ۔“ اُن کی آواز میں جانے کیا سحر تھا کہ میں نے مختصر اُنہیں اپنی بربادی کی داستان سنا ڈالی تھی۔

”بیٹے! اب کسی سے کچھ نہ کہنا۔ تم بہت خاص انسان ہو۔ اللہ نے تمہیں بہت ن

ارشاداتِ رسول

دوزخ کی آگ سے بچو۔ چاہے کھجور کا ایک ہی ٹکڑا خیرات کرو۔

اللہ کی راہ میں گن کر خرچ نہ کرو ورنہ خدا بھی تم کو گن کر دے گا۔

نخی اللہ سے قریب ہے، جنت سے قریب ہے لوگوں سے قریب ہے مگر دوزخ سے دور ہے۔

جب تمہیں اپنا نیک عمل مسرور اور شادماں کرے اور برائی ناگوار محسوس ہونے لگے تو سمجھ لو کہ تم مومن ہو۔

اچھا دل دی۔

بابا کے تاک کر نشانہ لگا تھا اور بابا ہڑ بڑا کراٹھ بیٹھے تھے۔ بابا نے ادھر ادھر دیکھا اور پھر مالا کے آنے والی سمت دیکھ کر فوراً میرے پاس چلے آئے تھے۔ بابا خود بھی کوئی پراسرار بندے تھے فوراً ہی معاملہ بھانپ گئے۔

”ہمت سے کام لو بیٹا! رب خیر کرے گا۔“

بابا نے کچھ پڑھنا شروع کیا تو بچی زمین میں جیسے ہلکا سا ارتعاش پیدا ہوا اور پھر اس ارتعاش نے معمولی سے زلزلے کی شکل اختیار کر لی۔ زمین اچانک اور ہونی اور پیپل کے بالکل سیدھی جانب سے سر ابھارنے لگی۔ بابا نے ایک حصار سا باندھ دیا تھا۔ میں ہلا اور تھوڑا سا آگے قدم بڑھائے اور فوراً ہی جس جگہ میں کھڑا تھا وہاں سے زمین اوپر ہو گئی۔ میں جہاں جہاں آگے ہوتا زمین سر ابھارنے لگی۔ پانچ جگہ سے زمین نے سر ابھارا۔

اور پھر بابا نے کہا: ”بیٹا! زم زم کہہ دے۔ آج بھی اس اسم میں خدا کی برکت پوشیدہ ہے۔“

میں نے ”زم زم“ کہہ کر زمین پر ہاتھ مارے اور پھر اللہ سے خضوع و خشوع سے دعا کرنے لگا۔

اللہ نے فوراً ہی سن لی تھی۔ ہماری عاجزی کو مولا نے

میں کے تھے سے لپٹی گہری دراڑیں اور جڑیں اُس کے جسم ہونے کا پتا دیتا تھا۔

اس درخت کے تھوڑا سا دور دوسرے کمروں کی طرف سے الگ ایک کوٹھا کھڑا تھا۔ دیواریں خستہ تھیں اور کاہی آلود ادھڑی ہوئی منڈیر بھی جن پر جا بجا بیٹوں کی پٹیں بسی ہوئی تھیں۔

ہر چیز عجیب ڈراؤنی سی نظر آ رہی تھی مگر یہاں آتے ہی ایک بات ہوئی۔ میرے کانوں میں چھن چھن چھن کی آوازیں بہت تیز ہو گئی تھیں۔

☆.....☆.....☆

مجھے یاد ہے وہ ایک سخت سردرات تھی۔ کانوں میں پس چھن لوری سنار ہی تھی۔ اچانک مجھے ایک جھٹکا سا لگا جیسے کوئی روح اپنا سرد ہاتھ چھو کر آگے بڑھتی ہو۔ کمرے میں خوشبوؤں بھری ٹھنڈک ٹھہری ہوئی تھی اور اُس روح کے پیروں میں سے چھن چھن کی آواز بہت تیزی سے اتر رہی تھی۔ اچانک مجھے خیال آیا اور اُس سے وہ مالا میں نے ہاتھ میں لے لی۔ اچانک مجھے ایسا لگا میں اپنے طور پر حرکت کرنا بھی چاہوں تو ایسا نہ کر پاؤں گا۔ وہ خوشبو میں بسی روح مجھے اپنے پیچھے پیچھے لیے چلی جا رہی تھی۔ میرے کانوں میں سرسراہی چھن چھن چھن چھن اور روح مجھے پیپل کے پاس لے گئی۔

کوئی آوازی تھی جس نے کانوں میں سرگوشی کی تھی۔ ”کھوڈ ڈال..... کھوڈ ڈال..... نکال لے مایا.....“

میں تب تک ٹرائس کی حالت میں تھا، یکدم بیدار ہوا تھا تھا۔ آواز بہت قریب سے آرہی تھی۔ ”کھوڈ ڈال“ اس مائی کے نیچے سے نکال لے مایا۔“ چھن چھن..... لال لگا جیسے کوئی پیپل کے برتن میں سکے چھنکار رہا ہو۔ میرا دم مار گھٹنے لگا۔

میرے قدم جم سے گئے تھے اور آواز حلق میں بند ہو چکی تھی۔

”بابا.....“ میرے حلق سے آواز نہ نکل پا رہی تھی کہ میں بابا کو اس انہونی صورت حال سے آگاہ کر سکوں۔ مدد کے لیے پکار سکوں۔ اچانک سے میرے اچھ میں موجود مالا خود بخود ہاتھوں میں حرکت کرنے لگی۔ میں نے پوری طاقت سے ہاتھ بلند کیا اور آدھے پختہ لال پر موجود چار پائی پر آرام کرتے بابا کی طرف مالا

بھاری پن محسوس ہوا۔ ہاں بابا کی دی ہوئی مالا جیب میں تھی۔ اُس زمانے میں لوگ اتنے بے ایمان نہ ہوتے تھے۔ یہاں آئے ہوئے کتنے ہی گھٹنے ہو گئے تھے۔ ہاں شاید بہت دیر ہو چکی تھی اور دیر تو ہو ہی گئی تھی۔ اس دیر میں میرے رشتے بھی مجھ سے بہت دور ہو چکے تھے۔ میں ناشتہ کر کے ادھر ادھر نظر ڈالنے کھڑا ہوا تو اس کیمپ کے باہر ہر طرف مہاجرین کے سٹے ہوئے چہرے، ننگے دھڑنگ بھوک سے ستائے ہوئے نظر آئے۔ ساتھ ہی ساتھ وہ بھی نظر آ رہے تھے جو قربانی میں اپنے اعضاء دے کر اس دھڑی پر سانس لے رہے تھے۔ جیسے جیسے میں آگے بڑھتا جاتا، میری آنکھوں میں یہ سارے کے سارے منظر محفوظ ہوتے چلے جاتے۔ جس وقت میری آنکھ کے کیمرے کی میموری فل ہو گئی میری آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا۔ اور میں کراہ کر گر گیا۔

☆.....☆.....☆

میری آنکھ جھولتے پھکڑے کی غیر متوازن چال سے کھلی تھی۔ پھکڑے کے آگے ایک مردار نیل بندھا ہم چار آدمیوں کا بوجھ ڈھونے سے قاصر تھا۔ میں بابا جی کی گود میں سر رکھے پڑا تھا۔ کہیں کچی کچی زمین پر پھکڑا رواں دواں تھا۔ میں نے آنکھیں کھول کر دیکھا۔ تاروں بھرا آسمان کسی سہاگن کی زرتار چہری کی طرح پھیلا پڑا تھا اور ساتھ ہی آسمان پر چاند پورے جوہن پر مسافر قافلوں کو جو اپنے اپنے غیر متعین رستوں پر رواں دواں تھے رستہ دکھا رہا تھا۔ ساری فضا میں جھیلروں کی ٹرٹری عجیب سا باندھ رہی تھی۔ ایسے میں کوئی جگنوؤں کی ٹولی آئی اور ”زندگی خوبصورت ہے“ کی نوید دیتی آگے ہو لیتی۔ اسی لپک چھپ میں جانے لگتی دیر بعد میری آنکھ لگ گئی۔ آنکھ لگتی تھی تو منظر اور ہوتا تھا اور آنکھ کھلتی تھی تو نظارہ ہی بدل جاتا تھا۔

☆.....☆.....☆

نیل کی گھٹیوں کی مدھرتان نے مجھے بیدار کیا۔ وہ بڑا وسیع صحن تھا۔ صحن کو لال اینٹیں پختہ کیے ہوئے تھیں۔ بڑے بڑے ستون، بڑے والے پایوں کی چار پائیاں، پیپل کے بڑے کلمے، صحن کے آخری کونے پر نیل باندھنے کے لیے بنی جگہ جہاں چاندی کا کھوٹا لگا ہوا تھا اور آدھے کچے صحن کے پتھوں بڑا سارا! پیپل کا درخت

اسی میں پھر سے لپیٹ لیتا۔ ایسے لمحات تھے جن کا تصور بھی جان لیوا ہے مگر خدا نے زندگی دینی تھی۔ اس صورت حال میں بھی میرے کانوں سے وہ چنچھنائی ہوئی آواز ذرا محو نہ ہوئی تھی بلکہ اس سے تو مجھے ایسا خوف محسوس ہوتا تھا وہ آواز سن کر کہ جیسے اکٹھے کئی مردے آنتیں اور آنکھیں ہاتھوں میں لیے میرے پاس آیا جاتے ہیں۔ وقت بھی رُکا ہے..... وقت کا نام چلتے رہنا ہے۔ بابا نے نجیف آواز میں میرا حوصلہ بڑھایا تھا۔

”بچے یہ ساری مشکلات خدا کا امتحان ہیں۔ مالا کو گردن میں پھیر کر کلمے کا ورد کرتا رہ۔ انشاء اللہ یہ بلا بھی ٹل جائے گی۔“ میں نے اُن کے کہے پر عمل کیا اور مالا پر کلمے کا ورد کرنے لگا۔

کتنی ہی دیر ہو چکی تھی۔ مجھے اس سے صرف یہ چتا تھی کہ کیسے بھی ہو یہ گوشت کے پہاڑ اوپر سے ہٹ جائیں مگر جیسے سارے لاشے ایک ہی جگہ ڈال دیے گئے تھے کچھ سے بعد ”چھن..... چھن..... چھن..... چھن.....“ کی آواز تیز ہوئی اور مجھے کچھ ہوش نہ رہا۔ سچ کہا ہے کسی نے کہ موت اور نیند جگہ ٹھکانہ نہیں دیکھتی بس آ جاتی ہے۔ مجھ پر بھی نیند نے پنچے گاڑ دیے تھے۔ وہ نیند تھی..... بے ہوشی کی نیند۔

☆.....☆.....☆

چنچھنائی ہوئی دھوپ نے منہ پر چھینے مارے تو میں ہڑ بڑا کراٹھ بیٹھا تھا۔ منظر بھلا یوں بھی بدل جاتا ہے۔ ہاں ایسا ہوتا ہے کہ آج جو ہم دیکھ رہے ہوتے ہیں کل وہ نہیں ہوتا۔ جو آج ساتھ ہوتے ہیں کل ان کا وجود ہی غائب ہو جاتا ہے۔ میرے ساتھ بھی یہی ہوا تھا۔

وہ بہت چمکیلا دن تھا۔ میں اتنے سارے نامانوس بے یار و مددگار لوگوں کے بیچ میں تھا مگر خود کو اجنبی محسوس نہ کر رہا تھا۔ اتنی دیر میں بابا جی میرے لیے کہیں سے ایک چھوٹے سے کانچ کے گلاس میں چائے اور پرانے بوسیدہ کاغذ میں کچھ رسک لپیٹ کر لے آئے۔ میری یادداشت جیسے سیکنڈ کے ہزاروں حصے میں واپس آئی تھی۔ میں نے اچانک سے اپنے آپ کو ٹوہ ٹوہ کر دیکھنا شروع کیا وہ خون..... میرے کپڑے تبدیل تھے۔ جیب میں کچھ

قبول کر لیا تھا۔ چھن چھن کی آوازیں بھی بند ہو گئیں۔
خدا نے پانچ سونے کی اشرفیوں سے بھری دیکیں
ہمارے آنگن سے نکال دیں گئیں۔ واہ رے مالک!
وہ ساری رات ہم نے گھر میں موجود کوٹھری میں
اشرفیاں منتقل کرتے گزاری تھی اور پھر پتا نہیں کب تھکن
سے چور ہو کر ہم سو گئے۔

☆.....☆.....☆

تھوڑی ہی دیر کو آنکھ لگی تھی کہ مجھے خواب نظر آیا۔
میرا بچپن۔ گوتم بدھ کے مندروں سے شروع ہونے والا
ایک ایک منظر جیسے فلم کی صورت چلتے لگا۔ ماں کی موت
بھی مایا ہی کی وجہ سے ہوئی تھی۔ ننھی کی بلی بھی یشومتی نے
دے ڈالی تھی اور محرک یہ مایا ہی تو تھی۔ اب لے دے
کے میرے ساتھ بابا جی بچے تھے۔ مایا کا سفر میرے بچپن
ہی سے شروع ہو گیا تھا۔ بدھ کے مندر کے پاس پتیل
کے پیڑ سے مایا میرے ساتھ چلتی چلی آئی تھی شملہ تک اور
پھر یشومتی کے گھر میں موجود پتیل کے پیڑ تک اور پھر
یہاں سیالکوٹ کے محلے میں موجود پتیل کے پیڑ تک مایا
کا سفر تمام ہوا تھا۔ خواب میں ہر بات بہت اچھی طرح
واضح طور پر مجھے میرے رب نے دکھادی تھی۔

اگلی صبح آنکھ کھلی تو مایا نے آخری قربانی بھی لے لی۔
بابا کی موت واقع ہو چکی تھی۔ سادہ زمانے تھے۔ گاؤں
والوں نے ہمیں پہلے ہی بہت مالدار سمجھ رکھا تھا۔ ہماری
سادگی کو عاجزی سے تعبیر کرتے تھے۔ زیادہ جیل حجت نہ
ہوئی اور پھر میں نے زندگی کی ڈگر پر سفر شروع کر دیا۔

یہ مایا از بابا کے ساتھ ہی دفن ہو گیا۔

گاؤں کے اسکول سے پڑھ لکھ کر مجھے اپنوں کے
پچھڑنے کے غم کو غلط کرنے کا سہارا مل گیا تھا۔ تعلیم
حاصل کرنے کی لگن ہی میری تنہائی کی بھجولی تھی۔ میرے
سنگ سنگ میرے بچپن کی یادیں میلہ لگائے رکھتی تھیں۔
گاؤں میں سب میرا بہت خیال رکھتے تھے۔

میں دل کھول کر ہر ایک کے دکھ درد میں کام آتا تھا۔
سب مجھے بڑا دیا لو سمجھتے تھے۔

مگر یہ سب اُس مایا کی وجہ سے ہی ممکن ہوا تھا جو
اُس رات میں نے اور بابا نے کوٹھری میں منتقل کر کے
کچن کو پھر سے اُس کی اصل شکل دے کر ممکن کیا تھا اور
بابا کو دفنانے کے بعد ہوئی برسات صحن کو اس کی اصل شکل

میں لے آئی تھی۔

☆.....☆.....☆

ثروت چاچا نذیر کی بیٹی تھی۔ چاچی صغرا نے مجھے
بیٹا بنایا اور میرے جوان ہونے پر اللہ کا نام لے کر ثروت
سے میرا نکاح پڑھوا کر میرا گھر آباد کر دیا۔

ثروت کے آنے کے بعد میرا گھر جنت کا نمونہ بن
گیا اور پھر ہم زیادہ دن وہاں نہ رہ سکے۔ پاکستان ترقی
کے عمل سے دو چار تھا۔ میں نے پہلے لاہور میں گھر لیا اور
انڈسٹری لگالی اور پھر ثروت کو لے کر وہاں آ کر شفٹ
ہو گیا۔ اللہ نے ہاتھ پکڑا اور میں نے مایا سے بھرپور فائدہ
اٹھاتے ہوئے کراچی جو اُس وقت پاکستان کا
دارالحکومت ہوا کرتا تھا، میں ایکڑ اراضی خرید کر ایک
کپڑے کی مل وہاں بھی لگالی۔

اُس وقت کے کیے ہوئے کام میری اگلی سات
نسلوں تک کے لیے زندگی کی آکسیجن ثابت ہوئے تھے
اور میرا شمار ملک کے مانے ہوئے سرمایہ داروں میں
ہونے لگا۔ پھر مجھے سیاست کا شوق چرایا اور آج آخر دم
میرا شمار اعلیٰ پائے کے سیاست دانوں میں ہوتا ہے
حالانکہ سیاست کو میں نے شوق ہی کی حد تک رکھا تھا اور
عین عروج پر ہی خیر باد کہہ دیا تھا مگر یہ تاج سر پر سج جائے
تو ہٹا کب ہے۔

☆.....☆.....☆

بہت دل چاہا کہ میں اپنی باتیں کسی سے شیئر کروں
مگر یہاں آج کے لوگوں کے دل بہت چھوٹے اور
زبانیں بہت بڑی ہیں اس لیے میں نے اپنی زندگی کے
سچ بیان کر دیے۔ سچ میں بہت مزا آیا اور لگتا ہے اب میں
زمین کی گود میں بہت پرسکون ہو کر سو جاؤں گا۔ آج بھی
گاؤں والا گھر میں نے مایا کی یادگار کے طور پر آباد رکھا
ہے۔ اُس گھر میں وہ لوگ رہتے ہیں جن کا کوئی نہیں ہوتا
اور یہ بات سب مانتے ہیں کہ اُس گھر میں پیر رکھنے
والے کی ساری پریشانیاں دور ہو جاتی ہیں۔

اس سکون میں میری ماں، بہن اور نورانی صورت
پراسرار بابا کی قربانی شامل ہے۔

کوئی یقین کرے یا نہ کرے مگر یہ سچ ہے کہ یہ دنیا
صرف آنکھوں کا پھیر ہے بڑا گورکھ دھندا ہے۔

☆☆.....☆☆.....☆☆

سلسلے وار کہانیاں

مکھنسی

ارشاد علی ارشد

ایک عجیب لڑکی کی داستان
جسے قدرتیں بہت شوق سے پڑھتے ہیں

ابو ظہری سے سنسنی خیز سلسلے آٹھویں کڑی



مکھنی ایک نہایت ذہین و سمجھ دار اوروں سے مختلف سوچ، خیالات، نظریات اور فنی طاقت رکھنے والی گاؤں کی ایک لڑکی ہے جو اپنے ماں باپ دو بھائیوں اٹھ اور مظہر ایک بہن سکھاں اور محبت میں ناکام غیر شادی شدہ پھوپھو ذکیہ کے ساتھ زندگی گزار رہی ہے۔ سکھاں کو اپنے کانٹا ٹیلر سانول سے محبت ہو گئی ہے مکھنی محبت اور عشق کے حوالے سے باتیں کرتے ہوئے اپنی بہن سکھاں کو سفید چوڑے کی دیوار کو اپنی فنی طاقت سے پردہ اسکرین بنا کر ماضی میں مجاہدین اسلام کا ایک لشکر دکھاتی ہے!!

محبت اور عشق کی باتیں کرتی، محبتیں سلجھاتی اور مسلمانوں کے عظیم ماضی و اسلاف کے کارنامے بتاتی اور دکھاتی مکھنی، سکھاں سے وعدہ کرتی ہے کہ وہ سانول سے اس کے رشتے کے سلسلے میں گھر والوں سے بات کرے گی۔ مکھنی کے بھائی اٹھ کی دینی روانگی سے پہلے شادی کر دی جاتی ہے۔ مکھنی اسی دوران سانول کے گھر اس سے ملنے جاتی ہے۔ ایک روز سکھاں کانٹا ٹیلر سے لوٹ رہی ہوتی ہے تو چوہدری اللہ رکھا کا بیٹا چوہدری راجیل اسے روک کر پریشان کرتا ہے اور پھر ایک روز جب سکھاں اپنی ماں کے ساتھ جارہی ہوتی ہے تو چوہدری راجیل دوبارہ وہی حرکت کرتا ہے۔ اس دوران میں سکھاں کا باپ اس کی مکھنی کا طرہ خالہ کے دیور سے کرنے کا فیصلہ کرتا ہے۔ ایک روز یوں بھی ہوتا ہے کہ چوہدری اللہ رکھا مکھنی کا راستہ روک لیتا ہے۔ مکھنی اس کو برا بھلا کہتی ہے تو وہ اسے تھپڑ مارنے کے لیے ہاتھ اٹھاتا ہے لیکن مکھنی اس کا ہاتھ پکڑ لیتی ہے۔ چوہدری اللہ رکھا اپنے کارندوں کے سامنے اس بے عزتی پر مکھنی کو دھمکی دیتا ہے کہ اب میرے حجرے میں تیرا ناچ ہوگا اور پھر ایک روز چوہدری اللہ رکھا کے کارندے مکھنی کو اغوا کر کے اس کی کوٹھی کی شکل میں موجود حجرے میں پہنچا دیتے ہیں۔

چوہدری اللہ رکھا کے حجرے میں مکھنی اس کی خواہشات پوری کرنے کی بجائے موقع ملے ہی چوہدری اللہ رکھا کی رائفل سے ہی اسے قتل کر دیتی ہے۔ مکھنی کو چوہدری کے قتل کے الزام میں گرفتار کر لیا جاتا ہے اور پھر سکھاں تھانے میں آ کر اسے بتاتی ہے کہ چوہدری اللہ رکھا کے بڑے بیٹے چوہدری مشتاق نے پیغام بھیجا ہے کہ اگر سکھاں کے لیے چوہدری راجیل کا رشتہ قبول ہے تو ہم مکھنی کو معافی کے بعدویت کے قانون سے رہائی دلا سکتے ہیں۔ اسی دوران میں لیڈی انسپکٹر شیانہ کو مکھنی سے گفتیش کے لیے بلایا جاتا ہے۔ مکھنی اسے دیوار پر محمد بن قاسم کا نظارہ کر کے دہلا دیتی ہے اور وہ تھانے دار کے گھر تک پہنچ جاتی ہے۔ مکھنی کے معاملات سے خائف ہو کر تھانے دار اسے لے کر گاؤں آتا ہے جہاں مکھنی کے قاتل ہونے کے گواہ اپنے بیان سے منکر جاتے ہیں۔ مکھنی تھانے دار سے رہائی حاصل کرنے کے بعد اپنے گھر آتی ہے۔

گھر آ کر اسے پتا چلتا ہے کہ اس کا ابا قانچ کے باعث چار پائی سے لگ گیا ہے پھر کچھ دن بعد اس کے ابا کا انتقال ہو گیا جبکہ اس کا بھائی باپ کی موت سے پہلے ہی دینی چلا جاتا ہے۔ ایک روز مکھنی کی اماں کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے۔ وہ بھگم بھاگ ڈاکٹر کو بلانے جاتی ہے کہ راستے میں اسے اغوا کر لیا جاتا ہے۔ اسے چوہدری کے قارم لے جایا جاتا ہے جہاں سے اسے لاہور کی ہیرامنڈی میں بھیج دیا جاتا ہے۔ وہاں اس کی ملاقات انم نامی لڑکی سے ہوتی ہے جو اپنی دکھ بھری داستان اسے سناتی ہے۔

مکھنی، انم کو حوصلہ دیتی ہے پھر مکھنی، انم کو اس غلط جگہ سے نکال کر لے جاتی ہے۔ اس کام کے لیے وہ دلاور نامی گاؤں کی مدد لیتی ہے مگر خانم کے غنڈے ان کا پیچھا کرتے ہیں۔ راستے میں قانچ سے دلاور مر جاتا ہے اور ان کی گاڑی میں آگ لگ جاتی ہے۔ مکھنی اور انم دیا میں چھلاٹک لگا دیتی ہیں۔

(اور اب آگے بڑھیے۔)

”آب حیات وغیرہ سب خیالی باتیں ہیں، اس کا وجود آج تک کوئی بھی ثابت نہیں کر سکا۔“ میں نے کہا۔

”لیکن مکھنی! قرآن مجید میں ایسے بہت سے واقعات موجود ہیں جنہیں عقل انسانی تسلیم نہیں کرتی۔“

”وہ تمام معجزات ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے ہر پیغمبر کو وقت کے لحاظ سے کوئی نہ کوئی معجزہ عطا فرمایا تھا مثلاً داؤد علیہ السلام کے دور میں آتش و آہن کا بڑا شہر تھا سازندوں اور گانے والے خوش آواز مغنیوں کی بھرمار تھی۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں یہ معجزہ عطا فرمایا کہ وہ لوہے کو بھی ہاتھ میں لیتے تھے تو وہ موم کی طرح پگھل جاتا تھا۔ وہ آہن پرست لوگ داؤد علیہ السلام کے اس معجزے سے بہت مرعوب ہو گئے۔

عیسیٰ علیہ السلام کے دور میں طب کا بہت غلطہ تھا۔ اس دور میں ایک سے بڑھ کر ایک مسیحا (ڈاکٹر) موجود تھا۔ اللہ

تعالیٰ نے عیسیٰ علیہ السلام کو یہ معجزہ عطا فرمایا کہ ان ہی کو وقت کا سب سے بڑا مسیحا بنا دیا۔ وہ کسی کوڑھی کے جسم پر صرف ہاتھ پھیرتے تو وہ شفا یاب ہو جاتا۔ کسی اندھے کی آنکھوں پر ہاتھ پھیرتے تو اس کی بینائی لوٹ آتی حتیٰ کہ کسی مردے کو کھوکھارے تو وہ اٹھ کر بیٹھ جاتا۔ لوگ ان کے ان معجزات سے بہت مرعوب ہوئے۔

موسیٰ علیہ السلام کے دور میں جادو اور جادو گروں کی بہتات تھی۔ اپنے خیال میں ہر شخص جادوگر تھا۔ فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کا امتحان لینے کے لیے اپنے دربار میں اس وقت کے انتہائی بڑے بڑے جادوگر بلائے۔ فرعون کے اشارے پر ان جادوگروں نے اپنے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی رسیاں اور لٹھیاں فرش پر پھینک دیں۔

جادوگروں کی پھینکی ہوئی رسیاں اور لٹھیاں انتہائی خوف ناک اور زہریلے سانپوں میں تبدیل ہو گئی تھیں۔ ان سانپوں کی پھینکار سے اچھے اچھوں کا پتا پانی ہو رہا تھا۔ فرش پہ ہر طرف سانپ ہی سانپ تھے جو موسیٰ علیہ السلام کی طرف بڑھ رہے تھے۔

اُسی وقت موسیٰ علیہ السلام کو حکم ملا کہ اپنے ہاتھ میں پکڑا ہوا عصا پھینک دے۔ موسیٰ علیہ السلام نے ایسا ہی کیا۔ عصا فرش پہ گرتے ہی انتہائی جیسیم اور خوف ناک اژدھے میں تبدیل ہو گیا اور وہ سینکڑوں سانپوں کو ایک ایک کر کے نکلنے لگا۔ جن لوگوں نے رسیاں اور لٹھیاں پھینکی تھیں، جو سانپ بن گئی تھیں وہ بھی حیران و پریشان یہ منظر دیکھ رہے تھے۔

میں نے آنکھوں کو مسل کر دیکھا، کیا میری آنکھ کا شیشہ ٹوٹ گیا ہے؟ میں نے آنکھوں کو مسلا تو مجھے یوں لگا جیسے پوری کائنات میرے اوپر آن گری ہے۔ میں نیچے پس گئی ہوں اور پھر میرا سر مدہ بن گیا ہے۔ لوگ یاری باری آرہے ہیں اور مٹھی بھر سرمدہ لیتے جارہے ہیں۔ پتا نہیں یہ سرمدہ ان کے کس کام آئے گا؟ میں نے سوچا مگر کوئی سلی بخش جواب نہ پا کر میں کوشش کر کے اچھی اور ایک شخص کے پیچھے ہوئی کہ دیکھوں تو لوگ سرمدے کا کرتے کیا ہیں؟ میں جس کے پیچھے چل رہی تھی وہ ادھیڑ عمر شخص تھا۔ داڑھی اور سر کے بال سفید ہونا شروع ہو گئے تھے۔ جسم فربہ کی طرف مائل تھا۔ سلیٹی رنگ کا پرانا کرتہ پا جامہ پاؤں میں ہوائی سلپرتھے۔ چال میں سستی اور کمالی تھی۔ مجموعی طور پر وہ بد حال اور دیوانہ سا شخص تھا۔

پچھلے تین گھنٹوں سے وہ رینگ رینگ کر چل رہا تھا۔ میں اس کی سستی سے عاجز آ گئی۔ جی چاہا، اسے پیچھے سے زور کا دھکا دوں تاکہ چال میں کچھ تیزی آئے۔ میں نے مزید ایک گھنٹہ برداشت کیا۔

جب رفتار میں کوئی بہتری نہ آئی اور نہ ہی منزل مقصود کے آثار دکھائی دیے تو میں بھنا کر اس کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ ”کب تک ایسے ہی چلتا ہے؟ میں تھک گئی ہوں۔ نہ آپ کی چل ٹوٹی ہے نہ چال میں بہتری آتی ہے اور نہ منزل کا نام و نشان ہے۔“

اس نے بلند قبچہ لگایا۔ مجھے غصہ بہت آیا مگر میں برداشت کر گئی۔ عجیب شخص ہے میری بے بسی پر قبچہ لگا رہا ہے۔ ”ابھی سے تھک گئی ہو ابھی تو میرے سفر کی ابتدا ہوئی ہے انتہا کب اور کہاں ہو؟ معلوم نہیں؟ تم جانتی ہو اس سفر کی انتہا کیا ہے؟“

”آپ ابھی تک یہ بات سمجھ نہیں پائے۔ اس سفر کی انتہا قبرستان ہے، گہری تاریک قبر..... تو سیدھا قبر میں جائے گا۔“ میں نے غصے میں جواب دیا۔

اس کے قبچہ تھم گئے۔ ”تم تھک کہتی ہو۔ آج اٹھارہ ماہ کے مسلسل سفر کے بعد مجھے یاد آیا مجھے قبرستان جانا ہے جہاں ایک قبر ہے اس قبر میں ایک گھر ہے، گھر میں ایک مرد ہے مجھے اُسی سے ملنا ہے۔ تم چلو گی میرے ساتھ؟“

”تو اور کیا! میں یوں ہی پچھلے چار گھنٹوں سے جھک مار رہی ہوں؟“

میری بات سن کر وہ پھر چل پڑا۔ وہی ست بو جھل قدموں سے۔ مجھے یاد آیا جب کائنات میرے سر پر گری تھی تب میرا کچھ منکل گیا تھا۔ میرے جسم کا سرمدہ بن گیا تھا۔ یہ شخص مٹھی بھر سرمدہ اٹھا لیا تھا اور میں یہ دیکھنے کے لیے کہ وہ سرمدے کا

کیا کرے گا اس کے پیچھے ہوتی تھی مگر اب اس کے دونوں ہاتھ خالی دکھائی دے رہے تھے۔ میں پوچھنا چاہ رہی تھی کہ وہ چلتے چلتے رک گیا۔ میں اس سے تین قدم پیچھے تھی۔ تین سیکنڈ بعد میں اس کے نزدیک پہنچ گئی۔

”قبرستان آ گیا ہے اب میرے عقب میں نہیں میرے ساتھ ساتھ چلو۔“ اس نے یہ کہتے ہوئے قدم بڑھا دیے مگر میں وہیں جم کر کھڑی ہو گئی۔ دس قدم آگے جا کر اسے احساس ہوا مگر مجھے دیکھا اور غصے سے بولا۔ ”چلو رک کیوں گئی ہو؟“

”آپ بھول رہے ہو میں عورت ہوں۔“

”میں اندھا نہیں ہوں دیکھ بھی سکتا ہوں اور پرکھ بھی سکتا ہوں۔ مجھے بتا ہے تم عورت ہو۔“

”کیا آپ کو اس حدیث مبارک کا نہیں پتا جو سرکارِ دو عالم حضرت محمد ﷺ نے عورتوں کے بارے میں فرمائی ہے؟“

”کون سی حدیث؟“

”اُن عورتوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہے جو اکثر قبروں کی زیارت کے لیے جاتی ہیں۔“

”اب تیرا کیا خیال ہے؟“ حدیث سننے کے بعد بھی اس نے پوچھا تو مجھے بہت برا لگا لیکن میں ضبط کر گئی۔

”آپ جائے قبر اور قبر والے سے جو کام ہے وہ کیجئے تب تک میں یہاں نماز پڑھ لیتی ہوں۔“

”ٹھیک میں چلتا ہوں مگر تم نماز مت پڑھنا۔“

وخطی قسم کا انسان ہے۔ اس نے مجھے نماز پڑھنے سے منع کیا تو میرے ذہن میں خیال آیا یقیناً پاگل شخص ہے نزدیک ہی ایک سایہ دار درخت تھا جس کی شاخیں جھکی ہوئی تھیں۔ میں وہاں سائے میں بیٹھ گئی۔ کتنا عجیب و غریب شخص ہے۔ نماز کا وقت ہے مسجدوں سے صدائیں گونج رہی ہیں۔ ”آؤ نماز کی طرف۔ آؤ فلاح کی طرف۔“ میں نماز پڑھنا چاہتی ہوں اور وہ کہہ گیا ہے نماز مت پڑھنا۔ سایہ دار درخت کی ٹھنڈی چھاؤں مجھے ماں کی گود کی طرح راحت بخش اور آرام دہ محسوس ہو رہی تھی۔ ہلکی ہلکی ٹھنڈی میٹھی ہوائیں لوری سناتے لگی۔ مجھ پر غنودگی طاری ہونے لگی۔

.....

یہ ایک روشن چمکدار اور خوشبودار محل تھا جو کہ اندر سے بہت بڑا اور انتہائی خوبصورت تھا۔ محل کے دروازے سے ٹورکی کرنیں پھوٹ رہی تھیں۔ طول و عرض میں نرم و گداز اور بیش قیمت قالین بچھا ہوا تھا۔ بڑے بڑے رنگی پردے اور پردوں سے اٹھتی خوشبوئیں جو سیدھی دل میں اتر رہی تھیں۔ چاروں گوشوں سے ہلکی سریلی آوازیں کانوں میں رس گھول رہی تھیں۔ میں نے زندگی میں ایسی مترنم خوبصورت اور دل کو لہانے والی آواز نہیں سنی۔

محل کے بڑے بڑے ستون چاروں اور ایسی چمک دیک بکھیر رہے تھے جیسے سونے کی دھات سے بنے ہوئے ہوں۔ صاف شفاف پانی دودھ اور مختلف مشروبات کی چھوٹی چھوٹی نہریں بہہ رہی تھیں۔ قریب جانے پر ایک عجیب و غریب ناقابلِ بیان فرحت بخش اور خوش کن احساس دل کو سکون کی اتھاہ گہرائیوں میں لے جا رہا تھا۔ محل کی چھت دیکھوں درود یوار دیکھوں یا فرش کو دیکھوں جہاں اور جس طرف بھی دیکھوں نظر سو گنا بڑھ کے واپس لوٹ کے آتی تھی۔ درود یوار پر نقش و نگاری اور کشیدہ کاری کی بے مثل فنکاری نمایاں تھی۔

باہر کی دنیا میں میری آنکھوں نے جتنا بھی حسن دیکھا تھا وہ سب محل کی ایک جھلک کے سامنے ہی محسوس ہو رہا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے سارے انعام و اکرام اور خاص عنایتیں اس محل کے لیے مختص کر چھوڑی تھیں۔ محل میں بہت سے دربان اور ملازم ادب سے کھڑے ہوئے تھے۔ ایک طرف پھولوں کی بے شمار لڑیوں کے بیچ گاؤں کیے گئے ہوئے تھے۔ میں نے غور کیا تو معلوم ہوا کہ تنکے سے ٹیک لگائے کوئی بیٹھا ہوا ہے۔ عقب میں دائیں بائیں دو دربان بڑے بڑے پتے ہاتھوں میں لیے لہرا رہے تھے۔

میں نے اپنے قریب کھڑے ہوئے دربان سے کہا۔ ”ایسا حسن و دل کشی میں نے نہ کبھی دیکھی نہ سنی۔ یہ عقل سے ماورا کون سی جگہ ہے یہ کس کا محل ہے اور یہ صاحب محل کون ہیں؟ جس کی چاروں جانب ایسی تیز اور پر نور روشنی کے ہالے ہیں کہ حسن کی تاب لانا میری گستاخ آنکھوں کی گرفت سے باہر ہے۔“ میں اپنی بات کہہ کے خاموش ہو گئی۔

دربان چند لمحوں بعد گویا ہوا تو مجھے اس کی آواز میں ایک عجیب دل کشی محسوس ہوئی۔ ”تمہیں نہیں پتا! جس نے چلتی کشتی کو توڑ دیا تھا۔ بچے کو قتل کر دیا تھا اور دیوار بھی اُن لوگوں کی بنائی تھی جنہوں نے انہیں تڑپایا اور ستایا تھا۔“

میں حیران و پریشان تھی دربان کیا کہہ رہا ہے تین جرم کرنے والے کا ایسا عالی شان محل! اللہ تعالیٰ ایسا مہربان رحیم اور کریم ہے۔ بے شک وہ ہے مگر شاید میں نے غلط سنا ہو۔ مجھ سے کچھ اور کہا گیا ہوگا شاید یہاں کا دلفریب اور جادوئی ماحول میرے دماغ پر اثر انداز ہو گیا ہے۔ میں نے سر کو زور سے جھٹکا دیا۔

.....

جھٹکا کچھ زیادہ ہی شدت سے لگ گیا تھا کیونکہ میں لڑھک کر زمین پر گر پڑی تھی۔ آنکھ کھلی تو احساس ہوا میں واقعی زمین پر پڑی ہوئی ہوں اور وہ جو قبرستان گیا تھا میرے سامنے کھڑا ہوا ہے۔ یہاں نہ محل تھا نہ صاحب محل کی کوئی جھلک اور چمک۔ کیا میں خواب دیکھ رہی تھی؟ مگر اتنا خوبصورت خواب۔ میرے لیے یہ خواب ایک معمر بن گیا۔ مجھے یقیناً اس بد بخت نے جگایا تھا۔ تھوڑی دیر صبر کر لیتا تو شاید میں یہ معمر مل کر لیتی۔ میں ایک بھید کو پالیتی مگر مجھے یک دم اس بھٹے پرانے گرتے والے پر بے حد غصہ آیا۔ میں نے غصے سے کہا۔ ”جہاں ایک گھنٹا لگا دیا ہے وہاں دس پندرہ منٹ اور صبر کر لیتے۔ خواہ مخواہ میری نیند میں خلل ڈال دیا۔“

میں نے سورج کو دیکھ کر اندازاً کہا تھا کہ وہ ایک گھنٹے بعد لوٹا ہوگا۔ وہ میری بات پر زور زور سے ہنسنے لگا جیسے میں نے کوئی لطیفہ سنا دیا ہے۔

اس بار مجھے اس کی ہنسی چھپی نہیں۔ ”کیوں ہنس رہے ہو؟“

”تمہاری عقل پر ہنس رہا ہوں۔ بے وقوف لڑکی! میں۔ ایک گھنٹے بعد نہیں میں چھ دنوں بعد تمہارے پاس لوٹا ہوں۔“

”چھ دنوں بعد؟“ میں نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا۔

”فکرمات کرو چھ دنوں میں دنیا نہیں بدلی۔ سب کچھ ویسے کا ویسا ہی ہے۔ ہاں چھ دنوں میں ایک گھر کی قسمت مزید بدل گئی ہے۔“

”کون سے گھر کی قسمت! اور آپ چھ دنوں تک قبرستان میں کیا کرتے رہے ہیں؟“

میرے پوچھنے پر بجائے جواب دینے کے وہ ایک طرف چل پڑا۔ میں بھاگ کر اس کے پیچھے لگی۔

”آپ نے جواب نہیں دیا؟“

”آگے چلنا ہے یا واپس جانا ہے؟“ اس نے رک کر میری طرف دیکھا۔

اُس وقت سورج سوانیزے پر تھا۔

میں نے کہا۔ ”تیرے بھید جب تک جان نہ لوں واپس نہیں جاؤں گی۔“

”تمہارے گھر والے تمہیں ڈھونڈ رہے ہوں گے۔ میرا سفر بہت لمبا ہے۔ واپس چلی جاؤ تو بہتر ہوگا۔“

”میں نے کہا ناں مجھے واپس نہیں جانا۔ میں روشنی کے بھید میں نکلی ہوں۔ اندھیروں میں پلٹ کر کیا کرنا ہے مجھے اندھیروں سے خوف آتا ہے۔“

”پکی!.....! اندھیروں سے نہ ڈرا اندھیرے سے آئی ہے۔ اندھیرے ہی میں جائے گی۔“

”جس اندھیرے سے میں آئی ہوں وہ میرے لیے روشن اندھیرا تھا۔ آگے بھی امید ہے کہ روشن اندھیرا ہی ملے گا۔ میری فکر چھوڑو اپنے سفر کی فکر کرو۔“

”تو پھر چلو گھر! میرے کسی کام میں دخل اندازی مت کرنا۔“

وہ جب عادت ست چال چل رہا تھا۔ اس کی ست روی مجھ پر بھاری گزر رہی تھی مگر میں نے ساتھ چلنے کا پختہ تہیہ کر رکھا تھا اس لیے ضبط کیے جا رہی تھی۔ چلتے ہوئے ہم ایک گھنے گھر سوکھے ہوئے جنگل میں داخل ہو گئے۔ جنگل کے سارے پودے درخت جھاڑیاں اور گھاس سوکھی ہوئی تھیں۔ پتے جھڑ چکے تھے پرندے اڑ چکے تھے اور جانور ہجرت کر

گئے تھے۔ جنگل کا ماحول دیکھ کر ایک لمحے میں اندازہ ہو جاتا تھا کہ یہاں پر بدترین خشک سالی کا موسم چل رہا ہے۔ ہمارے لیے تسلی بخش بات یہ تھی کہ ہمیں ابھی تک پیاس نے نہیں ستایا اور نہ یہاں پر کوسوں دور تک پانی کی ایک بوند تک دکھائی نہیں دے رہی تھی۔ جنگل کی سوچی ہوئی گھاس اور خشک پتے پاؤں کے نیچے آ کر جھرمرا رہے تھے یا پھر اپنی پامالی پر ماتم کناں تھے۔ جنگل ختم ہوا تو ہم میدان میں نکل آئے۔ حدنگاہ بے آب و گیاہ میدان جس کی زمین بخرگ رہی تھی۔ میدان میں اگر کہیں کہیں کبھی گھاس اُگی بھی تھی تو اب دھوپ کی تمازت سے جل گئی تھی۔ میدان میں ایک طرف آٹھ دس آدمی کنواں کھودنے میں مصروف تھے۔ کڑتی دھوپ، سخت محنت اور مشقت اور پیاس نے اُن کا برا حال کر رکھا تھا مگر وہ اپنے کام میں جتے ہوئے تھے۔

انہیں دیکھ کر میرے ہم سفر کے قدم تھم گئے تھے۔ ”یہ کیا کر رہے ہیں؟“ اس کا سوال مجھے بے ٹکا اور غیر معقول لگا۔

”کنواں کھود رہے ہیں۔ آپ کو اندازہ نہیں ہوا۔ یہاں کتنی بدترین قحط سالی چل رہی ہے۔ کہیں دور دور تک پانی کا نام و نشان نہیں۔ ہر طرف خشک سالی کا راج ہے۔“

”پانی کے لیے کنواں کھود رہے ہیں؟“ اگلا سوال پچھلے سوال سے زیادہ احمقانہ تھا۔ میں نے غصے سے جواب کہا۔ ”پانی کے لیے نہیں، روٹی کے لیے۔ وہ گڑھا کھودیں گے تو انہیں اندر سے پکی پکائی روٹیاں اور سالن ملے گا۔“ میرا الجھا انتہائی تلخ تھا۔

وہ خاموش رہا، منہ ہی منہ میں کچھ بڑبڑانے لگا۔ میری سمجھ میں کچھ بھی نہ آیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے؟ میں نے اسی دوران میں شور مٹا۔ ”پانی نکل آیا..... پانی نکل آیا!“ خوشی کے نعرے میدان میں گونج اٹھے تھے۔ وہ ایک دوسرے سے لپٹ کر مبارک باد دے رہے تھے اور پانی نکلنے کی خوشی میں باقاعدہ ناچ رہے تھے۔ ”چلو، بستی والوں کو خوشخبری سناتے ہیں۔ سب اپنے اپنے برتن لے آؤ۔ جسے جتنا پانی چاہیے لے جائے اور خوب سیراب ہو کر پی لو۔“

میں نے دیکھا وہ ہنسی خوشی دور نظر آنے والے گھروں کی طرف اڑے جا رہے تھے۔ ہم چلتے ہوئے کنویں کے پاس پہنچ گئے تھے۔ ایک طرف ان کے اوزار پانی نکالنے کے لیے ڈول اور رسی کا لچھاڑا ہوا تھا۔ میں نے کنویں میں جھانک کر دیکھا، چمکتا لہراتا پانی دیکھ کر میری پیاس بھی جاگ اٹھی۔ میں نے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری اور ڈول سے رسی باندھ کر اسے کنویں میں ڈال دیا۔ ”ارے کیا کر رہی ہو؟“ تلخ آواز میرے عقب سے ابھری۔ نہ جانے اسے کیا بیماری تھی؟ آنکھوں دیکھا حال بھی نہیں جان سکتا۔

”پیاس لگی ہے پانی پیتا ہے۔“
”نہیں یہ پانی تمہارے لیے نہیں ہے۔ تم یہاں آؤ۔“
میں نے اس کی بات سنی ضرور مگر اس پر عمل نہیں کیا۔ ڈول پانی سے بھر گیا تھا۔ میں رسی کھینچنے ہی والی تھی کہ میرے ہاتھ کو شدید جھٹکا لگا۔ رسی میرے ہاتھ سے چھوٹ گئی۔ ڈول بچ رسی کنویں میں گر کر پانی میں غائب ہو گیا۔ میرا دماغ بھونچکا رہ گیا۔ میں نے غصے اور حیرت سے خشکی کو دیکھا، اس نے میرے ہاتھ پر زبردست ضرب لگائی تھی۔ ضرب کے جھٹکے سے ہی رسی میرے ہاتھ سے نکل گئی تھی۔
”پچھے ہٹو۔“ اس نے مجھے شانوں سے پکڑ کر زور سے پیچھے دھکیلا۔

میں لڑکھڑا کر پیچھے جا گری۔ مارے غصے کے میرا برا حال ہو گیا مگر میں نے ضبط کا دامن نہیں چھوڑا۔ میں حیران و پریشان اس پاگل شخص کو دیکھ رہی تھی جو بیچلے اٹھا کر پاگلوں کی طرح کنویں میں مٹی ڈال رہا تھا۔ اس کی منطق میری سمجھ میں نہیں آئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اس نے مٹی اور بڑے بڑے پتھروں سے کنواں بھر دیا۔ اس نے دس بارہ آدمیوں کی شب و روز کی محنت لمحوں میں غارت کر دی تھی۔

میں اس کے قریب جا کر چیخے ہوئے بولی۔ ”یہ کیا کیا آپ نے؟ میں آپ کو خطی سمجھ رہی تھی مگر آپ تو سنگدل اور جانی بے رحم انسان ہیں، آپ کو احساس نہیں کہ یہاں بدترین خشک سالی کا راج ہے۔ نجانے کتنے دنوں سے لوگ پانی کے لیے کنواں کھود رہے تھے اور آپ نے پتا سوچے سمجھے لمحوں میں اسے بھر دیا۔ بستی والے لوگ خوشی برتن لے کر نہیں گئے تو کتنی بددعا میں دیں گے..... آپ.....“
”شش.....!“ اس نے ہونٹوں پر سختی سے انگلی جما کر مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ میں نہ چاہتے ہوئے بھی خاموش ہو گئی۔

اس نے مجھے سخت نظروں سے گھورتے ہوئے کہا۔ میں نے کہا تھا، میرے کاموں میں دخل اندازی مت کرنا۔ چلو اور میری بات کا دھیان رکھنا۔ اب کچھ نہ بولنا۔“

میں اس کے ساتھ دھیرے دھیرے قدم اٹھائے سوچ رہی تھی۔ بستی والے خوشی سے کھلتے اور مسرتوں میں چمکتے رہے جب کنویں کے پاس آئیں گے تو بند کنواں دیکھ کر انہیں کتنی اذیت اور دکھ پہنچے گا۔ اس ظالم شخص نے ان کی ساری محنت پر پانی پھیر دیا تھا۔ میری رائے میں یہ ایک جاہل انسان ہے۔ مجھے اس سے اپنی راہیں جدا کر لینی چاہئیں۔ ایسا نہ ہو کہ میں بھی اس کے قہر و جبر کا نشانہ بن جاؤں مگر میرے ذہن میں ابھرنے والے سوالات ابھی تشنہ تھے۔ ان کا جواب حاصل کیے بغیر مجھے اس کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے۔

میں نے ارد گرد کا جائزہ لیا تو پتا چلا، ہم میدان سے نکل کر پہاڑی علاقے میں داخل ہو چکے ہیں۔ انہیں پہاڑیوں کی جائے عمودی چٹانیں کہنا زیادہ بہتر ہوگا۔ چٹانوں کی جڑ میں چھوٹے بڑے شیب و فراز اور ٹیڑھے میڑھے راستوں پر ہم بہت رومی سے آگے بڑھ رہے تھے۔ یہاں پر کچھ پرندوں اور کہیں کہیں کسی جنگلی جانور کی آوازیں سنائی دے رہی ہیں۔ شاید قریب ہی کہیں جنگل بھی ہو۔ مجموعی طور پر یہاں بھی ہو کا عالم تھا۔ چلتے چلتے میرے ہاتھ پاؤں شل ہو گئے تھے، ہم بے حال ہو رہا تھا اور پسینے سے شرابور تھا۔

میں نے کن انکھوں سے ہم سفر کو دیکھا، اس کی ست چال میں ذرہ برابر فرق نہیں آیا تھا۔ وہ ایک پتھر کے قریب رک کر اپنے ہوائی چپل اتار کر انہیں جھاڑ رہا تھا۔ مجھے حیرانی ہو رہی تھی کہ اتنے لمبے سفر اور پر پیچ راستوں کے باوجود اس کی سستی اور عام سی چپل پستی نہیں۔ میں ایک بڑے سے پتھر پر بیٹھ گئی۔ اب مزید چلنے کی ہمت مفقود ہو گئی تھی۔ وہ بھی میرے پاس ہی پتھر پر بیٹھ گیا۔ اچانک میں نے دیکھا، ہم سے کوئی ایک کلومیٹر کے فاصلے پر چٹان کی جڑ میں ایک شخص بیٹھا ہوا تھا۔ غور کرنے پر معلوم ہوا کہ اس نے اپنے سامنے کشکول رکھا ہوا ہے۔ کشکول میں چٹان سے آنے والے پانی کے قطرے ٹپ ٹپ کر رہے ہیں۔ آدنی سے چند میٹر پیچھے ایک عورت پتھر سے ٹیک لگائے بے حال نیم دراز تھی۔ وہ منظر بکھرے ذہن میں جم سا گیا۔

وہ دونوں بھی ہماری طرح اُن دیکھی منزل کے مسافر ہیں۔ چلتے ہوئے انہیں بھی پیاس نے بے حال کر دیا ہے۔ یہاں دور دور تک پانی کے آثار نظر نہیں آ رہے ہیں۔ خوش قسمتی سے اس آدمی کو پانی مل گیا تھا مگر یہ چٹان سے ٹپکنے کی صورت میں گر رہا تھا۔ جس طرح قطرے رک رک کر گر رہے تھے اس سے لگتا تھا، کشکول بھرنے میں آدھا گھنٹا لگے گا۔

میں نے اپنے ہم سفر کو دیکھا، وہ بے پروائی سے بولا۔ ”دیکھ رہا ہوں پانی ہے مگر بہت قلیل مقدار میں۔ کشکول ابھی اسی میں نہیں ہوا اور میں اسے پورا ہونے بھی نہیں دوں گا۔ نہ جانے اس کے پاس غلیل کہاں سے آئی تھی؟ میں حیرانی سے اس کی حرکات و سکنات دیکھ رہی تھی۔

اس نے غلیل میں چھوٹا سا پتھر لگایا، ایک آنکھ بند کی، گویا فائر کر دیا۔ وہ کمال کا نشانہ باز تھا۔ پتھر سیدھا کشکول کو لگا۔ کشکول الٹ گیا اور پانی نیچے بہہ گیا۔

میں نے انتہائی نفرت سے اسے دیکھا۔ ”یہ کیا کر دیا؟ ظالم انسان، تمہیں پتا نہیں وہ بے چارہ کب سے قطرہ پانی جمع کر رہا تھا۔ اس کی عورت پیاس سے مر رہی ہے اور تم نے اس کا کشکول گرا دیا؟“ میری باتوں کا اس پر کوئی اثر

نہیں ہوا۔ وہ ایک اور پتھر غلیل میں ڈال رہا تھا۔

میرا غصہ آخری منزل پر جا پہنچا۔ میں اس کے سامنے تن کر کھڑی ہو گئی۔ ”تم پاگل نہیں۔ ایک جاہل اور سبک دہل انسان ہو..... میں..... تم.....“ اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر مجھے سختی سے چپ رہنے کا اشارہ کیا۔ میں چیخا چلا ناچا ہتی بلکہ اسے پتھر مارنے کی خواہش بھی شدید ترین ہوتی تھی لیکن پتا نہیں کیوں مجھے اس کی ”خش“ چپ کر ادیتی تھی۔

میں بے بسی سے اسے دیکھ رہی تھی۔ مجھے ماحول میں جس محسوس ہونے لگا۔ میں نے کشکول والے کو دیکھا تو میرے اندر ایک انجان سی خوشی دوڑ گئی۔ کشکول غالباً سلور یا اسٹیل کا تھا اس لیے ٹوٹنے سے بچ گیا تھا۔ وہ پھر سے کشکول میں قطرہ پانی جمع کرنے لگا مگر جیسے ہی کشکول میں تھوڑا پانی جمع ہوا، میرے خطی ہم سفر کی کینہ پرور فطرت پھر سے جاگ اٹھی۔ اس نے ایک بار پھر غلیل سے نشانہ لے کر پانی گرا دیا۔ کشکول والا شخص حیرانی سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا مگر اس کی نظر ہم پر نہیں پڑی۔ اس نے آسمان کی طرف دیکھا اور تیسری بار کشکول اٹھا کر پانی کے نیچے رکھ دیا مگر جب تیسری بار بھی غلیل کے چھوٹے سے پتھر نے اس کا کشکول گرایا تو وہ کشکول اٹھا کر ایک طرف چل پڑا۔ کچھ ہی دیر بعد وہ نظروں سے اوجھل ہو گیا۔

میں نے دیکھا جس شخص نے اس پر ظلم کے پہاڑ توڑے تھے وہ بے فکری اور ست روی کی چال چلتا ہوا اُن دیکھی منزل کی طرف روانہ ہو گیا۔ میرا جی چاہا اس کے بال نوچ لوں پیٹ میں زور زور سے کھونٹے ماروں اور اس کے دل و دماغ پر جی ظلم و جبر کی ساری کائی دھو ڈالوں۔ نہ جانے یہ لوگوں کو پیا سار کھ کر کون سی آسودگی حاصل کر رہا ہے۔ دوسروں کو بے جا تکلیف دینے اور اذیت پہنچانے میں اس پاگل شخص کے کس جذبے کی تسکین ہو رہی ہے؟ میں نے اسے عقب سے دیکھا وہ کسی کیڑے کی طرح رینگتا ہوا جا رہا تھا۔ میرا دل بہت اداس تھا۔ میرے ذہن کی سوئی کنویں اور کشکول کے درمیان جھکولے کھا رہی تھی۔ بہت آگے جا کر وہ رکا اور پلٹ کر مجھے دیکھا جیسے پوچھ رہا ہو چلتا ہے یا تیرے سفر کا انتقام ہو چکا؟

میں بادل ناخواستہ اس کے ساتھ چل پڑی۔ میں اسے غور سے دیکھ رہی تھی۔ اس کے دل میں محبت اور مروت نام کی کوئی چیز موجود نہیں تھی۔ شاید یہ انسانوں سے نفرت کرنے والا شخص ہے۔ ہو سکتا ہے ماضی میں وہ بھی کسی نفرت آمیز واقعے کا شکار ہوا ہو اور اب دوسروں سے انتقام لے کر آسودگی محسوس کرتا ہو۔ مجھے اب خیال آیا یہ سنگ دل اور بے رحم تو ہے ہی ایک لادین شخص بھی ہے۔ اس نے قبرستان جاتے وقت مجھے نماز پڑھنے سے بھی منع کر دیا تھا۔ اتفاق سے میں غنودگی میں چلی گئی اور نماز چھوٹ گئی تھی۔ میرے خیال کا پرندہ اڑتا ہوا قبرستان میں جا بیٹھا۔ اس شخص نے قبرستان میں پورے چھ دن بسر کیے تھے۔ ان چھ دنوں میں اس نے کیا کچھ تباہی مچائی ہوگی؟ میرے لیے اب یہ جاننا بہت ضروری ہو گیا۔

ہم نے قبرستان سے سفر شروع کیا تھا۔ جنگل پہاڑ میدان ریگستان اور کئی قسم کی خطرناک راہ گزروں کے بعد ہم اسی قبرستان تک پلٹ آئے۔ اسی قبرستان میں اس نے چھ روز بسر کیے تھے۔ قبرستان کے سامنے جھکے ہوئے خوشوں والے درخت کے سائے میں بیٹھ کر میں نے دنیا کی حسین و جمیل جگہ کا نظارہ کیا تھا۔ میرے لیے دنوں کا تعین کرنا مشکل تھا۔ ہم کتنے گھنٹے دن یا مہینے سفر میں رہے کچھ کہنا مشکل تھا کیونکہ راستے میں کئی بار تاریکی نے اجالے کو لٹکا اور کئی بار اجالے نے تاریکی کو کھٹکت دی۔

مجھے خیال آیا کہ میں اس بارے میں اپنے ہم سفر سے پوچھوں مگر دوسرے خیال نے اس کی نفی کر دی۔ خطی قسم کا ظالم شخص ہے نہ جانے کوئی معقول جواب دے گا جی یا نہیں؟

میں نے نظریں اٹھا کر آسمان کی طرف دیکھا۔ ابتدائے سفر کی طرح سورج سر کے عین اوپر تھا۔ گرمی کی شدت میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ میری خواہش تھی کہ آج پھر وہ قبرستان جائے اور میں جھکی ہوئی شاخوں کے سائے میں کچھ دیر کوستا

ہو سکتا ہے آج پھر اللہ تعالیٰ مہربان ہو جائے اور میں اس بار وقار اور وجہہ صاحب محل کا دیدار کر لوں۔ میں جانتی تھی آنکھوں کے خوبصورت سپنوں میں کھوئی ہوئی تھی مگر ایک بار پھر مجھے اس شخص نے چونکنے پر مجبور کر دیا۔ قبرستان کے نزدیک مشرقی جانب پانی کی بہت بڑی ٹنکی بنی ہوئی ہے۔ اس ٹنکی سے نزدیک کے تقریباً سو سے زیادہ ٹنکروں کو پانی سپلائی ہوتا تھا۔ ٹنکی اتنی بڑی تھی کہ اس کے پانی سے تین دن آرام سے نکل سکتے تھے۔ ہر تین دنوں بعد ٹنکی کو پھر اجاتا تھا۔ تین دن ٹنکی کو پانی کی سپلائی بند رہتی ہے۔ ٹنکی کو ابھی ابھی بھرا گیا تھا اور بھرنے کے بعد اس سے پانی گر رہا تھا۔ اس کا مطلب تھا کہ اگلے تین روز کے لیے پانی جمع ہو چکا ہے۔ اب تین دن لوگ پانی استعمال کریں گے۔

میرے چونکنے کی وجہ ظالم انسان کی ایک اور ناقابل فہم اور عقل کو دنگ کرنے والی حرکت تھی۔ وہ بڑی تیزی سے ٹنکی کی بیڑھیاں چڑھ رہا تھا۔ اس کی چال میں جتنی سستی تھی اس سے ہزار گنا زیادہ چڑھنے میں پھرتی تھی۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے اس کے پاؤں میں بجلیاں بھرنی ہوں یا موت کا فرشتہ اس کے پیچھے دوڑ رہا ہو۔

میں نے دل کر سوچا نہ جانے اب یہ ٹنکی پر چڑھ کر کیا گل کھائے گا؟ میں ابھی سوچ ہی رہی تھی کہ اس نے ٹنکی کو صاف کرنے والا بڑا گیٹ والو کھول دیا جس سے ٹنکی سے پانی پوری طاقت کے ساتھ نیچے گرنے لگا ساتھ ہی اس نے وہ ٹنکی بند کر دیا جس سے لوگوں کو پانی سپلائی ہو رہا تھا۔ میں نے ٹنکی کی جانب دوڑ لگا دی تاکہ سنگ دل انسان کی سنگ دلی کو لگام دے سکوں۔ یہ پانی تین دنوں تک سو گھروں کی ضروریات کو پورا کرے گا۔ اگر یوں ضائع ہو گیا تو لوگوں کے لیے یہ مصیبتیں کھڑی ہو جائیں گی۔

میں بہت تیز رفتاری سے بھاگ رہی تھی۔ غلٹ میں پاؤں سے جوتی اتر گئی تھی اور راستے کے کانٹوں سے پاؤں زخمی ہو رہے تھے مگر میں رک نہیں پوری طاقت سے بھاگتی رہی مگر میرے پیچھے سے پہلے ہی ٹنکی بالکل خالی ہو گئی۔

جب تک لوگوں کو اس بے رحم شخص کی حرکت کا پتا چلتا وہ اتر کر قبرستان میں داخل ہو گیا۔ میں حیران و پریشان زخمی پاؤں پر کھڑی سوچ رہی تھی۔ آخر اسے پانی سے کیا بھرے یا لوگوں کو دکھ اور ایذا پہنچانا اس کا مشغلہ ہے۔

میرے زخمی پاؤں سے درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں اور شدید گرمی کے سبب جسم پسینے سے شرابور تھا۔ دیکھتے ہی دیکھتے ہاں سینکڑوں لوگ جمع ہو گئے۔ وہ ایک دوسرے سے سوال پوچھ کر معاملے کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کر رہے تھے۔ مجھے اپنے آپ پر حیرت ہو رہی تھی کہ میں ان کے مجرم کے خلاف لب کشائی کی جرأت نہ کر سکی۔ میں دل میں اداسیاں سیٹے بال قدموں سے پلٹ آئی۔

مجھے اب قبرستان کے دروازے کے سامنے اس کا انتظار کرنا تھا۔ مجھے یقین تھا وہ ضرور آئے گا اور اس بار میرے آنے سے بچ نہیں پائے گا۔ میں اس کا گریبان پکڑ لوں گی اس کے منہ پر پتھر ماروں گی کپکپی کے سارے بال ہاتھوں سے ریز روں گی ہاتھ پاؤں کے ناخن منہ منہ لوں گی تاکہ اسے بھی احساس ہو کہ درد کیا ہوتا ہے۔ جب وہ خود دروازہ اذیت میں لگا ہوگا تو آئندہ کسی کو اذیت دینے سے باز رہے گا۔

میں ایک سایہ دار درخت کے ساتھ ٹیک لگا کے بیٹھ گئی۔ میری نظریں قبرستان کے دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔ اس بار کمانے دانستہ سونے کی کوشش نہیں کی کہ مبادا میرے سونے کے دوران وہ نکل جائے۔

جب وہ لوٹا تو میں پورے ہوش و حواس کے ساتھ جاق و چوبند اس کی منتظر گئی۔

میں نے اسے دیکھتے ہی انتہائی غصے میں کہا۔ ”اب دو صورتیں ہو سکتی ہیں حقیقت بتایا پھر مرنے کے لیے تیار ہو جا۔ میں اُن سینکڑوں لوگوں کو بتا دوں گی جو ٹنکی کے پاس جمع ہیں کہ یہی وہ بے رحم شخص ہے جس نے تم لوگوں کی بربادی کا سامان کیا ہے۔“

میری بات سن کر پہلے تو اس نے بلند قہقہہ لگایا پھر سنجیدگی سے بولا۔ ”میری چیل ٹوٹ گئی ہے۔ اب میں بری الذمہ ہوں۔“

اس کی بات سن کر میں نے زور زور سے آنکھوں کو دائیں بائیں گھمایا اور پلکیں جھپکائیں مگر میری آنکھ کا شیشہ ابھی ٹیکس ٹوٹا ہے اس لیے میں بری الذمہ نہیں ہوں۔ وہ کر دکھاؤں گی جو کہا ہے اور صرف ان لوگوں کو خبردار نہیں کروں گی

جنہوں نے کنواں کھودا تھا بلکہ وہاں جمع ہونے والے لوگوں کو بھی بتادوں گی اور کھول دالے کو بھی پکڑ لاؤں گی پھر پھر
تمہارا کیا انجام ہوگا؟ لوگ تمہاری بوٹی بوٹی نوچ ڈالیں گے۔

”مکھنٹی.....!“ میری بات سن کر اس نے کہا۔ ”تو نہیں سدھرے گی۔“
میں نے پہلی بار اس کے منہ سے اپنا نام سنا تھا۔ اس بار اس کی آواز بھی بدلی ہوئی تھی۔
وہ کہہ رہا تھا۔ ”اچھا چل نماز پڑھ لے پھر بتاتا ہوں۔“

میں نے نظریں اٹھا کر سورج کو دیکھا۔ ”لگتا ہے ظہر کی نماز کا وقت ہو چکا ہے۔ اب پانی کہاں سے لاؤں؟ سارا پانی
تو تم نے بہا دیا ہے۔“ میں بھنا کر بولی۔
”تیم کر لے۔“ اس نے بے فکری سے کہا پھر میری طرف بغور دیکھ کر بولا۔ ”تیم کے بارے میں کچھ جانتی بھی
ہو؟“

”اتنی جاہل نہیں ہوں۔ تیم کا مطلب ہے ارادہ کرنا۔ شرعی اصطلاح میں پاک مٹی یا مٹی کی قائم مقام کسی پاک چیز
سے پاکیزگی حاصل کرنے کو ”تیم“ کہتے ہیں۔ پانی میسر نہ ہو تو بدلے میں پاک مٹی سے غسل یا وضو کی نیت سے تیم کیا
جاتا ہے۔ اس کی اجازت ۵ھ میں اس وقت دی گئی جب غزوہ بنی المصطلق کے موقع پر ام المومنین عائشہ رضی اللہ عنہا کا ہار
تلاش کرنے میں لوگوں کو بہت دیر ہو گئی اور پانی کا سارا ذخیرہ ختم ہو گیا، بھی تیم کی اجازت نازل ہوئی تھی۔ قرآن مجید
میں دو مقامات پر تیم کا ذکر آیا ہے۔ اور سناؤں یا کافی ہے؟“

”سناؤ قرآن وحدیث کی باتیں جتنی ہار سنی جائیں ایمان تازہ ہوتا ہے۔“ اس کے منہ سے ایسی بات سن کر مجھے
حیرت کا جھٹکا لگا۔

”اچھا سنو قرآن کے پارہ نمبر ۶ میں ارشاد ہوا ہے۔“ اور اگر کبھی ایسا ہو کہ تم بیمار ہو یا سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی رنج
حاجت کر کے آئے یا تمہیں غسل کی حاجت ہو اور پانی نہ ملے تو پاک مٹی سے کام لو اور اس سے اپنے چہروں اور ہاتھوں پر
مسح کر لو۔ بے شک اللہ تعالیٰ نرمی سے کام لینے والا ہے اور بخشش فرمانے والا ہے۔“
میری بات سن کر اس نے آنکھیں موند لی تھیں۔

میں نے زمین پر بیٹھ کر تیم کیا اور نماز کی نیت کی۔ نماز سے فارغ ہوئی تو وہ درخت کے تنے سے ٹیک لگائے بیٹھا ہوا
ملا۔ ”آپ نے نماز پڑھ لی؟“ میں نے پوچھا۔

”ہاں پڑھنے میں تم سے کچھ تیز ہوں۔“
”یہی جگہ ہے جہاں آپ نے مجھے نماز پڑھنے سے منع کیا تھا مگر آج خود پڑھنے کو کہا ہے۔ میں آپ کو سمجھ نہیں پاتی۔“
”میں نے سوچا تھا تمہیں نماز پڑھنا آتی نہیں تو کیسے پڑھو گی؟ پہلے نماز سیکھ لو۔ آج سوچا آڑا کے دیکھ لوں۔“
”پھر کیا فیصلہ کیا؟“

”میں غلطی پر تھا۔ بشر ہوں نا! غلطی کا پتلا۔ تم نے واقعی نماز پڑھی ہے۔“
”میں قبرستان میں گزرے چھ دنوں کا احوال سننے کے لیے بے چین ہوں۔“ میں نے کہا۔

”وہ باتیں گزر راکھ ہو چکی ہیں۔ کچھ اور بات کرو۔ آج میرے آرام کا دن ہے۔ کل سے پھر سفر شروع ہو جائے
گا۔“

اس نے ایک نظر غور سے مجھے دیکھا۔ درخت کی شاخیں آہستہ آہستہ لہرا رہی تھیں۔ درخت کے نیچے ٹھنڈی چھاؤں
تھی مگر باہر دھوپ کی شدید تابش تھی۔

اس نے دھوپ پر نظریں جماتے ہوئے پوچھا۔ ”دو ہڈیاں کر اس میں رکھ کر ان کے بیچ میں انسانی کھوپڑی ثبت کر دی
جائے تو کس چیز کی علامت بنے گی؟“

”موت یا پھر خوف و ہراس کی۔“ میں نے حیرت سے جواب دیا۔
”ان ہڈیوں اور کھوپڑیوں کے ساتھ اگر 322 اور 666 کے ہند سے دیکھو تو کیا محسوس ہوتا ہے؟“

”دونوں ہند سے شیطانی اثرات کے حامل ہیں۔ میرے خیال میں موت اور شیطانی کام یکجا ہو جائیں تو ایک
نیری تباہ کن چیز وجود میں آ جاتی ہے۔ کسی جانور مثلاً بیل اور بکرے کے دو سینک الو کے کان دیکھو تو پھر کیا تاثر لیتی
ہو؟“

”عموماً ڈراؤنی مخلوق مثلاً آسیب بھوت یا جنات سے منسوب کی جاتی ہیں۔ آسان الفاظ میں یہ بھی دہشت اور
خوف کی علامت ہی ہوں گے۔“ میں نے اس کے سوالوں پر الجھ کر کہا۔ ”نماز پڑھنے کے بعد سمجھدار ہو گئی ہو۔ اب یہ بتاؤ
شہر خ کی بساط کے نشانات کا کچھ علم ہے؟“
”ڈبل اسکوئر؟“

”ہاں!“
”ڈبل اسکوئر یعنی دو رنگی چیزیں تو ترنمین و آرائش کے لیے استعمال ہوتی ہیں۔ سفید اور سیاہ خانوں کی چوکور ٹائلیں
مسجدوں، فاسٹ فوڈز اور بہت سے ریسٹورنٹس پر نظر آتی ہیں بلکہ سفید اور سبز دورنگی ٹائلیں اکثر مزارات کی خوبصورتی کے
لیے بھی لگائی جاتی ہیں۔ ہاں البتہ انہیں دیکھ کر اکثر میرے اندر تجسس کا پرندہ پھڑپھڑاتا ہے مگر آج تک اسے کوئی واضح
بیت نہیں دے سکی۔“

”سمجھو تمہارے تجسس کے پرندے کو آج آزادی ملنے والی ہے مگر ابھی رکو پہلے ایک اور بات بتاؤ۔ کبھی آگ کو غور
سے دیکھا ہے اس کے شعلوں پر دھیان دیا ہے؟“
”ہاں ایک بار نہیں ہزاروں بار کیونکہ آگ سے ہمارا یعنی مسلمانوں کا گہرا ربط ہے۔“
”تو پھر تم نے آگ سے کیا سیکھا کیا پایا اور کیا محسوس کیا؟“

”آگ بے وقافتہ چیز کا نام ہے جس کے اندر انتہا کا غرور پنہاں ہے۔ آگ کی فطرت میں جلانا ہے چاہے سامنے اس
کا بجاری ہی کیوں نہ ہو آگ ہر صورت میں خود کو منواتی ہے آگ سے جنات بنے ہیں اور آگ سے ہی شیطان بنا ہے
شیطان نے غرور میں آ کر ہی سجدے سے انکار کیا تھا۔ جہنم میں بھی خوف ناک آگ نافرمانوں کے لیے دھک رہی ہے۔
آگ ان چند چیزوں میں شامل ہے جنہیں دنیا میں بہت سے فرقے پوجتے ہیں۔“

”بہت خوب! میں تو تمہیں ایک عام سی لڑکی سمجھتا تھا مگر تم نے ثابت کر دیا، تم وہ نہیں ہو جو نظر آتی ہو۔ اس سے ثابت
ہوا کہ ہماری نظر جو دیکھتی ہے ضروری نہیں کہ وہ ہماری ہونے والا ہر اجڑا اور جاہل نظر آنے والا شخص ان پڑھ نہیں ہوتا۔ تمہاری
باتیں سن کر میرا دل چاہتا ہے کہ ہندوؤں کے بارے میں پوچھوں۔ یقیناً تمہیں ان کا بھی علم ہوگا۔“

”ہندوؤں کے بارے میں میں نے بہت سوچا کہ ہم، بسم اللہ الرحمن الرحیم کو ہندوؤں میں ۸۶ کے کسی قاعدے کے تحت
لکھتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ کے پاک اسم مبارک کو ۳۳۶ میں کیسے سویا جاتا ہے؟“
”ان پر اسرار ہندوؤں کے بارے میں جانتی ہو جو دنیا کو تہہ وبالا کر دیتے ہیں؟“ اس نے پوچھا۔
”نہیں مجھے ان کے بارے میں کوئی علم نہیں۔“ میں نے کہا۔

”666 کا ہندسہ 322 کا 13 اور 33 کا ہندسہ یہ وہ ہند سے ہیں جنہیں مختلف مقامات پر جادوگر اور شیطان کے
بجاری قسم کے عامل غلط کاموں کے لیے استعمال کرتے ہیں۔“ اس نے جواب دیا۔

”میں آپ کے تمام سوالات کا مقصد سمجھ نہیں پاتی؟“
”بتاتا ہوں یہاں میرے پاس بیٹھ جاؤ جہاں ٹھہری ہو وہاں دھوپ آگئی ہے۔“ اس نے کہا۔

”ٹھیک ہے۔“ میں اس کے قریب بیٹھ گئی۔
”آج سے اٹھائیس دن پہلے میرے پاس ایک بد حال اجڑی ہوئی عورت آئی۔“ اس نے کہا۔ ”وہ چلیے سے غریب
اور مسکین لگتی تھی۔ چہرے سے پریشانی اور باتوں میں تشویش کا عنصر نمایاں تھا۔ میں نے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ ”بی
بی! آرام سے بیٹھ جاؤ اور سکون سے بات کرو۔ تمہیں کیا پریشانی ہے مجھے پوری بات مبرجمل سے بتاؤ؟ اللہ تعالیٰ نے چاہا
تو مہربان ٹھیک ہو جائے گا۔“

میری حوصلہ افزائی کے باوجود ابتدائی چند منٹ وہ روتی رہی۔ دل کا بوجھ کچھ ہلکا ہوا تو بولی۔ ”میری ایک ہی بیٹی ہے۔ اس کے علاوہ نہ کوئی آگے ہے نہ پیچھے۔ تین سرے کا چھوٹا سا مکان ہے۔ بیٹی اسکول میں کام کرتی ہے اور میں اس کے لیے اپنی بساط کے مطابق جہیز تیار کرتی رہتی ہوں۔ بیٹی کو پندرہ سولہ سو ماہانہ مل جاتے ہیں جس سے ہماری زندگی کی گاڑی بہت اچھے طریقے سے چل رہی ہے۔“

میں کچھ دن سے محسوس کر رہی تھی کہ زیب النساء میں ایک نامانوس سی تبدیلی آتی جا رہی ہے۔ وہ پہلے کی طرح جات و چو بند نہیں رہی، کام سے آ کر گھر کے کاموں میں میرا ہاتھ نہیں بٹاتی اور چپ چاپ اور پریشان پریشان کی رہتی ہے۔ اکثر سردی کی وجہ سے افیت میں جٹلا رہے گی۔ دو تین بار ڈاکٹروں کو دکھایا مگر کوئی افادہ نہ ہوا۔

میں اس کی حرکات و سکنات پر دھیان رکھے ہوئے تھی پھر عجیب و غریب حرکتیں کرنے لگی۔ کبھی مجھے محسوس ہوتا وہ کسی سے باتیں کر رہی ہے مگر آس پاس کوئی ذی روح موجود نہیں۔ پہلے اسے وہم سمجھ کر میں نظر انداز کر گئی مگر ایک دن دھیان دینے پر پتا چلا کہ وہ واقعی کسی سے باتیں کر رہی ہے۔ میں باتوں کا مفہوم نہ جان پائی۔ وہ عجیب و غریب زبان میں باتیں کر رہی تھی۔ میں اس کے بارے میں پریشان رہنے لگی۔

پھر ایک دن میرا دماغ چکر اکر رہ گیا۔ میں گھر میں تھی اور دروازہ اندر سے بند تھا۔ زیب النساء باہر گئی ہوئی تھی۔ نہ دروازے کی آہٹ ہوئی نہ کوئی کھٹکا ہوا مگر میں کمرے میں گئی تو زیب النساء چار پائی پر لیٹی ہوئی تھی۔ میں حواس باختہ حالت میں چو کھٹ پکڑ کر رہ گئی۔ مجھے دیکھ کر وہ بولی۔ ”اماں! ابھی ابھی کام سے لوٹی ہوں۔ آج بہت تھک گئی ہوں۔ میں حیرت سے گنگ ہو گئی تھی۔ چھوٹے سے محن میں میری نظروں سے اوجھل ہو کر وہ کمرے میں کیسے اور کب پہنچی؟

اس سے اگلی رات بچھلے واقعے سے زیادہ خوفناک اور روٹنے کٹنے کڑے کر دینے والا واقعہ پیش آیا۔ زیب النساء چار پائی کے وسط میں آنکھیں بند کئے بیٹھی ہوئی تھی۔ دونوں ہاتھ سینے پر نماز کی طرح باندھ رکھے تھے۔ میں اس کی عجیب و غریب کیفیت سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی مگر جو کچھ ہو رہا تھا وہ میری سمجھ سے باہر تھا۔ زیب النساء کی کھوپڑی کا آدھا حصہ نی پوٹ (Tea pot) کے ڈھکن کی طرح اوپر اٹھا جس طرح کیتلی سے گرم گرم چائے کی بھاپ اڑتی ہے اسی طرح اس کی کھوپڑی سے گرم گرم بھاپ اڑ رہی تھی۔ اس خوفناک اور دہشت زدہ منظر نے میرے اوسان خطا کر دیے۔ میں سکتے میں رہ گئی۔ میں نے چیخنے کے لیے منہ کھولا مگر میرا چہرہ سرسبیت کی بہت بڑے ہاتھ میں دب گیا۔ میری چیخ قلع میں ہی دب گئی۔ یہ معمر میری سمجھ سے بالاتر تھا۔ میں دیکھ اور سن سکتی تھی مگر بولنا ناممکن تھا۔“

”اماں! تیری بیٹی زیب النساء انتہائی خوب صورت اور حسین و جمیل لڑکی ہے۔“ میرے کانوں سے ایک مردانہ آواز نکرائی۔ آواز میں دھیما پن اور نرمی واضح تھی۔ ”یہ وہ پھول ہے جس کی خوبصورتی کا مالی کو بھی اندازہ نہیں۔ اس کے حسن کے سامنے پھول و چمن، گل پوش وادیاں اور پہاڑیاں آبشاریں اور جھرنے چاند اور ستارے سارے منظر سارے نظارے سب بچھ ہیں۔“

میں حیرت سے بیٹی کے حسن کی تعریف سن رہی تھی۔ ”زیب النساء کا جسم گلابوں اور خوابوں کی طرح ہے۔ چمکتی روشن آنکھیں جیسے سورج کی سنہری کرنیں جیسے پورے چاند کی دودھیا چاندنی، مہکتا، دھکتا چہرہ! آج سے زیب النساء تمہاری بھی ہے اور ہماری بھی۔ یہ جب تک ہماری رہے گی تب تک تمہاری رہے گی۔ جس دن ہمارے دائرے سے نکل گئی نہ تمہاری رہے گی نہ ہماری رہے گی۔“

میں جواب میں کچھ کہنے سے قاصر تھی۔ میرا پورا چہرہ ایک مضبوط شکنجے میں جکڑا ہوا تھا۔ زیب النساء کی کھوپڑی کا ڈھکن پھر سے بند ہو گیا۔ ساتھ ہی میرا چہرہ بھی شکنجے سے آزاد ہو گیا۔ میں حواس باختہ انداز میں اٹھ کر زیب النساء کے پاس پہنچی۔ وہ سکون کے ساتھ سو رہی تھی۔ میں نے پاگلوں کی طرح ٹٹول کر اس کا سر دیکھا پھر پورے بدن پر ہاتھ پھیر کر اس کے صحت سلامت ہونے کا یقین کیا۔ زیب النساء روز کی طرح گہری نیند سو رہی تھی۔ میں نے پانی پی کر خشک گلے کو تر کیا اور دوپٹے سے پیٹا پونچھا۔ بقیہ رات میں نے آنکھوں میں گزاری دی۔

صبح زیب النساء بالکل ٹھیک تھی مگر اس کے بعد مسلسل وہ عجیب و غریب الجھنوں میں الجھ کر رہ گئی ہے۔ مجھے لگتا ہے وہ

میری اکلوتی بیٹی دھیرے دھیرے مجھ سے ہی نہیں زندگی سے بھی دور ہوتی جا رہی ہے۔ میں بڑی آس لے کر آپ کے پاس آئی ہوں۔“

”بی بی! ایک بات کان کھول کر سن لو اور اس پر عمل کرو۔ رسول اکرم ﷺ نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے فرمایا۔ ”جب مانگو تو اللہ سے مانگو اور جب مدد طلب کرو تو اللہ سے طلب کرو۔ تم گھر جاؤ۔ اللہ تعالیٰ نے جاہا تو تمہارا مسئلہ حل ہو جائے گا۔“ وہ چلی گئی اور میں اپنے مشن پر چل نکلا۔ میری منزل قبرستان تھی۔ سب سے پہلے میں نے ایک ڈھیر سے مٹی بھر سرمہ اٹھایا۔ تمہیں یاد ہے اسی راستے میں تم مجھے ملی تھیں؟“

”جی یاد ہے۔“ میں نے جواب دیا۔

”میں نے تمہیں نماز پڑھنے سے اس لیے منع کیا تھا کہ وہ غروب آفتاب کا وقت تھا۔ طلوع اور غروب آفتاب کے وقت نماز پڑھنا منع ہے۔ یہ دونوں شیطان کے وقت ہوتے ہیں۔ وہ سمندر میں ڈیرے ڈال کر بیٹھ جاتا ہے جیسے کوئی شہنشاہ ہو۔ سورج کے پجاری جب سورج کی پرستش کرتے ہیں اور اسے سجدہ کرتے ہیں تو شیطان اپنے خیال میں گمان کرتا ہے کہ اس کی پرستش کی جا رہی ہے اور لوگ اسے سجدہ کر رہے ہیں۔“

”مگر مجھے یاد پڑتا ہے وہ دن چڑھنے کا وقت تھا غالباً ظہر کی نماز کا؟“ میں نے سوچتے ہوئے کہا۔

”نہیں، تمہیں ایسا لگ رہا تھا حالانکہ ایسا تھا نہیں۔“

”آپ قبرستان میں کیوں گئے تھے؟“ میرے اندر بے پناہ تجسس تھا۔ میں سمجھ گئی یہ شخص جیسا نظر آتا ہے ویسا ہے نہیں۔

”قبرستان میں ایک تازہ قبر کے اندر جادوئی عمل ہو رہا تھا۔ میں اس کے توڑ کے لیے وہاں گیا تھا۔“

میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔ ”میرا تازہ قیاس درست نکلا۔ میں نے اسے سمجھنے میں غلطی کی تھی۔ تم نے مجھے علم نجوم اور جادوئی نشانیوں کے بارے میں بالکل ٹھیک ٹھیک جواب دے کر مجھے حیران کر دیا ہے۔ جس طرح تم نے مجھے بے رحم اور سنگ دل انسان سمجھا اسی طرح میں نے تمہیں ایک عام سی لڑکی سمجھا مگر ہم دونوں ہی غلطی پر ہیں۔ نظام ربی میں جیسے معتبر اور پاک اسمائے گرامی کو لکھا اور پڑھا جاتا ہے۔ اسی طرح جادو گروں کے کچھ مخصوص ہندسے جادوئی کرامات کے استعمال ہوتے ہیں۔ کھوپڑی، ہڈیاں، شطرنج کی بساط، آگ وغیرہ جادو گروں کے مشہور ہتھیار ہیں۔ ہندسوں میں 666 سب سے اہم اور مشہور ہے۔ اس کے ساتھ 322، 13 اور 33 کے ہندسے بھی ان کے لیے بڑے کارآمد ہیں۔ آج کل بین الاقوامی سطح پر ان ہندسوں اور مذکورہ اشیاء کو ایک خاص مقصد کے لیے استعمال کیا جا رہا ہے۔“ اس نے کہا۔

”میں کچھ کہنا چاہتی ہوں۔“

”بولو!“

”آپ کی باتوں نے میرے ذہن میں کھلبلی مچا دی ہے۔ میرا ذہن بین الاقوامی شاہراہ پر تیز رفتاری سے جا گئے لگا ہے اور میں برطانیہ کا پونڈ الٹ کر دیکھتی ہوں اس پر 666 کے ہندسے کی شبیہ دکھائی دیتی ہے۔ آگے بڑھتی ہوں تو امریکا کا انتہائی اہم ادارہ انسٹیٹ آف ڈیپارٹمنٹ کے مونو گرام میں 13 کا عدد بہت اہمیت کا حامل نظر آ رہا ہے۔ مجھے لگتا ہے عقاب اور ستارے بھی ان کی پہچان ہیں۔ یہاں عقاب کے ایک پنجے میں تیرا اور دوسرے میں 13 ہے ہیں اور تیروں کی تعداد بھی 13 ہے۔ اس طرح 13 ہی ستارے ثبت کیے گئے ہیں۔ یہاں سے زمین کو واپس دنیا کے چکر کے لیے آزاد چھوڑتی ہوں تو ہزاروں ملکی مشینیں کپنیوں کی ہزاروں مصنوعات پر 666 کی نہ کی حالت میں نظر آتا ہے۔“

”انتا تیز مت دوڑو مہنسی!“ اس نے کہا۔ ”زیادہ اڑو گی تو پر جل جائیں گے۔ اس طرح موازنہ کرنے سے بات بہت دور نکل جائے گی۔ بہت سی باتیں آج کے مسلمان اہل علم افراد کے لیے باعث فکر اور قابل غور ہیں۔ اہل علم حضرات کو آج کے حالات و واقعات پر انتہائی گہری نظر رکھنا ہوگی۔“ اس نے تشریح سے کہا۔

”آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں میں نے کئی بار دیکھا اور اس پر غور کیا ہے۔ ہمیں بہت سی چیزیں ایسی جگہ نظر آتی ہیں

جن کی یہ ظاہر وہاں ضرورت نہیں ہوتی۔ آگ، سانپ، شیطان کے دو سنگ، یہودیوں کی پہچان چھ کونوں والا ستارہ، الو کے کان یا اس کی تصویر، دجال کی ایک آنکھ، عجیب الخلق جانور کی شبیہ، کھوپڑی اور ہڈیاں، ڈبل اسکوئر، شیطانی جادوئی ہندسے، ان اشیاء کو میں نے بھی پی کیپ میں دیکھا، بچوں اور بڑوں کی ٹی شرٹس پہ دیکھا، سونو گرامز اور اشتہارات میں نظر آئے، یہ شیطانی چیزیں اور نشانات ہمارے اندر کسی نہ کسی طرح سرایت کر چکے ہیں۔ میں نے کہا: ”تم واقعی خاص الخاص لڑکی ہو۔ اتنی گہرائی تک مشاہدہ کرنا اور سوچنا تمہیں دوسروں سے منفرد بناتا ہے۔“ اس نے تو صغی انداز میں کہا۔

”میں اور بھی بہت کچھ سوچتی ہوں، بس میری آنکھ کا شیشہ ٹوٹنا چاہیے، جس دن یہ ٹوٹ گیا، میں دنیا کی تقدیر بدل دوں گی۔“

”ایک مہینہ دو دن ہو چکے ہیں۔ ہم ایک ساتھ رہ رہے ہیں مگر ابھی تک تم میرے نام سے لاعلم ہو۔“

”آپ نے بتایا کب ہے؟“

”نام تو تم نے بھی نہیں بتایا، مگر مجھے تمہارا نام معلوم ہے۔“

وہ تو جب میرے سر پر کائنات آن گری تھی، میرا سرمہ بننا تھا تو لوگ میرا نام پکارتے ہوئے میری طرف آ رہے تھے۔ آپ نے بھی سن لیا ہوگا، آخر آپ نے بھی میرے اس ڈھیر میں سے مٹی بھر سرمہ اٹھایا تھا۔ میں نے کہا۔

”میرا نام عبد اللہ ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”آپ جادوئی عمل کی بات کر رہے تھے؟“ میں پھر اسی موضوع پر آ گئی۔

”ہاں، قبر میں جیلے نوجوان کا جسدِ خاکی دفن تھا جسے قبر سے نکال کر اوپر زمین پر دھریا گیا تھا۔ قبر میں ایک شیطان صفت عامل بیٹھ کر جادوئی ہتھیاروں سے اپنے سفلی عملیات میں مگن تھا۔ قبر میں اس کے سامنے کراس میں دو ہڈیاں، بکرے کی سری، شطرنج کی بساط پر 666 کے ہندسے اور کچھ دوسری پر اسرار اشیاء پڑی ہوئی تھیں۔ قبر کے دو تین میٹر کے فاصلے پر آگ جل رہی تھی۔ جب میں وہاں پہنچا تو اس شیطان کو پتا چل گیا کہ اس کے کام میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے کوئی اور بھی قبرستان میں موجود ہے۔ یہ شخص جادوؤں کا ماہر عامل تو تھا ہی، اس کے قبضے میں بہت سے مشرک، شاطر و عیار، غیر مسلم جنات بھی تھے۔ ایک شریر اور ظالم جن نے مجھ پر حملہ کروایا مگر میں پہلے ہی اپنے گرد حصار بنا چکا تھا۔ جن حصار کے باہر زخمی سانپ کی طرح پھنکارتا، سر پٹختا رہا، چھ دن میری اور شیطان صفت عامل کی جنگ جاری رہی۔“

وہ بول رہا تھا اور میں سن رہی تھی۔ وہ پرت در پرت مجھ پر کھل رہا تھا اور میں شرمندگی سے دہری ہوئی جا رہی تھی۔

وہ بات جاری رکھے ہوئے بولا۔ ”ماجرہ کچھ یوں تھا کہ زیب النساء جب اسکول میں کام کرتی تھی، وہاں اسفرناہی ایک ٹیچر ہے، اسفر کا کردار انتہائی داغ دار ہے، خصوصاً چھوٹے بچوں کے معاملے میں۔ اسفر زیب النساء سے شادی کا خواہاں ہے اور زیب النساء نے اسے ہر قدم پر دھکا رہا ہے۔ اسفر کی فطرت میں کینہ، بغض اور کینہلی ہے۔ اس کا پیشہ انتہائی معتبر مگر حرکات انتہائی گھٹیا ہیں۔ جب زیب النساء نے اسے ہر قدم پر دھکا دیا تو اس نے زیب النساء کو جادو کے ذریعے حاصل کرنے کے لیے عامل سے رابطہ کیا۔ عامل نے زیب النساء کے پیچھے جن چھوڑ دیا جس کا مقصد زیب النساء سے اپنی بات منوانا تھا۔ اس کی بات اسفر سے شادی تھی۔ بصورت دیگر جن نے خود اس سے شادی رچانا تھی۔ میں نے اللہ تعالیٰ کے خاص فضل و کرم سے قرآنی آیات کے ذریعے چھ دنوں میں انہیں شکست فاش سے دو چار کیا مگر وہ انتہائی ضدی اور دنیا میں شر پھیلانے والا جن تھا، اس نے مجھے چیلنج کر دیا کہ تم نے ایک گھر بچایا ہے، میں ایسے سیکڑوں گھر تباہ و برباد کر دوں گا۔ میں تمہاری دنیا میں موت کا قص رچاؤں گا اور تم لوگ بے بسی سے دیکھتے رہ جاؤ گے۔ میں تین پانیوں کو زہر آلود کروں گا۔ بچا سکتے ہو تو انہیں بچالو۔“

وہ تھوڑی دیر خاموش رہا۔ میں بے تابی سے اس کے بولنے کی منتظر رہی۔ وہ کچھ دیر کے بعد بولا۔ ”بس اس نے تین پانیوں کو زہر آلود کرنا تھا اور میں نے انہیں بچانا تھا جو کنواں بستی والوں نے کھودا تھا، اس کا پانی زہر آلود تھا۔ میں نے کنواں بھر دیا ورنہ آج وہاں قبرستان ہوتا۔ ایک کنواں بھر گیا تو انہوں نے دوسرا کھود لیا۔ کسکول والا شخص جو پانی بھر رہا تھا، وہ بھی زہر آلود تھا۔ میں نے اسے بچانے کے لیے بار بار کسکول گرایا۔ اگلی موڑ پر پانی کا ٹھنڈا بیٹھا چشمہ گر رہا تھا جس سے نہ صرف اس شخص نے خود سیراب ہو کر پانی پیا بلکہ اپنی ماں کو بھی پلایا اور سامنے دیکھو، تمہیں ٹنگی نظر آ رہی ہے نا؟“

میں نے وہاں دیکھا، ٹنگی کو پھر سے پانی سے بھرا جا رہا تھا۔

”یہ بھی زہر آلود تھا، تین پانیوں کی بندھی۔ میں نے اللہ کے فضل سے توڑ دی۔“ عبد اللہ نے طویل سانس لے کر کہا۔

”کیا وہ جن دوبارہ ایسا کچھ نہیں کرے گا؟ ان پانیوں کو پھر سے زہر آلود کر سکتا ہے؟“ میں نے تشویش سے پوچھا۔

”دنیا میں جتنی بھی مادی طاقتیں ہیں، ان کی طاقت کی ایک حد مقرر ہے۔ حد سے تجاوز ہونا ان کے بس سے باہر ہے اس لیے اس کی حدود ہیں تک محدود تھی۔“

میں نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیے۔ ”ممکن ہو تو مجھے معاف کر دیں۔ میں نے آپ کو سراسر غلط سمجھا اور بہت برا بھلا کہا۔“

”اس میں ہمارا کوئی قصور نہیں ہے، انسان کا کام ہے بھول جانا، غلطی کرنا، بس اپنی غلطی پر نادم ہونا اور معافی مانگنا اعلیٰ ظرفی ہے۔ اب میرے اگلے سفر کا وقت ہونے والا ہے۔“ عبد اللہ نے آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”ایک مہینہ دو دن دیے ہیں تو چند پل مزید دے دیں۔ میرے اندر چند سوالات ہیں جو اندر ہی اندر مجھے ڈرتے رہتے ہیں۔“

”پوچھو!“ اس نے میری طرف پر خیال انداز میں دیکھا۔

”بلاول مجھ سے پوچھتا ہے کہ تمہارا اللہ کہاں ہے؟ دلیل سے پیش کرو۔ میں نے سکھاں کو کچھ دلیلیں دی تھیں، بلاول کو بھی دیں، وہ مطمئن نہیں ہوا لیکن سکھاں مان گئی تھی۔“ میں نے کہا۔

”تم نے سکھاں کو کمزور دلیلیں دی تھیں۔ بے چاری ان پڑھ ہے، جلد مان گئی۔ اگر بلاول کی طرح رد کر دیتی تو تم کیا کرتیں؟“

”مجھے کیا کرنا چاہیے؟“ میں نے پوچھا۔

”اللہ تعالیٰ کہتا ہے مجھے شواہد اور دلائل سے نہ پہچانو، مجھے عشق سے پہچانو۔“

”امام رازی سے شیطان نے پوچھا۔“ اللہ تعالیٰ ہے؟“

”جواب دیا۔“ ہاں، ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گا۔“

”ثابت کرو۔“

امام رازی دلیلیں دینے لگے۔ ایک دلیل دی۔ شیطان نے رد کر دی۔ دوسری تیسری، چوتھی حتیٰ کہ سو دلیلیں دے چکے۔ شیطان نے تمام کی تمام رد کر دیں۔ امام رازی کو پسینہ آنے لگا۔ امام رازی کوئی عام شخص نہیں تھے۔ جی ہاں، مجھے پتا ہے، امام فخر الدین رازی۔ آپ کے والد محترم ضیاء الدین ابوالقاسم اپنے شہر کے خطیب تھے اس لیے ابن الخطیب کے نام سے بھی جانے جاتے تھے۔ امام رازی مسلمانوں میں مشہور ترین عالم دین، صفر اور فلسفے کے علم میں باکمال اور بے نظیر تھے! آپ ”رے“ میں پیدا ہوئے۔ مختلف مقامات کا سفر کیا کیونکہ سفر علم میں اضافہ کرتا ہے۔ خوارزم، ماورائے نہر، بخارا، شرق و اور علم کا بڑا حصہ ہرات میں گزرا۔ فخر الدین رازی نے ۱۱۸۴ء میں بوعلی سینا کی ”کلیات“ کی شرح لکھی۔ سلطان غیاث الدین کے حکم پر شاہی محل میں عوام کے لیے مدرسہ کھولا۔ جب ہرات میں مقیم تھے تو انہیں شیخ الاسلام کا لقب ملا۔ اسی دور میں آپ کے ہم رکاب تین سو سے زائد شاگرد رہتے تھے۔ آپ نے فلسفے میں خاص مہارت حاصل کی۔ ذکاوت، ذہانت، بہترین حافظے اور فکر و عمل میں آپ کا کوئی ثانی نہ تھا۔ حد درجہ متقی اور پرہیزگار تھے۔ امام رازی نے اپنی وصیت میں لکھا۔ ”میں نے علم کلام کے تمام طریقوں اور فلسفے کی تمام راہوں کو آزمایا لیکن میں نے ان میں اطمینان نہیں پایا۔ نہ مجھے

ان سے سکون قلب حاصل ہوا۔ یہ دولت مجھے تلاوت قرآن مجید سے ملی۔“
 رازی نے ابن سینا کی ”اشارات“ کی شرحیں لکھیں۔ فلسفہ اور مسائل دین میں قطبین کی خاص صلاحیت رکھتے تھے۔ آپ کی تصنیفات کی فہرست طویل ہے۔ ان تصنیفات کا تعلق کلام، فلسفہ فقہ اور تفسیر سے ہے۔“
 ”مکھنئی اتم پر حیرت ہے۔“ عبد اللہ نے کہا۔ ”اتنا کچھ جانتی ہو پھر بھی اللہ تعالیٰ پر دلیلیں مانگتی ہو؟ اسے پوچھنے فلسفی اہل علم ذہن، فہیم شخص نے سو دلیلیں پیش کیں مگر شیطان نے ساری رد کر دیں اس لیے منطق کے ذریعے شاید باطل فلسفے کو اعلیٰ و ارفع مقام پر پہنچانے والے امام رازی مدلل انداز میں شیطان کو قائل نہ کر سکے۔“
 شہاب الدین سہروردی وضو کر رہے تھے مسح کرنے کے لیے پانی لیا پھر پانی سانے کی دیوار پر پھینکتے ہوئے تاسف سے کہا۔ ”ہائے وقت کا امام خطرے میں ہے۔“
 ”اوہ!“ میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

اس نے میری طرف نظریں اٹھا کر دیکھا۔ ”شہاب الدین سہروردی کے بارے میں بھی کچھ جانتی ہو؟ شہاب الدین سہروردی بہت بڑے بزرگ تھے۔ تمہیں یہ جان کی حیرت ہوگی کہ انہیں سزائے موت ہوئی تھی۔ وہ شیخ الاشراق کے نام سے مشہور تھے۔ حکمت الاشراق کے مصنف ہیں۔ اشراق کے لغوی معنی کشف اور روشن ضمیری کے ہیں۔ شہاب الدین کو اللہ تعالیٰ نے ذہانت سے دل کھول کر نوازا تھا۔ مسح کرتے ہوئے پانی دیوار پر پھینکا اور بولے۔ ”وہ کیوں نہیں کہتے میں نے اللہ تعالیٰ کو بے دلیل جانا، اپنے عشق سے جانا، عشق دلیل نہیں مانگتا، بس اللہ تعالیٰ ہے اس کے لیے کسی دلیل کی ضرورت نہیں۔“ اس وقت امام رازی نے کہا۔ ”میں نے رب کو دلیل سے مانا۔ اے شیطان اب دفع ہو جا۔۔۔۔۔“ امام رازی کا فلسفہ سو دلیلیں دے کر بھی ہار گیا اور ایک صوفی کے عشق نے فقط ایک بول سے شیطان کو بھگا دیا۔ اپنے اندر عشق ربانی پیدا کرو۔ کسی دلیل کی ضرورت نہیں پڑے گی۔“

میں سوچوں میں محو تھی کہ مجھے احساس ہوا میرے پہلو سے اٹھ کر وہ ایک طرف چل پڑا ہے۔
 میں بھاگ کر اس کے پیچھے لگی۔ ”صرف ایک بات اور بتا دیں اور میرا ایک کام کر دیں پھر آپ کا دوسرا سفر شروع ہو جائے گا اور میرا پہلا۔“

اس نے استفسار طلب نظروں سے مجھے دیکھا۔ ”پوچھو۔“
 ”سنئے آئے ہیں کہ رب عرش پر ہے۔ صوفی حضرات کہتے ہیں دل کے اندر ہے۔ اب میں کہاں جاؤں، کس کی مانوں، رب کو کہاں تلاش کروں، عرش پر یا دل کے اندر؟“
 ”دونوں کی مانو دونوں سچے ہیں اس میں بھی دلیل نہ ڈھونڈو۔ علماء نے تمہیں شریعت، طریقت بتائی ہے۔ اس نے تمہیں اسلام اور ارکان اسلام بتائے ہیں ان کے بغیر تم ادھوری ہو۔ صوفی تمہیں عشق بتائے گا۔ اس کے بغیر بھی تم ادھوری ہو۔“

موسیٰ علیہ السلام سے ان کی قوم نے پوچھا۔ ”اے موسیٰ! تیرے رب کا کوئی ٹھکانا ہے؟“
 قوم کے اس سوال پر موسیٰ علیہ السلام نے کہا۔ ”جب بھی کچھ پوچھتے ہو، احتمالاً سوال ہی پوچھتے ہو۔“
 اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ ”نہیں موسیٰ! انہیں بتاؤ ہمارا رب زمان و مکان کی قید سے آزاد ہے۔ زمانہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق ہے لہذا وہ زمانے میں نہیں ہے۔ مکان اس کی مخلوق ہے۔ اللہ تعالیٰ مکانوں میں نہیں ہے کہ وہ زمانے میں ہے نہ مکانوں میں ہے۔ جو دل اس کے لیے خالص ہو جاتا ہے وہ دل اس کا ٹھکانہ بن جاتا ہے۔ وہ اول ہے وہ آخر ہے ظاہر ہے باطن ہے وہ ہر شے پر قادر ہے وہ جانتا ہے زمین کی تہہ میں کیا ہے وہ جانتا ہے آسمان کے اوپر کیا ہے۔ کائنات کی وسعتوں میں وہی ہے اور آسمان کی بلندیوں میں وہی ہے۔ سمندروں کی گہرائیوں میں پڑے ہوئے پتھر اور پتھر میں پیدا ہونے والے کیڑے کو خوراک پہنچاتا ہے۔ وہی کارساز ہے مشکل کشا بھی وہی ہے اور حاجت روا بھی وہی ہے۔ بس اسے جان لو فلاح پا جاؤ گی۔“
 ”تو عام لڑکی نہیں ہے مکھنئی! تو عام لڑکی نہیں ہے۔“ یہ کہتا ہوا وہ چل دیا۔

ہمارا ساتھ ختم ہو رہا تھا۔ میرا دل اداسی کی اتھاہ گہرائیوں میں گر رہا تھا۔ نہ جانے کیوں میں اس کا ساتھ چاہتی تھی اس کی رخصتی پر ابدیدہ تھی۔ دس پندرہ میٹر دور جا کر وہ رکا۔ میرے دل کو ایک ڈھارس سی ہوئی کہ شاید وہ پلٹ آئے یا مجھے بلا لے۔ میری ساری توجہ اس طرف مبذول تھی۔
 وہ میری طرف چہرہ کر کے بلند آواز میں بولا۔ ”میرے اور تیرے پاس جو بھی ہے اللہ تعالیٰ کی دین ہے اس کی نظر عنایت ہے۔ سرخرو سے بھی اٹھنے نہ دینا۔ جب مٹی سے مٹی بن جاؤ تو وصیت کر جانا کہ نہ مزار بنے نہ عمارت نہ لوگ متھا رگڑیں نہ امیدیں باندھیں۔ جنت البقیع میں جا کر دیکھ لینا سب سمجھ جاؤ گی۔“
 اس کی جانب سے یہ آخری بات تھی۔ وہ میری نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ میں گھنے درخت کی جھکی ہوئی شاخوں کے نیچے بیٹھ گئی۔

اچانک ایک خیال کوندے کی طرح ذہن میں لپکا اور میں چونک اٹھی۔ وہ جو میں نے خواب دیکھا تھا، شان دار محل، دربان اور صاحب محل! وہ خود بہ خود میرے ذہن میں تعبیر کی صورت اتر آیا۔ جس طرح عبد اللہ نے تین پانیوں کے ساتھ پراسرار رویہ روار کھا، اسی طرح کا ایک پراسرار واقعہ خضر علیہ السلام اور موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ پیش آیا تھا۔ محل کے دربان نے مجھ سے کہا تھا۔ یہ اس کا محل ہے جس نے کشتی کو توڑا تھا، بچے کو قتل کیا تھا۔ ایک مجمع میں موسیٰ علیہ السلام خود کو سب سے بڑا عالم کہہ بیٹھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ نے عتاب فرمایا اور ان سے بڑے عالم کی خبر دی۔ میرے ذہن میں اس واقعہ کا مفہوم روشن ہو رہا تھا۔

موسیٰ علیہ السلام نے خضر علیہ السلام سے کہا کہ جو علم اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ کو سکھایا گیا ہے اگر آپ اس میں سے مجھے کچھ بھلائی کی باتیں سکھائیں تو میں آپ کے ساتھ رہوں۔ خضر علیہ السلام نے کہا کہ تم میرے ساتھ رہ کر صبر نہیں کر سکو گے۔“

موسیٰ علیہ السلام نے کہا۔ ”اللہ نے چاہا تو آپ مجھے صابر پائیں گے۔“
 خضر علیہ السلام نے کہا۔ ”مجھ سے کوئی بات مت پوچھنا جب تک میں خود نہ بتاؤں۔“ سفر میں خضر علیہ السلام نے ایک کشتی کو توڑ ڈالا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تعجب سے کہا۔ ”آپ نے اسے اس لیے توڑا کہ مسافر غرق ہو جائیں؟“
 دونوں آگے چلے وہاں انہیں ایک بچہ ملا۔ خضر علیہ السلام نے اسے مار ڈالا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا۔ ”آپ نے لڑکے کو ناحق بغیر قصاص کے مار ڈالا!“

خضر علیہ السلام بولے۔ ”کیا میں نے تم سے نہیں کہا تھا کہ تم میرے ساتھ رہ کر صبر نہ کر سکو گے؟“
 موسیٰ علیہ السلام نے محذرت کی اور پھر دونوں چل پڑے۔ دونوں ایک گاؤں میں پہنچے اور ان سے کھانا طلب کیا مگر گاؤں والوں نے انکار کر دیا۔ وہاں ایک خستہ دیوار تھی جو گرنے ہی والی تھی۔ خضر علیہ السلام نے دیوار کو سیدھا کر دیا۔ اس پر بھی حضرت موسیٰ نے تعرض کیا تو خضر علیہ السلام بولے۔ ”اب ہم میں علیحدگی ہے، تاہم جن باتوں پر آپ صبر نہ کر سکتے ان کے عہد بتا دیتا ہوں۔ وہ کشتی دریا میں مزدوری کرنے والے لوگوں کی تھی۔ ان کا گزر بسر کشتیاں چلانے پر موقوف تھا۔ آگے ایک بادشاہ تھا جو ہر کشتی کو زبردستی چھین لیتا تھا اس لیے میں نے کشتی کو عیب دار کر دیا۔ بادشاہ عیب دار کشتی نہ چھینے گا۔ جو لڑکا میں نے مارا اس کے ماں باپ دونوں مومن ہیں۔ ہمیں خطرہ ہوا وہ بڑا ہو کر انہیں کفر اور سرکشی میں نہ پھنسا دے۔ ہم نے چاہا پروردگار اس کی جگہ انہیں ایک اور پاک طینت اور محبت کرنے والا لڑکا عطا فرما دے۔ وہ دیوار جو ہم نے سیدھی کی وہ دو تہیم لڑکوں کی گئی جو شہر میں رہتے ہیں اور اس کے نیچے ایک خزانہ دفن ہے۔ ان کا باپ نیک بخت آدمی تھا لہذا تمہارے پروردگار نے چاہا کہ وہ اپنی جوانی کو تنہا نہیں تو یہ خزانہ نکال لیں۔ یہ تمہارے پروردگار کی مہربانی ہے اور یہ کام میں نے اپنی طرف سے نہیں کیے۔“

میں نے طویل گہری سانس لی۔ کاش میں صاحب محل کو خواب میں دیکھ لیتی۔
 عبد اللہ تو میری نظروں سے اوجھل ہو چکا تھا۔ مجھے لگا میری چار طرف آدمیوں کا ہالہ تہا ہوا ہے۔ وجدان کے بہت سے لحاظ باقی تھے۔ میں عبد اللہ کی قربت میں بہت کچھ پا سکتی تھی۔ نیک لوگوں کی صحبت ہمیں سکھنے کے لیے بہت سے

موانع فراہم کرتی ہے مگر وہ مجھ سے رخصت ہو گیا تھا۔ یقیناً اس کا نام بھی عبد اللہ نہیں ہوگا۔ عبد اللہ تو پوری انسانیت کا نام ہے۔ میں اسے کھوجنے لگوں تو کتنے عبد اللہ میرے راستے میں آئیں گے۔ کاش میری آنکھ کا شیشہ ٹوٹ جائے۔ میرے ہونٹے ہوئے شیشے کے کسی ٹکڑے میں اس کی شبیہ دیکھ لوں۔

”یہاں ایک لقمہ ووق سحر ہے سرخ ریت اور اس کے بڑے بڑے ٹیلے بدن کو جھلسا دینے والی کڑک دھوپ اور جسم میں سوراخ کر دینے والی آگنی ہوائیں! میلوں میل نہ کوئی بندہ نہ بندے کی ذات۔ ریت ایسی کہ پاؤں رکھوں تو گھٹنوں تک اندر دھنس جاؤں۔

بدن کی ساری قوت منجمد کر کے باہر نکلی تو خراش زدہ ٹانگوں سے ٹیسس اٹھنے لگیں جیسے خاردار جھاڑیوں سے نکلی پنڈلیاں کا گزر ہوا ہو۔ خراشوں سے خون لکیروں کی طرح رسنے لگا۔ نشیب ہو کر فراز حد درجہ گہرا اور لمبا۔ میری سانس اکھڑی ہوئی تھی۔ بھوک سے پیٹ پچک گیا تھا۔ پیاس سے برا حال تھا۔ حلق میں جیسے کانٹے آگے آئے تھے۔ خشک ہونٹوں پر چڑیاں جم گئی تھیں۔ شاں شاں کرتی ہوائیں اور اڑتی ہوئی ریت جو سیدھی ٹانگ، کان، آنکھوں، منہ میں گھس رہی تھی۔ میں یہ جاننے سے قاصر ہوں کہ میں اس صحرا میں پہنچی کیسے؟

بلادل نے مجھے پکن سے چھری لانے کا کہا تھا۔ وہ معاویہ کو آم کاٹ کے دینا چاہتا تھا۔ میں پکن کے بغلی دروازے سے اندر داخل ہوئی تو پتا چلا یہ دروازہ صحرا میں کھلتا ہے۔ منہ زور ہواؤں اور آگ برساتی دھوپ نے ایسے اوسان خطا کیے کہ میں پکن کا دروازہ بھول گئی۔ وہ میرے ساتھ ہی صحرا میں داخل ہوا تھا مگر میں نہیں جانتی کہ وہ اب کہاں ہے؟ میں پچھلے کئی گھنٹوں سے صحرا میں بھٹک رہی ہوں۔ مجھے صحرائیوں کا خیال آیا۔ وہ کس طرح زندگی گزار گئے اور تو اور اس کے رسول ﷺ کا سچا پیغام ہم تک پہنچا گئے۔ میں ریت کے اونچے ٹیلے پر کھڑی ہو گئی۔ آنکھوں پر ہاتھ کا چھبانا کر ادھر ادھر متلاشی نگاہوں سے دیکھنے لگی۔ عین ممکن، کوئی بھٹکا ہوا مسافر میری طرح دھکے کھا رہا ہو۔

بہت دور مجھے ایک جگہ سے دھواں اٹھتا محسوس ہوا۔ میری آنکھوں میں امید کا دیار روشن ہو گیا لیکن اس لمحے مجھے لگا میرے پاؤں نے زمین چھوڑ دی ہے۔ گھبرا کر نیچے دیکھا تو واقعی منہ زور ہوانے ریت کے ٹیلے کو گھوں میں میدان بنا دیا تھا۔ میں ہوا میں معلق تھی۔ ایسا منظر میں نے لی وی پر کارٹون فلم میں دیکھا تھا پھر ہوانے مجھے آگے اڑانا شروع کر دیا۔ میرا رخ اس طرف تھا جہاں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ میں اس جگہ سے کچھ میٹر پہلے زمین پر اتری جہاں میرے قدم پڑے تھے وہاں دائیں بائیں ہیر کے نیچے کی ٹھوس چیز کا احساس ہوا۔

میں نے جھک کر دیکھا، کپڑے کی ایک چھوٹی سی تھیلی تھی، کپڑے کی ایسی چھوٹی سی تھیلی میں میرے ابا چلم کا تباہ و بالا کرتے تھے۔ میں نے تھیلی کو کھول کر دیکھا اس میں چارالا انجیاں اور چار بیج کے دانے تھے۔ ان کا سا زعم سامنے سے سوا تھا۔ میرے ذہن کے نہاں خانے میں ایک نامعلوم سی جہنم ہونے لگی۔ چارالا انجیاں اور چار بیج کے دانے۔ ان میں کہیں کوئی پیغام پوشیدہ ہے!

میں نے آگے پیچھے دائیں بائیں دیکھا۔ اللہ تعالیٰ نے چار سمتیں بنائی ہیں۔ آسمان سے چار خاص کتابیں اتاری ہیں۔ صحیفے تو بہت سے ہیں۔ خانہ کعبہ کے چار کونے ہیں۔ نجات کی چار بنیادی چیزیں ہیں۔ جب انسان گناہ کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس پر چار قسم کے پردے ڈالتا ہے۔ چار موسم ہیں اور چار زندگی کے حصے ہیں۔ تمام صحابہ کرامؓ کی اپنی شان و شوکت ہے۔ ان میں دس اصحاب کہف ہیں اور ان سے بھی چار صحابہ کرامؓ سب سے اعلیٰ وارفع ہیں۔ ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ عثمان غنی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ۔ اس طرح بے شمار امثال ہیں جن کی نسبت چار سے جا کمراتی ہے۔ میرے ہاتھ میں بھی چارالا انجیاں اور چار بیج کے دانے ہیں۔

مجھے خیال آیا یہاں سے دھواں اٹھ رہا تھا۔ دھوپ کی نوعیت جاننے کے لیے میں نے نگاہیں اٹھائیں تو خوشی سے اچھل پڑی۔ میرے سامنے امی (میری ساس) ریت پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ ان کے سامنے اینٹوں کا چولہا بنا ہوا تھا جس میں بہت سے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے۔ دھواں انہی ٹکڑوں سے اٹھ رہا تھا۔ چولہے پر ہانڈی چڑھی ہوئی تھی جس سے اشتہا انگیز

ای ایک لمبی پھونک مار کر جیسے ہی سانس لینے کے لیے اوپر اٹھیں تو ان کی نظر مجھ پر پڑی۔ ”مکھنی!.....! معاویہ کہاں ہے؟ وہ بہت بھوکا تھا۔ میں اس کے لیے ہانڈی بنا رہی ہوں مگر نہ آگ جل رہی ہے نہ معاویہ نظر آ رہا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے انہوں نے ہانڈی سے ڈھکن اٹھایا۔ تیز بھابھ فضا میں اٹھنے لگی۔ میں نے غور سے دیکھا تو بھاب کے مرغولے میں چار الفاظ لکھے ہوئے فضا میں بلند ہو رہے تھے، ”غیبت، حسد اور لالچ!“ میں نے حیرانی سے امی کو دیکھا مگر ہر خیال آیا ”آن پڑھ امی کیا پڑھ پائے گی۔ میں نے ہاتھ میں پکڑی تھیلی کو دیکھا۔ میرے ذہن کی کھڑکی پر چار دستک ہوئی، ہر دستک کی آواز دوسری دستک سے الگ تھی۔ معاملہ کسی حد تک میری سمجھ میں سا گیا تھا۔

ذہن میں ایک بار پھر ٹھک ٹھک ہونے لگی۔ اس بار ساتھ اذیت کا احساس بھی ہونے لگا۔ آنکھوں کی جھپٹن شدت اختیار کرنے لگی۔ خشک گلے میں پہلے کانٹے جیسے تھے اب شیشے جیسی خراشیں بڑنے لگیں۔ چڑیاں جیسے ہونٹ پھٹنے لگے جن سے خون جاری ہو گیا۔ میں بہت ضبط کر کے درد کی شدت کو برداشت کرنے لگی۔

چند لمحے کچھ کی ہوئی تو تھیلی سے ایک لالہ لکڑی نکال کر میں نے ہانڈی میں ڈال دی اور مشرقی طرف دوڑ لگا دی۔ عقب سے امی کی چیخیں ہونے آواز آئی۔ ”مکھنی!.....! کہاں جا رہی ہو؟ نصیبوں جلی تیری قسمت میں کھانا نہیں کیا؟ کھانا تو کھاتی جا!“

”امی! معاویہ کو لینے جا رہی ہوں۔“ میں نے بھاگتے ہوئے چلا کر جواب دیا۔ پچھونے کہا تھا معاویہ میرے پاس ہوگا۔ میں اسے لے کر پلوانا چاہتی ہوں۔ امی! کھانا تیار رکھو۔ میں معاویہ کو لے کر انجی آتی ہوں۔“

صحرا میں جتنی پیش گرمی اور آگ کی لپٹیں اٹھ رہی تھیں یہاں اس سے کہیں زیادہ ٹھنڈی چھاؤں تھی۔ فرحت بخش ہوائیں چل رہی تھیں۔ چشمے بہہ رہے تھے اور پرندے چھپہارے تھے۔ زندگی کتنی خوب صورت ہے، تسکین آمیز خیال دل کے آ رہا ہو گیا۔ گتے پیڑ کے گتے سائے میں پچھونکے میں مدھانی ڈالے لے کر بنانے میں مگن تھی۔ مجھے دیکھتے ہی بولی۔ ”مکھنی! میں کتنے دنوں سے مدھانی چلا رہی ہوں۔ لے کر بنانے کا ارادہ ہے مگر اب یہ دودھ رہا نہ لے سکی۔ ٹھیک نہیں آیا۔ اب آنے کا فائدہ؟“ پچھونے مکے سے ڈھکن اٹھا کر اندر جھانکا۔ میری نظر بھی مکے منہ والے مکے میں پڑی تو جیسے ٹھہرے ہوئے پانی پر کائی سی جم جاتی ہے اسی طرح لسی کے اوپر پھٹکے ہوئے دودھ کے ٹکڑے نظر آ رہے تھے۔

میں چونک پڑی، مجھے اندر تین ٹکڑوں پر تین الفاظ لکھے ہوئے نظر آئے۔ ”غیبت، حسد اور لالچ۔“ یہاں بغض کا لفظ غالب تھا۔ اس کا مطلب ہے میری پہلی لالچی کام کر گئی ہے۔ میں نے فوراً تھیلی کا منہ کھولا۔ اندر سے روشنی کی لکیر باہر نکلی۔ جھانک کر دیکھا تو بیج کے چار دانوں میں سے ایک جلنو کی طرح چمک رہا تھا۔ میں نے لالچی کا ایک دانہ اٹھا کر مکے میں ڈال دیا اور پوچھا۔ ”ٹھیک کون پچھو؟“

”میری بہن کا بیٹا اور کون؟ تیری چھوٹی پھوپھی سمین کا بیٹا!“

”مگر آپ کے علاوہ تو میری کوئی پھوپھی نہیں ہے؟“ میں نے کہا۔

”مکھنی! تیری یادداشت کو کیا ہو گیا ہے؟ تیری تین پھوپھیاں ہیں۔ ٹھیک یا سمین کا بیٹا ہے۔ ہمارے پورے خاندان کی انتہائی شریف اور نیک بچہ ہے۔ دس سال کی عمر میں قرآن مجید حفظ کر لیا تھا۔ اب بائیس سال میں عالم بن گیا ہے۔ دینی مدرسے میں پڑھاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے چاہا تو کوئی مسجد مل گئی تو پیش امام بھی بن جائے گا۔“

”پچھو! آپ نے تو معاویہ کے بارے میں کہا تھا کہ اسے لے کر پلوانا ہے۔ معاویہ کہاں ہے؟“

”مکھنی! ہوش میں آ اور عقل سے کام لے۔ معاویہ تیرا بیٹا ہے اور تو سسرال میں رہتی ہے۔ مجھے کیا پتا معاویہ کہاں ہے؟ خود سے پوچھ نہ ملے تو سسرال والوں سے پوچھ مجھے تو یہ غم کھائے جا رہا ہے کہ اگر ٹھیک آ گیا تو کیا ہے؟“

”اف پچھو!“ میرے اندر سے درد بھری آہ نکلی۔ ”تیرے بارے میں پہلے صرف سنا تھا آج جان بھی لیا ہے۔ دادا

جی نے تجھے اس لیے اسکول نہیں بھیجا کہ تیرے بارے میں تحفظات رکھتے تھے اور میرے ابا نے تیری اسی لیے جلدی کر دی کہ تیرے بچپن اچھے نہیں تھے۔ تیرے سبب میں اور سکھان بھی اسکول نہ جاسکی اور ان پڑھ رہ گئی۔ ابا کو خوف تھا کہ جو غلطی بہن نے کی ہے وہی بیٹیاں بھی نہ کر گزریں اس لیے ہمیشہ کو لہے سے باندھ کر رکھا اپنی نگرانی میں گھر کی چار دیواری کے اندر قید کر کے رکھا۔

”مکھنی! مجھے دوش نہ دے۔“ پھپھو ہاتھ نچا کر بولی۔
میں نے بار بار ارمی سے کہا۔ ”ای! ہم اسکول کب جائیں گے؟“ جواب ملا۔ ”ابھی پڑھائی کی عمر نہیں ہے۔“

ہماری پڑھائی کی عمر سترہ برس تک نہ آئی تھی کہ شادی ہو گئی۔ پھپھو اتم نے لمبی معاویہ کو پلاتا تھی اور اب ٹھیکل کوچ میں لے آئی ہو۔ یاد رکھنا جس دن میری آنکھ کا شیشہ ٹوٹ گیا اس دن تجھے تیرے کیے کی سزا ضرور دوں گی۔“

پھپھو زور زور سے ہنسنے لگی۔ ہنسنے سے اس کا فریہ جسم یوں مل رہا تھا جیسے اندر زلزلہ آ گیا ہو۔
میں معاویہ کی تلاش میں سرگرداں در بدر ہوتی رہی نہ معاویہ ملا نہ اس کا کوئی سراغ۔

پانچویں رات کا کوئی پہر تھا میں ایک مسجد میں جا نکلی۔ سنا ہے مسجد میں بڑا سکون اور راحت ملتی ہے۔ ممکن ہے معاویہ بھی سکون کی تلاش میں یہاں چھپ گیا ہو۔

مسجد کے ہال میں جا کر پتا چلا ابھی ابھی عشاء کی نماز ادا کی گئی ہے۔ کچھ لوگ سنتیں ادا کر رہے تھے جو کر چکے تھے وہ ذکر و اذکار اور تعلیمات میں مصروف تھے۔ مختلف گوشوں میں لوگ چند ٹولیاں بنائے بیٹھے تھے۔ پانچ ٹولیاں دیکھ کر مجھے خیال آیا۔ اللہ رب العزت ایک ہم جس کی امت ہیں وہ رسول اقدس ﷺ ایک اور قرآن مجید بھی ایک ہے۔ سارا دین تو انہی پر استوار ہے پھر ہم ایک کیوں نہیں؟ درود کی تیز لہر بدن میں اٹھی اور دماغ کے ریشوں میں پیوست ہو گئی۔

میں نے ایک شخص کو روک کر پوچھا۔ ”بھائی! یہ پانچ ٹولیاں بنی ہوئی ہیں ان میں ایک عربوں اور بنگلہ دیشیوں کی ہے۔ ان دو کی تو سمجھ آتی ہے تین سمجھ سے بالاتر ہیں کیوں کہ یہ تینوں ٹولیاں پاکستانیوں کی ہیں۔“

”یہ فلاں مسلک کی ٹولی ہے دوسری فلاں اور تیسری فلاں مسلک کی ہے۔“ اس نے جواب میں کہا۔
میں نے کہا۔ ”اس کا مطلب ہے یہاں اسلام کا نہیں اپنے اپنے مسلک کا پرچار ہو رہا ہے۔ میں غلط جگہ آ گئی ہوں۔

مجھے تو مسجد میں جانا تھا۔ معاویہ مسجد میں ملے گا۔“ اس نے جھلا کر کہا۔
”اوہ بی بی! یہ مسجد ہی ہے۔“

”اگر یہ واقعی مسجد ہے تو ٹولیاں بنانے والے مسلمانوں سے کہہ دو کہ فرقوں میں بٹ گئے تو تباہ و برباد ہو جاؤ گے۔ فرقوں میں مٹ پڑو اور اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رکھو۔ بصورت دیگر آسمانی اور زمینی آفات تو اتار سے نازل ہوں گی اور دنیا و آخرت دونوں کی ناکامیاں بھی حصے میں آئیں گی پھر اللہ تعالیٰ سے گلہ نہ کرنا۔“

مجھے یقین تھا میرا معاویہ ایسی جگہ پناہ نہیں لے سکتا جہاں مذہب سے زیادہ فرقوں کا پرچار ہوتا ہو پھر یہ مسجد دینی کی سرزمین پر واقع تھی۔ معاویہ پاکستان میں نہیں ملے گا۔ میں واپس پلٹ آئی لیکن ذہن پر سوچوں کا بوجھ بڑھ گیا تھا۔ سورۃ فاتحہ میں پڑھتے ہیں رَبُّ الْعَالَمِينَ ”تمام عالموں کا رب!“ بے شک اللہ تعالیٰ تمام جہانوں کا مالک و خالق اور پروردگار ہے تمام جہانوں کا رازق ہے اس نے خود کو رَبُّ الْمُسْلِمِينَ نہیں کہا رَبُّ الْعَالَمِينَ فرمایا۔ تمام مخلوقات میں اشرف مخلوق انسان ہے۔ پہلے انسان بنا پھر اس کا مذہب۔

ہر بچہ پیدا کسی طور سے مسلمان پیدا ہوتا ہے۔ یہ اس کی بد قسمتی ہوتی ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں۔ ”آنحضرتؐ نے فرمایا۔ ”ہر بچہ اپنی فطرت (یعنی اسلام) پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے والدین اسے یہودی یا مجوسی یا نصرانی بنادیتے ہیں کہ اسے غیر مسلم گھرانے ملے تو وہ غیر مسلم کی راہیں منتخب کر لیتا ہے۔ ہمیں غیر مسلموں سے نفرت کرنے کی بجائے اپنے اندر وہ جو ہر پیدا کرنے چاہئیں جنہیں دیکھ کر وہ اسلام سے اس قدر متاثر ہوں کہ وہ خود بھی مسلمان ہو جائیں۔ اسی طرح اگر ایک مسلک دوسرے مسلک سے خود سے سچا اور کھرا سمجھتا ہے تو اسے خود صراطِ مستقیم پر چل کر دکھائے۔ بجائے دوسروں پر انگلیاں

برپا کر کے اس کی بد قسمتی ہوتی ہے۔ یہ اس کی بد قسمتی ہوتی ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں۔ ”آنحضرتؐ نے فرمایا۔ ”ہر بچہ اپنی فطرت (یعنی اسلام) پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے والدین اسے یہودی یا مجوسی یا نصرانی بنادیتے ہیں کہ اسے غیر مسلم گھرانے ملے تو وہ غیر مسلم کی راہیں منتخب کر لیتا ہے۔ ہمیں غیر مسلموں سے نفرت کرنے کی بجائے اپنے اندر وہ جو ہر پیدا کرنے چاہئیں جنہیں دیکھ کر وہ اسلام سے اس قدر متاثر ہوں کہ وہ خود بھی مسلمان ہو جائیں۔ اسی طرح اگر ایک مسلک دوسرے مسلک سے خود سے سچا اور کھرا سمجھتا ہے تو اسے خود صراطِ مستقیم پر چل کر دکھائے۔ بجائے دوسروں پر انگلیاں

برپا کر کے اس کی بد قسمتی ہوتی ہے۔ یہ اس کی بد قسمتی ہوتی ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں۔ ”آنحضرتؐ نے فرمایا۔ ”ہر بچہ اپنی فطرت (یعنی اسلام) پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے والدین اسے یہودی یا مجوسی یا نصرانی بنادیتے ہیں کہ اسے غیر مسلم گھرانے ملے تو وہ غیر مسلم کی راہیں منتخب کر لیتا ہے۔ ہمیں غیر مسلموں سے نفرت کرنے کی بجائے اپنے اندر وہ جو ہر پیدا کرنے چاہئیں جنہیں دیکھ کر وہ اسلام سے اس قدر متاثر ہوں کہ وہ خود بھی مسلمان ہو جائیں۔ اسی طرح اگر ایک مسلک دوسرے مسلک سے خود سے سچا اور کھرا سمجھتا ہے تو اسے خود صراطِ مستقیم پر چل کر دکھائے۔ بجائے دوسروں پر انگلیاں

برپا کر کے اس کی بد قسمتی ہوتی ہے۔ یہ اس کی بد قسمتی ہوتی ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ کہتے ہیں۔ ”آنحضرتؐ نے فرمایا۔ ”ہر بچہ اپنی فطرت (یعنی اسلام) پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے والدین اسے یہودی یا مجوسی یا نصرانی بنادیتے ہیں کہ اسے غیر مسلم گھرانے ملے تو وہ غیر مسلم کی راہیں منتخب کر لیتا ہے۔ ہمیں غیر مسلموں سے نفرت کرنے کی بجائے اپنے اندر وہ جو ہر پیدا کرنے چاہئیں جنہیں دیکھ کر وہ اسلام سے اس قدر متاثر ہوں کہ وہ خود بھی مسلمان ہو جائیں۔ اسی طرح اگر ایک مسلک دوسرے مسلک سے خود سے سچا اور کھرا سمجھتا ہے تو اسے خود صراطِ مستقیم پر چل کر دکھائے۔ بجائے دوسروں پر انگلیاں

انہا نے اور اعتراضات کرنے کے اپنے اندر وہ کمال پیدا کرے کہ دوسرے مسلک والے اسے دیکھ کر کہہ اٹھیں ہاں ہم غلطی پر ہیں اور یہ سچا ہے۔ میرے دماغ میں دستک ہونے لگی۔ کچھ واقعات تازہ ہونے لگے۔

کاندھلہ میں ایک زمین کے ٹکڑے پر ہندوؤں اور مسلمانوں کا انگریز جج کی عدالت میں مقدمہ چل رہا تھا۔ مسلمانوں نے کہا۔ ”فیصلہ ہمارے حق میں ہوا تو ہم اس پر مسجد بنائیں گے۔“ جواباً ہندوؤں نے بھی مندر بنانے کا عندیہ دے دیا۔

جج کو پریشانی لاحق ہوئی اس طرح قتل و غارت اور خانہ جنگی کا اندیشہ بہت بڑھ گیا تھا۔
ہندوؤں نے ایک تجویز جج صاحب کو دی۔ ہم تنہائی میں ایک نام آپ کو بتائیں گے وہ شخص کہے کہ زمین مسلمانوں کی ہے تو ہمیں کوئی اعتراض نہیں اور اگر کہیں کہ ہندوؤں کی ہے تو ہمیں عنایت کر دیجیے۔

مسلمانوں کے متفق ہونے پر اس تجویز کو منظور کر لیا گیا۔ ہندوؤں نے مفتی الہی بخش کاندھلوی کا نام بتایا جو شاہ عبدالعزیز کے شاگردوں میں سے تھے ان کا نام سامنے آیا تو مسلمان خوشی سے نعرے بازی کرنے لگے۔

پیشی پر جج نے پوچھا۔ ”مفتی صاحب! زمین کا یہ ٹکڑا کس کی ملکیت ہے؟“
مفتی صاحب نے بچی اور کھری زندگی گزارتی تھی حق بات کہنا سیکھا تھا بلا تامل فرمایا۔ ”زمین کا مذکورہ ٹکڑا ہندوؤں کی ملکیت ہے۔“

جج صاحب نے پوچھا۔ ”ہندو اس پر اپنا مندر تعمیر کر سکتے ہیں۔“
جواب دیا۔ ”ان کی ملکیت ہے چاہیں تو گھر بنائیں چاہیں تو مندر تعمیر کریں۔“

جج نے فیصلہ ہندوؤں کے حق میں کر دیا لیکن فیصلے میں ایک عجیب بات لکھی۔ ”آج اس مقدمے میں مسلمان ہار گئے مگر اسلام جیت گیا۔“

اس وقت ہندوؤں نے کہا۔ ”آپ نے فیصلہ سنا دیا اب ہمارا بھی سینے۔ ہم آج کلمہ حق پڑھ کر مسلمان ہوتے ہیں اور اس زمین پر مسجد بنانے کا اعلان کرتے ہیں۔“

میں یوں ہی اپنا دماغ کھپا رہی ہوں یہاں کچھ نہیں ہونے والا۔ ہاں جس دن میری آنکھ کا شیشہ ٹوٹے گا تب بہت کچھ ہو جائے گا۔

آپارخانہ کے دماغ کے ریشوں میں پتلی تانبے کی تاریں کھب رہی تھیں۔ جب باریک تاریں مغز کے ریشوں میں داخل ہوئیں تو رخسانہ آپا تڑپ اٹھتی اور بے اختیار اپنا ہاتھ دماغ میں ڈال دیتی۔ دماغ میں اس کی انگلیاں یوں پھنس جاتیں جیسے گندھے ہوئے آٹے میں پھنس جاتی ہیں پھر جس طرح آٹے سے ہاتھ واپس کھینچا جائے تو انگلیوں سے آٹا چکا رہ جاتا ہے۔ اس طرح آپارخانہ نے ہاتھ واپس کھینچا تو دماغ کا کچھ حصہ انگلیوں کے ساتھ کھینچا چلا آیا۔ اس نے ہاتھ کو زور سے جھٹکا دیا۔ مغز چھوٹے چھوٹے ڈبروں میں ادھر ادھر پھر گیا۔ اس کی آنکھوں سے موٹے موٹے آنسوؤں کے قطرے گرنے لگے۔

وہ دکھ بھرے لہجے میں کہنے لگی۔ ”بس کرو! بس کرو۔ خدا کے لیے! بس کرو۔“ مکھنی کا پیچھا چھوڑ دو۔ یہ میری دہی ہے اور موت کرو اس پر۔ میرے جسم میں تیز نوک دار سونیاں چھوٹی جارہی تھیں جب لہو قطرہ قطرہ رسنے لگا تو درد سے میری آنکھیں فضا میں بلند ہونے لگیں۔ ابھی یہ درد برداشت نہ کر پائی تھی کہ مجھے گھوڑے سے باندھ کر کھینچا جانے لگا۔ میرا ناتواں جسم بھی پتھر سے ٹکرا جاتا۔ کبھی درختوں خاردار جھاڑیوں میں پھنس جاتا، کبھی خطرناک نشیب میں اتر جاتا تو کبھی بلند ہو جاتا۔ میرا انگ انگ درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ کپڑے پھٹ گئے تھے جسم کا کوئی حصہ سلامت نہ بچا۔ چونوں کی کوئی انتہا نہ رہی۔ ہر ایک زخم سے لہو کا رساؤ جاری تھا مگر بے رحموں کو ترس نہ آیا۔ بس آپارخانہ کی سوز میں ڈوبی آواز گونج رہی تھی۔

”بس کرو! بس کرو! مکھنی دہی پر اور ظلم نہ کرو۔“
رخسانہ آپا کی دلدادہ آواز میں ایسا درد و کرب تھا کہ اگر پتھروں کے کان ہوتے تو سن کر وہ بھی رو پڑتے مگر یہ کیسے

رخسانہ آپا کی دلدادہ آواز میں ایسا درد و کرب تھا کہ اگر پتھروں کے کان ہوتے تو سن کر وہ بھی رو پڑتے مگر یہ کیسے

رخسانہ آپا کی دلدادہ آواز میں ایسا درد و کرب تھا کہ اگر پتھروں کے کان ہوتے تو سن کر وہ بھی رو پڑتے مگر یہ کیسے

رخسانہ آپا کی دلدادہ آواز میں ایسا درد و کرب تھا کہ اگر پتھروں کے کان ہوتے تو سن کر وہ بھی رو پڑتے مگر یہ کیسے

رخسانہ آپا کی دلدادہ آواز میں ایسا درد و کرب تھا کہ اگر پتھروں کے کان ہوتے تو سن کر وہ بھی رو پڑتے مگر یہ کیسے

ظالم ہیں ان کے کانوں پر جوں تک نہ رہ سکی۔ مجھ پر ظلم و ستم کے پہاڑ ٹوٹے رہے میں چیختی چلاتی رہی روتی اور بلباتی رہی البتہ ایک خیال میرے دماغ پر ہتھوڑے برساتا رہا۔ جنت کے آٹھ دروازے ہیں اور جہنم کے سات اپنا نہیں میرے حصے میں کون سا دروازہ آئے گا؟

رخسانہ آپا عظیم عورت تھی۔ اس نے ماں کے عظیم ہونے کی مثال قائم کر دی تھی۔ رخسانہ آپا کا جواں سال بیٹا خالد گردے ٹیل ہونے کے سبب خالق حقیقی سے جاملتا تھا۔ رخسانہ آپا نے بیٹے کی موت کا ایسا صدمہ لیا کہ صرف ایک ماہ دہلی میں روتے بیٹے دن گزارے۔

ایک ماہ بعد وہ بھی اپنے جواں سال بیٹے خالد سے جاملی۔ مجھے رخسانہ آپا کی موت کا بے حد دکھ ہے۔ وہ میری ماں جیسی تھی۔ وہ میرے دکھ پر دھی ہوئی تھی اور مجھے ہمیشہ دھی کہتی تھی۔ میری ہمیشہ دعا رہتی ہے اللہ تعالیٰ اُسے آٹھ دروازوں میں سے ایک دروازہ نصیب فرمائے۔ (آمین!)

مجھ پر ظلم ڈھانے والوں کی ساری ضد رخسانہ آپا سے تھی۔ وہ منوں مٹی کے نیچے دفن ہوئی تو میں بھی گھر پلٹ آئی۔

تپائی بر جوس کے گلاس رکھے ہوئے تھے۔ ان لوگوں کا تقاضہ تھا میں ایک گلاس پی لوں جبکہ میری ضد تھی جب تک معاویہ نہیں مل جاتا میں پانی کی ایک بوند اور روٹی کا لقمہ بھی منہ میں نہیں ڈالوں گی۔ غضب خدا کا میرا تخت جگر نہ جانے کہاں بھٹک رہا ہوگا اور یہ مجھے جوس پلانے کے درپے تھے؟ میرے انکار سے وہ زبردستی پر اتر آئے۔ جنید ماموں بھی چاہ رہے تھے میں جوس پی لوں۔ میں نے انتہائی غصے میں بلاول سے کہا۔ ”بلاول! تمہیں شرم نہیں آتی بیوی کے ہاتھ غیر مرد کی گرفت میں ہیں اور تو گلاس پکڑ کر بدھو کی طرح کھڑا ہوا ہے؟“

”مکھنی! یہ غیر مرد نہیں میرا بھائی ہے۔“ بلاول نے کہا۔

”تیرا بھائی ہے میرا نہیں میرے لیے نامحرم ہے۔ میں تھوکتی ہوں تیری سوچ پر اور اس کے منہ پر نہ اس میں غیرت ہے نہ تجھ میں۔“

”مکھنی بیٹی! جوس پی لے۔ تیرے دماغ کو قوت ملے گی۔ یہ صحت افزاء جوس ہے پی لے میری بیٹی!“ امی میری منت کرنے لگی۔

بلاول گلاس میرے ہونٹوں کے قریب لے آیا۔ جنید نے سخت لہجے میں کہا۔ ”بلاول! منہ کھول کے نہ رائیڈیل دے۔“

امی گھبرا کر بولی۔ ”آرام سے بلاول! مکھنی کے دانت بہت کچے ہیں ٹوٹ کے باہر آ جائیں گے۔“

”مکھنی! منہ کھول دے تنگ مت کر۔“ بلاول نے مجھے ملتہجیانہ نظروں سے دیکھتے ہوئے کہا۔

”تو بھی حد سے زیادہ شریف ہے بلاول!“ جنید کا لہجہ کڑھتا تھا۔ ”تیری بیوی ہے ماں ایک پھٹ مار اور جوس منہ میں ڈال دے۔“

”جنید! تو تڑپتا رہے اور جلتا رہے۔ تجھے تیری فطرت کبھی سکون سے نہیں رہنے دے گی۔ بلاول کبھی مجھ پر ہاتھ نہیں اٹھائے گا۔“

”مکھنی! منہ کھول۔“ بلاول کا پیار بھرا لہجہ دیکھ کر میرا دل موم ہو گیا۔

”ٹھیک ہے مگر ایک شرط پر۔ مجھ سے پہلے ایک گلاس جنید پیے گا۔“

”ٹھیک ہے جنید! مکھنی کا ہاتھ چھوڑ دو اور جوس پی لو۔“ امی نے فوراً حکم صادر کیا۔

جنید کے چہرے پر بارہ بج گئے اسے میری فتح ہضم نہیں ہوئی مگر امی کا حکم تھا بادل نا خواستہ اس نے میرے ہاتھ چھوڑ کر گلاس اٹھا لیا۔ میرے ہاتھ آزاد تھے اس لیے گلاس اس کے ہونٹوں تک جانے سے پہلے میں نے اس میں ایک

الابچی ڈال دی۔ کالج کے گلاس سے مجھے جوس میں ارتعاش نظر آیا۔ دو بلبلے اٹھے۔ ایک پر لالچ لکھا ہوا تھا اور دوسرے پر

معاویہ۔

تھیلی میں چمکنے والے جگنوؤں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا۔ جنید نے جوس لیا تو میں نے بھی بلا ترو گلاس اٹھا کر ہونٹوں سے لگالیا۔

بلاول مجھے ستائی نظروں سے دیکھ رہا تھا جبکہ جنید کی نظر اس کی فطرت کے مطابق کینہ پرور تھیں۔ اس کے ظاہری عمل بہت اچھے نیک اور صاف تھے مگر بات اعمال کی نہیں نیت کی ہے۔ نیت بری ہو تو اچھے اعمال بکھو کے مانند بن جاتے ہیں۔ اچھی نیت کے ساتھ کوئی برا عمل بھی سرزد ہو جائے تو درجہ اچھا ملتا ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ ”اعمال کا دار و مدار نیتوں پر ہے۔“

جنید کی طرح ابو بھی سر سے لے کر متقی اور پرہیزگار ہیں مگر مجھے کبھی کبھی ان کا اندرا چھان نہیں لگتا۔ من کا صاف انسان نہیں ہے۔ اسے دیکھ کر میں ایک بات ضرور سوچتی ہوں انسان ظاہری مومن ہے بی بی داڑھی سر پہ عمامہ ہاتھ میں تسبیح اور سینے میں قرآن۔ مگر باطن میں کینہ، بغض، حسد اور لالچ پال رکھے ہیں۔ لوگوں کی نظر میں مومن ہے مگر اللہ کی نظر میں جہنمی۔ اللہ تعالیٰ اپنی نظر سے دیکھے گا یا لوگوں کی نظر کا پاس رکھے گا؟

جب یہ سوال میرے دل کی دھڑکنوں میں سما یا اور اسے منہ کی سی دیوچنے کی سی کی تو مجھے خیال آیا۔ رسول اللہ ﷺ کو عمیرہ بن ابی صلت کے اشعار بہت پسند تھے۔ عمیرہ وہ شخص تھا جو محض اپنی ضد غرور میں اللہ کے نبی ﷺ پر ایمان نہیں لایا۔ اسے گماں تھا میں اتنا بڑا شاعر فصیح و بلیغ ذہین ترین دماغ والا شاعر اصولاً نبی تو مجھے ہونا چاہیے تھا۔ عمیرہ بت پرست نہیں تھا۔ تو حید کا زبردست قائل تھا۔ شاعری ایسی کہ اللہ کے نبی ﷺ ایک مجلس میں تشریف فرما تھے۔ آپ نے ایک صحابی سے پوچھا۔ ”تمہیں عمیرہ کا کوئی شعر یاد ہے؟“

جواب ملا۔ ”جی ہاں رسول اللہ ﷺ!“

فرمایا۔ ”سنو۔“ صحابی نے ایک شعر سنایا پھر دوسرا سنایا پھر تیسرا۔ اس طرح ایک مجلس میں رسول اللہ ﷺ نے عمیرہ کے سوا اشعار سننے اور پھر فرمایا۔ ”کم نخت کی زبان تو مومن کی تھی دل کا فر تھا۔“

میرے دل نے لہک کر کہا۔ ”مکھنی بات تو دل پر آ کر مہر ثبت کرتی ہے۔ زبان اور ظاہری شکل و صورت کیا ہے۔“

میرے ذہن نے ایک اور جست لی اور میں نور الدین زنگی کے دور حکومت میں پہنچ گئی۔ جب بروٹلم میدان جنگ بنا ہوا تھا۔ جرمنی کے شہنشاہ کانرڈ کی 9 لاکھ افراد پر مشتمل فوج کے مقابل مسلمانوں کی فوج برسرِ پیکار تھی۔ وہ مسکین صورت مگر

باریش یہودی مدینہ منورہ کے نواح میں داخل ہوئے۔ اپنے حلیے سے بکے مومن مسلمان لگتے تھے۔ اوپر سے ہر وقت ریاضت و عبادت میں ایسے مشغول رہتے کہ دیکھنے والی ہر آنکھ ان پر سچے اور کامل مومن ہونے کی مہر ثبت کر دیتی۔ دن بھر یہ یہودی اللہ اللہ کرتے رہتے مگر رات کی تاریکی میں ان کا مکروہ شیطانی کام شروع ہو جاتا۔ وہ اپنے حجرے میں سرنگ

کھودتے رہتے۔ ایک یہودی بظاہر عبادت میں مومن ہوتا مگر درحقیقت وہ پہرہ دے رہا ہوتا کیونکہ دوسرا یہودی کدال لے کر سرنگ میں کھدائی کر رہا ہوتا تھا۔ اس کا مقصد روضہ اطہر تک پہنچنا تھا۔ وہ کام میں ایسے مشغول رہے کہ کھودی ہوئی سرنگ روضہ اقدس کے بالکل قریب پہنچ گئی۔ مگر یہ دور کسی عام شخص کا دور حکومت نہیں تھا بلکہ سلطان نور الدین زنگی کا زمانہ

تھا جنہوں نے الملک عادل کا لقب پایا تھا جن کے متعلق ابن اشہر کہتا ہے۔ ”میں نے خلفائے راشدہ اور عمر بن عبدالعزیز کے بعد سے ایسا حکمران نہیں دیکھا جس نے اس سے زیادہ پاکیزہ زندگی گزاری ہو یا راست روی اور نیکی میں اس سے

زیادہ سرگرم عمل ہو۔ سلطان نور الدین ایک متقی مسلمان تھا۔ انہیں ہمیشہ قرآن و سنت کے مطابق ایک مومن کی سی زندگی بسر کرنے کا دھیان رہتا تھا۔ 1173ء میں اس نے ایشیائے کوچک پر حملہ کیا اور کئی شہر فتح کر لیے۔ سلطان ابھی اس مہم میں مصروف ہی تھا کہ اس کی دہشت گرد کے علاقوں میں گردش کرنے لگی۔

(اس حیرت اور اسرار بھرے ناقابلِ فراموش سلسلے کی اگلی کڑی آئندہ ماہ پڑھیے۔)

☆☆☆

دُعا بدو دعا

اُمّ عادل

زبان سے ادا ہونے والے حروف میں تو تاثیر ہوتی
ہی ہے لیکن دل سے نکلنے والی آہ عرش ہلا دیتی ہے

کرچی سے ایک مختصر اور نثر کہانی



کچھ عرصہ قبل میں ایک ویلفیئر ٹرسٹ میں بطور
کمپیوٹر آپریٹر کی جاب کرتی تھی۔ میرے روم کی باہر کی
طرف کھلنے والی کھڑکی کے پاس ریپیشنٹ عظمیٰ بھی بیٹھتی
تھی۔ اُس کھڑکی پر دن بھر اُن افراد کا تانتا بندھا رہتا
تھا جو صدقہ خیرات دینے اپنے بزرگوں کو ٹرسٹ میں جمع
کروانے یا بھی کبھار اپنے کسی بزرگ سے ملنے والے
لواحقین ہوتے تھے۔ عظمیٰ تمام وقت اپنے کام میں
مصروف رہتی تھی اور میرا بھی کمپیوٹر پر انٹریز کے حوالے
سے سارا دن بہت مصروف گزرتا۔ کبھی کبھار تو ہمیں
کھانے کا وقت بھی نہ ملتا تھا۔

اُس روز صبح کے وقت ابھی رش نہیں ہوا تھا کہ ایک
70.75 سالہ سفید ریش بزرگ نے کاؤنٹر پر آ کر سلام
کیا۔ عظمیٰ نے سلام کا جواب دے کر آنے کا مقصد پوچھا
تو بزرگ نے کہا کہ میں اپنی پردادی کو ٹرسٹ میں داخل
کروانا چاہتا ہوں۔ کیا طریقہ کار ہوگا؟ اُس بزرگ کی
بات سن کر ہمارا چونکنا قدرتی تھا۔ وہ ہم سے مذاق تو کر
نہیں سکتے تھے لہذا کچھ دیر کو ہمیں اُن کی ذہنی صحت پر شک
ہوا مگر وہ بات چیت اور لباس سے نہایت مہذب اور
نارل دکھائی دے رہے تھے۔ ہماری پھٹی آنکھیں اور
کھلے منہ دیکھ کر وہ سمجھ گئے کہ ہمیں اُن کی بات پر یقین
نہیں آیا۔

وہ دوبارہ گویا ہوئے۔ ”جو کچھ آپ لوگوں نے
سنا وہ سو فیصد درست ہے۔ میری پردادی حیات
میں اب میں خود بوڑھا ہو چکا ہوں اور اکثر بیمار رہتا
ہوں لہذا اُن کی دیکھ بھال کرنا میرے بس میں نہیں
رہا۔ آپ برائے مہربانی انہیں یہاں رکھ لیں۔“ عظمیٰ
نے اپنی حیرانگی پر قابو پاتے ہوئے انہیں داخلہ فارم
دیا اور قواعد و ضوابط بتائے۔ بزرگوار فارم لے کر
شکریہ ادا کرتے ہوئے دوسرے دن کا کہہ کر کھڑکی
سے ہٹ گئے۔ میرا قلم سے پرانا رشتہ ہے اور مجھے ہر
جگہ کہانی کی کھوج رہتی ہے۔ اس ٹرسٹ میں جاب
کرنے کا محرک بھی یہ جذبہ ہی بنا۔ صبح کا وقت تھا۔
ابھی رش نہیں تھا چنانچہ میں عظمیٰ سے پندرہ منٹ میں
آنے کا کہہ کر تیزی سے گیٹ کی جانب دوڑی جس
طرف بزرگوار آہستہ آہستہ بڑھ رہے تھے۔ گیٹ سے
کچھ پرے میں نے انہیں جالیا۔

”ایلسکوی زمی انکل!.....!“ میں نے انہیں پکارا۔ وہ
رک کر مجھے دیکھنے لگے۔
”بیٹا!.....! مجھ سے کچھ کہا ہے؟“
”جی انکل!.....! اگر آپ برا نہ منائیں اور آپ
کے پاس وقت ہو تو کیا میں آپ سے آپ کی پردادی
کے متعلق کچھ پوچھ سکتی ہوں؟“
”ہاں بیٹا! پوچھو کیا پوچھنا ہے؟ ریٹائرمنٹ
کے بعد تو انسان کے پاس وقت ہی وقت ہوتا
ہے۔“

میں انہیں نہایت ادب سے ٹرسٹ کے لان میں
لے گئی۔ اب ہم درخت کی ٹھنڈی چھاؤں میں بیٹھ
چکے تھے۔ میرا تجسس اُن کی پردادی کی عمر کے بارے
میں تھا مگر میں نے پہلے اپنا تعارف کروایا۔
”انکل! میں اس ادارے میں جاب کرتی ہوں۔ قلم
سے میرا تاجا جڑا ہے اس لیے کہانیوں کی تلاش رہتی ہے۔
ذرا اپنی دادی کے متعلق مختصر بتائیے گا۔ کہانی میں خود بنا
لوں گی۔ اچھا سب سے پہلے یہ بتائیے آپ کی پردادی
کی عمر کیا ہے؟“

”بیٹا! مجھے صحیح تو معلوم نہیں مگر جیسا میرے والد بتایا
کرتے تھے اُس حساب سے ڈیڑھ سو سے اوپر ہی ہے۔
میری پردادی اپنے والدین اور چھ بھائیوں کی اکلوتی بیٹی
وہن تھیں۔ والدین اور بھائیوں کی آنکھ کا تارا دن ہو یا
رات جس چیز کی جب فرمائش کرتی فوراً سے پہلے پوری
کردی جاتی۔ تمام گھر والے انہیں دیکھ دیکھ کر جیتے تھے۔
ماں تو ہر لمحہ انہیں ”میری بچی! میری لاڈلی! تو دو سو سال
جیے اور اپنی سات نسلیں دیکھے۔“ کی دُعا دیتی رہتی
تھیں۔ اللہ نے انہیں دھان پان سی جسامت دی تھی اس
لیے نہ صرف اپنی عمر سے کافی چھوٹے بچوں کے برابر
لگتیں بلکہ اُن کے ساتھ کھیتی کودتی رہتیں۔ اُن کی ہم عمر
لڑکیاں کب کی بیاہ کر دو تین بچوں کی مائیں بن چکی
تھیں۔ اُس وقت کے حساب سے اُن کی شادی کی عمر
نکلے جارہی تھی مگر اُن کے والدین کو اپنی لاڈلی کی شادی
کی کچھ فکر نہ تھی۔ انہیں اپنی بیٹی کے لیے کوئی لڑکا ہی پسند
نہیں آتا تھا۔ آخر جب اُن کے والدین حج پر جانے کی
تیاری کرنے لگے تو گاؤں کے مولوی صاحب نے انہیں
سمجھایا کہ جوان بیٹی کی موجودگی میں وہ حج پر نہیں جا

وہ پیاسے جھونکے بہت پیاسے لوٹ جاتے ہیں
جو دور دور سے بادل اڑا کے لاتے ہیں

کوئی لباس نہیں دل کی بے لہاسی کا
اگرچہ روز نئی چادریں چڑھاتے ہیں

خلوصِ شبنم و نکبت ' وفورِ آتشِ گل
وہ ہونٹ جو مری پلکوں پہ کپکپاتے ہیں

یہ بات کیوں کہی مجھ سے سکوتِ دریا نے
چراغِ پانی میں اکثر بہائے جاتے ہیں

ستارے کھوئے ہوئے بچے ہیں جنہیں اکثر
وہ ساتھ کھیلے ہوئے دوست یاد آتے ہیں

میں دن ہوں میری جبین پر دُکھوں کا سورج ہے
دیے تو رات کی پلکوں پہ جھللاتے ہیں

جلا رہا ہے ستاروں کو انتظار مرا
مگر وہ اشک جو پلکوں پہ تھر تھراتے ہیں

انہی کے پاس ملیں گے کئی نوادرِ غم
وہ قافلے جو رو دل پہ آتے جاتے ہیں

مگاب سا وہ بدن کیا ' ہوائے درد میں تو
گھنے درختوں کے جنگل بھی سُکھ جاتے ہیں

بشیرِ بدر

سکتے۔ پہلے وہ بیٹی کے فرض سے سبکدوش ہوں پھر ج ک
سفر رہیں لہذا مجبوراً والدین کو اُن کا بیاہ رچانا پڑا۔ اُن
سے کافی کم عمر لڑکے کے ساتھ میری دادی کی شادی
ہوگئی۔ اُس لڑکے کے والدین حیات نہ تھے صرف
بوڑھی دادی تھیں۔ یوں سسرال میں بھی آگے پیچھے روک
ٹوک والا کوئی نہ تھا۔ لڑکا نو عمر اور دبوسم کا تھا اس لیے
پردادی کو یہاں بھی گھر جیسا راج مل گیا۔ پردادی شوہر
کی دادی کو تو بالکل خاطر میں نہ لاتیں۔ شوہر کو ہمیشہ بچوں
کی طرح ٹریٹ کرتیں۔ جب وہ پہلی مرتبہ ماں بننے کے
مرتبے پر فائز ہوئیں تو بجائے خدا کا شکر ادا کرنے کے
انہوں نے بہت شور مچایا کہ وہ یہ بچہ پیدا نہیں کریں گی۔
وہ ماں بن کر بچوں کی ذمہ داریاں نبھانا بوجھ سمجھتی تھیں۔
انہیں تو زندگی کا ہر کام ہی بوجھ لگتا تھا۔ ماں نے لاڈ پیار
میں گھر کے کام کاج بالکل نہ سکھائے تھے اس لیے یہاں
تاحال کھانا پکانے کی ذمہ داری شوہر کی دادی کی ہی تھی۔
اُس وقت بچہ ضائع کرنے کی دوا میں یوں دستیاب نہ
تھیں لہذا پردادی کے ناچاہنے کے باوجود بیٹا پیدا ہو گیا
جس کی انہیں ذرا خوشی نہ ہوئی۔ خدا کی شان بختا وہ بچوں
سے بھاگتی تھیں خدا اتنا ہی اُن پر مہربان تھا۔ کچھ ہی
سالوں میں وہ چار بیٹوں اور تین بیٹیوں کی ماں بن گئیں
مگر وہ بچے جن حالوں میں پلے بڑھے وہ ایک الگ
داستان ہے۔ جیسے ہی لڑکیاں کچھ بڑی ہوئیں انہوں نے
گھر سنبھال لیا۔ اُن ہی دنوں پردادی کی چچی بستر مرگ
پر پڑی اپنی اکلوتی سکھڑ بیوہ بیٹی کا دوبارہ گھر بسانے کی
کوششیں کیں۔ پردادا جب بھی اپنی چچی کی تیار داری کے
لیے جاتے اُن سے اپنی بیٹی کے کسی مناسب رشتہ
ڈھونڈنے کی بات کرتیں۔ باوجود تلاش کے جب کوئی
رشتہ نہ ملا تو پردادا جو پہلے ہی پردادی کی بدسلوکی اُچارہ
داری اور پھو ہڑ پن کی وجہ سے چھٹکی اور بد مزہ زندگی جی
رہے تھے انہوں نے اپنے چچا کی بیوہ بیٹی کا ہاتھ تمام کر
چچی کی پرسکون موت کی راہ ہموار کر دی۔ جب پردادی کو
شوہر کی دوسری شادی کا علم ہوا تو انہوں نے طوقان کھڑا
کر دیا۔ وہ خوب روئی پٹنی پردادا کو کوسا برا بھلا کہا کئی
دن تک سوگ منایا۔

وہ برملا کہتیں۔ "اس کا جرم ناقابلِ معافی ہے یہ
میرے قدموں میں گر کر بھی معافی مانگے میں تب بھی

معاف نہیں کروں گی۔" سب سے پہلے تو پردادا کا گھر
میں داخلہ ممنوع قرار دیا گیا مگر پردادا کو کوئی فکر نہ تھی۔ وہ
اپنی نئی زندگی اور نئی بیوی سے خوش تھے۔ قسمت نے ان
کو ان کی ہم عمر اور سکھڑ بیوی دے دی تھی لہذا انہیں
گھر بدری سے کچھ فرق نہ پڑا مگر انہوں نے اپنی اولاد
اور اپنی اتنا پرست بیوی سے منہ نہیں موڑا بلکہ اُن کا نان
نفقہ پہلے سے بھی بڑھ کر پورا کرتے رہے۔ اپنی اولاد
کی ضروریات اور تربیت سے بھی غافل نہ ہوئے اور
وقت آنے پر اُن کے فرائض بھی نبھاتے رہے اس لیے
اولاد اُن کی دوسری شادی اور اُن سے کبھی متنفر نہیں
ہوئی۔

گزر تے وقت کے ساتھ خدا نے پردادا کو دوسری
بیوی سے بھی چار بچوں سے نواز دیا تھا پھر پردادا بیمار پڑ
گئے۔ اس وقت انہوں نے شدت سے پردادی سے ملنے
اور زندگی بھر کی ناراضگی ختم کرنے کی آرزو کی۔ پہلے
اولاد سے کہلوا یا مگر پردادی اس سے مس نہ ہوئیں پھر
انہوں نے خاندان کے ایسے حضرات کو کہا جن کے
بارے میں پردادا کو گمان تھا کہ پردادی اُن کی بات نہیں
ٹالیں گی مگر اُس اتنا پرست عورت نے کسی کی بھی نہ مانی۔
پردادا اُن کے منتظر ہی رہے اور اُن کی راہ دیکھتے دیکھتے
ہسپتال میں چل بسے۔ وہ سنگدل عورت وقتِ آخر اپنے
شوہر کا منہ دیکھنے بھی نہ گئی۔ لوگوں نے بہت باتیں
بنائیں برا بھلا کہا مگر اُس پر کچھ اثر نہ ہوا۔ میری پردادی
کے ہم عمر تو کیا اُن کی بعد کی دوسلوں کے تمام لوگ بھی
گزر گئے ہیں۔ اُن کے بڑپوتوں میں صرف میں بچا
ہوں۔ اب اُن کی ساتویں نسل یعنی میرے پوتے کا بچہ
بھی اس دنیا میں آنے والا ہے۔ پوتے کی بیوی تازک
مزاج اور تک چڑھی ہے اب وہ ان کا وجود گھر میں
برداشت نہیں کر رہی۔ میں بھی کبھار سوچتا ہوں پردادی
کو اپنی ماں کی دعا لگی ہے کہ میری بیٹی! تو دو سو سال جیے
یا اُن کے شوہر کے دل سے نکلنے والی کسی بددعا کا اثر ہے
کیونکہ انہوں نے شوہر کو کبھی سکھ نہیں دیا جنہوں نے
مرتے دم تک اُن کے ہاتھوں ذلت اٹھائی۔ میرے
پوتے کہتے ہیں۔ "دادا کی پردادی نے کہیں سے آبِ
حیات پی لیا ہے۔" یہاں تک کہہ کر بزرگ خاموش ہو
گئے۔ "اچھا" میں چلتا ہوں کل اپنی پردادی کو لے کر

آؤں گا۔" وہ اٹھ کھڑے ہوئے۔ میں بھی پردادی کی
داستان میں ایسی کھوئی کہ وقت گزرنے کا احساس ہی نہ
ہوا۔ عظمیٰ کو پندرہ منٹ کا کہہ کر آئی تھی گھڑی دیکھی تو
آدھا گھنٹا گزر چکا تھا۔ میں جلدی سے عظمیٰ سے نظریں
ملائے بغیر اپنی سیٹ پر جا کر بیٹھ گئی اور اپنے کام میں
مشغول ہو گئی۔

دوسرے دن میں صبح سے ہی اُن بزرگواری کی منتظر تھی
مگر وہ آ کر ہی نہ دے رہے تھے۔ تقریباً بارہ بجے وہ
بزرگ گیٹ سے داخل ہوئے نظر آئے۔ اُن کے ہاتھ
میں قدرے بڑی نوکری تھی۔

کاؤنٹر پر پہنچ کر سلام کے بعد انہوں نے کہا۔ "میں
پردادی کو لے آیا ہوں۔"

"لے آئے ہیں تو اندر لے آئیے۔" عظمیٰ نے بھی
اشتیاق سے کہا۔ انہوں نے نوکری کاؤنٹر پر رکھ دی جس
میں کپڑے کے اندر لپٹی کوئی چیز رکھی تھی۔ آج پھر ہم
دونوں کو اُن بزرگواری کی ذہنی صحت پر شبہ ہوا۔ اتنے میں
انہوں نے جلدی سے نوکری کے اوپر سے کپڑا ہٹایا۔
نوکری میں موجود وجود دیکھ کر میری اور عظمیٰ کی بے اختیار
چٹخ نکل گئی ڈیڑھ یا دو سال کے بچے کے برابر جسم رکھنے
والی نام نہاد بالوں والے سر اور مرغی کے برابر آنکھوں
والی عورت ایسی ہلکی آواز میں کچھ کہہ رہی تھی۔ اُس کا جسم
سکڑ کر نہایت چھوٹا ہو چکا تھا۔ انتہائی جھریوں زدہ کھال
اور صرف ہڈیاں گوشت کا کہیں نام نہ تھا مگر خدا اس
وجود کو زندہ رکھے ہوئے تھا۔ اس میں خدا کی کیا مصلحت
تھی یہ کسی دعا کا اثر تھا یا کسی آہ کا اور والا ہی بہتر جان
سکتا ہے۔ وہ بزرگ محترم اپنی پردادی کو ادارے کے
حوالے کر کے رخصت ہو گئے۔ اپنی جوانی میں سب کچھ
کر گزرنے والے انسان کا یہ انجام دیکھ کر میں کئی دن تک
خوفِ خدا سے لرزتی رہی تھی۔ کچھ عرصہ بعد مجھے ایک اور
بہتر ادارے میں جاب مل گئی اور میں نے ٹرسٹ والی
جاب چھوڑ دی۔ ابھی کبھار عظمیٰ کو فون کر کے پوچھ لیتی کہ
کیا وہ پردادی اب بھی زندہ ہے؟ تو جواب ہمیشہ ہاں
میں ہی ملتا۔ گزشتہ سال عظمیٰ کی بھی شادی ہو گئی۔ اُس
نے وہ جاب بھی چھوڑ دی ہے اس لیے اب کچھ معلوم نہیں
کہ پردادی مر گئی ہے یا ابھی.....!

خلق خدا کی بھلائی کے لیے مفید معلوماتی سلسلہ

محترم قارئین! ”مسئلہ یہ ہے“ کا سلسلہ خلق خدا کی بھلائی اور روحانی معاملات میں اُن کی رہنمائی کے جذبہ سے تحت ماہنامہ ”پچی کہانیاں“ کے اولین شمارے سے شامل اشاعت ہے۔ گزشتہ برسوں میں ان صفحات پر تحریر و تجویز کردہ وظائف اور دعاؤں سے بلاشبہ لاکھوں افراد نے نہ صرف استفادہ کیا بلکہ اس مادی دنیا میں آیات قرآنی اور ان کی روحانی طاقت کے حیران کر دینے والے معجزے دیکھے۔ جیسے جیسے لوگوں کو ان وظائف سے فائدہ ہوتا رہا، اُسی تناسب سے ہر ماہ موصول ہونے والے خطوط کی تعداد میں اضافہ ہوتا گیا پھر صورت حال یہ ہو گئی ہے کہ اگر ماہنامہ ”پچی کہانیاں“ میں خطوط کے جوابات دینے پر اکتفا کیا جاتا تو قارئین کو اپنے جوابات کے لیے کئی کئی ماہ انتظار کرنا پڑتا کیوں کہ پرچہ میں صفحات کی تعداد بہ ہر حال محدود ہے۔ ان ہی حقائق کو دیکھتے ہوئے فوری نوعیت کے مسائل کے جوابات بہ راہ راست ارسال کرنے کا سلسلہ شروع کیا گیا لیکن اتنے زیادہ خطوط کو سنبھالنا اُن کا ریکارڈ مرتب کرنا اور انہیں سپردِ ڈاک کرنا خاصا وقت طلب کام ہے جو مجھ ایسے آدمی کے لیے کسی طور ممکن نہیں۔ ان صفحات کی ترتیب و تدوین اور بہ راہ راست جوابات کے لیے میرا معاوضہ پاکستان کی سلامتی، قومی یکجہتی کی دعا اور مسلمان و مسلمات (خواہ وہ زندہ ہوں یا مردہ) کے لیے دعائے خیر ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ دعائے خیر سے بڑا معاوضہ اور قیمتی تحفہ کوئی کسی کو کیا دے سکتا ہے؟ قارئین کے خطوط کی بڑھتی ہوئی تعداد کے پیش نظر ادارے کو باقاعدہ اشاف رکھنا پڑا ہے جو خطوط کا ریکارڈ مرتب کرنے اور انہیں سپردِ ڈاک کرنے کا ذمہ دار ہے۔ اگر آپ اپنے مسئلے کا فوری جواب چاہتے ہیں تو ازراہ کرم جوابی لفافے کے ساتھ 300/= روپے کا منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ ماہنامہ ”پچی کہانیاں“ کے نام ارسال کر دیں۔ یہ رقم اُن افراد کی تنخواہ کی مد میں آپ کی امداد ہوگی جو اس شعبے سے متعلق ہیں۔ منی آرڈر کی رسید اور ڈرافٹ بھیجنے کے علاوہ خط میں منی آرڈر کی رسید اور بینک ڈرافٹ نمبر ضرور تحریر کریں۔ صاحب استطاعت حضرات ٹوکن منی 300/= روپے کو آخری حد تک سمجھیں وہ حسب استطاعت اس رقم میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ یہ رقم اُن خواتین کے کام آئے گی جو ملک کے دور دراز علاقوں میں رہتی ہیں اور جن کے لیے منی آرڈر یا بینک ڈرافٹ بھیجنا ممکن نہیں ہے۔ خطوط بھیجنے سے پہلے درج ذیل باتوں کا خیال رکھیں۔

- (1)..... مسئلے کے ساتھ اپنا اور اپنی والدہ کا نام ضرور تحریر کریں۔ اصل نام کی اشاعت مقصود نہ ہو تو خط فرضی نام سے شائع کیا جائے گا۔ فرضی ناموں سے جھوٹے خطوط نہ بھیجیں ورنہ فائدے کی بجائے نقصان کا احتمال ہے۔
- (2)..... منی آرڈر بینک ڈرافٹ ماہنامہ ”پچی کہانیاں“ کے نام ارسال کریں۔
- (3)..... اپنا مسئلہ صاف اور واضح الفاظ میں کاغذ کے ایک طرف تحریر کریں۔

ماہنامہ ”پچی کہانیاں“ 110 ”آدم آریکڈ“ شہید ملت روڈ۔ کراچی۔

□ شاہین اختر۔

☆ بیٹی! تمہاری خواہش پر مسئلہ شائع نہیں کر رہا۔ بیٹوں کی بے حسی کے بارے میں جان کر دکھ ہوا مگر تم نے کبھی سوچا ہے کہ وہ ایسے کیوں ہیں؟ دراصل انہوں نے اپنے باپ کو اپنی ماں کی جانب بہت بے حس پایا۔ تمہارے شوہر کے رویے کی بدولت آج وہ ایسے ہیں۔ بہر حال نرمی اور محبت سے سمجھاؤ۔ ہر نماز کے بعد الحمد شریف اور چاروں قل پڑھ کر تصور میں تینوں پر دم کر دیا کرو۔ برے رویے برائے نتیجہ ہی لاتے ہیں۔ آج وہ باپ کو بھی نہیں پوچھ رہے یہ سب باپ کا ہی بویا ہوا ہے جو بڑھاپے میں کم دونوں کاٹ رہے ہو۔ اللہ سے دعا کرو کہ وہ سدھر جائیں اور برائی کا سلسلہ یہیں رک جائے۔ مجھے حالات سے آگاہ رکھنا۔

□ وسیم سراج، میرپور خاص۔

○ جناب محترم باباجی! السلام علیکم! بعد سلام عرض ہے کہ میں آپ کا کالم ”مسئلہ یہ ہے“ بڑے شوق اور دلچسپی سے مطالعہ کرتا ہوں۔ آپ کے پچی کہانیاں جون 2013ء میں ایک خاتون رابعہ احمد کراچی کا مسئلہ نظروں سے گزرا جن کی 3 بیٹیاں اور ایک بیٹا ہے۔ میں نے اپنی والدہ کو بھی بتایا تو میں ان کی اجازت سے آپ کو یہ خط تحریر کر کے عرض کر رہا ہوں کہ میری والدہ محترمہ رابعہ کی بچیوں کو اپنی بہویں بنا کر لانا چاہتی ہیں۔ باباجی! ہم ذات کے سچ ہیں۔ اجیر شریف سے تعلق ہے۔ ہم چار بھائی اور دو بہنیں محسن مگر رضائے الہی سے ایک بہن کا 2012-10-06 کو انتقال ہو گیا ہے۔ اب ایک بہن ہے جو کہ شادی شدہ ہیں۔ میں گورنمنٹ ملازم ہوں بلدیہ میرپور خاص میں۔ ہم میرپور خاص میں رہتے ہیں۔ گھر اپنا ہے۔ والد صاحب کا انتقال ہو گیا ہے۔ بڑے بھائی کراچی کورنگی نمبر 6 میں شفٹ ہیں اور ایک بھائی کوریر کمپنی میں کلرک ہے۔ (O.C.S.) میں پی اے پاس ہوں۔ قرآن شریف پڑھا ہوا ہوں۔ بھائی ایم اے اے کیے ہوئے ہیں۔ باباجی! ہماری والدہ ہم دونوں بھائیوں کی شادی کے لیے رابعہ احمد کی بیٹیوں کو اپنے گھر کی بیٹی بنانا چاہتی ہیں اور ہمیں کوئی جہیز وغیرہ نہیں چاہیے۔ انشاء اللہ تعالیٰ رابعہ احمد اور

اُن کی بیٹیوں کو یہ رشتہ طے کر کے خوشی حاصل ہوگی اور اُن کی بچیاں اللہ کے فضل و کرم سے خوش و خرم زندگی گزاریں گی۔

☆ بیٹے وسیم! تمہیں براہ راست بھی جواب دے رہا ہوں اور کالم میں بھی تمہارا خط شائع کر دیا ہے۔ مذکورہ خاندان اگر چاہے گا تو وہ تم سے خود رابطہ کرے گا۔ بچیوں کے کوائف اور پتے کسی کو بھی نہیں دیے جاتے۔ بہر حال بیٹے! تمہاری سوچ بہت اچھی ہے۔ اللہ تمہیں اس کا اجر ضرور دے گا۔

□ شازیہ عالم۔ بگرام۔

○ السلام علیکم! باباجی! امید ہے آپ خیریت سے ہوں گے۔ میں نے اسکول نہیں پڑھا ہے اور نہ مجھے تحریر پڑھنا آتی ہے۔ میں یہ خط کسی اور لڑکی کے توسط (ذریعہ) سے لکھوا رہی ہوں۔ باباجی! میرا مسئلہ یہ ہے کہ میری شادی ابھی تک نہیں ہوئی ہے اور صرف ایک آدھ رشتہ آنے کے بعد پھر میرا رشتہ نہیں آیا۔ باباجی! میں اتنی بری نہیں ہوں، جاذبِ نظر ہوں لیکن پھر بھی رشتہ کیوں نہیں آتا؟ میں بہت پریشان ہوں۔ پلیز! میری مدد کریں یعنی مجھے کوئی آسان سا وظیفہ یا تعویذ دیں۔ میں عمر بھر آپ کی احسان مند رہوں گی۔ میری عمر 28 سال ہے۔ اگر آپ اس خط کو رسالے میں جگہ دیں تو اچھی بات ہے ورنہ صرف خط کا جواب دیں تو بہت مہربانی ہوگی۔

☆ بیٹی شازیہ! اللہ تمہیں خوش رکھے۔ تعویذ میں تیار کر دوں گا۔ اس کے لیے مجھے مکمل پتے کے ساتھ جوابی لفافہ ارسال کرو۔

□ بدر عالم۔ سکھر۔

○ باباجی! السلام علیکم! جس طرح آپ دیکھی انسانوں کی خدمت کرتے ہیں اللہ آپ کو اس کا اجر دے۔ (آمین!) باباجی! میں نے دو سال پہلے کرائے کی دکان لی تھی۔ میں نے دکان میں بچوں کی چیزیں ثانی، چاکلیٹ، بسکٹ وغیرہ رکھے ہیں۔ دکان کا کرایہ 2,500 نکال کر میرے پاس 3,000 روپے بچتے تھے۔ میں نے دکان میں موبائل کے کارڈز اور ایزی لوڈ کا اضافہ کیا تاکہ میری آمدنی میں اضافہ ہو۔ پہلے پہلے یہ کام خوب چلا پھر ٹھنڈا ہو گیا۔ رمضان میں پکڑے

سمو سے اور کھلے پھینک بھی لگائے کہ ان میں کچھ بچت ہو جائے لیکن وہ بھی نہیں چلے۔ باباجی! اب میں دکان میں مال بڑھانے سے بھی ڈرتا ہوں کہ جتنا بھی مال بڑھا لوں بچت وہی کراپہ نکال کر 3,000 سے 3,500 روپے تک ہی ہوتی ہے۔ باباجی! میری روزی میں رکاوٹ ہے یا کسی نے بندش کروائی ہے؟ آپ استخارہ کر کے بتائیں اور جو بھی وظیفہ دیں اس کے پڑھنے کی تعداد کم ہو جو میں آسانی کے ساتھ پڑھ سکوں۔ باباجی! اب میں سوچتا ہوں کہ میری امی گھر میں کھانا بنا دیں تو میں دکانوں میں نفن دے آؤں لیکن باباجی! ڈر لگتا ہے کہ اگر پکڑوں اور سوسوں کا نقصان ہو گیا تو ہمارا سارا پکا ہوا کھانا بے کار جائے گا۔ باباجی! میں اپنے والدین کا اکلوتا ہوں۔ بی اے کا امتحان دیا ہے۔ دُعا کریں میرا رزلٹ اچھا آئے۔ باباجی! اگر تعویذ کی ضرورت ہو تو وہ بھی بتادیں کہ تعویذ کس طرح منگواؤں؟ باباجی! وظیفہ زیادہ بڑا نہ ہوا تاہو کہ میں آسانی کے ساتھ پڑھ سکوں۔ میری روزی کے دروازے کھل جائیں تاکہ میں اپنے والدین کی خدمت کر سکوں اور گھر میں خوش حالی آجائے۔

☆ بیٹے بدر! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود براہِ یہی کثرت سے پڑھا کرو۔ بیٹے! ایک بات ذہن میں اچھی طرح بٹھالو کہ ہر کام میں اللہ تعالیٰ کی کوئی مصلحت ہوتی ہے۔ وقتی ناکامیوں سے دلبرداشتہ ہونے کی ہرگز ضرورت نہیں۔ تعویذ منگوانے کے لیے تفصیل درکار ہوتی ہے۔ تم مجھے اپنا مکمل نام مع والدہ ارسال کرو۔ جوابی لفافے پر واضح پتا لکھو تاکہ تمہیں تفصیل ارسال کی جاسکے۔

□ محمد امجد۔ ساہیوال۔

○ باباجی! سلام کے بعد عرض ہے کہ آپ اللہ کے فضل و کرم سے خیریت سے ہوں۔ باباجی! بات کچھ اس طرح سے ہے کہ میں نے جب سے ہوش سنبھالا ہے دُکھوں کو اپنے ارد گرد دیکھ رہا ہوں۔ اللہ نے میرے والد کو اتنی دولت دے رکھی ہے کہ ان کا شمار علاقے کے دولت مند ترین لوگوں میں ہوتا ہے۔ ان کے پاس پیسے کی ریل پیل ہے مگر اس کے باوجود وہ اتنے کنبوس ہیں کہ

میں بتا نہیں سکتا۔ باباجی! اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ جہاں پر اس نے ہمیں اتنا کنبوس باپ دیا ہے وہیں پر اس نے ہمیں انتہائی محبت کرنے والی حوصلہ مند ماں بھی دی ہے۔ شاید آپ سوچ رہے ہوں گے کہ میں اپنے باپ کے خلاف اتنا کیوں ہوں؟ تو بات یہ ہے کہ ان کے پاس دولت تو ہے مگر ہمارا گھر انتہائی خستہ حال ہے جہاں میں اپنے کسی دوست کو بلا بھی نہیں سکتا۔ گھر کی حالت سے مفلسی اور عسرت ظاہر ہوتی ہے تو پھر یہ دولت کس کام کی ہے؟ آج تک کسی بیٹے نے اپنے باپ پر لعنت نہیں بھیجی ہوگی مگر میں اپنے باپ پر اور اس کی دولت پر لعنت بھیجتا ہوں۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہ بات بات پر میری ماں سے جھگڑتا ہے اسے انتہائی بے دردی سے مارتا ہے۔ ماں کی اذیت بھری کراہیں مجھ سے برداشت نہیں ہوتیں اسی تشدد کی وجہ سے میری ماں نے کئی مرتبہ خودکشی کرنے کی کوشش کی مگر اللہ نے اس کو بچا لیا۔ باباجی! میں یہ کہتا ہوں کہ اگر میری ماں کو کچھ ہو گیا تو میں اپنے باپ کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔ آپ مجھے کوئی ایسا جلائی وظیفہ بتائیں کہ جس کے کرنے سے ہم اپنا گھر بنانے میں کامیاب ہو جائیں بلکہ میرے والد کے دل کو اللہ تعالیٰ کر دے اور باباجی! آپ بھی ہمارے لیے دُعا کریں کہ اللہ ہمیں بھی خوشی کے دن دکھائے۔ (آمین!)

☆ بیٹے امجد! اللہ تمہارے مسائل حل فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت کثرت سے پڑھا کرو۔ ہمارا مذہب ہمیں توازن کی نصیحت کرتا ہے۔ زندگی کے ہر معاملے میں اعتدال کا راستہ اپنانا چاہیے۔ ہم سب کو یہی دُعا کرنی چاہیے کہ اللہ اپنے تمام بندوں کو عقل سلیم عطا فرمائے۔ کچھ بھی ہے وہ تمہارے والد ہیں ان کے بارے میں برامت سوچو۔ والدہ کو سمجھاؤ زندگی اللہ کی امانت ہے اس کی حفاظت کریں۔ رزق کا وعدہ اللہ کا ہے لہذا بے فکر رہو۔ والد اور والدہ دونوں کا خیال رکھو اور اللہ سے مدد مانگتے رہو۔ والدہ سے کہو نماز فجر اور عشاء کے بعد اول و آخر تین تین مرتبہ دُرود شریف کے ساتھ 11-11 بار سورۃ فاتحہ پڑھیں۔ مدت 41 دن ہے۔ تم خود بھی ہر وقت با وضو رہنے کی کوشش کرو اور درود شریف کے ساتھ اٹھتے بیٹھتے یا غفار پڑھتے رہا کرو۔

□ ریحانہ۔ جہانیاں۔

○ السلام علیکم! باباجی! اس سے پہلے بھی میں نے کئی مرتبہ آپ کو خط لکھے اور آپ نے میرے مسائل کو حل کیا۔ باباجی! میری عمر 40 سال ہے اچانک میرے منہ پر داڑھی اور مونچھوں والی جگہ بال نکل رہے ہیں۔ میں بہت پریشان ہوں۔ مجھے بال مستقل ختم کرنے کا نسخہ بتائیں تاکہ میں اس پر عمل کروں۔ اگلے شمارے میں ضرور میرے لیے نسخہ لکھ دیجیے گا۔ بہت بہت شکریہ!

☆ بیٹی ریحانہ! تمہارا مسئلہ شدید نوعیت کا نہیں۔ اب تو سائنس نے بہت ترقی کر لی ہے۔ اس کے لیے کئی وظیفے یا تعویذ کی ضرورت نہیں ہے۔ تم کسی اچھے بیوی پارلر سے رابطہ کرو۔ اس مسئلے کے لیے بڑے بیوی پارلر میں جدید مشینیں آگئی ہیں۔ کچھ خواتین گرم ویکس بھی استعمال کرتی ہیں لیکن پارلر میں خاتون کا تجربے کا ہونا ضروری ہے۔

□ ثارم۔ خانیوال۔

○ باباجی! السلام علیکم! امید کرتی ہوں کہ آپ خیریت سے ہوں گے۔ باباجی! میری عمر 18 سال ہے۔ میں خانیوال سے تعلق رکھتی ہوں۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ میں ایک لڑکے کو چاہتی ہوں وہ ہمارے خاندان سے تعلق رکھتا ہے لیکن وہ کسی اور کو چاہتا ہے اور میں اس کی چاہت میں گرفتار ہو چکی ہوں۔ اس لڑکے کے پاس کسی رشتے دار خاتون نے کافی جادو تعویذ وغیرہ کیے ہیں اور وہ اسی کی باتوں پر عمل کرتا ہے۔ باباجی! مجھے کوئی ایسا وظیفہ بتائیں جس سے میری شادی اس کے ساتھ ہو جائے۔ یہ وظیفہ میں عشاء کی نماز کے ساتھ کر سکوں گی۔ باباجی! میں آپ کو ہمیشہ دُعا میں دیتی رہوں گی۔ باباجی! میرا دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میرے بھائی بہت سخت ہیں وہ ذرا ذرا سی بات پہ ہماری بے عزتی کر دیتے ہیں۔ باباجی! مجھے ایسا وظیفہ بتائیں کہ وہ ہم سے پیار کریں اور انہیں کوئی اچھی سی نوکری مل جائے۔ میں آپ کی بہت شکر گزار ہوں گی۔

☆ بیٹی ریحانہ!..... اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور بہ کثرت پہلے کلمے کا ورد کرو اور ہر نماز کے بعد 121 مرتبہ یا لطیف کا ورد کیا کرو

اور دُعا کرو۔ رزق میں برکت کے لیے یا غنی یا مغنی کا بہت ورد کرو۔ مدت 2 ماہ ہے۔

□ ساجدہ خاتون۔ لاہور۔

○ محترم باباجی! السلام علیکم! میرا یہ پہلا خط ہے اور میرا مسئلہ بہت بڑا ہے۔ میری شادی کو 12 سال ہو گئے ہیں اور میں اولاد کی نعمت سے اب تک محروم ہوں۔ ہم میاں بیوی تمام ٹیسٹ کروا چکے ہیں۔ میں اپنی جگہ ٹھیک ہوں خرابی میرے شوہر میں ہے۔ انہوں نے کافی علاج کرایا لیکن بات نہیں بنی۔ باباجی! میں بہت پریشان ہوں میں اپنے شوہر سے بہت پیار کرتی ہوں اور ان کو الزام نہیں دیتی بس صبر کرتی ہوں۔ میرے شوہر بھی اس بات پر بہت پریشان ہیں۔ اتنی ٹینشن ہے کہ ہائی بلڈ پریشر اور شوگر جیسے مرض میں مبتلا ہو چکے ہیں۔ میں ان کی وجہ سے بھی بہت پریشان ہوں۔ آپ کے بارے میں پڑھ چکی ہوں کہ آپ خلق خدا کی خدمت کرتے ہیں سو اپنا مسئلہ لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوں۔ مہربانی کر کے کوئی اچھا سا وظیفہ ارسال کر دیں۔ زندگی بھر دُعاؤں میں یاد رکھوں گی۔ میرے اور میرے شوہر کے لیے دُعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں اولاد کی نعمت سے نوازے۔ (آمین!) میرا دوسرا مسئلہ میرے بھائی کا ہے۔ میرے بھائی کی کوئی مستقل ملازمت نہیں ہے۔ فی الحال سروے کا کام کرتے ہیں۔ تنخواہ بھی زیادہ نہیں۔ دو بچے ہیں۔ گزارہ بہت مشکل سے ہوتا ہے۔ مہینے کا آخر تو ہمیشہ ادھار پر چلتا ہے۔ ان کے لیے بھی کوئی اچھا سا وظیفہ دیں۔ ہمیشہ آپ کی شکر گزار رہوں گی۔

☆ بیٹی ساجدہ! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف کثرت سے پڑھا کرو۔ جو شخص اللہ کو راضی کر لیتا ہے وہ کامیاب رہتا ہے۔ بیٹی! اولاد کے لیے تعویذ دیتا ہوں تم مجھے جوابی لفافے کے ہمراہ خط لکھو میں تفصیل ارسال کر دوں گا۔ جہاں تک دوسرے مسئلے کا تعلق ہے تو اپنی بھابی سے کہو بعد نماز مغرب سورۃ واقعہ ضرور پڑھیں۔ اللہ تعالیٰ کرم فرمائے گا۔

□ مسز یاسمین۔ اسلام آباد۔

☆ بیٹی یاسمین! تم نے جو اپنی کیفیت لکھی ہے وہ

معدے کی خرابی کی وجہ سے ہے۔ پانی بہت زیادہ پیا کرو یعنی دن میں کم سے کم دس سے بارہ گلاس! پانی سبزیاں اور پھل بہ کثرت استعمال کرو۔ بعد نماز فجر ایک بار سورۃ رحمن پڑھ کر پانی پر دم کر دیا کرو اور یہ پانی دن بھر استعمال کرو۔
□ نسرین رحمان۔ کراچی۔

☆ بیٹی نسرین! اللہ تمہاری والدہ کو اولاد کا سکھ نصیب کرے۔ بیٹی! تمہیں براہ راست بھی خط لکھا ہے مگر تم خط پر پتا نامکمل لکھتی ہو۔ شہر کا نام نہیں ہوگا تو خط کیسے پہنچے گا؟ بہر حال بیٹی! تم ہمیں وظیفہ مل کے کرلو۔ سورۃ احزاب بعد نماز فجر پڑھیں اور دو ہمیں بعد نماز عشاء پڑھیں انشاء اللہ ضرور گرم ہوگا۔ مدت 41 دن ہے اور مجھے تفصیلات سے آگاہ کرنا۔
□ رضوانہ۔ حیدرآباد۔

☆ بیٹی رضوانہ! پہلے تو تم پنج وقتہ نماز کی پابندی کرو اور نمازیں اول وقت میں پڑھا کرو۔ اس کے ساتھ آیت الکرسی نماز عشاء کے بعد پڑھتی رہو۔ نماز فجر اور عشاء کے بعد 101-101 بار اول و آخر درود شریف 3-3 بار پھر حاجت بیان کرو۔ مدت 41 روز ہے۔
□ راشدہ میرانی۔ حیدرآباد۔

☆ بیٹی راشدہ! تمہارے حالات جان کر بہت دکھ ہوا۔ ہمت اور صبر سے حالات کا مقابلہ کرو۔ تمہیں اب اپنی اولاد کی خاطر ڈٹ کر کھڑا رہنا ہے۔ سب سے پہلے نماز کی پابندی رکھو اور جس قدر ممکن ہو یا اللہ یا رحمٰن کا ورد کیا کرو۔ کوشش کرو کہ ہر وقت با وضو ہو۔ یہ روز جمعہ بعد نماز ظہر ایک بار سورۃ یٰسین ضرور پڑھو۔ مدت 41 روز ہے۔
□ ماہ نور۔ لاہور۔

☆ بیٹی ماہ نور! اللہ تمہیں بے شمار خوشیاں دکھائے۔ نماز کی پابندی کی عادت ڈالو اور بہ کثرت یا مہجیب کا ورد کیا کرو۔ نماز فجر کے بعد ایک بار سورۃ مدثر پڑھو اور حاجات ایک ایک کر کے بیان کرو۔ یہی وظیفہ بعد نماز عشاء کرو۔ معاملات میں خاموشی رکھو۔ مجھے حالات سے آگاہ رکھنا۔ وظیفہ کی مدت 41 دن ہے۔
□ طاہرہ سعید۔ راولپنڈی۔

☆ بیٹی طاہرہ! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ

فرمائے۔ بیٹی! نماز کی پابندی رکھو اور کثرت سے درود شریف پڑھو۔ دن میں کم از کم 5 بار آیت الکرسی پڑھ کر اپنے اوپر دم کر لیا کرو یعنی ہر نماز کے بعد ضرور آیت الکرسی پڑھو۔ حسب استطاعت صدقہ خیرات ضرور کیا کرو۔ مجھے حالات سے آگاہ رکھو۔
□ ثمنہ۔ ملتان۔

☆ بیٹی ثمنہ! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف کثرت سے پڑھو۔ بیٹے کا تعویذ تم احتیاط سے رکھو ورد جاری رکھو۔ بیٹے سے کوئی بات باہر جانے کے بارے میں مت کرو۔ دوسرے بیٹے کا تعویذ مجھے روانہ کر دو۔ میں اسے دوسرا تعویذ بھیج دوں گا۔ پرانے تعویذ کی مدت ختم ہو چکی ہے۔ صدقہ خیرات خوب کرو۔ اللہ حامی و ناصر ہو۔
□ فرحانہ۔ مظفر گڑھ۔

☆ بیٹی فرحانہ! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور فارغ اوقات میں کثرت سے درود شریف کا ورد کیا کرو۔ بیٹی! تمہارے گھریلو حالات جان کر بہت دکھ ہوا۔ میری دعا ہے کہ اللہ سب کو اپنی ذمے داریاں بخیر و خوبی پوری کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ بیٹی! تم بعد نماز فجر ایک مرتبہ سورۃ رحمن کی تلاوت کر لیا کرو۔ اول و آخر درود شریف پڑھو پھر حاجت بیان کرو۔ مدت 41 دن ہے۔
□ رابعہ۔ ایبٹ آباد۔

☆ باباجی! میں آپ کی بہت بد نصیب بیٹی ہوں۔ 32 سال کی زندگی میں اتنے دکھ دیکھے ہیں کہ اب زندہ رہنے ہی کو دل نہیں چاہتا۔ اللہ نے مجھے مجھے اولاد کی نعمت سے نواز ہے۔ مجھے اپنی اولاد سے بہت محبت ہے مگر باباجی! مالی حالات اتنے خراب ہیں کہ میں اور بچے اکثر بھوکے ہی رہتے ہیں۔ شوہر نشے کی لعنت میں مبتلا ہے۔ حالات بہت خراب ہیں۔ میں ان پڑھ عورت ہوں رشتے دار بھی میرے جیسے ہی غریب ہیں۔ 5 بچے کون پال سکتا ہے؟ باباجی! میرے والد کہتے تھے کہ اللہ کی دنیا بہت بڑی ہے اور یہ اچھے لوگوں کی وجہ سے ہی چل رہی ہے مگر مجھے لگتا ہے کہ سب اچھے لوگ میرے والد کے ساتھ ہی مر گئے۔ اب صرف برے لوگ ہی زندہ ہیں

کیونکہ میں جس کے پاس بھی مدد مانگنے گئی، کبھی نے منع کر دیا۔ میں یہ خط اپنی ایک بیٹی سے لکھوا رہی ہوں اس نے سرکاری اسکول جا کر ٹوٹا پھوٹا لکھنا سیکھ لیا ہے۔ اللہ کرے آپ کو میری بات سمجھ آ جائے۔ مجھے کوئی ایسی دعا بتائیں جس کے پڑھنے سے اللہ مجھ سے راضی ہو جائے اور میرے بچے بھی سب کے بچوں کی طرح پیٹ بھر کر روٹی کھا سکیں۔

☆ بیٹی رابعہ! اللہ تمہاری مشکلات دور فرمائے۔ بیٹی! تم نے یہ کیسے سوچ لیا کہ اللہ تم سے راضی نہیں؟ اللہ اپنے پیارے بندوں ہی کو آزماتا ہے۔ نادار سختی افراد کا خیال یقیناً وہی لوگ رکھتے ہیں جو جنت میں گھر بنانا چاہتے ہیں۔ یقین رکھو دنیا میں بہت اچھے لوگ موجود ہیں اسی لیے یہ دنیا قائم بھی ہے۔ مایوس مت ہو کر ا وقت سدا نہیں رہتا۔ صبر اور مستقل مزاجی سے حالات کا مقابلہ کرو۔ نماز فجر اور عشاء کے بعد 33-33 بار الحمد شریف پڑھو اور دعا کرو۔ میں تمہارے لیے خصوصی دعا کا اہتمام کروا رہا ہوں۔ اپنا مکمل پتا مجھے ارسال کرو۔
□ سائرہ۔ ملتان۔

☆ باباجان! میری عمر صرف 19 سال ہے۔ گزشتہ 2 سال سے میرا وزن بہت تیزی سے بڑھ رہا ہے حالانکہ میں کھانے میں بہت احتیاط کرتی ہوں۔ ڈرنی ہوں کہ اگر وزن اسی طرح بڑھتا رہا تو کسی اور بیماری میں مبتلا نہ ہو جاؤں۔ میں نے سنا ہے کہ آپ وزن کم کرنے کی دوا دیتے ہیں۔ برائے مہربانی مجھے بھی طریقہ کار بتا دیں۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ باباجان! دوسرا مسئلہ میری نند کا ہے۔ اس کے چہرے پر بہت دانے نکل رہے ہیں اس کے لیے بھی دوا دے دیں۔

☆ بیٹی سائرہ! مجھے اپنا موجودہ وزن ضرور تحریر کرو۔ دوا میں تیار کر دوں گا۔ اس کے لیے مجھے اپنا پتہ ارسال کرو۔ ادویات کتنے عرصے کے لیے چاہئیں یہ بھی تحریر کرو۔ انشاء اللہ ضرور فائدہ ہوگا۔
□ محمد عالم۔ پورے والا۔

☆ باباجی! میں ایف۔ اے میں پڑھتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ بہت تعلیم حاصل کروں مگر جو بھی پڑھتا ہوں بھول جاتا ہوں۔ پیچھے کے سوال کا جواب بھی نہیں دے

پاتا حالانکہ مجھے جواب آتا ہے۔ بہت جلدی گھبرا جاتا ہوں اور پسینہ پسینہ ہو جاتا ہوں۔ لڑکے میرا مذاق اڑاتے ہیں۔ باباجی! اگر یہی حالات رہے تو میں کیسے پڑھ سکوں گا؟ شاید میرا مسئلہ آپ کو بہت اہم نہ لگے مگر میرے لیے زندگی موت کا مسئلہ ہے۔ خدا کے لیے میری مدد کریں۔

☆ بیٹے عالم! میں جانتا ہوں کہ تمہارا مسئلہ بہت اہم ہے کیونکہ اس پر تمہارے مستقبل کا دار و مدار ہے۔ تم سب سے پہلے تو اپنی پڑھائی پر توجہ دو۔ اگر دن میں 4 گھنٹے پڑھتے ہو تو اب 8 گھنٹے پڑھو یعنی دو گنا وقت دو۔ نماز پابندی کے ساتھ ادا کیا کرو۔ رات کو سونے سے قبل ایک گلاس گرم دودھ ضرور پیو۔ نہار منہ 3-4 با دام اچھی طرح چبا کر کھالیا کرو۔ رب زدنی علما اور نصر من اللہ فتح قریب کا بہت ورد کیا کرو۔

□ ثریا۔ بہاولپور۔
☆ باباجی! مجھے کسی سے معلوم ہوا ہے کہ آپ یرقان کی دوا دیتے ہیں۔ میرے گھر میں میرے شوہر اور بڑی بیٹی اس مرض میں مبتلا ہیں۔ ہم نے اس کا بہت علاج کرایا مگر وقتی فائدے کے علاوہ کچھ نہیں ہوتا۔ اب ہم لوگ علاج کرا کے تھک چکے ہیں نہ ہمت ہے اور نہ پیسا۔ اب آپ ہی سے امید ہے کہ آپ ہماری مدد کریں گے۔

☆ بیٹی ثریا! اللہ تم سب کو شفا دے۔ اپنا پتا ارسال کرو۔ میں دوا تیار کر دوں گا اور انشاء اللہ جلد آفاقہ ہوگا۔
□ نصیر خان۔ مردان۔

☆ باباجی! میں پہلی بار آپ کو خط لکھ رہا ہوں۔ میری عمر 25 سال ہے اور میرا سر تقریباً گنجا ہو چکا ہے۔ پورے سر میں خشکی بھری رہتی ہے حالانکہ میں سرسوں کا تیل بھی لگاتا ہوں۔ بال کم ہونے کی وجہ سے اپنی عمر سے بہت بڑا لگتا ہوں۔ میں نے پڑھا ہے کہ آپ بالوں کی دوا دیتے ہیں۔ پلیز مجھے جلدی سے دوا بھیجیں تاکہ میرا مسئلہ حل ہو سکے۔

☆ بیٹے نصیر! خط میں اپنا پتا ضرور لکھا کرو۔ میں دوا کے ساتھ طریقہ استعمال بھی ارسال کروں گا۔

□ صائمہ ارشاد۔ کراچی۔

☆ بیٹی صائمہ! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف کثرت سے پڑھو۔ خصوصاً نماز فجر اور عشاء کے بعد 101-101 بار پڑھو اور دُعا کرو۔ مدت 3 ماہ ہے۔

□ حمیدہ۔ شیخوپورہ۔

☆ بیٹی حمیدہ! نماز کی پابندی رکھو اور ہر نماز کے بعد 3 بار آیت الکرسی پڑھ کر اپنے اوپر ضرور دم کرو۔ والدہ سے کہو خوب صدقہ خیرات کیا کریں۔ تم اپنی زندگی کا کوئی فیصلہ بھی بنا استخارہ کیے مت کرنا۔ خواب پریشان کن ہیں۔ ہر قدم بہت سوچ سمجھ کر رکھنا۔ سورۃ الناس بہ کثرت پڑھا کرو۔

□ رفعت جان۔ کوہاٹ۔

☆ بیٹی رفعت! تمہارے دونوں خط مجھے ملے مگر بھٹے ہوئے۔ میں نے دونوں خطوط کے جواب بھی دیئے مگر مجھے محسوس ہوا کہ تمہارا پتا بھی مکمل تحریر نہیں ہوتا۔ آئندہ خط لکھو تو مکمل پتا ضرور لکھا کرو۔ شہر کا نام واضح لکھو۔ مکان نمبر اور گلی نمبر بھی صاف لکھا کرو۔

□ شاہدہ۔ رحیم یار خان۔

☆ بیٹی شاہدہ! جو حالات تم نے تحریر کیے ہیں وہ بدترین ہونے والے ہیں لہذا جتنی جلد ممکن ہو مجھ سے تعویذ منگوا لو۔ تعویذ کے لیے جوابی لفاظی ضرور ارسال کرو۔

□ راشد علی۔ سرگودھا۔

○ بابا جان! میری بیوی نے آپ سے میری ملازمت کے لیے تعویذ منگوا یا تھا۔ اللہ کا بڑا کرم ہے کہ 3 سال بعد مجھے اپنی پسندیدہ جگہ پر نوکری مل گئی۔ فی الحال تنخواہ کم ہے مگر میں مطمئن ہوں۔ یہاں ترقی کے بہت مواقع ہیں۔ بابا جان! میرا ایک اور مسئلہ بھی بہت اہم ہے۔ میری کچھ زمین ادھر ہے جو میں بیچنا چاہتا ہوں مگر مناسب قیمت نہیں ملتی۔ کوئی وظیفہ عنایت سمجھیے جس کی برکت سے یہ مسئلہ بھی حل ہو جائے۔ میرے رشتے کے چچا یہ زمین مارکیٹ ویلیو سے کچھ کم پر خریدنا چاہتے ہیں مگر وہ یہ رقم دو اقساط میں ادا کریں گے۔ اب آپ مشورہ دیں کہ میں ایسا نہ ہو کہ اس سودے بازی کا ہمارے آپس

کے تعلقات پر برا اثر پڑے۔ آپ کے جواب کا منتظر۔

☆ بیٹی راشد! اللہ تمہیں خوش رکھے۔ میں ہمیشہ بات سمجھاتا ہوں کہ جو لوگ اللہ سے پورے یقین کے ساتھ مدد مانگتے ہیں وہ ضرور کامیاب ہو جاتے ہیں۔ اللہ کا شکر ادا کرو کہ اس نے تم پر اپنا کرم فرمایا۔ نماز پابندی سے ادا کیا کرو۔ نماز فجر کی سنتوں کے بعد ایک بار سورۃ رحمن پڑھ کر فرض پڑھو۔ اول و آخر دُرود شریف 9-9 بار پھر حاجت بیان کرو۔ یہی عمل بعد نماز عشاء بھی کرو۔ مدت 41 دن ہے۔ بس خیال رہے حاجت پوری ہوتے ہی حسب استطاعت رقم اللہ کی راہ میں دو گے۔

□ عصمہ۔ کراچی۔

☆ بیٹی عصمہ! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہت پڑھو۔ روزانہ رات کو ایک گلاس گرم دودھ اور چوتھائی چمچ گڑ کھالیا کرو۔ یہ عمل ہر ماہ 7 دن کرو پھر ترک کر دو۔ بکثرت ینا شفائی کا ورد کیا کرو۔ اللہ مکمل شفا عطا فرمائے گا۔

□ نسیم۔ گوجرانوالہ۔

☆ بیٹی نسیم! اللہ تمہارے مسائل حل فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہ کثرت پڑھو۔ کچھ معاملات بڑوں کے طے کرنے کے ہوتے ہیں۔ چھوٹے چاہتے ہوئے بھی اُس میں نہیں بول سکتے۔ تم اللہ سے اچھے حالات کی دُعا کرتی رہو وہ ضرور سنے گا۔ والدہ سے کہو اپنے تمام بچوں پر چاروں قل اور الحمد شریف پڑھ کر ضرور دم کیا کریں۔ اپنی کزن سے کہو بعد نماز عشاء ایک بار سورۃ انعام ضرور پڑھیں۔ مدت 41 دن ہے۔

□ رخشندہ۔ شیخوپورہ۔

☆ بیٹی رخشندہ! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور دُرود شریف بہ کثرت پڑھو۔ امتحان شروع ہونے سے قبل خط لکھا کرو تا کہ وظیفہ کرنے کا ٹائم بھی ہو۔ بہر حال ینا حیم کا بہ کثرت ورد کیا کرو۔ آئرس کے مضمون تمہارے لیے بہتر ہیں۔ اپنی توجہ دوسری چیزوں سے ہٹا کر صرف پڑھائی پر مبذول رکھو کامیابی ہوگی انشاء اللہ!

□ حمیدہ الیاس۔ کراچی۔

☆ بیٹی حمیدہ! اللہ تمہاری حاجت پوری کرے۔ تم

نماز کی پابندی کرو اور ہر نماز کے بعد 111 بار یا رحمن یا رحیم پڑھو اول و آخر دُرود شریف۔ پھر حاجت بیان کرو۔ مدت 2 ماہ ہے۔ اللہ ضرور اپنا کرم فرمائے گا۔

□ محمد خان جوکھیو۔ لاڑکانہ۔

○ بابا جی! میرے دو مسئلے ہیں بہت شدید نوعیت کے ایک تو پورا سال میرا گلا خراب رہتا ہے کچھ بھی کھا لوں تکلیف شروع ہو جاتی ہے۔ دوسرے میری بیوی کا وزن بہت تیزی سے بڑھ رہا ہے جس کی وجہ سے اُس کو جوڑوں کی بھی تکلیف شروع ہو گئی ہے۔ میں نے آپ کے رسالے میں پڑھا ہے کہ آپ ان امراض کی دوائیں دیتے ہیں۔ برائے مہربانی مجھے بھی بنا دیں۔ میں نومبر کے آخر میں کراچی آ رہا ہوں یہ دوائیں دفتر سے لے لوں گا۔

☆ بیٹی محمد خان! بس دفتر آنے سے پہلے مجھے مطلع کرو ادیتا میں دونوں ادویات تیار کر دوں گا۔ انشاء اللہ ضرور فائدہ ہوگا۔

□ شائستہ۔ ساٹکھڑ۔

○ پیارے بابا جی! السلام علیکم! اسلام! اس سے پہلے بھی آپ سے کئی بار رابطہ کیا مگر پتا نہیں کیوں آپ جواب نہیں دیتے؟ بابا جی! مسئلہ یہ ہے کہ میرے سر میں ایک عجیب سی تکلیف ہے۔ میرا تمام سر کی عجیب سی قوت میں جکڑا ہوا ہے جس کی وجہ سے نہ صرف میرا داغ جکڑا ہوا ہے بلکہ سننے اور سمجھنے کی قوت بھی کم ہے۔ اس بیماری کا بہت علاج کروایا مگر کوئی افادہ نہیں ہوا تو کسی عالم سے استخارہ کروایا۔ اس نے بتایا کہ میں جب بالکل چھوٹی تھی تو ایک دن میرے اوپر سے جن اور پریوں کا گزر ہوا تھا۔ مجھے یہ تکلیف اسی وقت سے ہے۔ پہلے کم تھی اب بہت بڑھ گئی ہے۔ بابا جی! بات کچھ بھی ہو پر میرے ساتھ بہت بڑا مسئلہ ہے۔ میں یونیورسٹی میں پڑھتی ہوں یہاں تک میں کیسے پہنچی یہ تو مجھے یا میرے اللہ کو معلوم ہے۔ میں بہت پڑھنا چاہتی ہوں لیکن اس تکلیف نے میرا سارا کیریئر ہی تباہ کر دیا ہے۔ میں دو برس سے مسلسل دُرود شریف پڑھتی آرہی ہوں۔ اس سے بس اتنا افادہ ہوا ہے کہ میری نظر کی کمزوری کچھ دور ہوئی ہے اور کچھ سمجھنے میں بھی افادہ ہوا ہے لیکن اب تو روز بہ روز پڑھائی

بڑھتی جا رہی ہے۔ میں اگر کلاس میں دُرود شریف کی طرف دھیان دیتی ہوں تو کچھ سمجھ میں نہیں آتا اور اگر دُرود شریف چھوڑ دیتی ہوں تو تکلیف ویسی کی ویسی رہتی ہے۔ کبھی کبھی تو میرا دل چاہتا ہے خودکشی کر لوں لیکن اللہ تعالیٰ پہ یقین کر کے آگے بڑھتی ہوں کہ شاید کسی دن وہ مجھ پہ رحم کرے اور مجھے اس عجیب و غریب بیماری سے چھٹکارا حاصل ہو جائے۔ بابا جی! خدا کے لیے مجھے اس تکلیف سے چھٹکارا دلائیں۔ میں دن رات روتی رہتی ہوں۔ میں اپنی تعلیم میں بہت آگے جانا چاہتی ہوں۔ بابا جی! اپریل میں میرے امتحان ہیں اور میں سخت پریشان ہوں۔ آپ جو وظیفہ بھی بتائیں میں کرنے کو تیار ہوں۔ میرے لیے اجتماعی دُعا کریں۔ میں کسی بھی مشکل وظیفے یا تعویذ کے لیے تیار ہوں۔ خدا کے لیے اس مشکل کا کوئی راستہ نکالیں۔

☆ بیٹی شائستہ! تمہیں میں نصیحت کروں گا کہ جلد از جلد مجھ سے تعویذ منگوا لو۔ تعویذ کے لیے مجھے جوابی لفاظی کے ہمراہ خط لکھو۔ فی الحال ہر وقت با وضو رہنے کی کوشش کرو اور یا جی یا قیوم کا ورد کرتی رہا کرو۔ اللہ حامی و ناصر ہو۔

□ ثنا خان۔ پشاور۔

○ محترم بزرگ! السلام علیکم! اللہ سبحانہ تعالیٰ آپ کو لمبی حیات عطا فرمائے۔ (آمین!) بابا جی! میں اُن لوگوں میں سے ہوں جو بے حد ہارے ہوئے ہیں۔ ہر قدم پر ناکامی ہی ناکامی دیکھی ہے۔ اتنی ناکامی کے بعد یقین ہو گیا ہے کہ میں کسی قابل نہیں ہوں بے حد ناکارہ ہوں جو زندگی میں کچھ نہیں کر سکتی۔ اتنی ناکامی کے بعد کامیابی کا احساس ہی ختم ہو گیا ہے۔ کسی کا کوئی قصور نہیں۔ اس رحیم و کریم کا انصاف تو بہترین ہے۔ مگر تو مجھ میں سے اور بے انتہا کمی ہے۔ میں اپنی ماں کو کوئی خوشی نہیں دے سکتی۔ اپنی وجہ سے جب اس کی آنکھوں میں آنسو دیکھتی ہوں تو وہ تکلیف ناقابل بیان ہوتی ہے۔ اس مرتبہ تیسری مرتبہ BA کے پیپرز دے رہی ہوں۔ میں دن رات محنت کر رہی ہوں لیکن اتنی محنت پر بھی بہت کمی ہے۔ میرے امتحانات میں میری ماں کی بہت خواہش تھی کہ میں کامیاب ہو جاؤں لیکن پیپرز سے مجھے

کوئی امید نہیں نظر آ رہی ہے۔ پتا نہیں کیوں میری محنت میں کمی رہتی ہے؟ برائے مہربانی کوئی ایسا وظیفہ دے دیجیے جس کی بدولت میں کامیاب ہو کر ایک بار اپنی ماں کو خوش کرنا چاہتی ہوں صرف اور صرف اپنی ماں کو خوش دینا چاہتی ہوں۔ برائے مہربانی جلد از جلد جواب دیجیے گا۔ میں وظیفہ خود کرنا چاہتی ہوں۔

☆ بیٹی! پریشان ہونے سے کچھ نہیں ہوتا۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہ کثرت پڑھو۔ اپنی توجہ صرف ایک جانب رکھو۔ اگر بہت کچھ ایک وقت میں کرنا چاہو گی تو کچھ بھی نہیں کر پاؤ گی۔ بعد نماز فجر 41 بار الحمد شریف اول و آخر درود شریف کے ساتھ پڑھو۔ ناغے کے دن شمار کر کے بعد میں پورے کر لینا۔

□ آئیہ میر پور خاص۔
☆ بیٹی! آئیہ! اللہ تمہیں کامیابی عطا فرمائے۔ نماز کی پابندی کی کوشش کرو اور درود شریف کثرت سے پڑھو۔ میرا بتایا ہوا وظیفہ جاری رکھو۔ انشاء اللہ ضرور کرم ہوگا۔
□ سعدیہ بتول، سکھر۔

○ محترم بابا صاحب! السلام علیکم! محترمی! کافی عرصے بعد میں آپ سے مخاطب ہوں۔ میرا مسئلہ یہ ہے کہ کچھ عرصے پہلے اپنی خواہش کے مطابق کہ میری شادی ہوئیں نے وظیفہ منگوایا تھا۔ وظیفہ پڑھنے کے بعد ایک رشتہ آیا۔ یہ رشتہ میرے ایک کلاس فیلو اور منہ بولے بھائی کے توسط سے آیا۔ بات چیت ہوئی۔ انہوں نے تصویر مانگی اور لڑکے کی تصویر دی تاکہ ایک دوسرے کے گھر والے پہلے تصویر کے ذریعے پسند کریں پھر بات چیت کی جائے۔ اس سلسلے میں استخارہ بھی کیا گیا وہ بھی درست نکلا اور ایک دوسرے کا گھر بھی پسند کیا گیا یعنی کہ میری تصویر لڑکے کے گھر والوں کو پسند آئی اور میرے گھر والوں کو لڑکا پسند آیا۔ لڑکے کی بہن نے میرے جاننے والے یعنی رشتے کرانے والے شخص سے یہ کہا کہ ہم لڑکی کے گھر والوں سے ملنا چاہتے ہیں تاکہ بات طے کر سکیں پھر اس شخص نے مقررہ دن بتایا لیکن انتظار کرنے کے بعد بھی وہ لوگ نہ آئے اور نہ اس بیچ والے شخص سے رابطہ ہوا۔ آخر ایک ہفتے کے بعد جب رابطہ ہوا تو اس شخص نے

کہا کہ میری بیٹیاں بیمار تھیں جس کی وجہ سے رابطہ نہ ہو سکا۔ اب میں ملاقات کا دن کا فائل کر کے آپ لوگوں کو بتاتا ہوں۔ کچھ دنوں کے بعد انہوں نے میری بہن کو اپنے آفس میں بلا کر کہا کہ اس کے گھر والوں نے نہیں لیکن لڑکے نے یہ شرط عائد کی ہے کہ جو شخص میری طلاق یافتہ بہن سے شادی کرے گا میں اسی گھر میں شادی کروں گا حالانکہ میں نے رشتے کرانے والے شخص کو بتایا تھا کہ میرے تین بھائی ہیں اور وہ تینوں شادی شدہ ہیں۔ اس ضد کی وجہ سے لڑکے نے انکار کر دیا حالانکہ پہلے وہ راضی تھا لیکن بعد میں کیا ہوا؟ مجھے علم نہیں جس کی وجہ سے میں دینی طور پر خاصی ڈسٹرب رہی ہوں۔ اس بات کو ختم ہوئے ایک ماہ ہو گیا ہے لیکن اس نے دوبارہ رابطہ نہ کیا حالانکہ شادی کی ساری بات لڑکے والوں کو پہلے مجھ سے کرتی تھی بعد میں گھر والوں سے۔

☆ بیٹی! اللہ تمہارے حق میں بہتر فرمائے۔ یہ تم کہہ رہی ہو کہ وہ شریف لوگ تھے حالانکہ شریف لوگ ایسی حرکت نہیں کرتے۔ لڑکی کی بہت عزت ہوتی ہے اور اچھی فیملی سے تعلق رکھنے والے اپنی ہونے والی بہو یا کسی کی بھی بہن یا بیٹی کے ساتھ خرید و فروخت والا رویہ نہیں رکھتے۔ بات ہمیشہ واضح اور صاف کرنی چاہیے۔ اصل میں جو شخص درمیان میں تھا غلطی یا جان بوجھ کر اس نے ایسا کیا ہے تاکہ دونوں طرف سے فائدہ اٹھالے۔ بیٹی! میں تمہیں مشورہ دوں گا کہ اس معاملے میں خاموشی اختیار کرو اور آئندہ رشتے کی بات چیت بڑوں میں ہونے دیا کرو۔ نماز کی پابندی رکھو اور ہر نماز کے بعد تین سو بار حَمْدُ یَا رَحِیْم کی پڑھو اول و آخر درود شریف۔ وظیفہ کی مدت 41 دن ہے۔ ناغے کے دن شمار کر کے بعد میں پورے کر لینا۔

□ صوفیہ۔ جیکب آباد۔
○ باباجی! میرا مسئلہ انتہائی اہم نوعیت کا ہے۔ میری عمر 15 سال ہے اور تین سال سے میری دور کی نگاہ بہت کمزور ہے۔ ایک آنکھ زیادہ کمزور ہے اور دوسری کی کمرچشمے کے بغیر مجھے بالکل بھی نظر نہیں آتا۔ آپ مجھے کوئی ایسا وظیفہ بتائیں جس سے میری دور کی نگاہ بالکل ٹھیک ہو جائے۔ میرے بال انتہائی کمزور ہو گئے ہیں اور وزن

بھی کافی بڑھ رہا ہے۔ آپ کے آفس سے کیا یہ دوائیں ملتی ہیں اور بدیہ کیا ہے؟ اور طریقہ استعمال بھی بتادیں۔ اللہ تعالیٰ آپ کو خوش رکھے۔ دُعاؤں کی طلب گار۔
☆ بیٹی صوفیہ۔.....! اللہ تمہیں کامیابیاں عطا فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو کہ ہر وظیفہ کے لیے تمام نمازیں بہت ضروری ہیں۔

اور درود شریف بہت پڑھو۔ سونف بہت استعمال کیا کرو اس کے علاوہ کسی اچھے سے ڈاکٹر سے پوچھ کر وٹامن A کا استعمال شروع کرو۔ ادویات دفتر سے دستیاب ہیں فون کر کے طریقہ کار معلوم کر لو۔ یس فور کا بہت ورد کیا کرو۔

□ شائستہ۔ میر پور خاص۔
○ محترم باباجی! السلام علیکم! میں آپ نے جو 7-7 تسبیحات صبح و شام پڑھنے کے لیے بتائی ہیں۔ رُبَّنَا هَبْ لَنَا فِجْرًا و عِشَاءً۔ وہ وظیفہ 21 دن کا پورا ہو گیا ہے اور کافی فرق ہے۔ آپ یہ بتائیں کہ میں یہ وظیفہ دوبارہ شروع کروں یا تھوڑا وقفہ دوں یا پھر آپ مجھے کوئی اور عمل بتائیں جو دشمن کے لیے ہو۔ میں دشمن کے شر سے بہت پریشان ہوں اور وظیفہ مکمل ہونے پر میں شکرانے کے نفل پڑھ لیتی ہوں اور مسجد کے گٹے میں کچھ پیسے رکھ دیتی ہوں۔ باباجی! آپ نے ڈائجسٹ میں ہر نماز کے بعد جو سورۃ فاتحہ چاروں نفل سورۃ البقرہ کا پہلا اور آخری رکوع کسی کو بتایا تھا اور اس کی عام اجازت دی تھی وہ بھی میں ہر نماز کے بعد پڑھتی ہوں۔ دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ میری بیٹی شمیمہ کے ابھی فرسٹ ایئر کے امتحان ہوئے ہیں۔ آپ دُعا کیجیے گا اور آپ کوئی دُعا بتائیں کہ جب تک اس کا رزلٹ نہیں آتا وہ یہ پڑھتی رہے اور آپ اس دُعا یا عمل کی عام اجازت دے دیجیے گا تاکہ جن جن بچوں کے امتحان ہوئے ہیں وہ بھی پڑھ سکیں اور اس عمل سے فیض یاب ہو سکیں۔ اللہ تعالیٰ سب بچوں کو کامیابی عطا فرمائے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو دونوں جہان میں خوش رکھے۔

☆ بیٹی شائستہ! اللہ تمہاری حاجات قبول فرمائے۔ وظیفہ ابھی مزید ایک ماہ جاری رکھو۔ بیٹی سے کہو یا سَمِیع کا بکثرت ورد کرے اور اس ورد کی اُن تمام بچوں کو اور

اُن کے والدین کو اجازت ہے جو امتحانات میں حصہ لے رہے ہیں۔
□ سلطانہ بیگم۔ سیالکوٹ۔

○ محترم باباجی! السلام علیکم! میرے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ میں ایک لڑکے کو پسند کرتی ہوں لیکن اس کی مکتبی کہیں اور ہو گئی ہے جبکہ میں اسے بہت پہلے سے پسند کرتی ہوں اس لیے چاہتی ہوں کہ اس سے شادی ہو جائے اور میں اس کے گھر کے ماحول میں ایڈجسٹ بھی ہو جاؤں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کے گھر سے رشتہ آئے۔ باباجی! میرے ماں باپ دونوں کا انتقال ہو چکا ہے۔ خدا کے لیے آپ میری مدد کریں اور کوئی تعویذ دے دیں جس کے ذریعے آسانی سے بغیر کسی پریشانی کے میری شادی وہیں ہو جائے اور خوشگوار زندگی گزرے۔ آپ جواب ایک ہفتے کے اندر رائد رے دیں۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی۔ شکریہ!

☆ بیٹی! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ بیٹی! تم نماز کی پابندی کے ساتھ حسینا اللہ نعم الوکیل اٹھتے بیٹھتے پڑھا کرو۔ درود شریف بھی بہ کثرت پڑھتی رہو۔
□ علی محمد چانڈیو۔ لارکانہ۔

○ محترم باباجی! السلام علیکم! آپ ہزاروں لوگوں کے مسائل حل کرتے ہیں یقیناً اللہ تعالیٰ آپ کو اس کا اجر عظیم عطا کرے گا۔ محترم باباجی! میں بھی آج کل مسائل میں بھرا ہوا ہوں۔ میری طبیعت ٹھیک نہیں رہتی۔ چار ماہ پہلے میری شادی ہوئی ہے۔ شادی کے بعد سے میری طبیعت نہیں سنبھل رہی۔ میں کراچی کی ایک گارمنٹ فیکٹری میں کام کرتا ہوں۔ باباجی! کچھ عرصہ پہلے مجھے بی بی کی بیماری ہو گئی تھی۔ میں نے نو مہینے تک دوائی کا کورس کیا لیکن باباجی! مجھے لگتا ہے کہ میری بیماری ابھی تک ختم نہیں ہوئی۔ ڈاکٹر سے دوائی لیتا ہوں تو کچھ عرصے تک ٹھیک رہتا ہوں لیکن پھر وہی تکلیف شروع ہو جاتی ہے۔ سینے کی دونوں طرف درد رہتا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے میرے سینے میں کافی زخم ہیں۔ ڈاکٹر کہتا ہے کہ میرے معدے میں زخم ہے لیکن مجھے پورے سینے میں تکلیف ہوتی ہے۔ نوکری پر جاتا ہوں تو دوبارہ طبیعت خراب ہو جاتی ہے اور واپس گاؤں آ جاتا ہوں۔ باباجی! میں

بہت پریشان ہوں کیا کروں؟ ایسا لگتا ہے کہ میں دے کا مریض ہو گیا ہوں۔ کوئی کام کرتا ہوں یا میٹرھیاں چڑھتا ہوں تو سانس پھول جاتی ہے۔ زیادہ وزن بھی نہیں اٹھا سکتا ہوں۔ باباجی! ایسا لگتا ہے کہ میں مستقل مریض بن گیا ہوں۔ اناں اور بھائی مجھے نوکری پر جانے نہیں دیتے اور کہتے ہیں کہ تم گھر میں رہو تمہارا بوجھ ہم اٹھائیں گے تمہیں خرچہ ہم دیں گے لیکن میں چاہتا ہوں کہ میں نوکری پر جاؤں۔ میرے بھائی کب تک میرا بوجھ اٹھائیں گے؟ آخر ایک دن تنگ آ جائیں گے۔ باباجی! میں اکیلا ہوتا تو گھر پر رہ لیتا لیکن میری بیوی بھی ہے اس کا بھی تو خرچہ ہے۔ پیارے باباجی! میں بہت پریشان ہوں کہ کیا کروں؟ ایک طرف بیماری اور دوسری طرف بے روزگاری میں پھنس کر رہ گیا ہوں۔ محترم باباجی! میرے مسئلے کا کوئی حل تجویز کیجیے۔

☆ بیٹے علی محمد! اللہ تمہیں مکمل شفا دے۔ سب سے پہلے تو نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہ کثرت پڑھا کرو۔ کوشش کرو کہ ہر وقت با وضو ہو۔ تمہیں کام ضرور کرنا چاہیے کیونکہ تمہاری بیوی صرف تمہاری ہی ذمہ داری ہے پھر مالی مسائل رشتوں میں بھی دراڑ ڈال دیتے ہیں مگر ان سب سے پہلے ایک بار خوب لگن سے اپنی صحت پر توجہ دو۔ والدہ سے کہو نہار منہ اور گ کی قاشیں 6-7 توے پر نمک ڈال کر ہلکی سے سینک لیں اور وہ قاشیں بسم اللہ پڑھ کر کھا لو۔ رات میں مرغی کی بچنی ایک پیالی ضرور پیو۔ پابندی سے یہ عمل ایک ماہ کرو۔ انشاء اللہ تم خود اپنے اندر مثبت تبدیلی محسوس کرو گے۔ مجھے ایک ماہ بعد حالات سے مطلع ضرور کرو۔

□ مریم حمید۔ اوکاڑہ۔

☆ بیٹی! اللہ تمہارے مسائل حل فرمائے۔ خط واضح لکھا کرو اور ایک وقت میں دو مسائل سے زیادہ مت لکھا کرو مجھے جواب دینے میں وقت ہوتی ہے۔ بہر حال تمہیں یہی نصیحت کروں گا کہ معاملات میں خاموشی اختیار کرو۔ ایک چپ ہزار مسائل کا حل ہے۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہ کثرت پڑھو۔ نماز فجر اور نماز عشاء کے بعد سورۃ آل عمران آیت 66 گیارہ گیارہ سو بار پڑھو اور دعا کرو۔ مدت 41 دن ہے۔

□ سعدیہ سجاد۔ لاہور۔

☆ بیٹی سعدیہ! بیٹے کی طرف سے اتنی تشریف کی ضرورت نہیں ہے۔ بچے معصوم ہوتے ہیں وہ خود سے کبھی کوئی بات نہیں سمجھتے۔ تم اسے پیار اور نرمی سے سمجھاؤ۔ کوشش کرو کہ اس کے ضد کرنے کی نوبت نہ آئے۔ اس کے کھانے کی چیزیں مثلاً بسکٹ، پھل وغیرہ ایسی جگہ رکھو جہاں سے وہ خود اٹھا لیا کرے۔ بچوں کو سکھانا پڑتا ہے پھر شرمندہ ہونے کی ضرورت نہیں۔ پیار سے محبت سے اپنی مرضی سے اولاد کی پرورش کرو۔ بچے پر سورۃ فلق، سورۃ الناس اور درود شریف مغرب کے بعد پڑھ کر دم کر دیا کرو۔

□ سائرہ شفیق۔ رحیم یار خان۔

○ محترم باباجی! السلام علیکم! میرا مسئلہ یہ ہے کہ ہم تین بہنیں ہیں اور تینوں شادی کے لائق ہیں۔ ہمارے ساتھ مسئلہ یہ ہے کہ ہماری ایک پھوپھی جن کی عمر تیس سال ہے وہ بھی ابھی غیر شادی شدہ ہیں اور ہمارے والد صاحب کا کہنا ہے کہ پہلے پھوپھی کی شادی ہوگی اس کے بعد ہماری شادیاں کریں گے۔ پھوپھی کے کئی رشتے آئے مگر بات نہیں بنی۔ ہر رشتے میں کوئی نہ کوئی عیب نکال دیا۔ نہ ان کی شادی کرتے ہیں اور نہ کہیں بات ٹھہراتے ہیں۔ ہماری امی بھی پریشان ہیں، ہم بھی پریشان ہیں۔ آپ کا دیا ہوا وظیفہ بہنوں نے کیا تھا مگر اس کے کرنے سے والد صاحب بیمار ہو گئے پھر بڑی بہنیں جنہوں نے وظیفہ کیا وہ بھی بیمار ہو گئیں۔ ہم اور بھی وظائف پڑھتے رہتے ہیں مگر بات نہیں بنتی۔ آپ برائے مہربانی کوئی ایسا وظیفہ بتائیں کہ گھر والے ہمارے بارے میں سوچیں اور جلد از جلد رشتے طے کر کے شادی کر دیں۔

☆ بیٹی! اللہ تمہارے حق میں بہتر فیصلہ فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور درود شریف بہت پڑھو۔ بیٹی! وظیفہ کلام الہی ہے اس کے کرنے سے کوئی بیمار نہیں ہوتا۔ یہ بات ذہن سے نکال دو۔ بعض اسمائے جلالی نکراتے ضرور ہیں اسی لیے تاکید ہے کہ ہر وظیفے کے پہلے اور آخر میں درود شریف کا ورد ضرور کرو اور ایک وقت میں صرف ایک ہی وظیفہ کرو۔ اللہ کو یاد کرنے والا

ہمیشہ کامیابی کی طرح ہی بڑھتا ہے۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ ہر کام اپنے مقرر کردہ وقت پر ہی ہوتا ہے جو اللہ نے طے کیا ہے اور انسان بے شک بہت بے صبر ہے۔ تم نماز کی پابندی رکھو اور بکثرت بسم اللہ کا ورد کرو۔ والدہ سے کہو حسب استطاعت صدقہ خیرات ضرور کریں۔ مجھے 41 روز بعد مطلع کرو۔

□ کلثوم۔ منڈی بہاء الدین۔

☆ بیٹی کلثوم! ہر وقت با وضو رہنے کی کوشش کرو اور نماز کی پابندی کرو۔ بعد نماز مغرب ایک تسبیح سورۃ قریش کا ورد کر لیا کرو۔ اول و آخر درود شریف ضرور پڑھنا پھر حاجت بیان کرو۔ انسان ایک حد تک کوشش کر سکتا ہے اس کے بعد معاملہ اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دینا چاہیے۔ تم بھی اللہ تعالیٰ سے مدد مانگو ضرور کرم ہوگا۔ مدت 41 دن ہے۔

□ زینت۔ شیخوپورہ۔

☆ بیٹی زینت! اللہ تمہاری والدہ کو مکمل شفا عطا فرمائے۔ نماز کی پابندی رکھو اور بہ کثرت درود شریف پڑھو۔ اللہ سے دعا کرو کہ وہ تمہاری والدہ کو صحت عطا فرمائے۔ نماز عشاء کے بعد ایک بار سورۃ یٰسین ضرور پڑھو۔ مدت 41 دن ہے۔

□ نھرت۔ ڈارو۔

☆ بیٹی نھرت! نماز کی پابندی رکھو یہی ہر مسئلے کا بنیادی حل نماز پنج گانہ ہے۔ روزانہ دن میں دو بار آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر زور زور سے 7 بار الحمد شریف پڑھا کرو۔ اس دوران میں اپنی آنکھیں اپنے چہرے پر مرکوز رکھو۔ یہ عمل گھر کے ایسے حصے میں کرو جہاں سے آسمان نظر آتا ہو یعنی آئینے سے نظریں اٹھاؤ تو اوپر آسمان نظر آئے۔ یہ عمل بلا ناغہ نوے دن تک کرو۔ انشاء اللہ اللہ کا کرم ہوگا۔

□ عبدالرحیم۔ صادق آباد۔

○ محترم باباجی! السلام علیکم! میں نے آج پہلی بار بہت امید سے خط لکھا ہے۔ میں اور میرے بہن بھائی کافی چھوٹے تھے کہ ہمارے والد صاحب نے دوسری شادی کر لی اور ہم سے تعلق ختم کر دیا۔ ہم دو بھائی اور دو بہنیں ہیں۔ ہماری ماں نے بہت دکھ جھیل کر ہمیں پالا پوسا بڑا کیا آج اللہ تعالیٰ نے ہمیں سب کچھ دے

دیا ہے لیکن ایک مسئلہ بہت ہی بڑا مسئلہ بن گیا ہے۔ پہلے ہماری پھوپھی نے میری بہن کے ساتھ اپنے بیٹے کی حشمتی کی لیکن اب اس نے بغیر کسی وجہ کے حشمتی توڑ دی۔ ہم بہت زیادہ پریشان ہیں اس لیے کہ ہماری بہن کے لیے ایک اور بہت اچھا رشتہ آیا ہے لیکن اس میں ہمارے خاندان کے لوگ رکاوٹ ڈال رہے ہیں۔ ہماری خالائیں، ماموں، چچا سب ہم سے تعلق ختم کر گئے ہیں۔ باباجی! ہم بہت زیادہ پریشان ہیں، ہم چاہتے ہیں کہ جو رشتہ آیا ہے ہماری بہن کی شادی وہاں جلد از جلد ہو جائے۔

☆ بیٹے توصیف! اللہ تمہاری حاجت قبول فرمائے۔ اپنی بہن سے کہو کہ وہ بعد نماز عشاء اول و آخر درود شریف کے ساتھ گیارہ سو مرتبہ الوکیل کا ورد کرو۔ وظیفے کی مدت 41 دن ہے۔

□ واجد۔ سیدو شریف۔

○ محترم باباجی! السلام علیکم! میں نے جماعت وہم کا امتحان دیا ہے۔ میں ایک لڑکی سے پیار کرتا ہوں وہ بھی مجھ سے بہت پیار کرتی ہے۔ ہم ایک دوسرے سے شادی کرنا چاہتے ہیں۔ میرا ارادہ ہے کہ سیکنڈ ایئر کے بعد اس لڑکی سے حشمتی کر لوں اور وہ بھی یہی چاہتی ہے۔ ہم ایک دوسرے کے بغیر نہیں رہ سکتے۔ باباجی! آپ پلیز ہم دونوں کے لیے ایک ایسا تعویذ بنا کر دیں کہ ہماری شادی کے راستے میں کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ ہمارے خاندان والے بھی مان جائیں اور ہماری شادی ہو جائے۔ پلیز باباجی! ہمارے لیے کوئی تعویذ بنا کر دیں کہ ہماری مشکل حل ہو جائے اور ہماری شادی ضرور ہو۔

☆ بیٹے واجد! میں ہمیشہ یہی کہتا ہوں کہ اپنے آپ کو اس قابل رکھو کہ لڑکی کے والدین خوش ہو کر اپنی بیٹی کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دیں۔ تم پہلے اپنی تعلیم پر توجہ دو اور خود کو کسی قابل بناؤ۔ لڑکی کی عزت بہت نازک ہوتی ہے اس بات کا خیال رکھنا چاہیے۔ کسی کو پسند کرنا جرم نہیں مگر حدود میں رہنا لازمی ہے۔ بیٹے! تم دونوں نماز کی پابندی کرو اور ہر نماز کے بعد 99 بار یا فہم کا ورد کرو اول و آخر درود شریف پھر حاجت بیان

کرو۔ مدت نوے دن ہے۔

☆ نبی نوح علیہ السلام

☆ نبی نوح علیہ السلام! اللہ تمہیں مکمل شفاء عطا فرمائے۔ اپنی کیفیت سے پریشان مت ہو بلکہ اس صورت حال سے باہر نکلنے کی کوشش کرو۔ نماز کی پابندی کی کوشش کرو۔ ہر وقت با وضو رہو۔ جس قدر ممکن ہو اللہ کا ورد کیا کرو۔ اپنی والدہ سے کہو تمہارے نام پر صدقہ خیرات ضرور نکالیں ضرور کرم ہوگا۔

☆ نورین۔ ساہیوال۔

☆ نبی نورین! تم میں سے استخارہ کسی کے حق میں نہیں۔ تم نماز کی پابندی رکھو۔ نماز فجر اور عشاء کے بعد 99-99 (بار) سورۃ التوبہ پڑھو اور دعا کرو۔ مدت نوے دن ہے۔ ناغے کے دن شمار کر کے بعد میں پورے کر لینا۔

☆ ساجدہ۔ کراچی۔

○ محترم باباجی! السلام علیکم! اللہ تعالیٰ آپ کی عمر دراز کرے اور آپ کے درجات میں اضافہ کرے۔ باباجی! جس طرح آپ دُکھی انسانیت کی مدد کلام پاک سے کرتے ہیں اور صحیح رستہ دکھاتے ہیں اللہ آپ کو اس کا ضرور اجر دیں گے۔ باباجی! پہلے بھی میں نے آپ سے وظائف منگوئے اور ان کو پڑھنے سے مجھے کامیابیاں ملیں۔ اب بھی باباجی! ایک مسئلہ ہے۔ باباجی! میری شادی کراچی سے لاہور ہو گئی ہے۔ میں شادی سے پہلے جاب کرتی تھی۔ لاہور میں مجھے ایک دور دراز کے اسپتال میں تعینات کیا گیا ہے۔ اب میں نے ٹرانسفر کے لیے درخواست دی ہے۔ بہت سا کام ہو گیا ہے اب تمہوڑا سا رہ گیا وہ نہیں ہو رہا۔ باباجی! مجھے کوئی ایسا وظیفہ بتائیں کہ اپنے علاقے کے اسپتال میں میرا ٹرانسفر ہو جائے اور آپ استخارہ کر کے بتائیں کہ شادی کے بعد نوکری میرے لیے بہتر ہے یا نہیں؟ میں نے دو تین وظائف بھی پڑھے لیکن کام وہیں رکا ہوا ہے۔ باباجی! میں روز روز اپنی نوکری کی وجہ سے اتنی دور کا سفر نہیں سکتی اس لیے کوئی ایسا وظیفہ بتائیں کہ کام ہو جائے۔ میں آپ کی شکر گزار ہوں گی۔ آنے والے ہمارے میں اس کا جواب دے دیں۔

☆ نبی.....! اللہ تمہارا مسئلہ حل فرمائے۔ نماز کی

پابندی رکھو اور درود شریف بہت کثرت سے پڑھو۔ نماز فجر اور نماز عشاء کے بعد 77-77 بار سورۃ اخلاص پڑھو اور دعا کرو۔ دوران وظیفہ نماز بالکل قضا نہ ہو۔ مدت 21 روز ہے۔

☆ چاند بی بی۔ مردان۔

☆ نبی.....! مجھے تمہاری پریشانیوں کا اندازہ ہے حالانکہ خط تم نے بہت سنبھل کر لکھا ہے جس سے مجھے تمہاری والدہ کی بہترین پرورش کا اندازہ ہوا۔ نبی.....! میں خود اس رویے کے شدید خلاف ہوں کہ شوہر بیوی اور بچوں کو چھوڑ کر صرف کمانے کی غرض سے دور رہے۔ بہر حال تم نے بہت طویل عرصہ انتہائی صبر اور مستقل مزاجی سے گزارا ہے۔ اللہ تمہیں اس کا بہت صلہ دے گا۔ تم ہر نماز کے بعد ایک تسبیح یا وہاب کی پڑھ لیا کرو۔ نماز کی پابندی اس قدر ضروری ہے۔ نماز کے بعد انتہائی خضوع و خشوع سے دعا کرو اور اپنی حاجت بیان کرو۔ وہ رب رحیم انشاء اللہ کرم فرمائے گا۔ وظیفے کی مدت 41 دن ہے۔ ناغے کے دن بعد میں شمار کر کے پورے کر لینا۔ نبی! اللہ یہ بھروسہ رکھو۔

☆ اسما احمد۔ کراچی۔

☆ نبی اسما.....! اللہ تمہیں خوش رکھے۔ پہلے ہی سے یہ طے کر لینا کہ سسرال والے ظالم ہی ہوں گے غلط ہے۔ انسان اپنے رویے سے ہر شخص کو اپنا گرویدہ بنا سکتا ہے۔ تمہاری سوچ بہت اچھی ہے کہ سسرال والوں کو ساتھ لے کر چلنا چاہتی ہو تو نبی.....! ایسا ہی ہوگا۔ تم جس طرح اپنی ماں سے محبت کرتی ہو ان کی ڈانٹ کا برا نہیں مانیں اور کسی سے شکوہ نہیں کرتیں ایسے ہی ساس کے ساتھ رہنا۔ کوئی مسئلہ کبھی پیدا نہیں ہوگا۔ تم اچھی ہوگی تو ہر شخص بھی تم سے اچھا ہی رہے گا۔ نماز کی پابندی بہت اچھی بات ہے۔ سورۃ الفاتحہ کثرت سے پڑھا کرو۔ بہن سے کہو رات کو 5-6 بار دام پانی میں بھگو کر نہار منہ کھا لیا کرے۔ اللہ تعالیٰ کرم فرمائے گا انشاء اللہ!

☆ ☆ ☆

عائشہ عارف

آپ کی ڈائری کے لیے

ان منتخب مشہ پاروں کو آپ اپنی ڈائری میں سجاسکتے ہیں

انتخاب

کر سچیشن برنارڈ۔ انسانی دل کو بدلنے والا پہلا ڈاکٹر

دنیا میں ایسے بہت سے لوگ آئے جنہیں ایک زمانہ گزرنے کے باوجود تاریخ فراموش نہیں کر سکی وہ اپنی زندگی میں کوئی ایسا کارنامہ سرانجام دے جاتے ہیں کہ آنے والی نسلیں انہیں یاد رکھتی ہیں۔ کر سچیشن برنارڈ کا شمار بھی انہی لوگوں میں ہوتا ہے جنہوں نے اپنی زندگی میں کوئی عظیم کارنامہ سرانجام دے کر خود کو امر کر لیا۔ کر سچیشن برنارڈ نے انسانی دل کی تبدیلی کا پہلا آپریشن کر کے ایک نئی تاریخ رقم کی تھی۔ کر سچیشن برنارڈ 8 نومبر 1922ء کو جنوبی افریقہ میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد ایک چرچ میں پادری تھے۔ ان کا بھائی ابراہیم پانچ سال کی عمر میں دل کا دورہ پڑنے سے جاں بحق ہو گیا تھا۔ شاید یہ واقعہ ان کے لاشعور میں کہیں سا گیا اور وہ آنے والے دنوں میں امراض قلب کے ماہر ڈاکٹر بن گئے۔ برنارڈ نے 1940 میں میٹرک کا امتحان پاس کیا پھر وہ طب کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے یونیورسٹی آف کیپ ٹاؤن میڈیکل اسکول چلے آئے جہاں انہوں نے 1946ء میں ایم بی بی سی ایچ ای کی ڈگری حاصل کی۔ انہوں نے اپنی انٹرنشپ گروٹے شیورے اسپتال کیپ ٹاؤن میں مکمل کی۔ اس کے بعد انہوں نے کیپ ٹاؤن کے ایک دیہی علاقے سیرس سے بطور جنرل پریکٹیشنر

اپنے کیریئر کا آغاز کیا تھا۔

تین دسمبر 1967ء کو انسانی دل کی تبدیلی کا پہلا آپریشن کیا گیا۔ یہ آپریشن نو گھنٹے تک جاری رہا اور اس میں میں افراد پر مشتمل ٹیم نے حصہ لیا۔ جس مریض کا دل تبدیل کیا گیا اس کا نام ”لوئس“ تھا اور اس کی عمر 54 سال تھی۔ اس کامیاب آپریشن کے بعد اٹھارہ دن تک زندہ رہا مگر کر سچیشن برنارڈ نے طب کی دنیا میں ایک سنگ میل عبور کر لیا تھا۔ کر سچیشن برنارڈ کا ستمبر 2001ء میں قبرص میں انتقال ہوا۔

حسن انتخاب۔ عامر کراچی۔

یاد رکھنے کی باتیں

☆ یاد رکھو کوئی چیز اچھی یا بری نہیں ہوتی یہ انسان کا کردار ہے جو اسے اچھا یا برا بناتا ہے۔

☆ اے عمدہ لباس کے شوقین لوگو! کفن بھی یاد رکھنا۔

☆ کردار ایک ایسا ہیرا ہے جو پتھر کو بھی کاٹ سکتا ہے۔

☆ خوبصورت مکان کے شیدائیوں کو قبر کے گڑھے بھی یاد رکھنے چاہئیں۔

☆ خوبصورت ہوتے ہیں وہ لوگ جو دوسروں کا ہر لمحہ خیال رکھتے ہیں۔

☆ شیطانی کاموں پر جھوٹے والے انسانوں موت کا جھکا تمہارے کالے کرتوتوں پر پانی پھیر دے گا۔

☆ بچی خوشی کا ایک لمحہ دکھوں کے ہزار لحوں پر بھاری ہے۔
☆ آج نیکی مفت میں مل رہی ہے حاصل کر لو ورنہ قیامت کے دن مزاحمت اور رسوائی ہوگی۔
☆ جھوٹ، فریب، دھوکا اور مکاری سے ناجائز مال جمع کرنے والے انسان عنقریب تجھے یہ مال سانپ، بچھو بن کر ڈسے گا۔

حسن انتخاب۔ کرن شبیر۔ کراچی
ہم کسی سے کم نہیں
ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ جاپان میں ایک صابن بنانے والی فیکٹری میں غلطی سے ایک پیکٹ بغیر صابن کے پیک ہو گیا۔
انہوں نے اس مسئلے کا حل یہ سوچا کہ لاکھوں ڈالر لگا کر ایک X-Ray مشین خرید لی۔ جو یہ چیک کرتی تھی کہ پیکٹ کے اندر صابن موجود ہے یا نہیں؟
یہی مسئلہ پاکستان میں ہوا تو انہوں نے کیا کیا؟
انہوں نے اسبلی لائن کے پیچھے ایک پگھلا لگا دیا۔
خالی پیکٹ خود بخود اڑ کر دور جا گرتے۔ اس سے ثابت ہوا کہ ہم کسی سے کم نہیں۔
حسن انتخاب۔ عبدالعزیز جی آ۔ پکوال
دعا

دعا تو اللہ اور بندے کے درمیان تعلق کا نام ہے اور آپ جانتے ہیں یہ تعلق کیسے بنتا ہے؟
دعا کیسے اللہ تک پہنچتی ہے؟
سائنس کہتی ہے ہر وہ چیز جیسے زمین سے فضا میں جانا ہے اسے انرجی چاہیے جیسے کہ جہاز..... اسے اڑنے کے لیے فیول چاہیے ہوتا ہے جس سے وہ اتنی پاور حاصل کرتا ہے کہ وہ اڑ سکے جیسے کہ راکٹ..... مشعل وغیرہ۔
سب کو طاقت چاہیے۔ انرجی چاہیے۔ وہ طاقت کے بل پر زمین سے فضا تک اور پھر خلا تک پہنچ سکتے ہیں تو پھر آپ اس بات کو کیسے صحیح ثابت کریں گے کہ آپ کی دعا بغیر کسی قوت کے بنا کسی طاقت کے ساتویں آسمان تک جا پہنچی ہے۔ یاں لیں کہ دعا بھی ایک قسم کی انرجی ہے، بھی تو یہ سفر کرتی ہے زمین سے آسمان تک آپ غور کریں! گھوڑے ہوں، ٹیلی فون ہو یا سیل ان سب میں ایک چیز مشترک ہے اور وہ ہے تیز رفتاری آپ اپنے سیل سے

ایک نمبر ڈائل کرتے ہیں تو سات سمندر پار دنیا کے ساتویں کوٹے میں موجود دوسرا شخص دوسری تہی غلطی پر کال ریسیو کرتا ہے۔ وہ ہیلو کہتا ہے تو سیکنڈ کے ہزاروں حصے میں آواز آپ کو سنائی دیتی ہے۔ آپ اسے ٹیکنالوجی کہتے ہیں میں اسے اللہ کے تجلی اسرار کہتی ہوں جسے انسان روزیہ روز کو جوتا جا رہا ہے اسے ہم کہتے ہیں ٹیکنالوجی کی ترقی..... فون کے اسپیکر میں آپ بولتے ہیں آواز الیکٹرک مل سٹل میں بدلتی ہے یہ سگنلز سفر کرتے ہوئے دوسرے شخص تک جا پہنچتے ہیں۔ بنیادی طور پر آپ کا پیغام الیکٹرک سگنلز کی شکل میں سفر کرتا ہے۔ الیکٹرک سگنلز انرجی کی فارم ہے۔ دعا کا بھی یہی حساب ہے آپ کے منہ سے نکلے لفظ کسی انرجی میں بدلتے ہیں اور پھر تیزی سے سفر کرتے ہوئے ساتویں آسمان تک جا پہنچتے ہیں۔ یہ الگ بات نہ آپ کو اسپیکر کی ضرورت ہوتی ہے اور نہ اللہ کو ریسیور کی۔ یہ تیز ترین اور براہ راست رابطے جیسا ہے۔ دنیا میں کوئی چیز ایسی نہیں جو کہ روشنی جیسی تیز رفتار ہو بجز دعا کے اور یقیناً یہ انرجی ہی ہے اور یہ اس سے کہیں زیادہ رفتار سے سفر کرتی ہے جتنا کہ روشنی۔
حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مفہوم کوئی ایسی چیز نہیں ہے جو قسمت کو بدل سکے بجز دعا کے دعا ایسی چیز ہے جو قسمت کو بدل دیتی ہے تو پھر یقیناً یہ طاقت کا ایک خزانہ ہی ہوگی جو کہ قسمت جیسی چیز کو بھی بدل دیتی ہے۔

اللہ پھر کیسے اس مانگی جانے والی دعا کو رد کر سکتا ہے جس میں اتنی پاور ہو اور پتا ہے دعا کا فیول کیا ہے جو اسے اتنی پاور دیتا ہے؟
دعا اگر ٹریول کرتی ہے تو اسے فیول چاہیے اور یہ فیول ہوتا ہے آپ کا یقین..... جتنا یقین زیادہ ہوگا دعا اتنی ہی تیزی سے ٹریول کرے گی اور پھر اتنی ہی جلدی قبول ہو جائے گی۔

سحر ساجد کے ناول ”طاقت پرواز“ سے اقتباس
انتخاب: شائستہ جبین جو نیجو۔ بورڈی شریف

شے شے / چاشنی چن
جب ہم چین گئے تو چینی زبان سے بالکل کورے تھے لیکن ہمت کرے انسان تو کیا ہو نہیں سکتا۔ سترہ اٹھارہ دن بھی نہ گزرنے پائے تھے۔ کہ دو لفظ نہایت روانی سے

بولنے لگے۔ ایک نی ہاؤ یعنی (مزاج شریف) دوسرا چائی چن (اچھا پھر ملیں گے) سو مہمان کو یہی دو لفظ آنے چاہئیں باقی گفتگو کے لیے ترجمان موجود ہے۔ ہاں یاد آیا ایک اور لفظ بھی ہم برجستہ اور باموقع بول کر چینیوں کو حیران کرتے تھے وہ ہے شے شے (یعنی شکریہ) بعضوں نے پوچھا بھی کہ آپ نے اتنی جلدی چینی زبان کیسے سیکھ لی؟ ہمیں یقین ہے کہ ہم چند ماہ اور وہاں رہے تو انہی کی زبان میں صاحب سلامت کرنے لگتے۔ ہاں تو چین میں ایسا بھی ہوا کہ ترجمان پاس نہ تھا پھر بھی ہم کو چینیوں سے مکالمات میں کبھی دقت نہ ہوئی۔ ہم نی ہاؤ کہتے تھے اُدھر سے چینی زبان میں کچھ ارشاد ہوتا، ہم شے شے شے کرتے جاتے کہ اس کی بات ختم ہو جاتی اور ہم چائی چن جاتی چن کر کے رخصت ہو جاتے۔

ابن انشاء کے مضمون ”چین میں ایک دن اردو کے طالب علموں کے ساتھ“ سے اقتباس
انتخاب: ام عادل سہراب گوٹھ۔ کرلچی
”ترقی یافتہ“

ہماری بعض ”ترقی یافتہ“ عورتیں ہر وقت آزادی نسواں کا ڈھنڈورا پیٹتی رہتی ہیں۔ اگر وہ مغربی عورت کے ذہن میں گھس کر دیکھیں تو پتا چلے کہ معاشی آزادی حاصل کرنے کی دھن میں اس نے کتنی مصیبتیں مول لی ہیں۔ ہر چوٹی شادی زندگی کے دسویں برس میں ختم ہو جاتی ہے۔ پائل عورتوں کی تعداد اتنی زیادہ بڑھ گئی ہے کہ ماہرین صحت پریشان ہو گئے ہیں۔ سوسائٹی میں بدظنی، گھروں میں انتشار اور بے راہ روی جیسی لعنتیں اس کے علاوہ ہیں۔ نیندیں اُچاٹ ہو چکی ہیں۔ عورتیں خصوصاً بے خوابی کا شکار ہیں۔ خواب آور گولیاں بے تحاشا استعمال کی جاتی ہیں۔ خودکشی کی وارداتیں اکثر ہوتی ہیں۔ ہر طرف سے تنگ آ کر اپنا غم شراب میں ڈبوئے کی کوشش کی جاتی ہے۔ مذہب بھی انسان کو دینی سکون بخش سکتا ہے مگر وہاں یہ سہارا غائب ہے۔ چینی چلاتی موسیقی، وحشانہ رقص اور تیز منشیات میں زندگی کے مسائل کا حل تلاش کیا جاتا ہے۔ ایک مرد کی غلامی قبول نہ تھی مگر اب ہزاروں مردوں کی چاکری کرنی پڑتی ہے۔ ہر شخص عورت کو کھلونا سمجھتا ہے۔ جی بھر گیا تو توڑ کے پھینک دیا۔ بے شمار خواتین نے مجھ سے کہا۔ ”سب کچھ

موجود ہے لیکن دلی خوشی نہیں ملتی۔ انہیں کون سمجھائے کہ جو کچھ ان کے پاس ہے وہ انسان کو خوشی نہیں دے سکتا اور جو کچھ ان کے پاس نہیں، نئی پاکستانی عورتیں اس سے بچھا چھڑانے کی ہر ممکن کوشش کر رہی ہیں۔

بحوالہ: ”ہاتھ کی زبان“ پامسٹ ایم اے ملک
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کیسے گھر
جادو کی حقیقت

صلح حدیبیہ کے بعد جب نبی مدینہ واپس تشریف لائے تو محرم الحرام کے مہینے میں خیبر سے یہودیوں کا ایک وفد مدینہ آیا اور ایک مشہور جادوگر لیبید بن اعصم سے ملا جو انصار کے قبیلے یعنی ذریق سے تعلق رکھتا تھا۔ ان لوگوں نے اس سے کہا کہ محمد نے ہمارے ساتھ جو کیا ہے وہ تمہیں معلوم ہے؟

ہم نے ان پر بہت جادو کرنے کی کوشش کی مگر کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ اب ہم تمہارے پاس آئے ہیں کیونکہ تم ہم سے بڑے جادوگر ہو۔ یہ لو تین اشرفیاں انہیں قبول کرو اور محمد پر ایک زوردار جادو کر دو۔

اُس زمانے میں حضور اکرم ﷺ کے یہاں ایک یہودی لڑکا خدمت گار تھا سرسبز سے ساز باز کر کے ان لوگوں نے حضور اکرم ﷺ کی کٹھنی کا ایک ٹکڑا حاصل کر لیا جس میں آپ کے موئے مبارک تھے۔ انہی بالوں اور کٹھنی پر جادو کیا گیا۔ بعض روایات میں ہے کہ لیبید بن اعصم نے خود جادو کیا تھا اور بعض میں یہ ہے کہ اس کی بہنیں اس سے زیادہ جادوگر نیاں تھیں۔ ان سے اس نے جادو کروایا تھا۔ بہر حال دونوں صورتوں میں سے جو بھی صورت ہو۔ اس جادو کو ایک زکھور کے خوشے کے غلاف میں رکھ کر لیبید نے بنی ذریق کے کنوئیں، دروان یا ”ذی اروان“ نامی کی تہہ میں ایک پتھر کے نیچے دبا دیا۔

اس جادو کا اثر نبی کریم ﷺ پر ہوتے ہوئے ایک سال لگ گیا۔ دوسری ششماہی میں کچھ تغیر مزاج محسوس ہونا شروع ہوا۔ آخری چالیس دن سخت اور آخری تین دن زیادہ سخت گزرے۔

مگر اس کا زیادہ اثر جو حضور پر ہوا وہ بس یہ تھا کہ آپ گھلتے جا رہے تھے۔ کسی کام کے متعلق خیال فرماتے کہ وہ کر لیا ہے مگر نہیں کیا ہوتا۔ اپنی ازواج کے متعلق

خیال فرماتے کہ آپ ان کے پاس گئے ہیں مگر نہیں گئے ہوتے۔ بعض اوقات اپنی نظر پر شبہ ہوتا کہ کسی چیز کو دیکھا ہے مگر نہیں دیکھا ہوتا تھا۔ یہ تمام اثرات آپ کی ذات تک محدود رہے حتیٰ کہ دوسرے لوگوں کو یہ معلوم تک نہ ہو سکا کہ آپ پر کیا گزر رہی ہے۔

کتاب: ”ما فوق الفہم“ سے اقتباس
انتخاب: زرینہ جونجو بورڈی

برمودا تکون میں غائب ہونے والے مشہور جہاز

(1) اگست 1800ء میں امریکی کشتی انسرچنٹ بغیر کسی حادثے کے غائب ہوئی اس پر 340 مسافر سوار تھے۔

(2) جنوری 1880ء میں اٹلانٹا نامی برٹش جہاز غائب ہوا اس پر 290 مسافر سوار تھے۔

(3) اکتوبر 1902ء میں فیریا نامی جرمن جہاز غائب ہوا۔ اس کا علمہ اغوا کر لیا گیا جبکہ جہاز مل گیا۔

(4) مارچ 1918ء میں امریکی مال بردار جہاز سائیکوپ اپنے تمام عملے سمیت غائب ہوا عملے کی تعداد 309 تھی۔

(5) 1924ء میں مال بردار جاپانی کشتی رائی نوکو غائب ہوئی۔

(6) 1931ء میں مال بردار جہاز اسٹانچر غائب ہوا۔ اپریل 1931ء میں ہی جون اینڈ میری نامی امریکی جہاز غائب ہوا پھر کچھ وقت بعد جنوبی برمودا سے پچاس میل دور پانی پر تیرتا ہوا ملا۔

(7) 1938ء میں برطانوی آسٹریلیائی مال بردار جہاز اینگلو آسٹریلیز غائب ہوا۔

(8) 1940ء میں گلوبیا کولڈ نامی تفریحی کشتی غائب ہوئی۔ پھر کچھ عرصہ بعد غائب ہونے کی جگہ سے دو سو میل دور پانی گئی لیکن سواروں سے خالی۔

(9) 22 اکتوبر 1944ء کو کیوبا کارڈ پیکون نامی جہاز غائب ہوا پھر کچھ عرصہ بعد فلوریڈا کے ساحل کے کوئیب سواروں سے خالی پایا گیا۔

(10) 1948ء میں فرامیسی روزالی نامی جہاز کا علمہ اس پر سے اغوا کر لیا گیا اور جہاز بعد میں اسی علاقے

سے مل گیا۔

(11) جون 1950ء میں سائڈ رائی جہاز اس علاقے میں غائب ہوا۔

(12) 1955ء میں Queen Mayrio نامی تفریحی کشتی غائب ہوئی۔

(13) 2 فروری 1963ء کو میرین سلفر کون نامی امریکی مال بردار جہاز غائب ہوا اس پر 38 جہاز ران سوار تھے۔ اس پر سلفر لدا ہوا تھا۔

(14) یکم جولائی 1963ء کو اسنو بوائے نامی کشتی غائب ہوئی۔

(15) دسمبر 1967ء کو وچ گرانٹ نامی جہاز غائب ہوا۔ اس کا وزن بیس ہزار ٹن تھا اور عملے کی تعداد 32 تھی۔

(16) مئی 1968ء مشہور امریکی آبدوز اسکورپین نناویں فوجیوں سمیت غائب ہوئی۔

(17) اپریل 1970ء میں امریکی مال بردار جہاز ملٹن ٹریڈ غائب ہوا۔

(18) مارچ 1973ء میں جرمنی کا مال بردار جہاز اینچا غائب ہوا۔

یہ محض وہ واقعات ہیں جو زیادہ مشہور ہوئے ورنہ یہ فہرست کافی طویل ہے۔

کتاب: برمودا تکون اور دجال، فوج نمبر 39-40
مصنف: مولانا عاصم عمر
مرسلہ: وقاصد ام حسین غازی۔ حیدر آباد سندھ

معلومات

☆ برطانیہ میں ایک پچھلی لوڈیا سال میں 20 کروڑ انڈے دیتی ہے۔

☆ دلدل میں ایک پودا سنڈیو بکھیوں کو پکڑ کر کھا جاتا ہے۔

☆ ایک آبی جانور جو پائے دوسم کے نام سے مشہور ہے اتنی روٹی دیتا ہے کہ پاس کشتی میں بیٹھا ہوا مسافر اخبار پڑھ سکتا ہے۔

☆ کچھ چوہیاں دوسرے مل کی چوہنیوں میں سے غلام پکڑ کر لاتی ہیں اور ان سے خوراک ڈھونڈنے کا کام لیتی ہیں۔

☆ انسانی جسم میں جذبات کی لہر چار سو فٹ فی

سیکنڈ کی رفتار سے سفر کرتی ہے۔

☆ کچھوے کی عمر سو سال ہوتی ہے۔
ڈاکٹر غلام جیلانی برقی کی کتاب ”عظیم کائنات کا عظیم خدا“ سے اقتباس
انتخاب: ماہ نور عبور

دل کا دروازہ

ایک آرٹسٹ سے کہا گیا کہ وہ دل کے دروازے کی تصویر بنائے۔ آرٹسٹ نے ایک بہترین عمارت کی تصویر بنائی جس میں ایک عدد خوبصورت سا دروازہ بھی بنایا۔

اس سے کہا گیا۔ ”یہ دروازہ تو بند ہے۔“
آرٹسٹ نے کہا۔ ”دل کا دروازہ ہر خاص و عام کے لیے نہیں کھلتا۔“

تصویر بنوانے والے نے کہا۔ ”مگر یہ دروازہ نامکمل ہے اس کا ہینڈل تو ہے ہی نہیں۔“

آرٹسٹ نے کہا۔ ”دل کے دروازے کا ہینڈل باہر نہیں اندر ہوتا ہے اور ہمیشہ اندر ہی سے کھلتا ہے؟“

محمد طلحہ رحمانی: رشید آباد ملتان
افسوس کی حقیقت

اچھی باتیں

☆ آپ کی زندگی میں چند لوگ آپ کو تکلیف دینے کا کام کرتے ہیں ان کے اس کام پر افسوس مت کریں بلکہ خوش اخلاقی سے ان سے ملیں ہو سکتا ہے ان کا رویہ تبدیل ہو جائے۔

☆ دوستی کو ہمیشہ نبھائیں کیونکہ یہ ظلم رشتہ بہت کم لوگوں کے نصیب کا حصہ بنتا ہے۔

☆ خوش رہیں مگر رب کی ذات کو کبھی نہ بھولیں۔

☆ جس سے محبت کی جائے اس سے مقابلہ نہیں کیا جاسکتا۔

☆ اگر کسی کو دینا چاہتے ہو تو اسے اچھا وقت اور دعا دو کیونکہ آپ ہر چیز واپس لے سکتے ہو مگر کسی کو دیا ہوا اچھا وقت اور دعا واپس نہیں لے سکتے۔

☆ عبادت کے ستر دروازے ہیں ان میں افضل رزق حلال ہے۔ (فردوس الاخبار کلدیکی باب الحین حدیث 4061 ج 2 ص 86)

☆ فرمان مصطفیٰ ہے پہلے سلام کہنے والا تکبر سے بری ہے۔

☆ جو علم کی تلاش میں کسی راستے پر چلتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے لیے جنت کا راستہ آسان بنا دیتا ہے (سنن ابن ماجہ حدیث 223 ج 1 ص 145)

☆ قیامت کے دن سب سے پہلے نماز کی پرسش ہوگی۔ (سنن النسائی حدیث 463 ص 84)

☆ تم میں بہترین لوگ وہ ہیں جن کے اخلاق اچھے ہیں۔ (بخاری شریف کتاب الاداب)

☆ حق بات کہو اگر چہ کڑوی ہو۔ (مشکوۃ المصابیح)

☆ چغل خور جنت میں داخل نہیں ہوگا۔ (صحیح بخاری)

انتخاب: مریم شاہ۔ سرگودھا
شیطان کے گاہک

حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے دیکھا کہ شیطان چار گدھوں پر سامان تجارت لادے ہوئے جا رہا ہے۔ آپ نے پوچھا۔ ”ارے مردود..... یہ مال کہاں لے جا رہا ہے؟“

شیطان نے فخر سے جواب دیا۔ ”یہ مال تجارت ہے ایک گدھے پر ظلم دوسرے پر خیانت تیسرے پر مکرو فریب اور چوتھے گدھے پر حسد۔“

حضرت عیسیٰ نے پوچھا۔ ”اس مال کا خریدار کون ہے؟“

شیطان نے کہا کہ ظلم حکمرانوں کے کام کی چیز ہے وہ اس کو خریدتے ہیں۔ خیانت تاجروں کے ہاتھ فروخت کرتا ہوں مکرو فریب عورتوں کا پسندیدہ مال ہے اور حسد کی علماء کے ہاں بہت مانگ ہے۔“

انتخاب: ام عادل

کڑوے درخت سے میٹھا پھل

بہرام شاہ شکار کا بے حد شوقین تھا لیکن اپنی رعایا کے حالات سے بالکل بے خبر۔ وہ منظم فوج کی برید اور اپنے درباریوں کی چالوسی دیکھ کر خوش ہو جاتا کرتا۔ ایسے حالات میں ملک کی سرحدوں پر جنگ چھڑ گئی۔ وہ عوام سے مدد طلب کرنے پر مجبور ہو گیا لیکن عوام نے اس کی بات پر کان نہ دھرے۔ بادشاہ یہ دیکھ کر حد درجہ متاثر ہوا اس نے سوچنا شروع کیا کہ عوام کے ہاتھوں اس کی شکست کے کیا اسباب ہیں؟ ایک دن وہ لباس اور حلیہ بدل کر شہر سے باہر گیا۔ اس نے ایک شخص کو دیکھا جس

نے اپنے خیمے کے سامنے ایک کتے کی کھال لٹکا رکھی تھی۔ سبب پوچھا تو بتایا گیا ”میری زندگی میں گزر اوقات چند بھیڑوں پر ہوتی تھی جوان بنوہ زاروں میں چرا کرتی تھیں اور یہ کتا جس کی کھال یہاں لٹکی ہوئی ہے ان بھیڑوں کی حفاظت کرتا تھا۔ میں اور میرا چرواہا بے فکری کے ساتھ اپنے کام کو وسعت دینے کی سوچ رہے تھے لیکن چند روز بعد چرواہا آیا اور اس نے مجھے بتایا کہ آج ایک بھیڑ کو بھیڑیوں نے کھالیا۔ اس کے بعد مسلسل دو تین روز تک ایسی ہی خبریں ملنے لگیں۔ میں کتے سے بدگمان ہو گیا۔ میں نے اور چرواہے نے مل کر پھر کتے کی نگرانی کی۔ ہم نے دیکھا کہ کتے نے چند مادہ بھیڑیوں کے ساتھ جنسی تعلقات قائم کیے ہوئے ہیں۔ وہ اپنی شہوت پوری کرنے کے لیے مادہ بھیڑیوں کو بھیڑوں پر حملہ کرنے دیتا ہے۔ ہمیں یہ نقصان ایسی وجہ سے ہوا تھا کہ ہم نے کتے پر حد درجہ اعتماد کر لیا تھا۔ میں نے فوراً کتے کا سر کاٹ دیا اور اس کی کھال یہاں لٹکا دی تاکہ لوگ جان لیں کہ اگر کوئی کسی ذمہ داری کو سنبھالتا ہے اور اپنے کام سے خیانت کرتا ہے تو اس کا انجام ایسا ہی ہوتا چاہیے۔ بادشاہ نے تمام طبقوں میں پھیل کر معلومات اکٹھا کی پتا چلا کہ درباریوں، وزیروں اور دیگر عہدیداروں کے ظلم کے سبب رعایا کی دشمن بن چکی ہے۔ اس نے فوراً سب کو معزول کر دیا اور جلد ہی اس نے عوام میں مقبولیت حاصل کر لی۔

کتاب کا نام: عظیم لوگوں کی کامیابی کے راز
صفحہ نمبر 120-121-122

ترقی

ہم نے پچھلی بار جاپان سے آکر ایک مضمون لکھا تھا ضرورت ہے جاپان کے لیے ایک گدھے کی۔ اس پر ہمیں بہت سے خط آئے کہ ہم بالکل گدھے ہیں۔ ہمیں جاپان بھجوا دیجیے۔ ہمیں وضاحت کرنی پڑی کہ صاحبو گدھے مت بنو۔ بات سمجھنے کی کوشش کرو۔ وہاں تمہاری نہیں بلکہ سچ جگہ کے گدھے یعنی جانور کی ضرورت ہے۔ چڑیا گھر کے لیے جاپانیوں کا خیال تھا کہ جاپانی بچے چڑیا گھر میں گدھا دیکھیں گے اور ان کو معلوم ہوگا کہ یہ پاکستان سے آیا ہے تو وہ اس رشتے سے پاکستان سے بھی متعارف ہوں گے اور پاک جاپان دوستی کا راستہ کھلے گا لیکن ہمارے ہاں کے لوگوں نے کچر کچر کی اور کہا۔

اونٹ منگوانو بکرا منگوانو کچھ اور منگوانو گدھے پر اصرار مت کرو۔ جاپان والے بہت مایوس ہوئے۔ ان کی سمجھ میں نہ آیا کہ جب ان کے پاس اتنے گدھے ہیں ایک ہمیں دینے میں کیا حرج ہے۔ بہر حال مژدہ ہو کر اپنیں نے گدھا بھیج دیا اور اب پاکستان کی گلو خلاصی ہوئی۔ اب فرمائش یہ ہے کہ گھوڑا بھیجو۔ چلیے کچھ تو ترقی ہوئی گدھے سے گھوڑے پر تو آئے۔

ابن انشاء: رفیق ایس ایم

قاتل اور خونخوار لوگوں کا حشر

معراج کے سفر میں آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک گروہ کو دیکھا کہ فرشتے انہیں چھریوں سے بکروں کی طرح ذبح کر رہے ہیں اور ان کے حلقوں سے سیاہ رنگ کا بدبودار خون نکل رہا ہے۔ یہ لوگ ذبح کرنے سے مر جاتے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی قدرت سے پھر زندہ ہو جاتے ہیں۔ پھر ذبح کیے جاتے ہیں۔ ان کی یہ دردناک کیفیت دیکھ کر آپ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم و آلہ وسلم نے جبرئیل علیہ السلام سے دریافت کیا کہ یہ کون ہیں؟ تو انہوں نے بتایا۔ ”حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! یہ وہ قاتل اور خونخوار لوگ ہیں جنہوں نے دنیا میں بے گناہ اور ناحق خون کیے تھے۔ اس کی سزا میں ایسے لوگ ہمیشہ اسی طرح ذبح ہوتے رہیں گے۔“

کتاب: نیکی پھیلائیں بدی مٹائیں سے ماخوذ
(بشکریہ عارف الرحمن صاحب۔ لاہور)

بشیر احمد بھٹی فوجی ہسپتال۔ بہاولپور

تقلید

ایسے کتنے ہی لوگ ہیں جو رات کو گم نامی کی نیند سوئے اور صبح ناموری کی روشنی میں بیدار ہوئے تو عام فہم بات ہے کہ کسی بھی خاموش شاعر کا کلام چھپنے سے پہلے عظیم نہیں ہوتا اور کلام چھپ جائے تو نام وری عطا ہو جاتی ہے ایک انسان اپنے شب و روز میں میانہ زندگی گزر رہا ہے اس کے سامنے ایک چیلنج آتا ہے وہ اس چیلنج کو قبول کرتا ہے اور ایک خوش بخت عمل کے گزرتا ہے نتیجہ یہ کہ وہ عظیم غازی علم الدین شہید بن جاتا ہے۔ اس طرح بے شمار مثال مثالیں ہیں ان لوگوں کی جنہیں واقعات نے عظیم بنایا۔ یہاں تو بات واضح ہے کہ عظیم لوگ آتے جاتے رہتے ہیں۔ اپنی عظمتوں کو فیض بناتے

ہیں اور کبھی کبھی اپنی عظمتوں کو ایک جھنڈا بناتے کسی سرزمین پر گاڑ دیتے ہیں۔ اپنے ہاں جو بھی لوگ عظیم ہیں ان کی زندگی کا بغور مطالعہ کیا جائے جس شعبے میں اور جس مقام پر وہ عظیم ہیں ان کو سلام پیش کیا جائے اور جہاں ان کی زندگی معذرت سے گزر رہی ہے وہاں سے گریز کیا جائے۔ ہمارے ہاں وقت یہ ہے کہ جو علماء صاحبان ہیں وقت کے تقاضوں کی عظمتوں سے بے خبر ہیں اور جو عظیم لوگ ہیں وہ احکام شریعت سے غافل ہیں یہی وجہ ہے کہ قوم جب کسی ہیرو کی تقلید کرتی ہے تو دین بے راہ ہو جاتی ہے اور اگر دینی طور پر پابند زندگی گزارے تو وقت کے تقاضے نظر انداز ہو جاتے ہیں۔ ہم یہاں تک متعصب ہیں کہ کسی بڑے آدمی کا اس طرح نام بھی نہیں سنا چاہتے کہ وہ دینی معاملات میں کمزور تھا ہم اس کی خوبی کے پرستار ہیں اور عظمت کی پرستش کے دوران اس کی زندگی کے غافل حصے کی بھی تقلید کر جاتے ہیں۔

مثلاً کوئی عظیم مفکر قوم کو عظمتوں سے آشنا کرنے والا دین کے کسی فرض کی ادائیگی میں ذرا کمزور ہو تو اتنا کہنے کی بھی جرأت نہیں ہوتی کہ یہاں وہ سچ ہے یہاں وہ سچ نہیں۔ ہماری قوم ایک مثالی عظمت اور عظیم آدمی کی تلاش میں ہے اور یہ بڑے ہی افسوس کی بات ہے ہم لوگ سمجھ نہیں سکتے کہ دنیا کے عظیم انسانوں میں صرف ایک چند صفات کی عظمت ہے۔ واحد عظیم ہستی حضور اکرم کی ہے جن کی زندگی کا ہر شعبہ مثالی ہر عمل بے مثال جن کی ہر صفت جن کی نشست و برخاست جن کا جاگنا سونا اور جن کا بولنا سنا باعث تقلید ہے جن کے نقش قدم پر چلنا ہی فلاح کی راہ ہے۔ باقی تمام عظیم ہستیوں کا ان کی اس صفت کے مطابق جائزہ لینا چاہیے جس میں وہ عظیم ہیں۔ ہر آدمی خواہ کتنا ہی عظیم ہو تقلید کے قابل نہیں۔ اگر ہم ہر ایک کو قابل تقلید رہنما بناتے رہے تو قوم ایک بے جہت اور بے سمت سفر میں گم ہو سکتی ہے۔ اکابرین ملت کو آفات رسالت کی کرنیں ہی مانا جائے بس نور ظہور سب ہی حضور کا ہے باقی سب عظمتیں صرف دیکھنے کے لیے ہیں تقلید کے لیے نہیں۔ تقلید صرف اس ذات کی جسے اللہ کی تائید حاصل ہے۔

(تحریر: واصف علی واصف۔ تصنیف ”حرف حرف حقیقت“)

انتخاب: عمران گل مسیح۔ ڈیرہ روڈ دریا خان

موت بھی فتح

شاستری: جرنیل صاحب! آپ خاموش کیوں ہو گئے؟

جنرل چوہدری: مہاراج اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہم خود ہتھیار ڈالنے اور پسپا ہونے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔

جنرل چوہدری: میرا یہی مطلب ہے مہاراج! جنگ کا دوسرا اصول یہ ہے کہ کسی فوج کو فتح کی امید صرف اس وقت تک ہوتی ہے جب تک کہ اس کے پاس دشمن کا مقابلہ کرنے کے وسائل موجود ہوں لیکن پاکستان کے سپاہی ہمارا حملہ روکنے یا ہم پر حملہ کرتے وقت یہ سوچنے کی تکلیف بھی گوارا نہیں کرتے کہ ہمارے ٹینکوں کے مقابلے میں ان کے ٹینکوں اور ہماری توپوں، مشین گنوں اور ہوائی جہازوں کے مقابلے میں ان کے ٹینکوں، توپوں، مشین گنوں اور ہوائی جہازوں کی تعداد کتنی ہے۔ وہ ہر حال میں آخری وقت تک اس امید اور یقین کے ساتھ لڑتے ہیں کہ فتح صرف ان کے لیے ہے یہاں تک کہ وہ اپنی موت کو بھی فتح سمجھتے ہیں۔

اقبال پورس کے ہاتھی ازیم جازی
انتخاب: صفیہ محل شاہ۔ لاہور

انصاف کی صورت

”بکھرے موتی“

☆ کسی انسان کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ تلاش رزق کی بجائے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کے بیٹھ جائے اور دعا کرے کہ اے اللہ! مجھے رزق دے۔ تمہیں معلوم ہے کہ آسمان سے سونا اور چاندی نہیں برستا۔

☆ جلتے وقت خیال رکھو کہ تمہارے قدموں سے اٹھنے والی دھول میں کسی کا رستہ نہ کھوجائے۔

☆ زندگی حسین ہے مگر اسے حسین تر آپ کے اعمال بناتے ہیں۔

☆ مسکراہٹ زندہ دلی کا نام ہے اور یہ لوگوں کو جینا سکھاتی ہے۔

مرسلہ: نیہا، کراچی۔

سہکتی کلیاں

☆ اگر کسی کے دل میں ماسوائے اللہ کے کوئی اور چیز ہے اگر وہ سراپا اطاعت ہو پھر بھی مردہ دل ہے۔

☆ روؤ زیادہ اور ہنسوک۔

☆ جو عمل محض اللہ تعالیٰ کے لیے کیا جائے وہی اخلاص ہے۔
☆ اگر تم دنیا طلب کرو گے تو دنیا تم پر غالب آجائے گی اور اگر تم دنیا سے منہ موڑ لو گے تو تم دنیا پر غالب آ جاؤ گے۔
☆ مخلوق کی ایذا رسائیوں پر صبر و تحمل من جملہ علامات ولایت ہے۔
☆ تمہاری گویائی تمہاری خاموشی سے کم ہونی چاہیے۔
☆ اعلانیہ گناہ مخفی گناہ کی نسبت سخت تر اور اس گناہ کا اظہار دوسرا جرم ہے۔
☆ جس کو خلقت پر شفقت نہیں وہ اللہ تعالیٰ کی دوستی سے محروم ہے۔
☆ ایک لمحہ بھروسے کے لیے اللہ تعالیٰ کا ہور ہنا زمین و آسمان کے اعمال سے بہتر ہے۔
☆ لوگ کہتے ہیں کہ خدا عقل و دلیل سے ملتا ہے بہ خدا صرف خدا سے ملتا ہے۔
☆ اللہ تعالیٰ سے محبت پیدا کرو تا کہ تمہارا دل قوی ہو جائے۔

مرسلہ: عمران لاری کراچی۔

کلونجی

کلونجی کے سلسلے میں رسولؐ نے فرمایا ہے کہ ”اس میں موت کے سوا ہر بیماری سے شفا ہے۔“
اور اس بات کو بین الاقوامی سطح پر ثابت بھی کیا جا چکا ہے جس کی وجہ سے مغرب ہو کہ مشرق کلونجی کا استعمال دواؤں وغیرہ میں بہت کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ کھانوں میں اجار اور چینی جیسے ذائقے دار اور خوشبودار چٹ پٹی اشیاء بھی کلونجی کی بدولت ہی اپنا ذائقہ محفوظ کر پاتی ہیں۔ کلونجی چھوٹے چھوٹے سیاہ بیجوں کی صورت میں ملتی ہے اور رومی ان بیجوں کی افادیت سے واقف تھے اس لیے روم میں اس کے پودے بہت زیادہ پائے جاتے ہیں۔ یونان اور عرب نے بھی کلونجی کی اہمیت کے تحت اس کے ابتدائی پودے روم سے حاصل کیے تھے اور اب تو یہ ”میسا پودے“ تمام دنیا میں کاشت کیے جاتے ہیں۔

مرسلہ: ندیم صدیق سیالکوٹ۔

سائنسی معلومات

☆ دنیا کے 10 فیصد جنگلات کینیڈا میں ہیں اور یہ لکڑی برآمد کرنے والا سب سے بڑا ملک ہے۔
☆ سب سے چھوٹی چھلی 10.33 انچ ہوتی ہے۔
☆ ایبزون جنگل کا درجہ حرارت پورے سال 27 ڈگری کے قریب رہتا ہے۔
☆ انڈے دینے والی ایک مرغی اپنی زندگی میں (اوسطاً) 257 انڈے دیتی ہے۔

مرسلہ: عنبرین اقبال کراچی۔

پالک

یہ سبزی برصغیر میں عام استعمال کی جاتی ہے۔ اگرچہ بظاہر بہت معمولی غذا ہے لیکن قدرت نے اس میں فولاد کے اجزا شامل کر کے اس کی قدر و قیمت بڑھا دی ہے۔ مقوی، زود ہضم اور قبض کشا ہے۔ جن لوگوں کو قبض کی شکایت اکثر رہتی ہو انہیں پالک کا باقاعدہ استعمال کرنا چاہیے۔ تاثیر کے لحاظ سے سرد تر ہے۔ گرم خشک طبیعت والوں کے لیے بہت مفید ہے۔ پتھری، یرقان، مانچو لیا اور گرمی کے بخاروں میں بھی فائدہ بخش ہے۔ ماہرین تحقیق کے بعد اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ پالک میں فولاد اور شیشیم (چونا) کی مقدار بہت زیادہ ہوتی ہے۔ فولاد خون بڑھاتا اور جگر کو تقویت دیتا ہے۔ چونا ہڈیوں کی ساخت کو مضبوط سخت اور پائیدار بناتا ہے۔ جن لوگوں کے جسم میں خون کی کمی ہو وہ اسے استعمال کریں۔ کشتہ فولاد کھانے سے خون اتنا نہیں بڑھتا جتنا پالک کے کھانے سے بڑھتا ہے۔

مرسلہ: کاشف لاہور۔

شہد اور صحت

☆ امراض قلب: شہد ایک چچہ اور دار چینی کا سفوف آدھا کچ ملا لیں۔ اسے جیم کی طرح ڈبل روٹی پر لگا کر کئی دن ناشتا کریں یہ نسخہ خون کی شریانیں کھلنے میں مدد دے گا اور مریض حملہ قلب سے محفوظ رہے گا۔
☆ بدبودار سانس: نیم گرم پانی ایک گلاس میں ایک چچ شہد اور آدھا چچ دار چینی ملا کر باقاعدگی سے غرارے کرنے سے سارا دن سانس خوشوار رہتی ہے۔
☆ تھکن: معمر افراد کے علاوہ کبھی کبھی نوجوان بھی تھکن محسوس کرتے ہیں۔ ایک گلاس پانی لیں اس میں

شہد آدھی چمچی اور چنگی بھر دار چینی کا سفوف حل کر کے نہار منہ اور دوپہر کے کھانے سے پہلے پی لیں۔ ایک ہفتے میں عمدہ نتائج پائیں۔
☆ ٹیل مہا سے: شہد تین حصے اور دار چینی کا سفوف ایک حصہ ملا کر لیپ بنالیں۔ رات کو سوتے وقت اسے ٹیل مہاسوں پر لیپ کر دیں اور صبح نیم گرم پانی سے منہ دھولیں۔ دو ہفتے کے استعمال کے بعد مثبت اثر ظاہر ہوگا۔

مرسلہ: محمد عثمان لیاقت آباد کراچی۔

مہکتی کلیاں

☆ طالب دنیا سمندر کا پانی بننے والے کی مثل ہے کہ جس قدر پیتا ہے تو اور زیادہ پیاس لگتی ہے۔
☆ کوئی بھی مصیبت پڑنے پر ہرگز موت کی تمنا نہ کرو۔
☆ سب سے بدترین وہ شخص ہے جس کی بدزبانی کے سبب لوگ اس سے ملنا چھوڑ دیں۔
☆ جب تم شرم نہ کرو تو پھر جو تمہارا راجی چاہے سو کرو۔

☆ سنی سنائی بات دیکھی ہوئی چیز کے برابر نہیں ہوتی۔

☆ پھول بننے کی دعامت مانگو کیونکہ خوشبو ہر پھول کا مقدر نہیں ہوتی اور مرجھانا ہر پھول کی قسمت ہے۔
☆ دوست کی تعریف سب کے سامنے کر دو مگر نصیحت صرف تنہائی میں کرو۔
☆ محبت کی پاکیزگی کے لیے شرافت کا وجود ضروری ہے ورنہ محبت نفرت میں بدل جاتی ہے۔

مرسلہ: سلطانہ بیگم کراچی۔

ملک ملک کی کہاوٹیں

☆ ذہانت کی فتح کا نام محبت ہے۔ (امریکی کہاوٹ)
☆ اس میں شک نہیں کہ آزادی کی بھوک اسیری کی سیری سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ (جرمن کہاوٹ)
☆ بہادر کی آزمائش میدان جنگ میں دوست کی مصیبت کے وقت اور غلغلہ کی غیض و غضب میں ہوتی ہے۔ (عربی کہاوٹ)
☆ نیلامی کے وقت اپنا منہ بند رکھو۔ (ایتھنی کہاوٹ)

☆ جو چیز شیر کو لومڑی بناتی ہے وہ ضرورت ہے۔ (فارسی کہاوٹ)
☆ عمدہ دوائی اکثر کڑوی ہوتی ہے (جاپانی کہاوٹ)
☆ کل کے دو سے آج کا ایک بہتر ہے۔ (انگینڈ کی کہاوٹ)
☆ جب کتا ہو تو پتھر نظر نہیں آتا اور جب پتھر ہو تو کتا نظر نہیں آتا۔ (پاکستانی کہاوٹ)
☆ کسی سے محبت کرنا اور اسے کھودینا محبت نہ کرنے سے بہتر ہے۔ (چینی کہاوٹ)
☆ بھیڑ کو باپ نہیں صرف گھاس یاد آتی ہے۔ (روسی کہاوٹ)
☆ مکار سب سے پہلے پکڑا جاتا ہے۔ (فرانسیسی کہاوٹ)
☆ بالکل نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر ہے۔ (مصری کہاوٹ)

مرسلہ: ہمارو ج اقبال کراچی۔

کیا سے کیا..... بن جاتا ہے!

☆ جو زمین ہو..... وہ مجرم بن جاتا ہے۔
☆ جو امیر ہو..... وہ امیر ترین بن جاتا ہے۔
☆ جو غریب ہو..... وہ غریب ترین بن جاتا ہے۔
☆ جو بے کار ہو..... وہ گھروانا بن جاتا ہے۔
☆ جو لاچار ہو..... وہ شوہر بن جاتا ہے۔
☆ جو شریف ہو..... وہ گونگا بن جاتا ہے۔
☆ جو گونگا ہو..... وہ عوام بن جاتا ہے۔
☆ وہ پڑھ جائے..... وہ بیورو کریٹ بن جاتا ہے۔

☆ جو نہ پڑھے..... وہ اداکار بن جاتا ہے۔
☆ اور جو اداکار ہو..... وہ سیاستدان بن جاتا ہے۔
مرسلہ: ثوبیہ شہاب علوی کراچی۔

سچ کہتے ہیں.....

☆ عقل کی حد ہو سکتی ہے بے عقل کی نہیں۔
☆ زندگی بغیر محنت کے اور بغیر عقل کے مصیبت کا پیش خیمہ ہے۔
☆ گالی کا جواب نہ دو کہ کیوتر کوے کی بولی نہیں بول سکتا۔

☆ عمل دل کو اس طرح زندہ رکھتا ہے جس طرح بارش زمین کو۔
☆ تمہارا راز تمہارا قیدی ہے لیکن افشا ہونے کے بعد تم اس کے قیدی بن جاؤ گے۔

مرسلہ: فرح ناز پنڈی۔
دولت حسن کی حفاظت
حسن و جمال ایک نایاب و نادر دولت ہے اور دولت سدا چھپا کر بحفاظت رکھی جاتی ہے نہ ہر کسی کو دکھائی جاتی ہے اور نہ ہی پھرائی و گھمائی جاتی ہے۔ اسی لیے خواتین کو شرعی حدود و قیود کے اندر پردہ میں رکھنا ان کی غفلت، عزت، عظمت و عصمت کے لیے انتہائی ضروری ہے۔

مرسلہ: عظمیٰ سلیمان کراچی۔
آپ بھی جانیں
☆ جنت ماں کے قدموں تلے ہے۔ (حضور اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)
☆ اگر میری ماں مجھ سے جدا ہو جائے تو میں پاگل ہو جاؤں گا۔ (حضرت لقمان)
☆ بچے کے لیے سب سے اچھی جگہ ماں کا دل ہے۔ (ولیم جیکس)
☆ وہ کون کون شخص تھے جو اپنی والدہ کے لیے پانی کا کٹورا لیے کھڑے رہے۔ (حضرت بایزید بسطامی)
☆ سلطان المشائخ کے معنی کیا ہیں؟ (بزرگوں کے بادشاہ)

☆ سلطان المشائخ کن کا لقب تھا؟ (نظام الدین اولیاء)
☆ حضرت نظام الدین اولیاء کی والدہ کا نام کیا تھا؟ (بی بی زلیخا)

عبدالقیوم خان۔ آدم ٹاؤن میرپور خاص
بکھرے موتی
☆ جو محبت اور توجہ آپ دوسروں سے حاصل کرتے ہیں وہ آپ کی اپنی ذات کی کمائی ہے۔
☆ جب بارگاہ الہی میں تمہاری دعائیں قبول نہ ہو رہی ہوں تو اپنی گفتگو اور غذا کا احتساب کرو۔

☆ انسان اپنا چہرہ صاف رکھتا ہے جس پر لوگوں کی نظر ہوتی ہے مگر دل صاف نہیں رکھتا جس پر رب کی نظر

ہوتی ہے۔

☆ آپ کے بارے میں صرف دو لوگ بالکل سچ بتا سکتے ہیں ایک وہ دوست جو غصے میں اپنا ضبط کھو بیٹھے اور دوسرا وہ دشمن جو آپ کو چاہتا شروع کر دے۔
☆ پریشان ہونا انسان کے انسان ہونے کی دلیل ہے لیکن پریشان رہنا انسان کے اللہ پر یقین نہ ہونے کی دلیل ہے۔

☆ اچھا سوچے اور اچھا بولے کیوں کہ بدگمانی اور بدزبانی دو ایسے عیب ہیں جو انسان کے ہر کمال کو زوال میں بدل دیتے ہیں۔

مراسلہ نگار: قرۃ العین نصیب۔ ملتان

محبت میں کوئی شرط نہیں ہوتی
محبت سے جینے کی امنگ پیدا ہوتی اور زندگی کو روشنی ملتی ہے۔ محبت سے تو سب کچھ ہے۔ پہلی محبت بھی فنا نہیں ہوتی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس میں شدت آ جاتی ہے۔ محبت کے بارے میں فلسفہ یہ ہے کہ اس میں کوئی درمیانی راہ نہیں ہوتی یا تو محبت ہوتی ہے یا پھر نہیں ہوتی اگر کسی کو کسی سے سچی محبت ہو جائے تو کوئی شے درمیان میں حائل نہیں ہوتی۔ محبت مشروط یا باند نہیں ہوتی۔ یہ ایک آزاد جذبہ ہے جو آپ اپنی مرضی کا مالک ہے۔ محبت کا کم یا زیادہ ہونا دوسرے کے رویے پر منحصر ہے لیکن محبت یکسر ختم نہیں ہوتی۔ دوسرے کی سرد مہری، بے وفائی، بے حسی حتیٰ کہ نفرت بھی محبت کے جذبے کو ختم نہیں کر سکتی۔ بھرم ٹوٹ جانے سے دکھ تو ہوتا ہے مگر نفرت نہیں ہوتی۔ محبت سرسبز و شاداب ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی ایک کسک، ایک چھین بھی ڈیرے ڈال دیتی ہے جو من کو ہر لمحہ بے قرار رکھتی ہے۔ ویسے جن لوگوں نے سچی محبت کی ہے وہ اچھی طرح جانتے ہیں کہ محبت کرنے والوں کی خواہش بھی بڑی عجیب ہوتی ہے۔ وہ نہ صرف خود محبوب کے نام کی تسبیح کرتے رہنا چاہتے ہیں بلکہ ہر دوسرے شخص کو بھی اس تسبیح پر لگا دینا چاہتے ہیں۔

شعبان کھوسہ کوسہ۔

وہ الٹ لمحہ.....
بیتی ہوئی بہاریں اور ملن کی رتیں دھڑکوں کے ساتھ دھڑکنے والے نام تصور کے آئینے میں دکھنے

والے چہرے جب برسوں بعد زندگی کے کسی انجانے موڑ پر اتفاقاً مل جاتے ہیں تو وقت کی زنجیریں توڑ کر برسوں کی حدیں پھلانگ کر وہ لمحے وہ پل وہ چودھویں کی چاندنی کا اضطراب، وہ جدائی کا لہجہ اور قربتوں کی انمول خوشی وہ پھولوں کا لازوال حسن وہ کوئل کی کوک سننے کی چاہ وہ رت جکوں کی بے قراری۔

سب کے سب ایک لمحے میں سمٹ آتے ہیں تو وقت تھم جاتا ہے ساعتوں کے پاؤں میں بیڑیاں پڑ جاتی ہیں دل کے زخم پھر سے ہرے ہو جاتے ہیں جیتا ہوا گل آج کا مہمان ہو جاتا ہے تب آنکھیں اس اتفاق کو دیکھ کر انگلیاں ہو جاتی ہیں پتہ نہیں ایسا کیوں ہوتا ہے۔

مرسلہ: ربیعہ ناز گھارو۔

ایک کوشش ضروری ہے
خوشیاں ہمارے آس پاس موجود ہوتی ہیں انہیں تلاش کرنا پڑتا ہے۔ ہم میں سے اکثریت ایسے لوگوں کی ہے جو اپنے آنے والے گل کی فکر اور گزرے ہوئے گل کی کوتاہیوں پر پشیمان ہوتے رہتے ہیں مگر اپنے آج کو جو خوشگوار طریقے سے گزارنا چاہیے انہی الجھنوں میں گنوا دیتے ہیں جبکہ وہ بخوبی جانتے ہیں کہ گزرا ہوا گل دوبارہ نہیں آئے گا اور آنے والا گل کس نے دیکھا ہے لہذا اپنے موجودہ آج میں خوش رہنے کی کوشش کریں کیونکہ یہ بھی کبھی آپ کا مستقبل تھا اور کبھی ماضی کا حصہ بن جائے گا۔

یادوں سے بے رخی نہ کر
یادیں ہماری زندگی میں بہت اہمیت کی حامل ہوتی ہیں۔ ہر شخص کے دل میں کسی نہ کسی کی یاد کا بسیرا ہوتا ہے۔ کسی بیٹے کے دل میں ماں کی یادیں، کسی بیٹی کے لیے شفیق باپ کی یادیں، پچھڑے بہن بھائیوں کی ایک دوسرے سے وابستہ یادیں، عاشق کے دل میں محبوب کی یادیں، اچھے دوستوں کی یادیں، اسکول، کالج اور استادوں کی یادیں، گزرے دنوں کی یادیں۔

غرض کہ ہر دل کسی نہ کسی کی یاد میں گرفتار رہتا ہے۔ اگر آپ کو بھی کوئی یاد آتا ہے تو اسے اچھی طرح یاد کیا کیجیے کیونکہ ممکن ہے کہ آپ بھی کسی کی یادوں میں شامل ہوں اور وہ آپ کو بہت یاد کرتا ہو۔

خوشبو گئی نہ گھر سے نہ یادوں سے بے رخی ظالم کے سارے نقش بڑے پائیدار تھے

مسکراہٹ

☆ م..... محبت۔
☆ س..... سکون
☆ ک..... کوشش
☆ ر..... راحت
☆ ا..... انمول
☆ ہ..... ہمت
☆ ٹ..... ٹمگر

سات حروف پر مشتمل لفظ ”مسکراہٹ“ اپنے اندر بہت معنی اور گہرائی رکھتا ہے۔ ”مسکراہٹ“ ”محبت“ کا پیغام دیتی ہے۔ کسی اپنے کی مسکراہٹ دل کو ”سکون“ دیتی ہے۔ یہ دو دلوں کو قریب لانے کی ”کوشش“ کرتی ہے اور اس کوشش کی کامیابی میں ”راحت“ ہی ”راحت“ ہے۔ مسکراہٹ تو وہ ”انمول“ تحفہ ہے جو کسی تھکے ہارے انسان کی ”ہمت“ بندھاتا ہے اور پھر کسی کی ایک مسکراہٹ کی خاطر انسان دنیا کی بڑی سے بڑی طاقت سے ”فکر“ لینے کو تیار ہو جاتا ہے۔

ماں..... پیار ماں
ماں ایک ایسی نعمت ہے جس کے بغیر زندگی ادھوری لگتی ہے اور گھر گھر نہیں لگتا۔ یقیناً ماں سے اچھا تحفہ دنیا میں اتارا ہی نہیں گیا۔ کتنے خوش نصیب ہیں وہ لوگ جن کی ماں ان کے پاس ہے اور بڑے بد نصیب ہیں وہ لوگ جن کی ماں ہو اور وہ اس کی قدر نہ کریں۔

مجھے یقین ہے کہ ماں جب گھر میں موجود ہوتی ہے تو کس قدر رونق ہوتی ہے۔ اس کے ہونے سے ہی گھر میں بہار ہے۔ ماں کے ہوتے ہوئے گھر میں کوئی فکر اور پریشانی نہیں ہوتی اور گھر میں چاروں طرف تقبہ گو بجتے رہتے ہیں۔

اے ماں.....! یہ گھر تیرے ہی دم سے ہے۔ خدا تمہیں ہزاروں سال زندگی دے۔ میری زندگی کی تمام تر خوشیاں تجھ سے ہیں۔ ماں تو میری زندگی کا سب سے قیمتی سرمایہ ہے اور مجھے تم سے بہت پیار ہے۔

عظمت گم شدہ

حضرت آدم جب دنیا میں تشریف لائے تو انہیں احکام و فرامین عطا کیے گئے۔ ذریت آدم میں ہزاروں انبیائے کرام مبعوث کیے گئے جنہیں ایک روایت کے

مطابق تین سو پندرہ کتابیں اور صحائف مقدسہ عطا ہوئے۔ یوں انسانی ہدایت اور رہنمائی کے لیے کتاب لازمی قرار پائی۔ پرانے زمانے میں کتابیں پتھروں تختیوں ہڈیوں چھڑوں کپڑوں تھلیوں اور چٹوں پر لکھی جاتی تھیں۔ ایسی بعض تحریروں کے مجموعے آج بھی آثار قدیمہ کے مراکز اور عجائب گھروں کی زینت ہیں۔ اللہ کے محبوب رسول محمد ﷺ کو کتاب مبین قرآن پاک عطا کی گئی۔ یہ کتاب ہدایت علم اور تعلیم کا بنیادی حوالہ ہے جو رہتی دنیا تک انسانیت کی رہنمائی کرتی رہے گی۔ تاریخی روایات کے مطابق عہد خلافت راشدہ میں متعدد صحابہ کرامؓ اور ان کے بعد تابعین عظام کے شخصی ذخائر میں اوراق و قراطیس کے مجموعے موجود تھے۔ اموی عہد میں تو باقاعدہ کتب خانوں کا آغاز ہو چکا تھا۔ خلافت عثمانی میں قرآن مجید کی جو نقول مراکز اسلام میں رکھوائی گئیں وہ بھی ایک طرح کتب خانوں کے قیام کی شہادت اولیٰ قرار دی جاسکتی ہے۔ عہد عباسی میں کتب خانوں کی عظیم روایات قائم ہوئیں ”سوق الوارفین“ قائم ہوئے جہاں کتابوں کی نقول تیار کر کے اہل ذوق کو فروخت کی جاتی تھیں۔ عہد اسلامی کی دو صدیاں علم دوستی کتب شناسی اور کتب خانوں سے محبت کی لازوال داستان ہے۔ اہل یورپ نے مسلمانوں کے علمی مراکز بالخصوص ہسپانوی مراکز سے استفادہ کر کے تحقیق کی دنیا میں قدم رکھا۔ اموی عباسی فاطمی سلجوقی عثمانی اور مظاہر سلطنتوں میں کتب خانوں کی جو عظیم روایتیں قائم ہوئیں وہ اب دم توڑ رہی ہیں۔ وائے افسوس کہ مسلمانوں نے اپنے تہذیبی و تمدنی عروج کی سات صدیاں شان و شوکت سے گزارنے کے بعد جمود اور اندھی تقلید میں گرفتار ہو کر اپنی علمی شان کو گہن لگا دیا ہے۔ مسلمانوں کے مشہور کتب خانے عباسی عہد خلافت میں قائم ہوئے۔ موجودہ دور میں دنیا کی سب سے بڑی لائبریری ”لائبریری آف کانگریس“ ہے جس میں کروڑوں کی تعداد میں کتابیں موجود ہیں۔ لیٹن گراڈ روس کے ایک کتب خانے میں چھوٹی ریل کے ذریعے کتابوں کے ہال اور کمروں کو ملایا گیا ہے۔ پیرس کے نواح میں مسلم علوم اور ثقافت پر ایک کتب خانے میں تقریباً تین ملین کتابیں اور وثائق پائے جاتے ہیں۔ ”نیشنل لائبریری آف پاکستان“ پاکستان کی

سب سے بڑی لائبریری ہے جو دارالحکومت اسلام آباد میں واقع ہے۔ علاوہ ازیں پنجاب پبلک لائبریری سینٹرل لائبریری پنجاب یونیورسٹی دیال سنگھ ریسرچ لائبریری لاہور بھی قابل ذکر ہیں۔ اسلام آباد میں ادارہ تحقیقات اسلامی کی وسیع و عریض لائبریری جبکہ مروجہ البلاد کراچی میں ہر نوع کے ہزاروں کتب خانے موجود ہیں تاہم افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہاں علم کے پروانوں کی تعداد روز بروز گھٹ رہی ہے۔

مرسلہ۔ احمد اقبال کراچی۔

معزز اور کھتر آدمی

امام شافعیؒ فرماتے ہیں۔ ”معزز ترین آدمی کی پہچان یہ ہے کہ اس کے دل میں ہر ایک کے لیے محبت ہوئی ہے اور وہ آسانی سے کسی دوسرے کے ساتھ دشمنی پر آمادہ نہیں ہوتا وہ چاندی کی پیالی کی طرح ہوتا ہے اگر اسے موڑنا چاہیں تو آسانی سے مڑ جائے گا مگر آپ اسے توڑنا چاہیں تو وہ آسانی سے نہیں ٹوٹے گا۔“

کھتر آدمی کی پہچان یہ ہے کہ وہ آسانی سے محبت پر آمادہ نہیں ہوتا دشمنی کے لیے اُدھار کھائے بیٹھا رہتا ہے مٹی کے پیالے کی طرح ہوتا ہے اگر آپ اسے موڑنا چاہیں تو ہرگز نہیں مڑے گا مگر توڑیں تو فوراً ٹوٹ جائے گا۔“

مرسلہ۔ محمد شعیب وفا۔ مکن کرم ایجنسی۔

فرمان رسول ﷺ

☆ آدمی کے اسلام کی خوبی اس کا غیر متعلق باتوں کو چھوڑ دینا ہے (امام ترمذی)

☆ جس نے ہمارے دین میں کوئی ایسی بات نکالی جو اس میں سے نہیں وہ مردود ہے۔ (امام بخاری)

☆ تو جہاں کہیں بھی ہو اللہ سے ڈرتا رہ اور بدی کے پیچھے نیکی کر وہ اسے (بدی کو) مٹا دے گی اور لوگوں سے عمدہ معاملہ کر (امام ترمذی)

☆ نیکی کی تلقین کرنا صدقہ ہے برائی سے روکنا صدقہ ہے (امام مسلم)

☆ دین کی بنیاد اسلام ہے۔ اس کا ستون نماز ہے اور اس کے کوہان کی چوٹی جہاد ہے۔ (امام ترمذی)

☆ نماز نور ہے اور صبر روشنی ہے۔ (امام مسلم)

مرسلہ۔ ثانیہ بھٹی سیالکوٹ۔

☆ ☆ ☆

مہکتے پھول

(1) لمحوں میں قربتوں کے فاصلے تلاش کرنے والے لوگ نہ تو منزل کے رستے ہیں نہ سفر کے۔

(2) آسمان کی وسعتیں اس لیے زیادہ رکھ دی گئی تاکہ آدم کی اولاد کی سوچ پرواز کر سکے۔

(3) ہمارا دامن خالی اس وجہ سے ہوتا ہے کہ ہمارے ہاتھ مصلیٰ برائٹھا ہی نہیں کرتے۔

(4) یہ جو صبح صبح میرے در پہ صدا ہوا کرتی ہے ہے کوئی مانگنا والا اس کے بعد پھر مانگنے نکل پڑتا ہوں۔

(5) سرد آداس شامیں ہوں سلگتے جون کے ارمان وفا کرنے والے کی آنکھ کے آنسو گرم ہوا کرتے ہیں۔

(6) ہم معتدل اس وجہ کہ اس سے زیادہ ہم کچھ کر نہیں سکتے۔ اس سے بہتر کچھ ہوں تو میرا مالک خود بخود مجھے دے دیتا۔

(7) کچھ لوگ اور کچھ واسطے اس وجہ سے لکھتے پڑتے ہیں کہ نہ ہم نکل سکتے ہیں نہ اگل سکتے ہیں۔

(8) کچھ شامیں اس وجہ سے آداس کرتی ہیں آنکھوں کے ساتھ پوروں پر بنے ہوئے زخم بھی کسی کو واپس آنے کی التجا کرتے ہیں۔

مرسلہ۔ ناصر سلیم کراچی۔

سنہرے موتی

☆ زندگی میں ہمیشہ ہر کسی سے پیار کر و رشتہ جو بھی ہو۔ جب کسی سے پیار کرو تو اسے زندگی میں کبھی مت آزماؤ ہو سکتا ہے وہ تمہاری آزمائش پر پورا نہ اتر سکے اور تم ایک محبت کرنے والا گنواؤ۔

☆ عمدہ چیز کا حاصل کرنا کوئی خوبی نہیں بلکہ اس کو عمدہ طریقے سے استعمال کرنا خوبی ہے۔

☆ وقت ایک خاموش سمندر ہے جو انسان کی ہر خواہش کو ہضم کر جاتا ہے۔

☆ کسی کا دل مت دکھاؤ تلوار کا زخم مٹ جاتا ہے لیکن زبان کا نہیں۔

☆ کفر کے بعد سب سے بڑا گناہ دل آزاری کرنا ہے پھر جا ہے وہ مومن کی ہویا کسی کا فری۔

☆ کسی کی نفرت ختم کرنے کے لیے اس سے محبت کرو کیونکہ نفرت بھی نفرت سے ختم نہیں ہوتی۔

☆ صورت دل کو متاثر کرتی ہے لیکن سیرت روح کو

جیت لیتی ہے۔
☆ جو لوگ زندگی کو مقدس فرض سمجھ کر بسر کرتے ہیں وہ کبھی ناکام نہیں ہوتے۔

☆ فرصت کے اوقات کو غنیمت جانو یہ ایسے بادل ہیں جو جا کر واپس نہیں آتے۔

سدرہ انور علی۔ جھنگ صدر

مسکرا افسیہ

کعبہ

ایک آدمی نے اپنی بیوی سے کہا۔ ”بیگم میرا بال بال ترے میں جکڑا ہوا ہے۔“

باس بیٹھے بچے نے بڑی مصومیت سے کہا۔ ”پاپا آپ تو سمجھتے ہیں۔“

مرسلہ۔ محمد اسماعیل بروہی۔ نواب شاہ

لطیفہ

ایک شاعر ڈاکو بن گیا بینک میں ڈاکا ڈالنے گیا اور بولا۔ عرض کیا ہے۔

تقدیر میں جو ہے وہ ملے گا
Hands Up کوئی اپنی جگہ سے نہیں ہلے گا

اپنے سب خواب میری آنکھوں سے نکال دو
جو کچھ بھی ہے جلدی سے اس بیگ میں ڈال دو

بہت کوشش کرتا ہوں تیری یاد کو بھلانے کی
خبردار کوئی ہوشیاری نہ کرے پولیس کو بلانے کی

دل کا آنگن تیرے بن ویران پڑا ہے
جلدی کرو یا ہر میرا ساکھی پریشان کھڑا ہے

مرسلہ نگار: قرۃ العین زینب۔ ملتان

مہارت

ایک پروفیسر نے اپنی بیگم سے کہا۔ ”آج کیا پکایا ہے؟“
بیگم صلحہ نے فرمایا۔ ”کدو۔“

”کیا کہا؟ کچھ سات دن سے اس گھر میں کدو پک رہا ہے۔ تمہیں کوئی اور سبزی بنانا نہیں آتی؟“ پروفیسر نے احتجاج کرتے ہوئے کہا۔

”بنانا تو آتی ہے مگر میری امی کہتی ہیں کہ جب تک ایک کام میں مہارت حاصل نہ کر لی جائے تب تک دوسرا کام شروع نہیں کرنا چاہیے۔“ بیگم نے اطمینان سے جواب دیا۔

رانی اسلام۔ گوجرانوالہ

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

☆ ☆ ☆

جواب

ایک خاتون ایک کار لے کر سروس اسٹیشن پہنچیں۔ کار میں بے شمار ڈینٹ پڑے ہوئے تھے۔ خاتون نے لڑکے سے پوچھا۔ ”سنا ہے یہاں کاریں دھوئی جاتی ہیں؟“

”جی ہاں دھوئی جاتی ہیں لیکن استری نہیں کی جاتی۔“ لڑکے نے جواب دیا۔

مرسلہ: صنم ناز۔ گوجرانوالہ

غلط فہمی

گاہک نے غصے سے کہا ”یہ کھانے میں نقلی دانت کس کے پڑے ہوئے ہیں؟ اب میں یہ کھانا نہیں کھا سکتا۔“

بیرے نے مسکرا کر جواب دیا۔ ”جناب یہ نقلی دانت تو میرے ہیں۔ میں کب سے تلاش کر رہا ہوں۔ وہ اصل میں غلطی سے آپ کا کھانا چکھتے ہوئے یہ اس میں گر گئے ہوں گے۔“

بزم آوازی

غزل

چہرہ میرا تھا نگاہیں اُس کی
خاموشی میں بھی وہ باتیں اُس کی
میرے چہرے پہ غزل کھتی گئی
شعر کہتی ہوئی آنکھیں اُس کی
شوخی لحوں کا کا پتا دینے لگیں
تیز ہوتی ہوئی سائیں اُس کی
اے موسم بھی گزارے ہم نے
مجتنبیں جب اپنی تھیں شامیں اُس کی
دھیان میں اُس کے یہ عالم تھا بھی
آنکھ مہتاب کی یادیں اُس کی
فیصلہ موج ہوا نے لکھا
آندھیاں میری بہاریں اُس کی
نیند اس سوچ سے ٹوٹی اکثر
کس طرح سے نکلتی ہیں راتیں اس کی
دور رہ کر بھی سدا رہتی ہیں
مجھ کو تھامے ہوئے ہاتھیں اُس کی
(پروین شاکر) حسن انتخاب: مار یہ جلال ملیر کراچی

غزل

تیری دنیا میں یارب! زیست کے سامان جلتے ہیں
فریب زندگی کی آگ میں انسان جلتے ہیں
ہوس کی باریابی ہے خردمندوں کی محفل میں
رو پہلی چلمنوں کی اوٹ ایمان جلتے ہیں
شگوفے جھومتے ہیں اس چمن میں بھوک کے جھولے
بہاروں میں نشیمن تو بہر عنوان جلتے ہیں
حوادث رقص فرما ہیں قیامت مسکراتی ہے
سنا ہے ناخدا کے نام سے طوفان جلتے ہیں
مناؤ جشن سے نوشی بکھیرو زلف سے خانہ
عبادت سے تو ساغر دہر کے شیطان جلتے ہیں
کلام: ساغر صدیقی

غزل

تیلیوں کا مجھے ٹوٹا ہوا پر لگتا ہے
دل پہ وہ نام بھی لکھتے ہوئے ڈر لگتا ہے
رات آئی تو ستاروں بھری چادر تائی
خوبصورت مجھے سورج کا سفر لگتا ہے
یہ بھی سوتے ہوئے بچے کی طرح ہنستا ہے
آگ میں پھول فرشتوں کا ہنر لگتا ہے
زندگی تو نے مجھے قبر سے کم دی ہے زمین
پاؤں پھیلاؤ تو دیوار میں سر لگتا ہے
میں تیرے ساتھ ستاروں سے گزر سکتا ہوں
کتنا آسان محبت کا سفر لگتا ہے
انتخاب: ام عادل کلام: بشیر بدر

غزل

ہم نے جو دیپ جلائے ہیں تری گلیوں میں
اپنے کچھ خواب سجائے ہیں تری گلیوں میں
جانے یہ عشق ہے یا کوئی کرامت اپنی
چاند لے کر چلے ہیں تری گلیوں میں
تذکرہ ہو تری گلیوں کا تو ڈر جاتا ہے
کیوں ہر چیز ادھوری سی ہمیں لگتی ہے
جانے کیا چھوڑ کے آئے ہیں تری گلیوں میں
شاعر: وحی شاہ انتخاب: ام عادل

غزل

ہاتھ رکھو یہیں اداسی ہے
یہ مرا دل نہیں اداسی ہے
ابتدا میں تو اتنا خوش مت ہو
مجھ میں آگے کہیں اداسی ہے
تو بھی اتنا قریب نہیں مرے
جتنی دل کی قریں اداسی ہے
دیکھ اس حسن سوگوار کی طرف
دیکھ کتنی حسین اداسی ہے
اس پر قصر خوشی نہ ٹھہرے گا
میرے دل کی زمیں اداسی ہے
آنکھ یا پھیلتا ہوا کاجل
شام یا سرخیں اداسی ہے
تم اداسی کو دیکھ سکتے ہو
میں جہاں ہوں وہیں اداسی ہے

(شاعر) شہزاد نیر۔

انتخاب: عکاشہ سحر۔ ملتان

کس سمت لیے جائے ہے یہ دور ترقی
دھاتوں کے ہوئے جسم تو پتھر کے دل ہوئے
انتخاب: شمیم ناز۔ کراچی

زندگی ہے یا کوئی طوفان ہے
ہم تو اس جینے کے ہاتھوں مر چلے

(ایم سعید انور سعید۔ لاہور)

اک قیامت ہے جو ہر روز گزر جاتی ہے
تو نے دیکھا نہیں عالم مری تنہائی کا
(عمیر سعید۔ لاہور)

گو ذرا سی بات پر برسوں کے یارانے گئے
لیکن اتنا تو ہوا کچھ لوگ پہچانے گئے
(کور سعید۔ لاہور)

خوشی کیا ہے کسی موڑ پر پھنسنے جائے
رو حیات میں تم غم کو ہم سفر رکھنا
(عمر فاروق۔ لاہور)

بلندوں کو پستی سے ہے اجتناب
پکڑتا نہیں کمبھوں کو عقاب
بشیر احمد بھٹی۔ فوجی بستی۔ بہاول پور

اپنی باتوں میں کسی کے حوالے رکھنا
ہم سے پھڑے ہو ذرا خود کو سنبھالے رکھنا
لوگ پوچھیں گے کیوں پریشان ہو
آنکھوں سے جو بھی کہو ہونٹوں پر تالے رکھنا
صنم ناز۔ گوجرانوالہ

کیا ضروری ہے کہ ہاتھوں میں تیرا ہاتھ بھی ہو
چند یادوں کی رفاقت ہی بہت کافی ہے
لوٹ جلتے ہیں اسی پل سے گھروں کی جانب
یہ تھکن اتنی مسافت ہی کافی بہت کافی ہے
رانی اسلام۔ گوجرانوالہ

خلاف شرع کوئی کام کرو مت
حق بات کہنے سے ڈرو مت
ہوسکے تو خوشیوں کے پھول ہانٹو
اپنا دامن کانٹوں سے بھرو مت
شاعر: عبدالعزیز جی۔ آ۔ چکوال شی

جو حیراں ہیں تمہارے ضبط پر کہہ دو قتل ان سے
جو دامن پر نہیں گرتا وہ آنسو دل پر گرتا ہے
شاعر: قتیل شفائی۔ کرن شہیر۔ کراچی

انا کے قید خانے کا میں وہ باغی سا مجرم ہوں
جسے پھانسی چڑھا ڈالا محبت کے وکیلوں نے
مراسلہ نگار: قرۃ العین زہنب۔ ملتان

جو بات دل میں ہے وہ بتا کیوں نہیں دیتے
انجمنوں کا بوجھ میرے سینے سے ہٹا کیوں نہیں دیتے
بڑھ جائیں ان کی فصلیں تو گھٹتی ہی نہیں
ایسی ان دیکھی دیواروں کو گرا کیوں نہیں دیتے

مجید احمد جانی ملتان۔ ملتان

پسند اپنی اپنی

دل کی خواہش ہے کہ دیر تک آنکھیں
تجھ کو دیکھیں تیرا دیدار کریں!!
تجھ میں کھوجائیں کچھ اس طرح ہم
خود سے زیادہ تجھ سے پیار کریں

شاعر: شمیم ناز۔ اورنگی ٹاؤن

☆ ☆ ☆

مٹی کا قرض

شمینہ ناز۔ اورنگی ٹاؤن

اس ملک کی جڑوں میں ڈورتا ہوا لہو آج ہم سے اپنے حساب کا طلب گار ہے کہ ہم نے اس مٹی کا قرض کس طرح ادا کیا۔ کہیں ہمارے اپنوں کا خون ہماری گردنوں پر تو نہیں۔ کہیں ہم کسی کے بچے ہوئے آنسوؤں کا سبب تو نہیں بنے۔ کہیں ہم ماں باپ کی نافرمانی اور حرام خوری جیسے گناہ کبیرہ کے مرتکب تو نہیں ہوئے۔

آج یہ دل رو کر اللہ کے حضور سجدہ سجود ہو کر یہ کہہ رہا ہے کہ یا اللہ! ہم کب تک اس آزادی کی قیمت بوریوں میں بند لاشوں کی صورت میں ادا کرتے رہیں گے، مسجدوں سے اپنے پیاروں کے لاشے اٹھانے کی صورت میں ادا کرتے رہیں گے۔ روڈوں پر سے بکھرے ہوئے وجود کو سیٹھنے کی صورت میں ادا کرتے رہیں گے۔ حکمرانوں کی لاپرواہیوں اور کوتاہیوں کے سبب ہونے والے حادثات کی صورت میں ادا کرتے رہیں گے۔ یا اللہ! پاک تو بڑا غفور الرحیم ہے ہم پر رحم فرما! ہمارے اندر کے اچھے انسان کو حسد، کینہ اور برائی جیسی پیاریوں سے بچا۔ شیطان کے شر سے بچا، گناہ اور فریب سے بچا۔ یا اللہ ہمارے دلوں کی سیاہی کو اپنے پُر نور اجالے سے منور فرما ہمارے ہاتھوں کو ہمیشہ دینے والا بنا۔ یا اللہ! ہمیں ایسا بنا کہ ہم وطن سے محبت و خدمت کو عبادت سمجھ کر ادا کرتے رہیں بے شک تو خوب خوب نوازنے والا ہے۔ (آمین)

نشا ایک لعنت

شیخ معظم الہی۔ لاہور

آج کل کالج اور یونیورسٹی کے لڑکے اور لڑکیاں ہر طرف آپ کو نشہ کرنے کے عادی دکھائی دیتے ہیں۔ سگریٹ، چرس، ہیروئن، گنگا اور سب سے خطرناک نشہ شیشہ پینا رواج بن چکا ہے۔ لڑکیاں اور لڑکے اپنے اپنے تعلیمی اداروں سے بھاگ کر یہ عادت بد اپنا رہے ہیں اور یوں ہمارا نوجوان طبقہ نشہ کی لعنت میں مبتلا ہو رہا ہے جو ایک بہت ہی افسوس ناک بات ہے۔ نشہ کرنے والے لڑکے اور لڑکیوں کے والدین کو چاہیے کہ وہ ان پر سخت نگرانی کریں اور ایسے خطرناک نشہ سے باز رہنے کی تلقین کریں ورنہ ہماری آج کل کی نسل مستقبل میں کچھ نہیں کر پائے گی۔ ہم جس مذہب سے تعلق رکھتے ہیں اس میں نشہ نہ کرنے کی سخت مذمت کی گئی ہے۔ مطلب یہ کہ بطور مسلمان ہمیں نشہ کی لعنت سے بچنا چاہیے لہذا میں ان والدین سے التجا کرتا ہوں کہ وہ اپنے بچوں کو نشہ کی اس لعنت سے نجات دلوائیں کیونکہ اس میں آپ ہی کا بھلا ہے بچوں کا مستقبل اب آپ کے ہاتھ میں ہے۔ دیکھتے ہیں کہ آپ اس پر کتنا عمل کرتے ہیں؟ اپنے بچوں پر بھرپور توجہ دیں (شکریہ)

وہ رشتہ بے نام

سیدہ حافظہ مومن شاہ۔ سرگودیا

جس طرح کوئی دھیسے سُروں کا نغمہ سماعتوں کو بھلا لگتا ہے، کوئی مدھری دھن فضا میں بکھر کر جلتی رہتی ہے۔ جیسے خوابوں کا گلابی عکس آنکھوں میں ہلکورے لینے لگتا ہے، کوئی بات بے ساختہ دل میں یوں اتر جاتی ہے جیسے..... جیسے کسی نرم گھاس پر اوس کا قطرہ جم جاتا ہے یا پھر سرخ گلوں پر تتلیاں رقص کرتی ہیں۔ چلو یوں ہی سمجھ لو جیسے رسوائی کا داغ دھل بھی جائے تو اُس کا نشان باقی رہتا ہے جیسے آسمان پر اڑتے سفید بگلوں کی حسایت بن چھوئے محسوس ہوتی ہے۔

جیسے سانسوں کا رشتہ زندگی کا اٹوٹ انگ ہے میرا قلم ان رشتوں کی جاذبیت کو سپرد تحریر کرنے سے قاصر رہا ہے۔ ہاں! یہ رشتوں کے طلسم کدے حرف و معانی کے فہم میں کہاں آنے والے ہیں۔ ان کے گداز احساسات شاید کبھی بھی حرف و معانی کا لباس نہیں پہن سکتے۔

ایک دوسرے سے گلے ملتے رشتے

جڑتے لفظوں کی طرح جڑتے رشتے
دھنک کی طرح رنگ رنگ رشتے
دوسروں کا درد خود میں سموتے رشتے

اور
کچے دھاگوں کی طرح ٹوٹتے رشتے
برسات کی طرح بکھرتے رشتے
کہیں مصروفیت کے بوجھ تلے دبے رشتے
مقبوم کھوتے، لڑتے جھگڑتے رشتے

خون کے رشتے، دل کے رشتے، نظر کے رشتے اور احساس کے رشتے، یہ بڑا خوبصورت سارشتوں کا جال ہے جو ہر انسان کے گرد پھیلا ہوا ہے بہت خوبصورت..... ذرا محسوس تو کرو۔

ہاں اپنی آنکھوں کا درپچہ بند کر کے گہرا سانس بھرو..... بولو کیا محسوس ہوا؟ آکسیجن زندگی ہے اور زندگی کے بھی زندگی رشتے ہیں۔

جس طرح فضا میں پھیلتی عطریں خوشبو سانسوں میں مہک اُٹھتی ہے اسی طرح سچے رشتوں کی خوشبو رگوں میں خون بن کر بہتی ہے۔

کچھ رشتے انمول لفظوں کا روپ دھار لیتے ہیں جیسے ماں باپ، بہن بھائی، بیوی بچے، شوہر دوست اور ان کے توسط سے بننے کی نسلوں اور پشتوں تک جڑتے رشتے جو زندگی میں حرارت کا سماں ہیں۔

سائے، بہو، سر، داماد، بہنوئی، جیسٹ، جیٹھانی، دیوڑ، دیورانی، ننڈ، ماموں، خالہ، پھوپھو وغیرہ ہر دور و نزدیک کا رشتہ انوکھا لطف دیتا ہے ”محبت“ جو اپنی کی طرح ان کو جوڑتی ہے ”محبت“ ہی سے تو ان کا خمیر گوندھا جاتا ہے۔ احساس کے جادو رس میں..... احساس نہ ہو تو محبت نہیں ہوتی۔ محبت نہ ہو تو قریبی رشتے بھی اہمیت کھودیتے ہیں احساس و محبت ہوں تو دور کے رشتے بھی دل کے قریب محسوس ہوتے ہیں یعنی محبت اس کائنات کی بنیاد ہے۔

وہ احساس جو بتاتا ہے کہ ”اللہ“ موجود ہے وہ اللہ جس کو جتنا محسوس کرو اتنا ہی قریب لگتا ہے۔ سب سے پہلا رشتہ جو انسان کا بنتا ہے وہ اللہ ہی سے جڑتا ہے۔

وہ خالق ہے ہم اس کی مخلوق

ہم ساجد ہیں وہ ہمارا معبود

ہم طالب ہیں وہ ہمارا مطلوب

ہم عبد ہیں وہ ہمارا معبود

ہمارا کام اس معبود لاشریک کی الوہیت کے ڈنگے بجانا ہے جس کے ساتھ ہمارا رشتہ کانوں میں ”اللہ اکبر“ کی صدا گونجنے سے بھی پہلے کا ہے ”اللہ اکبر“ کی صدا گویا مہر تصدیق ہے ہم اُس کے عبد ہیں۔

پس ہمارا مقصد اس کی معبودیت بتلانا ہے اور ہمارا مقصد اس کی عبادت ہے وہ ہماری عبودیت کے صلے میں ہمیں اشرف المخلوقات کے انعام سے نواز کر ہماری ذات پر بے شمار و حساب احسانات فرماتا ہے۔ ایسے احسانات جس کی مقروض ہماری ہر سانس ہے اور جس کا قرضہ ہم کبھی اُتار نہیں سکتے ہاں مگر نماز، صبر، شکر اور حقوق العباد..... پھر بھی اُس کی نوازشوں کے برابر یہ سب امر نہیں ہو سکتے کیونکہ ہمارے مہر امر کے بدلے اس کا کرم ڈگنا ہے۔

سب کرموں سے بڑا کرم سب احسانات سے بڑا احسان محبوب انس و جاں و جود کائنات حضرت محمد ﷺ کی ذات فیوض و برکات، کیف آ و رد دل آ و رمہک سے دو عالم مہک گئے۔

جو دکھیا دلوں کا قرار بن کر آیا۔ جان بہار بن کر آیا۔ ایسا پیارا ایسا انمول رشتہ جس کی لذت کی انتہا نہیں ہے جس سے کائنات کا ذرہ ذرہ عشق کرتا ہے وہ شہزادہ گلگوں قبا حسن انسانیت اور ہمارے لیے شفیع روز شمار ہے۔ جس کے واسطے تن و

جان حاضر ہیں اور جوان روحان نہ وارے وہ بلاشبہ کافر ہے جو ان سے عشق نہ کرے مومن نہیں ہو سکتا۔

کیونکہ وہ پیغمبر اکرم ﷺ پیدا ہوتے ہی سر اقدس کو سجدے میں رکھ کر اُمت کی مغفرت کی دعا کرتے ہیں۔ وہ تو دشمنوں پر بھی کرم بے بہا کرتے ہیں اور ہم تو ان کی اُمت ہیں جن سے وہ پیار بے شمار کرتے ہیں جو سجدوں میں دعاؤں میں ہماری بخشش مانگتے ہیں۔

احسانِ عظیم جس کا بدل کوئی نہیں۔ وہ جانِ مسیحا کہ ایسا مسیحا کوئی نہیں۔ ایسا رشتہ جس کی نعت و ثناء سے زبان و دل عاجز آ کر اس کی محاسن بیان نہیں کر پاتے۔

ان کے قیمتی انمول پیارے میٹھے مشکبار آنسو ہماری بھلائی چاہتے ہیں اُمت کی بخشش کی خاطر بہتے ہیں۔ معراج کی شب بھی ”کن“ کی گنجی جیسی مقدس و مبارک زبان اقدس صرف ہماری نجات کی طلب گار بن جاتی ہے تو پھر اپنی قسموں پر رشک کیوں نہ کریں خود کو خوش نصیب کیوں نہ جانیں ہمیں وہ آقا ﷺ ملے جو خدا کے محبوب بلکہ پوری کائنات کے محبوب اور لحظہ لحظہ ہماری فکر کرنے اور خبر گیری کرنے والے ہیں۔

اس لیے لاکھ دکھوں غموں میں اگر ہماری زیست گزر رہی ہو تو کبھی بھی خود کو بد قسمت نہ کہیں ہماری قسمت کی قابل رشک بات یہی ہے کہ ہم ان ﷺ کے امتی ہیں۔ وہ کہ نورِ ازل منظرِ نور خدا جسے بھیج کر رب فرماتا ہے۔ ”اور ہم نے بھیجا تمہیں تمام جہانوں کے لیے رحمت بنا کر۔“

ہر رشتہ قربان ان کے نوری نوری قدموں پر کہ ان کے قدموں میں جو آجائے وہ فنا نہیں نہیں..... نہیں..... ہرگز..... نہیں بے ادب ان کے قدموں میں آنے والی فادراصل بقا ہے دائمی بقا..... ذرا سچا عاشق بن کر تو دیکھو..... اٹھا سیرتِ صحابہ اور بتا بھلا وہ فنا ہیں یا بقا پڑھ سیرتِ اہل بیت اطہار اور بتا بھلا وہ فنا ہیں یا بقا پڑھ سیرتِ اولیاء اور بتا وہ فنا ہیں یا بقا..... لیکن شرطِ اخلاص و عشق ہے۔ ہماری تو جان حاضر ہے محبوب ﷺ کے قدموں سے لگے ذروں کے واسطے ان کے آل و اصحاب کے واسطے اس اصل حقیقت کے بعد وہ رشتے جو اللہ نے ہمیں عطا کیے۔ کیا انسانیت احساسِ کارِ رشتہ نہیں ہے محسوس کر اور بتلا۔

”تو اپنے رب کی کون کون سی نعمت کو جھٹلائے گا؟“
کچھ رشتے جو فہم و ادراک سے ماورا ہیں۔
زبان ان کو کوئی نام دینے سے قاصر ہے محسوسات انہیں کسی کا حصہ دار بنانے سے لاچار ہیں۔
جن سے آشنائی وہی پاتا ہے جو انہیں محسوس کرتا ہے۔ دنیا تو انسانیت کا رشتہ سمجھے گی مگر حقیقت یہ ہے کہ یہ انسانیت سے بھی اوپر کی چیز ہے۔
کیونکہ

صرف لفظ انسانیت سے ان رشتوں کی تکمیل نہیں ہو سکتی۔ کوئی حرف ایجاد ہو جو ان کی معنویت کے اعتبار سے ان کے احساسات کو اپنے اندر بھر پور سمو سکے۔ وہ رشتہ ایسا ہی بے نام ہے..... پاکیزہ جس میں خون کی سند ضروری نہیں ہوتی۔ جس میں نہ طلب کی چاہ ہے نہ ذات کی فوقیت کیا یہ محبت ہے؟
لیکن نہیں

یہ محبت بھی نہیں ہے اور ہے بھی..... ہے اس لیے کہ رشتہ کوئی بھی ہو جب تک محبت کا فرمانہ ہو..... رشتہ پنپ نہیں سکتا۔

بالکل یوں جیسے محبت کے بغیر بندہ اللہ کو پہچان نہیں سکتا۔ حضور پاک کا مقام نہیں جان سکتا۔ آل پاک کی فضیلت سمجھ نہیں سکتا۔

اصحابِ کرام کا مرتبہ جانچ نہیں سکتا۔ اور اولیاء کرام کی قدر جان نہیں سکتا۔
اسی طرح رشتہ کوئی بھی ہو محبت کے بغیر پنپ نہیں سکتا اور کچھ رشتے ادھورے ہی ہوتے ہیں ادھورے مگر پوری جان سے محسوس ہونے والے۔

سوان کو بے نام ہی رہنے دیں آپ سے بس یہ گزارش ہے ہر رشتے کو اس کا مقام دیں زندگی خوبصورت ہو جائے گی کیونکہ ہر رشتہ اللہ کا انعام ہے اور
”تو اپنے رب کی کون کون سی نعمتوں کو جھٹلائے گا؟“

قائد اعظم محمد علی جناح غم و غصے میں

شمر احمد۔ بفرزون۔ کراچی

وہ کئی دیر سے بیٹھا یہ سب دیکھ رہا تھا۔ محن میں لگے نیم کے پیڑ پر بے گھونسلے کو تک رہا تھا۔ کچھ دیر پہلے پیش آئے واقعے نے اس کو سوچنے پر مجبور کر دیا تھا کیا یہی ”حال“ ہمارا ہے۔ 1947ء 14 اگست پاکستان زندہ باد میرا وطن پاکستان آباد رہے۔ خوش حال رہے پاکستان زندہ باد..... کے نعرے اس کے کانوں میں گونجنے لگے۔ لاکھوں مسلمانوں کی جانوں کی قربانی کے بعد حاصل ہوا یہ وطن۔ ہزاروں کی تعداد میں لوگ بے گھر ہوئے کتنے والدین بچوں سے محروم ہوئے۔ کتنے بیٹے اپنی جان سے گئے۔ اس وطن کو آزادی دلانے والا ایک عظیم رہنما قائد اعظم محمد علی جناح جس نے اپنی زندگی کا مقصد اس وطن پاکستان کی آزادی کے سپرد کر دیا اپنی زندگی کو پاک و وطن کی عوام کی خوشحالی و ترقی کے لیے قربان کر دیا۔ محن میں نیم کے پیڑ پر کئی مہینوں پرانا اک گھونسلہ جس میں اک چڑیا چڑا مزے سے رہ رہے تھے جہاں ان کے دو معصوم بچوں نے جنم لیا یہ چاروں اس گھونسلے کو اپنی ساری دنیا مان کر خوش جی رہے تھے کہ اک دن کوئے کی نظر اس گھونسلے پر پڑ گئی اور اس نے چڑیا کو یہاں سے بھگانے کا فیصلہ کر لیا کوئے نے اپنی چونچ سے سارا گھونسلہ برباد کر دیا اس لڑائی میں چڑیا کا ایک بچہ زخمی ہو کر زمین پر گرے ہی اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھا..... وہ حیرت سے یہ سب دیکھتا رہا ہم انسانوں اور جانوروں میں کیا فرق ہے۔ آج کا انسان بھی ان جانوروں کی طرح زندگی جیتا ہے جہاں طاقت و کمزور پر غالب آ جاتا ہے۔ ہماری حکومت نے اس طاقت کا مذاق بنا دیا ہے اپنی حکومتی طاقت کے بل پر عام عوام پر بھی بجلی کا حملہ ہوتا ہے تو بھی عوام بڑھتی مہنگائی کے نیچے پستی ہے پانی کی کمی بجلی کی کمی ملک کے حالات بہتر سے بہتر کے بجائے بدتر سے بدتر کے نزدیک آ گئے ہیں کل و عارت عام ہے۔ مسلمان مسلمان کا دشمن ہو گیا ہے اس وطن پاکستان کی حفاظت کی ذمہ داری کس کی ہے؟ حکومت کی یا عوام کی اپنے گزر جانے والے کل پر رونے کے بجائے آنے والے کل کی فکر کون کرے گا کیا ہم اک اور قائد کے انتظار میں ہیں کیوں.....؟ ہم خود اٹھ کر اس ملک کی ترقی کے لیے کام نہیں کر سکتے اسے برباد ہاتھوں بچا نہیں سکتے۔ صحیح فطرت کا شعور ہر انسان رکھتا ہے صحیح لیڈر کا انتخاب ہمارے ووٹ کی بنیاد پر کیا جاتا ہے تو ہم کیوں اپنی حکومت کا صحیح انتخاب نہیں کرتے۔ ایک دن مرنا سب کو ہے پر ذرا سوچیں آپ اپنے بچوں کو کیسا وطن دے کر جائیں گے وہ عظیم لوگ جو اس وطن پاک پاکستان کے لیے قربان ہوئے انہیں کیا جواب دیں گے عظیم رہنما قائد کو کیا جواب دیں گے کہ ہم اک وطن کو خوشحال نہ کر سکے اس کی حفاظت نہ کر سکے مجھے اک کوئے چڑیا کی جنگ نے بے دار کر دیا آپ کیسے بے دار ہوں گے؟

کیا رشتے وفا پر قائم ہیں؟

صنم ناز۔ گوجرانوالہ

ہر رشتہ چاہے چاہے وہ خون کا ہو یا احساس کا وفا پر قائم ہوتا ہے۔ ہمارے رشتے ہم سے کچھ زیادہ نہیں مانگتے صرف ہم سے ہمارا ٹھوڑا سا ٹام مانگتے ہیں۔ ٹھوڑی سی وفا مانگتے ہیں۔ اور کبھی بھی تو ہماری ذات حالات کی گردشوں میں اس طرح پھنس جاتی ہے کہ ہم سے سارے رشتے دور ہو جاتے ہیں۔ اور ہم حالات کی سنگ دلی پر تنہا کھڑے رہ جاتے ہیں لیکن ہم یا ہمارے رشتے یہ نہیں سمجھتے کہ قصور کس کا ہے ہمارا ہمارے رشتوں کا یا ان حالات کا..... کبھی بھی ہمیں ناچاہتے ہوئے بھی اپنے ناپسندیدہ حالات سے واسطہ رکھنا پڑتا ہے۔ اور ہمارے محبوب رشتے ہمیں بے وفا سمجھنے لگتے ہیں۔ کیا ضروری نہیں ان سب حالات کو سمجھیں۔

☆☆☆☆

پسند اپنی اپنی

قارئین کے پسند کردہ اشعار ادبی ذوق کے آئینہ دار

شاکستہ احمد..... لاہور

طلاق دے رہے ہو بہت قہر کے ساتھ
مری جوانی بھی لوٹا دو میرے مہر کے ساتھ

راشدہ..... کراچی

جو لہریں ساحلوں پہ ہنس رہی تھیں
سمندر میں بھٹکتی پھر رہی ہیں

عائشہ..... ملتان

ہم تو بس یونہی کیا کرتے ہیں پھولوں سے کلام
خواجواہ بات بڑھاتی ہیں ہوائیں صاحب

ریشم..... حیدرآباد

آ جا رات سہلی، کھیلیں اک دوچے کا غم
برس برس کے بارش دار اچانک جا میں تھم

ساجد علی خان..... کراچی

عجب اعتبار و بے اعتباری کے درمیاں ہے زندگی
میں قریب ہوں کسی اور کے مجھے جانتا کوئی اور ہے

نورالحین..... پشاور

ڈر شب کا وہاں کیوں نا بھلا تیز بہت ہو
جس گھر کا دیا ایک ہوا تیز بہت ہو

ندیم احمد..... ایبٹ آباد

برہنگی کا یہ درماں ہے تیرگی میں جئیں
چراغ ہو تو جلا میں لباس ہو تو سئیں

ناصر خان..... پشاور

ہر اک سوال کا اس کو جواب کیا دیتا
میں اپنی ذات کا اس کو حساب کیا دیتا

غلام شبیر..... بہاول نگر

کبھی اندھیرے بھی اجلیے محبتوں کے سرنزلے
عجب سہارا بنا ہے وہ بھلے بھی گرا دے بھی سنبھالے

نسرین اختر..... لاہور

میری دعاؤں میں تیرا وجود رہتا ہے
اب اس سے بڑھ کے میرا اعتراف کیا ہوگا

سرخان..... پشاور

ہر اک سوال کا اس کو جواب کیا دیتا
میں اپنی ذات کا اس کو حساب کیا دیتا

غلام شبیر..... بہاول نگر

کبھی اندھیرے بھی اجلیے محبتوں کے سرنزلے
عجب سہارا بنا ہے وہ بھلے بھی گرا دے بھی سنبھالے

نسرین اختر..... لاہور

روتے ہیں تنہا دیکھ کر مجھ کو وہ راستے
جن پہ ترے بغیر میں گزرا کبھی نہ تھا

خالدہ عزیز..... راولپنڈی

انہیں میری وفاؤں کا خیال آیا تو کب آیا
مٹا کر وہ مجھے میری کمی محسوس کرتے ہیں

مصطفیٰ لکھیل..... سیالکوٹ

کوئی آواز نہ سایہ نہ شجر کچھ بھی نہیں
شہر خاموش میں تاحہ نظر کچھ بھی نہیں

نور احمد..... کراچی

اپنے ہی مقدر کا مجھے مل جائے گا یارب!
وہ چیز عطا کر کہ جو قسمت میں نہیں ہے

مریم..... کراچی

ہر خوشی کو تیری طرف موڑ دوں تیرے لیے چاند تارے توڑ دوں
خوشیوں کے سبب میں تجھ پہ کھل دوں یا دوجھوٹا دل دوں؟

سیمہ..... کراچی

تاریک سفر میں جو اجالوں کی طرح ہے
اک شخص محبت میں مثالوں کی طرح ہے

مجید احمد..... بہاول پور

حوادث میں الجھ کر مسکرانا میری فطرت ہے
مجھے ناکامیوں پہ اشک برسانا نہیں آتا

راشدہ عظیم..... کراچی

ہم سے روشن تھی کبھی ہزم طرب
ہم ہی اب غم کا سمندر ہو گئے

اجمل شاہ..... کوہاٹ

آئے خزاں کے سبز قدم جب سے باغ میں
شاخوں سے پات ٹوٹ گئے پھول پھل گرے

نسرین اختر..... لاہور

میری دعاؤں میں تیرا وجود رہتا ہے
اب اس سے بڑھ کے میرا اعتراف کیا ہوگا

غلام شبیر..... بہاول نگر

کبھی اندھیرے بھی اجلیے محبتوں کے سرنزلے
عجب سہارا بنا ہے وہ بھلے بھی گرا دے بھی سنبھالے

نسرین اختر..... لاہور

میری دعاؤں میں تیرا وجود رہتا ہے
اب اس سے بڑھ کے میرا اعتراف کیا ہوگا

غلام شبیر..... بہاول نگر

کبھی اندھیرے بھی اجلیے محبتوں کے سرنزلے
عجب سہارا بنا ہے وہ بھلے بھی گرا دے بھی سنبھالے

نسرین اختر..... لاہور

نورین..... کراچی

یہ بھی اک تماشا ہے بازار الفت میں فراز
دل کی کا ہوتا ہے بس کسی کا چلا ہے

محمد علی..... حیدرآباد

قدرت کا وہ شاہکار مجھے بھولتا نہیں
اک شخص میرے یار مجھے بھولتا نہیں

سعدیہ..... کراچی

میرے ہاتھوں کی لکیروں میں یہ عیب چھپا ہے محسن
میں جس شخص کو چھو لوں وہ میرا نہیں رہتا

نازیہ جاوید..... کراچی

اک عمر جن پہ جاں کو نچھاور کے رہے
ان سے ہمارا حال بھی پوچھا نہیں گیا

شہناز..... ملتان

زندگی ہے عذاب کی صورت
اور پھر موت کس کو کہتے ہیں؟

راشد علی..... میرپور خاص

خیال خاطر احباب چاہیے ہر دم
انہیں شخص نہ لگ جائے آہنگیوں کو

گل زمان..... نوشہرہ

کیا ہوا اگر اس نے ہمیں چھوڑ دیا فراز
ہم نے بھی تو اس کے لیے زمانہ چھوڑا تھا

صنوبر..... کراچی

یہ وقت بڑا بے دردی ہے یہ وقت بڑا ہی قاتل ہے
یہ وقت نہ ٹھہرا میرے لیے جس وقت وہ مجھ سے جدا ہوا

رضوانہ خان..... ڈسکہ

تیرے مشورے کے خلوص پر مجھے ترک عشق قبول ہے
مگر ایک بات ہے ہم نشیں میری زندگی کا سوال ہے

غزب محبوب..... کھاریاں

محور عشق ہے دونوں کا ایک ہی غالب
مجھے اس سے اور اسے مجھ سے فرصت نہیں ملتی

نیہا..... کراچی

سو خلوص باتوں میں سب کرم خیالوں میں
بس ذرا وفا کم ہے شہر کے غزالوں میں

☆ ☆ ☆

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی پیش کش

(WWW.PAKSOCIETY.COM)

یہ شمارہ پاک سوسائٹی ڈاٹ کام نے آپ کیلئے پیش کیا۔

ہم خاص کیوں ہیں؟؟؟؟

یہ واحد ویب سائٹ ہے جہاں سے تمام ماہنامہ ڈائجسٹ، ناول، عمران سیریز، شاعری کی کتابیں، بچوں کی کہانیاں، اور اسلامی کتابیں

ڈائریکٹ ڈاؤن لوڈ کرنے کے ساتھ ساتھ آن لائن پڑھ بھی سکتے ہیں۔



fb.com/paksociety



twitter.com/paksociety1

ہائی کوالٹی پی ڈی ایف

اگر آپ کو ویب سائٹ پسند آئی ہے تو پوسٹ کے آخر میں اپنا تبصرہ ضرور دیں۔

اپنا تبصرہ صرف پوسٹ تک محدود رکھیں۔ درخواست کے لئے رابطہ کا صفحہ استعمال کریں۔

اپنے دوست احباب کو بھی پاک سوسائٹی کے بارے میں بتائیں۔

پاک سوسائٹی ڈاٹ کام کی انتظامیہ سے مالی تعاون کیجئے۔ تاکہ یہ منفرد ویب

سائٹ آپ کیلئے جاری رکھی جاسکیں۔

پاکستانیوں کے ویب سائٹ

WWW.Paksociety.Com

Library For Pakistan



WWW.PAKSOCIETY.COM

بازگشت

خواب



آپ نے کبھی سوچا ہے کہ علامہ اقبالؒ نے پاکستان کا خواب کیوں دیکھا تھا جو بعد ازاں سارے اسلامیان ہند کا مطالبہ بن گیا؟

آپ نے کبھی سوچا ہے کہ اسلامیان ہند نے قیام پاکستان کا مطالبہ کیوں کیا؟ شاید ہماری نوجوان نسل کی اکثریت یہ نہ جانتی ہو سو یہ چند وجوہ انہی کے لیے تحریر کی جارہی ہیں۔

غیر منقسم ہندوستان میں مسلمان زبان لباس تہذیب اور عقائد کے اعتبار سے بھارت کی اکثریت والی آبادی ہندوؤں سے قطعاً مختلف تھے۔ ہندو ہر لحاظ سے اُن پر غالب آنا

چاہتے تھے۔ اس صورت حال میں مسلمان دنیا کے رہتے نہ دین کے۔ یہ صرف اور صرف دین کا تعلق تھا جس کی بنیاد پر انہوں نے الگ قوم ہونے کا دعویٰ کیا اور انگریزوں کے ساتھ ساتھ

ہندوؤں کو بھی یہ دعویٰ تسلیم کرنا پڑا کیونکہ اس دعوے کی بنیاد سچائی پر ہے۔ بالآخر اس دعوے کی بنیاد پر کیا جانے والا مطالبہ جائز ٹھہرا اور برصغیر کے مسلمانوں کو اپنا الگ وطن مل گیا جس میں وہ اپنے

دین کے مطابق اپنا اجتماعی نظام چلا سکیں۔

قیام پاکستان عمل میں آیا تو ہر فرد کا یہ خیال تھا کہ اس سرزمین میں اسلامی قوانین رائج کیے جائیں گے۔ یہاں عدل و انصاف کا دور دورہ ہوگا۔ کوئی کسی کے حقوق غصب نہیں کر سکے گا۔ یہاں

صحیح معنوں میں بھائی چارہ اور اخوت ہوگی۔ سب کو برابر تصور کیا جائے گا اور کسی کو کسی پر ترجیح نہیں دی جائے گی۔ یہاں ایک ایسا معاشرہ قائم ہوگا جس میں کوئی لوٹ کھسوٹ ہوگی نہ استحصال۔ سب

کی جان و مال اور عزت و آبرو محفوظ رہے گی۔ ارباب اختیار دیانت دار ہوں گے اور پولیس تحفظ کی ضامن۔ ظلم و ستم تو دور کی بات ہے، کوئی کسی کی طرف نیکی آنکھ سے بھی نہیں دیکھے گا۔ ظلم کرنے والوں

کے ہاتھ قلم کر دیے جائیں گے اور مظلوموں کی وادری کی جائے گی۔ مختصر یہ کہ ہر طرف امن و سکون ہوگا اور یہاں رہنے والے اپنے دین و مذہب کے مطابق زندگی بسر کریں گے۔ یہ شخص ایک خواب تھا

جو چمکا چور ہو گیا۔ سرکوں، گلیوں، مسجدوں اور امام بارگاہوں میں نامعلوم بے رحم قاتلوں کی گولیوں سے دم توڑتے ہوئے ہزاروں لہیوں سے جو آواز آرہی ہے وہ آپ بھی سن رہے ہیں نا؟

پاکستان کا مطلب کیا؟

لا الہ الا اللہ

کیا یہی ہمارے خواب کی تعبیر ہے؟

قارئین کرام! سہام مرزا (مرحوم) نے مذکورہ ادارہ ماہنامہ ”دوشیزہ“ اور ماہنامہ ”سچی کہانیاں“ کے لیے نومبر 1996ء میں تحریر کیا تھا۔ ذرا غور کریں کیا یہ ادارہ موجودہ صورت حال کا عکاس نہیں؟